یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.



منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

مصباح المجالس

جلد اول

مصنفہ

سید المفسرین ادیب اعظم الحاج مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی
بانی جامعہ امامیہ و صدر جامعہ امامیہ کمیٹی

مصنف دوسو سترہ (۲۱۷) کتب

ناشر
ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ رجسٹرڈ
ناظم آباد کراچی

ناشر: .... ظفر شمیم پبلیکشنز ٹرسٹ ناظم آباد نمبر ۲ کراچی نمبر ۱۸

مطبع: .... قریشی آرٹ پریس کراچی

کتابت: .... سیّد طاہر حسین نقوی امروہوی

سال اشاعت .... جنوری ۱۹۹۸ء

کچھ اس ایڈیشن کے بارے میں

ظفر شمیم پبلیکشنز ٹرسٹ کے ممبران اور مومنین کی خواہش پر مصباح المجالس حصہ اوّل کی کتابت از سرِ نو کرائی گئی ہے اس کے علاوہ آیات قرآنی کے حوالہ جات بھی ہر آیت کے نیچے بمعہ سورہ اور آیت نمبر دیئے گئے ہیں طباعت اور کاغذ کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے تاکہ اس کا معیار بھی ٹرسٹ کی دوسری کتب کی طرح زیبا دید رہے۔ اس کتاب کی تصحیح کے سلسلے میں عالیجناب مولانا سید عنایت حسین جلالوی۔ جناب حمتاز حسین صاحب۔ جناب سید کاظم حسین صاحب نقوی۔ سید مظاہر حسین صاحب عابدی اور اپنے چھوٹے بھائی جناب سید شبیہ الحسن صاحب نقوی کا تہہ دل سے مشکر گزار ہوں کہ جنھوں نے میری پوری معاونت فرمائی۔ ان حضرات کے علاوہ میں قبلہ و کعبہ عالیجناب مولانا حسن اصغر صاحب پرنسپل جامعہ امامیہ کراچی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے عربی عبارات کی صحت فرمائی۔

ڈاکٹر سیّد ندیم الحسن

التماس دعا

حضرت ادیب اعظم و مفسر قرآن مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ (مرحوم) ابنِ سیّد دلشاد علی صاحب مرحوم کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیئے مومنین سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔

ہدیہ ۱۵۰ روپے

انتساب

میں اپنی اس مقبول عام کتاب کے آٹھویں ایڈیشن کا انتساب اپنے مرحوم والدین کے نام سے کرتا ہوں جن کی دعاؤں کا اثر میری دینی خدمات اور منازل حیات میں میری کامیابی ہے اے خالقِ بے نیاز! اے معبودِ برحق تیری بارگاہِ عزّت وجلال میں میری یہ درخواست ہے کہ جب تک میری یہ کتاب مجلسوں اور منبروں پر پڑھی جائے۔ جب تک اہلِ ایمان اس سے فیض روحانی حاصل کرتے رہیں اس کا ثواب میرے شفیق والدین کی روح کو پہنچتا رہے۔ تیری رحمت بے پایاں میری اُمید کا سہارا ہے۔

ناچیز: ظفر حسن

مختصر حالات مصنف کتاب ہذا حضرتِ ادیب اعظم مدظلہ

حضرت ادیب اعظم مولانا و مقتدانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ نقوی ابن سید دلشاد علی بن سید امداد علی کا اصلی وطن امروہہ ضلع مراد آباد یوپی بھارت ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سید المدارس اور امام المدارس امروہہ میں حاصل کی پھر مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں تقریباً دو سال فاضل کی جماعت میں تعلیم حاصل کی، لکھنؤ سے امروہہ واپس آکر سرکاری نصاب تعلیم کی طرف توجہ کی۔ پہلے ۱۹۰۸ء میں میور سینٹرل کالج الٰہ آباد سے ملّا کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۹ء میں اسی کالج سے امتحان فاضل پاس کیا۔ ۱۹۱۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ان سب امتحانات کی تیاری آپ نے امروہہ کے مشہور و معروف زبان فارسی و عربی کے ادیب کامل فاضل جلیل و عالم نبیل مولانا و مقتدانا سید جواد حسین صاحب قبلہ عالی طاب ثراہ خویش جناب سرکار نجم العلماء اعلی اللہ مقامہ کے زیر تعلیم رہ کر کی۔ لکھنؤ جانے سے پہلے آپ نے جناب جنّت مکاں فقیہ لاثانی مولانا و مقتدانا سید اولاد حسن صاحب قبلہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ میں آپ کو جناب سرکار نجم العلماء نور اللہ مرقدہ اور جناب ملک الناطقین خطیب لاثانی مولانا سید سبطِ حسن صاحب قبلہ اور جناب مولانا عالم حسین صاحب قبلہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔

مذہب کی محبّت میں آپ نے پرائیویٹ طریقہ پر انگریزی زبان حاصل کرکے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس ایل سی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۰ء تک آپ تھیوسوفیکل ہائی اسکول میں سات سال بطور ہیڈ مولوی رہے۔ اور جب وہ کالج ہوگیا تو بحیثیت فارسی پروفیسر کام کرتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو آپ کو وطن سے قریب رہنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں آپ پارکر ہائی اسکول مراد آباد میں آگئے یہ اسکول بھی چند سال بعد کالج ہوگیا۔ ۱۹۴۹ء تک آپ یہاں رہے۔ مشن والوں نے آپ کی ادبی خدمات اور اعلیٰ علمی قابلیت کی بہت قدر کی۔ اسکول کے لائق مینیجر مسٹر این جارڈن آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ آپ کو شمس العلماء کا خطاب مل جائے گورنر یوپی نے وعدہ کرلیا تھا۔ ضروری کاغذات سیکریٹریٹ میں پہنچ چکے تھے کہ تقسیم ملکی کا قصہ چھڑ گیا اور یہ سلسلہ ختم ہوا۔

آپ ہمیشہ سے شدید المطالعہ ہیں۔ عربی فارسی کے علاوہ آپ نے انگریزی کی بھی بڑی بڑی مبسوط کتابیں پڑھ ڈالیں۔ آپ کو اسٹرالوجی (علم نجوم) جیولوجی (علم طبقات الارض) سائکالوجی (علم النفس) وغیرہ مضامین سے چونکہ بہت زیادہ دلچسپی تھی لہٰذا ان علوم کی کتب آپ کے مطالعہ میں زیادہ رہتی تھیں اور جن نظریوں سے احکامِ اسلام کی تائید ہوتی تھی۔ ان کو آپ اپنی نوٹ بک میں درج کرتے جاتے تھے۔ جن سے آپ کو اپنی تالیفات میں مدد ملی۔ ۱۹۲۰ء میں انگلینڈ میں ایک اسپریچول سوسائٹی قائم ہوئی۔ جس کے راس درئیس یورپ کے مشہور مسمیرائیزر مسٹر سلون تھے۔ اس سوسائٹی نے روحانیت پر چند قابلِ دید کتابیں شائع کیں۔ مولانا نے اس سوسائٹی سے خط و کتابت کر کے ان کی تالیفات حاصل کیں۔ اور بنور ان کا مطالعہ کر کے رسالۂ نور میں ایک مضمون "روحوں کی حاضرات" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ جب مولانا تھیوسوفیکل کالج میں پروفیسر تھے ایک نیشنل ویک قائم ہوا جس میں علمی تقاریر بھی داخلِ پروگرام تھیں۔ کالج کے سات پروفیسروں نے اس میں حصہ لیا۔ مولانا نے بھی ان میں شامل تھے۔ پبلک نے سب سے زیادہ آپ کی تقاریر پسند کیں چنانچہ کالج کی طرف سے دو سو پچاس روپیہ آپ کو انعام ملا ان مضامین کو نولکشور پریس نے دو سو پچاس روپے میں خرید کر کے "کارخانہ عالم" کے نام سے چھپوا دیا۔

۱۹۱۴ء سے جب کہ مولانا کا بنور میں تھے۔ آپ نے مجالس پڑھنا شروع کیا۔ اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اور آپ کا شمار صفِ اوّل کے واعظین میں ہے مگر آپ کراچی سے باہر اپنی عدیم الفرصتی کی بناء پر بہت کم جاتے ہیں لاہور میں بزمانہ عشرۂ محرم تقریباً ۲۶ سال سے ایبٹ روڈ خلیفہ لاج میں آپ ایک عشرہ برابر پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ یہ عشرہ ملکی تقسیم سے پہلے ریاست پٹیالہ میں وزیر صاحب کے عزاخانہ میں ۱۹۴۰ء سے پڑھتے چلے آرہے تھے۔ واعظین کی فہرست میں شاید ہی کوئی واعظ آپ کو ایسا ملے جس نے پچاس سال متواتر ایک عشرہ ایک منبر پر پڑھا ہو۔

آپ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ اب آپ کی عمر انگریزی حساب سے تقریباً ۸۸ سال اور عربی سال سے تقریباً ۹۱ سال ہے۔ مگر بحمد اللہ اب بھی سات آٹھ گھنٹے برابر دماغی کام کر لیتے ہیں۔ اولاد کے اعتبار سے آپ بہت خوش نصیب انسان ہیں آپ کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ اور ماشاء اللہ سب نہایت سعید اور صالح ہیں۔

۱۔ سید تہذیب الحسن جواردو فارسی کے متعدد امتحانات پاس ہیں۔

۲۔ سید شمیم الحسن نقوی ایم اے ایل ایل بی یونائیٹیڈ بینک میں سینئر وائس پریذیڈنٹ ہیں۔

۳۔ سید نسیم الحسن بی ایس سی میکینکل اینڈ الیکٹریکل انجینئر ایڈوائزر اٹامک انرجی کمیشن

۴۔ ڈاکٹر سید توصیف الحسن ایم ایس سی پی ایچ ڈی پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی انڈیا۔
۵۔ ڈاکٹر سید ندیم الحسن بی ایس سی۔ ایم بی بی ایس سابق شپ سرجن جاٹنا نیوی گیشن
۶ سید تسنیم الحسن بی ایس سی انجینئر ڈپٹی ڈائرکٹر پولی ٹیکنیک ایجوکیشن۔ چیئرمین بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن سندھ
۷۔ سید شبیہ الحسن ایم اے ایل ایل بی منیجر یونین بینک منیجر حبیب کریڈٹ اینڈ ایکسچینج بنک کراچی (ریٹائرڈ)
صاحبزادیوں میں محترمہ بلقیس فاطمہ اور پروین دولت

حضرت ادیب اعظم مع اپنے متعلقین کے مئی ۱۹۵۰ء میں ترک وطن کرکے کراچی تشریف لے آئے اس وقت سے مستقل قیام یہیں ہے۔ ناظم آباد ۲ میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرایا۔ حضرت قبلہ نے اپنی مبارک زندگی کا بیشتر حصہ علمی خدمات اور مذہب وملت کی خدمت اور فلاح وبہبود میں صرف کیا ہے۔ آپ کی تصنیفات کی طولانی فہرست دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور محنت پسند ہے۔ دنیا میں کم لوگوں کی تصنیف وتالیف کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ ہوگا باوجود کہ مجالس خوانی کی مصروفیت قومی کاموں کی انجام دہی اور رسالہ نور میں مستقلاً ۲۴ سال مضامین نویسی کے پھر بھی میدان تصنیف وتالیف میں آپ کا قلم چلتا رہتا ہے۔ رسالہ نور میں زیادہ مضامین آپ ہی کے ہوتے تھے۔ یہ رسالہ دس سال تک مرادآباد سے نکلتا رہا اور پھر کراچی سے ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوا جو کہ بوجوہات گرانی کاغذ کے ۱۹۶۸ء میں بند ہوگیا۔

۱۹۵۳ء سے آپ نے کراچی میں ایک نہایت مفید قومی ادارہ کی بنیاد ڈالی۔ پاکستان میں مدرسۃ الواعظین کی سخت ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ اس ضرورت کو آپ نے پورا کرنا چاہا۔ اس کے لئے نواب مظفر علی خان صاحب قزلباش کی مدد سے آپ نے ایک قطعہ اراضی ۲۱۳۲ گز ناظم آباد میں الاٹ کرایا اور انتہائی جانفشانی سے چندہ جمع کرکے اس کی تعمیر کا کام شروع کرادیا۔ یہ آپ ہی کی کوششوں کا واحد نتیجہ تھا کہ صرف چار سال کے اندر حسب ذیل عمارت اس سرزمین پر بن گئی۔ ایک عالی شان مسجد ایک موذن کا مکان۔ مدرسہ کے لئے نیچے اوپر سولہ کمرے اور دو ہال دو گیلریاں دو زینے۔ تین عالی شان گیٹ۔ سترہ دکانیں تین فلیٹ۔ اب ۱۹۵۷ء سے یہاں تین جماعتیں تعلیم پا رہی تھیں ناظرہ قرآن۔ حافظین قرآن۔ جس میں ہر طالب علم کو بتیس روپے ماہوار وظیفہ دیا جاتا تھا۔ چھ سال بعد یہ کلاس ختم کردی گئی۔ واعظین کلاس درجہ اول، دوم، سوم، چہارم ہر طالب علم کو دو سو پچاس وظیفہ دیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کا نظم ٹرسٹیز کرتے ہیں جس کے صدر آپ ہیں۔ جس زمانہ میں آپ کا قیام ہندوستان میں تھا آپ نے امروہہ میں ایک شیعہ آرٹس اسکول بھی قائم کیا تھا۔ جس میں قوم پر کپڑا بننا سکھایا جاتا تھا مگر افسوس روپیہ ختم ہونے سے پہلے اسکول ختم ہوگیا۔ کیونکہ سادات کرام نے اس خیال سے اپنے بچوں کا داخلہ روک لیا کہ وہ کپڑا بن کر جولاہے کہلانے لگیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کو اس قابل قدر وجود پر جس قدر بھی فخر ہو کم ہے۔ ایسی ٹھوس خدمت کرنے والی

ہستیاں کم پائی جاتی ہیں اور پھر خوبی یہ کہ انتہائی دیانت اور ہمدردی سے آپ جس کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں اس کو کامیاب بنانے میں پوری کوشش کرتے ہیں۔ آپ ۶۳ سال سے علمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں دماغ اتنا رسا اور طبیعت اتنی روشن کہ جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں دریا بہادیتے ہیں جس موضوع پر تقریر فرماتے ہیں اس کے کسی پہلو کو تشنۂ تکمیل نہیں رکھتے۔ رسالہ نور میں بعض بعض مضامین آپ نے متعدد قسطوں میں لکھے جیسے حقیقت انسانیہ۔ اسلام فطری دین ہے۔ روحوں کی حاضرات۔ علامہ برزخی کا مکالمہ۔ نورؔ ہی پر موقوف نہیں۔ بہت سے اخبار و جرائد میں آپ کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔ جیسے رضا کار شیعہ البرہان وغیرہ۔

آپ کی ادبی خدمات کی قدر یوپی کے محکمۂ تعلیم نے بھی کی۔ اور ایک عرصہ تک آپ کی تصنیفات بطور ٹیکسٹ بک انگریزی اسکولوں، کالجوں اور ورنیکلر مدارس میں پڑھائی جاتی رہیں۔ کئی بار آپ کو مضمون نویسی پر گورنمنٹ اور پبلک سوسائٹیوں کی طرف سے انعام بھی ملے جیسے کرک شیلنگ پرائز جارج پنجم کی سلور جوبلی کے موقع پر جو قصاید لوگوں نے لکھے تھے۔ یوپی میں ان کی تعداد ۷۲۳ تھی۔ آپ کا قصیدہ ان میں سب سے اوّل رہا۔ جس پر گورنمنٹ یوپی کی طرف سے آپ کو انعام ملا۔ ۱۹۳۷ء سے یکایک آپ کی طبیعت نے پلٹا کھایا اور اس مشغلہ کو چھوڑ کر آپ نے تمام تر توجّہ دینی خدمت کی طرف مائل کی۔

آپ کی تصنیفات تین قسم کی ہیں۔ اوّل وہ کتابیں جو آپ نے محکمۂ تعلیم کی ضرورت کے لحاظ سے لکھیں۔ دوم جو اپنے ذاتی شوق سے بطورِ ادبی خدمات کے لکھیں۔ سوم مذہبی اور دینی خدمت چونکہ یہ سلسلہ تقریباً ۵۹ سال سے جاری ہے۔ لہٰذا بہت سی کتابیں تو پہلے ہی ناپید تھیں اور اس ملکی انقلاب نے تو ان سب کتابوں کا خاتمہ کردیا۔ جو ہندوستان میں چھپی تھیں۔ کیونکہ قبلہ موصوف کا کتب خانہ وہیں رہ گیا۔ آپ کی توجّہ نظم سے زیادہ نثر کی طرف ہے لیکن جب نظم لکھنے بیٹھتے ہیں تو خوب لکھتے ہیں۔

۱۹۵۴ء سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم ہوگیا تھا جس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ امامیہ کے کاموں کی وجہ سے آپ کی فرصت کے اوقات بہت تنگ ہوگئے تھے۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی اسی مقدّس کام کے لئے وقف کردی ہر روز مغربین کی نماز جماعت آپ ہی پڑھاتے رہے۔ چند سال بعد پھر قلم اسی رفتار سے چلنے لگا۔ (اگلے صفحہ پر ان کتابوں کی فہرست ہے جو طبع ہوچکی ہیں)

۱ تعلیمی خدمات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحے	سنہ طباعت	نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت
۱	القواعد اردو	۳۲	۱۹۱۴ء	۲۳	گلزار فارسی حصہ اول	۶۴	۱۹۳۰ء
۲	گلدستۂ مضامین	۳۴	۱۹۲۰ء	۲۴	گلزار فارسی حصہ دوم	۶۴	۱۹۳۰ء
۳	ادب فارسی	۸۰	"	۲۵	لڑکوں کی کہانیاں حصہ اول	۶۴	۱۹۳۰ء
۴	تہذیب القواعد	۳۴	۱۹۲۳ء	۲۶	لڑکوں کی کہانیاں حصہ دوم	۶۴	۱۹۳۰ء
۵	ورنیکلر فائنل مضامین	۹۶	۱۹۲۴ء	۲۷	لڑکوں کی کہانیاں حصہ سوم	۶۴	۱۹۳۰ء
۶	معلم خطوط نویسی	۸۰	۱۹۲۴ء	۲۸	لڑکوں کی کہانیاں حصہ چہارم	۶۴	۱۹۳۰ء
۷	تکمیل اردو	۳۴	۱۹۲۴ء	۲۹	گلدستۂ قواعد حصہ اول	۴۸	۱۹۳۱ء
۸	تہذیب اللغات	۱۰۰	۱۹۲۵ء	۳۰	گلدستۂ قواعد حصہ دوم	۴۸	۱۹۳۱ء
۹	چمن اردو	۱۰۰	۱۹۲۵ء	۳۱	سلک اردو حصہ اول	۱۵۰	۱۹۳۲ء
۱۰	گنجینۂ مضامین	۴۰۰	۱۹۲۶ء	۳۲	سلک اردو حصہ دوم	۲۵۰	۱۹۳۲ء
۱۱	نصاب فارسی	۱۲۰	۱۹۲۷ء	۳۳	سلک اردو حصہ سوم	۲۸۰	۱۹۳۲ء
۱۲	قواعد اردو حصہ اول	۳۲	۱۹۲۷ء	۳۴	سلک اردو حصہ چہارم	۳۰۴	۱۹۳۲ء
۱۳	قواعد اردو حصہ دوم	۴۰	۱۹۲۸ء	۳۵	سلک اردو حصہ پنجم	۳۲۰	۱۹۳۲ء
۱۴	بہارستان اردو حصہ اول	۱۶۰	۱۹۲۸ء	۳۶	سلک اردو حصہ ششم	۴۳۸	۱۹۳۲ء
۱۵	بہارستان اردو حصہ دوم	۱۶۰	۱۹۲۸ء	۳۷	کمال اردو حصہ اول	۹۶	۱۹۳۳ء
۱۶	دبستان اردو	۱۴۸	۱۹۲۸ء	۳۸	کمال اردو حصہ دوم	۱۱۶	۱۹۳۳ء
۱۷	ترجمان فارسی حصہ اول	۶۴	۱۹۲۹ء	۳۹	کمال اردو حصہ سوم	۱۳۴	۱۹۳۳ء
۱۸	ترجمان فارسی حصہ دوم	۸۰	۱۹۲۹ء	۴۰	کمال اردو حصہ چہارم	۱۵۰	۱۹۳۳ء
۱۹	بچوں کی کہانیاں حصہ اول	۶۴	۱۹۳۰ء	۴۱	کمال اردو حصہ پنجم	۱۸۰	۱۹۳۳ء
۲۰	بچوں کی کہانیاں حصہ دوم	۶۴	۱۹۳۰ء	۴۲	تسہیل القواعد	۳۲	۱۹۳۴ء
۲۱	بچوں کی کہانیاں حصہ سوم	۶۴	۱۹۳۰ء	۴۳	تحصیل القواعد	۴۰	۱۹۳۴ء
۲۲	بچوں کی کہانیاں حصہ چہارم	۶۴	۱۹۳۰ء	۴۴	تکمیل القواعد	۴۸	۱۹۳۴ء

۱ تعلیمی خدمات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت	نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت
۴۵	شمیم القواعد	۹۶	۱۹۳۴ء	۵۰	رسالہ قواعد اردو	۱۶	۱۹۳۴ء
۴۶	نسیم القواعد	۸۰	۱۹۳۴ء	۵۱	ادبی خطوط	۲۰۴	۱۹۳۴ء
۴۷	ندیم القواعد	۶۴	۱۹۳۴ء	۵۲	شباب اردو	۳۰۴	۱۹۳۴ء
۴۸	قسیم القواعد	۶۴	۱۹۳۴ء	۵۳	کلید امتحان	۱۶۰	۱۹۳۴ء
۴۹	توصیف القواعد	۱۶۰	۱۹۳۴ء	—	—	—	—

۲ ادبی خدمات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت	نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت
۵۴	سیر کواکب	۱۸۰	۱۹۱۵ء	۶۵	لطائف الشعراء	۳۰۰	۱۹۲۵ء
۵۵	صحبت کا اثر	۴۸	۱۹۱۵ء	۶۶	دنیا کے چار دروازے	۱۵۶	۱۹۲۶ء
۵۶	گل صد برگ	۹۶	۱۹۱۶ء	۶۷	مرثیہ استاد	۱۶۰	۱۹۲۶ء
۵۷	اخلاق حسنہ	۱۰۸	۱۹۱۷ء	۶۸	اردو گلستان	۲۰۰	۱۹۲۶ء
۵۸	فریاد عاصی	۳۲	۱۹۱۷ء	۶۹	شہید یونان	۱۶۰	۱۹۳۳ء
۵۹	ارمغان عاصی	۱۶	۱۹۱۸ء	۷۰	ثمرہ تجارت	۲۰	۱۹۳۳ء
۶۰	ایام غدر	۲۵۰	۱۹۱۹ء	۷۱	یورپ کے سیارے	۱۵۴	۱۹۳۳
۶۱	رہنمائے مسرت	۶۴	۱۹۲۱ء	۷۲	زندگی کے دو رخ	۱۲۸	۱۹۳۳ء
۶۲	کارخانۂ عالم	۲۵۰	۱۹۲۱ء	۷۳	مشاہیر عالم	۲۰۴	۱۹۳۳ء
۶۳	تہذیب الاطفال	۱۶۰	۱۹۲۲ء	۷۴	انسان اور حیوانیت	۴۲۵	۱۹۳۳ء
۶۴	اسرار قدرت	۳۰۴	۱۹۲۴ء		... ...	...	...

مصباح المجالس

جلد اوّل

مصنّفہ

سیّد المفسرین ادیب اعظم الحاج مولانا سیّد ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی

بانی جامعہ امامیہ و صدر جامعہ امامیہ کمیٹی

مصنّف دو سو سترہ (۲۱۷) کتب

ناشر

ظفر شمیم پبلیکیشنز ٹرسٹ رجسٹرڈ

ناظم آباد کراچی



ادیب اعظم مفسر القرآن عالیجناب مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ

۳ مذہبی خدمات

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت	نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت
۷۵	اصحابِ رسول حصہ اوّل	۸۰	۱۹۱۶ء	۹۷	سوانح عمری حضرت امام نہم	۴۸	۱۹۳۷ء
۷۶	اصحابِ رسول حصہ دوم	۸۰	۱۹۱۶ء	۹۸	سوانح عمری حضرت امام دہم	۷۶	۱۹۳۷ء
۷۷	اصحابِ رسول حصہ سوم	۸۰	۱۹۱۶ء	۹۹	سوانح عمری حضرت امام یازدہم	۴۸	۱۹۳۷ء
۷۸	قضایائے امیرالمومنین	۱۰۴	۱۹۱۸ء	۱۰۰	سوانح عمری حضرت امام دوازدہم	۱۰۰	۱۹۳۷ء
۷۹	آئینہ اسلام	۳۰۴	۱۹۱۸ء	۱۰۱	دینی کہانیاں حصہ اوّل	۳۰۴	۱۹۳۸ء
۸۰	شیعہ دینیات کورس	۱۱۲	۱۹۲۲ء	۱۰۲	دینی کہانیاں حصہ دوم		۱۹۳۸ء
۸۱	الشہید	۶۴	۱۹۲۴ء	۱۰۳	دینی کہانیاں حصہ سوم		۱۹۳۸ء
۸۲	جنّت البقیع	۹۶	۱۹۲۵ء	۱۰۴	دینی کہانیاں حصہ چہارم		۱۹۳۸ء
۸۳	مناظرہ تقدیر و تدبیر	۱۰۴	۱۹۲۹ء	۱۰۵	دینی کہانیاں حصہ پنجم	۴۰۰	۱۹۴۰ء
۸۴	حقیقتِ روح	۱۰۴	۱۹۳۰ء	۱۰۶	دینی کہانیاں حصہ ششم	۲۸۸	۱۹۴۰ء
۸۵	جوازِ عزا	۹۶	۱۹۲۹ء	۱۰۷	تحفۃ الابرار	۲۴۸	۱۹۳۸ء
۸۶	حقیقی اصحابِ رسولؐ	۳۰۴	۱۹۲۷ء	۱۰۸	مذہبی مکالمہ	۴۶۴	۱۹۳۹ء
۸۷	سوانح عمری حضرت رسولِ خداؐ	۱۵۰	۱۹۳۷ء	۱۰۹	یداللہی طمانچہ	۹۶	۱۹۳۹ء
۸۸	سوانح عمری حضرت علیؑ	۱۶۰	۱۹۳۷ء	۱۱۰	سرفروشانِ ملّت	۳۰۴	۱۹۳۹ء
۸۹	سوانح عمری حضرت امام حسنؑ	۶۴	۱۹۳۷ء	۱۱۱	خواتینِ اسلام	۱۶۰	۱۹۳۹ء
۹۰	سوانح عمری حضرت فاطمہؑ	۱۰۴	۱۹۳۷ء	۱۱۲	بچوّں کی دینیات حصہ اول	۴۴/۶۴	۱۹۴۰ء
۹۱	سوانح عمری حضرت امام حسینؑ	۲۴۰	۱۹۳۷ء	۱۱۳	بچوّں کی دینیات حصہ دوم	۳۲/۱۱۲	۱۹۴۰ء
۹۲	سوانح عمری حضرت امام چہارمؑ	۱۱۲	۱۹۳۷ء	۱۱۴	شیعہ دینیات حصہ اول		
۹۳	سوانح عمری حضرت امام پنجمؑ	۶۴	۱۹۳۷ء	۱۱۵	شیعہ دینیات حصہ دوم		
۹۴	سوانح عمری حضرت امام ششمؑ	۱۳۶	۱۹۳۷ء	۱۱۶	مصباح المجالس حصہ اوّل	۳۱۲	۱۹۴۱ء
۹۵	سوانح عمری حضرت امام ہفتمؑ	۱۸۸	۱۹۳۷ء	۱۱۷	مصباح المجالس حصہ ۲	۱۱۲	۱۹۴۱ء
۹۶	سوانح عمری حضرت امام ہشتمؑ	۱۲۰	۱۹۳۷ء	۱۱۸	تحفۃ المومنین	۳۰۴	۱۹۴۲ء

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت	نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سنہ طباعت
۱۱۹/۱۲۳	مجمع الآیات	۲۸۵۰	۱۹۴۴ء	۱۵۲	اہل بیت و منازل روحانیت	۸۰	۱۹۵۵ء
۱۲۴	ترجمہ قرآن مع حاشیہ (غیر مطبوعہ)		۱۹۴۶ء	۱۵۳	سکینہ بنت الحسینؑ	۲۴	۱۹۵۵ء
۱۲۵	مجالس خواتین	۳۰۰	۱۹۵۲ء	۱۵۴	واقعات کربلا کا پس منظر	۳۲	۱۹۵۵ء
۱۲۶	محافل و مجالس	۲۴۴	۱۹۵۲ء	۱۵۵	واقعات کربلا پر تحقیقی نظر	۴۸	۱۹۵۵ء
۱۲۷	عقائد اسلام	۱۱۲	۱۹۵۳	۱۵۶	واقعات کربلا کی مختصر تاریخ	۴۸	۱۹۵۶ء
۱۲۸	مختار نامہ	۴۸	۱۹۵۲ء	۱۵۷	اہلبیتؑ کا احسان اسلام پر	۸۰	۱۹۵۴ء
۱۲۹	سوانح عمری حضرت حجت علیہ السلام	۴۸	۱۹۵۲ء	۱۵۸	اہل بیتؑ اور اسلام ۱۵۹ اخلاق الائمہ		۱۹۵۴ء
۱۳۰	فضائل حضرت امیر المومنینؑ	۴۸	۱۹۵۲ء	۱۶۰/۱۶۱	اہل بیتؑ کی دینی خدمات واقعہ کربلا کے بعد		۱۹۵۴ء
۱۳۱/۱۳۳	دعائے نور۔ دعائے مشلول حدیث کسا مترجم		۱۹۵۲ء	۱۶۲/۱۶۳	رباعیات انیسؒ رباعیات دبیر پر تبصرہ		۱۹۵۴ء
۱۳۴	حکومت الہیہ اور سیاست علویہ	۱۴۴	۱۹۵۲ء	۱۶۴/۱۶۵	تحقیق مسئلہ بدا۔ خصائص حسنہ		۱۹۵۴ء
۱۳۵/۱۳۶	حیات بعد الموت عقائد الشیعہ		۱۹۵۳ء	۱۶۶/۱۶۷	امامت منصوصہ ۔ نورانی پیکر		۱۹۶۳ء
۱۳۷	تحقیق حدیث قرطاس	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۶۸/۱۶۹	مودت ذوی القربیٰ ۔ جواز مراسم		۱۹۶۳ء
۱۳۸	تحقیق حدیث فدک	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۰	مجمع فضائل ترجمہ شہر آشوب	۶۰۰	۱۹۶۳ء
۱۳۹/۱۴۰	تحقیق مسئلہ متعہ، تحقیق مسئلہ تقیہ		۱۹۵۴ء	۱۷۱	الشافی ترجمہ اصول کافی جلد اول		۱۹۶۴ء
۱۴۱	تحقیق مسئلہ خمس و حق ذوی القربیٰ		۱۹۵۴ء	۱۷۲	الشافی ترجمہ اصول کافی جلد دوم		۱۹۶۴ء
۱۴۲	جواز مراسم عزا	۴۸	۱۹۵۴ء	۱۷۳	الشافی ترجمہ فروع کافی جلد اول		۱۹۶۴ء
۱۴۳	قاتلانِ حسینؑ کا مذہب	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۴	الشافی ترجمہ فروع کافی جلد دوم		۱۹۶۴ء
۱۴۴	یزید بن معاویہ	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۵	اہلبیتؑ اور اسلام خدمات		۱۹۶۴ء
۱۴۵	تحقیق مسئلہ فقہ	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۶	مصباح المجالس حصہ چہارم		۱۹۶۳ء
۱۴۶	تحقیق مسئلہ تحریف	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۷	مصباح المجالس حصہ سوم		۱۹۶۳ء
۱۴۷	تحقیق مسئلہ عقد کلثوم	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۷۸	حالات انبیاء و ائمہ معہ تنقید و تبصرہ		۱۹۷۱ء
۱۴۸	تحقیق مسئلہ خلافت، تحقیق مسئلہ بیعت یزید		۱۹۵۴ء	۱۷۹	تفسیر القرآن جلد اول تا پنجم		۱۹۷۷ء
۱۴۹/۱۵۰	تحقیق لفظ آل و اہل بیتؑ	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۸۰	سیرت الرسولؐ اول تا سوم		
۱۵۱	تحقیق ایمان ابو طالب	۲۴	۱۹۵۴ء	۱۸۱	سیرت امیر المومنینؑ اول تا پنجم		

فہرست مصباح المجالس حصّہ اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مصباح المجالس

حصہ اوّل

پہلی مجلس

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ﴿۹۲﴾

آل عمران ۳/۹۲

یعنی جب تک تم اپنی محبوب چیز راہ خدا میں صرف نہ کرو گے ہرگز ہرگز نیکی نہ پاؤ گے اس سے معلوم ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں انفاق فی سبیل اللہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ متقی اور پرہیزگار لوگوں کی جہاں اور صفتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۳﴾

بقرہ ۲/۲

یعنی قرآن مجید ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے۔ متقیوں کے لئے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں نماز پڑھتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اسے راہ خدا میں صرف کرتے ہیں۔ سورہ منافقون میں

ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٩﴾

۹/۶۳ منافقون

اے ایمان والو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں ذکر خدا سے غافل نہ کر دیں۔ اور جو ایسا کریں گے تو وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوں گے۔ اور جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے اسے اس سے پہلے (راہِ خدا میں) خرچ کر ڈالو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے۔ اور اس وقت وہ کہنے پالنے والے تو کچھ مدت (میری موت) ٹال دے تو میں تیرے حکم کی تصدیق کر دوں اور صالحین میں سے ہو جاؤں (صدقہ دے کر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محبوب چیز مال ہے جس کے اوپر ایسا اوقات اپنی جان اور آبرو اور اولاد سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور اس کی محبت مرتے دم تک ہمارے دل سے نہیں جاتی ہماری خواہش ہی رہتی ہے کہ تمام دنیا کی دولت ہمارے گھر میں آجائے جتنا یہ مال جمع ہوتا جاتا ہے اتنے ہی حرص کے پاؤں زیادہ پھیلتے جاتے ہیں۔ حدیث میں ہے منهومان لا يشبعان طالب العلم و طالب المال (دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے طالب علم اور طالب مال) جو لوگ مال جمع کرنا تو جانتے ہیں مگر راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے ان کے مال کا مآل اچھا نہیں۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

۳۵/۹ توبہ

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے تو اے رسولؐ ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم کر کے اور لال کیا جائے

گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھ کو داغا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہ ہے جسے تم نے (دنیا میں) جمع کر کے رکھا تھا۔

آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ راہِ خدا میں مال کا خرچ کرنا باعثِ ثوابِ عظیم ہے کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حلال طریقے سے روزی کما کر نیک کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ مال و دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ترویج دین و حفاظتِ مذہب اور اعانت فقراء و مساکین، بیوگان و یتیمان، صلہ رحم اور ادائے حقوق بنی نوع میں صرف کیا جائے مالداروں پر خدا نے زکوٰۃ و خمس کو اسی لئے واجب کیا ہے کہ اس کے غریب بندوں کو اس سے سہارا ملے اور ان کی پریشانی میں کچھ کمی ہو سکے۔ سنگ دل اور خدا ناشناس ہیں وہ لوگ جو ضرورت سے زیادہ دولت رکھنے پر بھی خدا کے محتاج بندوں کی خبر نہیں لیتے۔ شیطان ان کو افلاس سے ڈراتا ہے اور خدا ان کی دولت کو بڑھانے اور ان کی حفاظت کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ شیطان کی دھمکی سے تو کانپنے لگتے ہیں لیکن خدا نے جو وعدہ کیا ہے اس پر اعتماد نہیں رکھتے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ خدا فرماتا ہے فقرا میرا کنبہ ہیں جو ان پر احسان کرے گا میں اس پر احسان کروں گا وہ انسان ہی نہیں جس کے دل میں دوسروں کے درد اور دُکھ کا احساس ہی نہ ہو۔ اس مواسات و ہمدردی میں ہم کو اہلِ بیت علیہم السلام کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے سبحان اللہ وہ کیسی مسکین پرور اور غریب نواز ہستیاں تھیں کہ اپنا تمام سرمایہ فقراء و مساکین کی حاجت براری کے لئے وقف کر دیا تھا اور خود بھوکے سو رہتے تھے لیکن یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کے ہمسایہ میں کوئی بھوکا سو رہے اور امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

كَيْفَ اَشْبَعُ وَحَوْلِيْ بُطُوْنٌ غَرْثٰى (میں کیونکر شکم سیر ہوں درآنحالیکہ میرے گرد کچھ بھوکے ہیں) ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔ ترجمہ: میں ان میں سے نہیں ہوں جو شکم سیر ہو کر سو رہے اور اس کا ہمسایہ بھوک سے تڑپ رہا ہو۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ تین تین دن اکثر اس طرح فاقہ سے گزر جاتے تھے کہ پیٹ پر پتھر باندھا ہوتا تھا۔ آغازِ اسلام میں اس اساس کی مضبوطی کے لئے دو چیزیں سخت ضروری تھیں۔ ایک شجاعت اور دوسرے سخاوت۔ شجاعت سے کفار و مشرکین کے شر کو رفع کرنا تھا اور سخاوت سے نادار مسلمانوں کی مدد کرنا۔ ان دونوں صورتوں کو بہتر صورت میں اہلِ بیت رسولؐ نے پورا کیا۔ حضرت علی علیہ السلام کی ذوالفقار آبدار سے کفار مشرکین کی طاقت کا قلع قمع ہوا اور سلطنت اسلامی کی بنیاد قائم ہوئی اور ان کی عدیم المثال سخاوت سے ان محتاج اور غریب الوطن مسلمانوں کو کھانے کپڑے کی مدد ملی جن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ اس گھر سے اتنی

سادادہ پیش ہوتی کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آج تک فقراء و مساکین ان کا واسطہ دے کر لوگوں سے اپنی حاجت براری کے لئے سوال کرتے ہیں۔ مالداری کی حالت میں کسی کی مدد کرنا آسان ہوتا ہے اصلی سخاوت یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں پر دوسروں کی ضرورتوں کو مقدم رکھے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٩﴾ ۵۹/۹ حشر

ترجمہ:۔ جو لوگ مہاجرین سے پہلے ہجرت کے گھر مدینہ میں مقیم اور ایمان میں مستقل رہے اور جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس کی اپنے دلوں میں کچھ غرض نہیں پاتے اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام نے خود فاقے کئے دوسروں کو کھلایا خود پیوند لگائے اور دوسروں کو نیا لباس پہنایا۔ ایک روز امیرالمومنین علیہ السلام کے گھر میں کئی دن کا فاقہ تھا۔ آپ نے ایک باغ کو اجرت پر پانی دیا۔ وہاں سے جو اجرت کے خرمے ملے۔ وہ لے کر گھر کو چلے کہ بھوکے اہل و عیال کو کھلائیں راستہ میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ضعف سے لڑکھڑاتے نظر آئے سمجھ گئے کہ یہ نقاہت فاقے کی ہے فرمایا اے سلمان میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہیں اپنے ہاتھ سے وہ رطب تازہ کھلاؤں جو میں نے اپنے قوت بازو سے حاصل کئے ہیں۔ اس کے بعد وہ سب خرمے جناب سلمان کو کھلا دیئے اور خالی ہاتھ گھر واپس آئے۔ اور جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا اور حسنین علیہم السلام سے یہ حال بیان کیا سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ کیا ممکن کہ ذرا تو ملال کے آثار چہروں سے ظاہر ہو جائیں۔ کیا دنیا میں ایسی سخاوت کی مثالیں کہیں اور بھی ملتی ہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اہل بیت طاہرین کی اس مواسات و ہمدردی سے بہت کم لوگوں نے سبق حاصل کیا ہے۔ کیا غضب کی بات ہے کہ ہم اپنے نادار بھائیوں کو دیکھ کر بجائے رنجیدہ و ملول ہونے اور مدد کرنے کے طعن و تشنیع سے ان کے دکھے ہوئے دل کو دکھاتے ہیں۔ ان کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں ہم اچھی سے اچھی غذائیں کھاتے ہیں اور عمدہ سے عمدہ لباس پہنتے ہیں اور وہیں ان بے کس و نادار پر رحم نہیں آتا جن کے تن پر نہ کپڑا ہے اور نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ ہم کہنے کو ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں لیکن حقیقت میں دشمنوں سے

بدتر۔ کیا ہمارے آئمہ اس عمل سے خوش ہوتے ہوں گے۔

کتاب رسائل میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ ایک بار قوم بنی اسرائیل ایسے سخت قحط میں مبتلا ہوئی جس کا سلسلہ کئی سال چلا۔ بے شمار لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ لوگ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستے تھے اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نے بمشکل تمام چند ٹکڑے حاصل کئے چاہتی تھی کہ ان کو کھا کر کسی طرح جان بچالے۔ ایک یتیم بچہ روتا بلبلاتا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے مادرِ مہربان میں بھوک سے جان بلب ہوں۔ خدا کے لئے کچھ مجھے دے کر میری جان بچائیے۔ میں یتیم ہوں کس سے کہوں۔ وہ عورت اہلِ دل تھی بے چین ہوگئی اور سب ٹکڑے اٹھا کر اسے دے دیئے۔ اب خدا کی شان رحمت دیکھو اس عورت کا ایک چھوٹا سا بچہ گھر میں پڑا سو رہا تھا۔ جب وہ اُسے اُٹھانے کے لئے گئی تو دیکھا کہ ایک کالا ناگ اس کے بستر کے نیچے پڑا ہوا ہے عورت اسے دیکھ کر کانپ گئی اور بچے کو اٹھا کر بھاگی

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ ہم نے فلاں عورت کے بچے کو اس کی نیکی کی وجہ سے بچالیا جو اس نے ایک یتیم بچے کے ساتھ کی تھی۔

جناب امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ میرے نزدیک ایک بندہ مومن کی حاجت براری سے زیادہ محبوب کام نہیں۔ مروی ہے کہ جب کوئی بندہ اپنے برادر ایمانی کے واسطے دعائے مغفرت کرتا ہے تو خدا اس کی دُعا رد کرنے سے شرم کرتا ہے۔ خاص کر ایسے بندوں کے متعلق جو برادر ایمانی کی حاجت براری بھی کرتے رہے ہوں۔

کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہر سال اپنا مال تعزیہ داری میں صرف کرتے ہیں اور اس رسم خیر کو دنیا میں برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ہمارا یہ ایمان ہے کہ جو کوئی تعزیہ داری میں اپنا مال صرف کرتا ہے وہ غریب نہیں ہوتا خدا اس کے مال میں برکت عطا فرماتا ہے تعزیہ داری ہم شیعوں کی رگِ جان ہے۔ اس سے مذہب حقہ کی ترویج ہوتی ہے۔ ایمان و معرفت کا درس ملتا ہے۔ حق سے محبت باطل سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ ہر بندۂ مومن کا فرض ہے کہ جتنا ممکن ہو اس کارِ خیر میں صرف کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مظلوم امام نے دینِ اسلام پر وہ عظیم الشان احسان کیا ہے کہ اہلِ ایمان اس کو بھلا نہیں سکتے ہمارا ایمانی فریضہ ہے کہ ہر سال واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی ہمارے زخمِ دل ہرے ہو جاتے ہیں اور ہر شیعہ کے گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ ہماری عورتیں حسینؑ مظلوم کے ماتم میں ۸ ربیع الاول تک سوگوار رہتی ہیں۔ گھر گھر سے نوحہ و غم کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ تعزیے خانے کھل جاتے ہیں علم نصب

ہو جاتے ہیں۔ جا بجا مجلسیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر دل محزون و مغموم نظر آتا ہے واقعہ کربلا کی ایک دردناک تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چالیس دن کے لئے ہر قسم کی خوشی ہم سے رخصت ہو جاتی ہے۔ عزاداری کے سوا اور کسی کام پر ہمارا دل نہیں لگتا۔

منقول ہے کہ جب محرم کا چاند نمودار ہوتا تھا تو امام رضا علیہ السلام اسے دیکھ دیکھ کر زار زار روتے تھے اور فرماتے تھے۔ اِنَّ الْمُحَرَّمَ شَهْرٌ كَانَ اَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يُحَرِّمُوْنَ فِيْهَا الْقِتَالَ فَاسْتُحِلَّتْ فِيْهِ دِمَاؤُنَا وَهُتِكَتْ فِيْهِ حُرْمَتُنَا وَسُبِيَ فِيْهِ ذَرَارِيْنَا وَلَمْ يُرَاعَ حُرْمَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِيْنَا۔ محرم وہ مہینہ ہے کہ کفار و مشرکین اس میں جنگ کو ناحرام جانتے تھے لیکن اسی مہینے میں ہمارے خون حلال سمجھے گئے اور ہماری ہتک حرمت کی گئی اور اس مہینے میں ہمارے کنبے کو قید کیا گیا اور حرمتِ رسولؐ کا ہمارے بارے میں ذرا لحاظ نہ کیا گیا اے زمینِ کربلا تو نے ہمیشہ کے لئے مجھے درد و کرب میں مبتلا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ محرم کا مہینہ ایک عجیب مصیبت کا مہینہ ہے آہ آہ!!! اس مہینے میں ہمارے رسولؐ کا سارا گھر تباہ ہو گیا۔ اس مہینے میں اولادِ رسولؐ پر وہ وہ مصیبتیں نازل ہوئیں کہ اگر پہاڑ پر پڑتیں تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اگر دنوں پر پڑتیں تو غم سے کالی راتوں کی صورت میں تبدیل ہو جاتے۔ بیشک یہ دن ہمارے لئے رونے پیٹنے اور سر و سینہ کوٹنے کے ہیں۔ ہمارا مظلوم امام آج سے ہمارا مہمان ہے۔ یہ مہمان کیسا بے کس و مظلوم ہے کہ اس پر رونے والے جی بھر کر رو بھی نہ سکے۔ جب ہی تو ہمارے مظلوم امام نے فرمایا ہے انا قتیل العبرہ یعنی میں وہ مقتول ہوں جس کا نام لے کر رویا کریں گے۔ آہ اس امام غریب الدیار کی مصیبت نے کس کس کو نہ رلایا حضرت رسولؐ خدا روئے حضرت علی مرتضیٰؑ روئے حضرت فاطمہ زہراؑ روئیں حضرت امام حسنؑ روئے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تو چالیس سال اسی غم میں روتے ہی رہے۔ ان کے علاوہ ہمارے تمام آئمہ علیہم السلام اس واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ روتے ہی رہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ یکم محرم سے اربعین تک کسی نے آپ کے لبوں پر مسکراہٹ نہ دیکھی۔

ہم کیوں کر اس غم میں صبر کر سکتے ہیں جبکہ خدا نے ہم کو پیدا ہی مصیبت حسین علیہ السلام میں رونے کے لئے کیا ہے چنانچہ منقول ہے کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام پیدا ہوئے تو جبرائیل امین خدمت سرورِ کائنات میں حاضر ہوئے اور بعد تہنیت فرمایا یہ بچہ آپ کی امت کے ہاتھوں انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا جائے گا اس کے بعد تمام واقعہ کربلا بیان کر کے وہاں سے تھوڑی سی مٹی بھی لا کر دی۔ جو

ایک شیشہ میں رکھی تھی آپؐ نے وہ شیشہ اُم سلمہؓ کے سپرد کیا اس کے بعد آپ خانہ جناب سیدہؑ میں تشریف لائے اور کل حال بیان کیا۔ ماں کو اولاد سے جو محبت ہوتی ہے اس کو کون نہیں جانتا۔ جناب سیدہ اس واقعہ کو سنتے ہی بے چین ہو گئیں اور رو رو کر کہنے لگیں۔ بابا میں اس مظلوم فرزند پر جو راہِ خدا میں شہید ہوگا دل کھول کر ماتم کروں گی۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے نور دیدہ یہ وہ زمانہ ہوگا جب دنیا میں نہ میں ہوں گا نہ تم۔ نہ علیؑ نہ حسنؑ۔ یہ سُن کر جناب سیدہؑ کا غم سے بُرا حال ہوا۔ عرض کرنے لگیں۔ بابا پھر میرے اس مظلوم فرزند کو کون روئے گا؟ فرمایا اے بیٹی غم نہ کر۔ خدا ایک ایسی قوم کو پیدا کرے گا جن کے مرد ہمارے مردوں پر نوحہ کریں گے اور جن کی عورتیں ہماری عورتوں پر نوحہ کریں گی۔ اور ان کے بچے ہمارے بچوں پر۔ جناب سیدہؑ کو یہ سُن کر تسکین ہوئی اور فرمایا کہ اگر وہ قوم میرے فرزند سے اتنی محبت رکھتی ہوگی تو میں بھی اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوں گی جب تک اس قوم کے ہر چھوٹے بڑے کا گناہ بخشوا کر داخلِ جنت نہ کرا دوں۔

مومنینِ کرام جناب سیدہ کو امام حسینؑ پر رونے کے متعلق اس قدر اہتمام کیوں مدِ نظر ہوا اس کی کئی وجہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ عرب میں دستور تھا کہ جس مُردہ پر نوحہ نہ ہوتا تھا اس کو منحوس سمجھا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب جنگِ اُحد کے بعد انصار کی عورتیں اپنے اپنے شہیدوں پر روئیں اور ان کی آوازِ گریہ حضرتؐ کے کان میں آئی تو حسرت سے فرمایا۔ اما عمی حمزہ فلا بواکی لہ یعنی افسوس کہ میرے چچا حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں۔ چنانچہ یہ سنتے ہی انصار نے اپنی اپنی عورتوں سے جا کر کہا کہ پہلے حضرت رسول اللہؐ کے یہاں جا کر آپ کے چچا حضرت حمزہ پر نوحہ کرو پھر اپنے مُردوں پر آکر رونا جب زنانِ انصار کی آوازِ گریہ بلند ہوئی تو حضرتؐ نے فرمایا خدا ان آوازوں پر اپنی رحمت نازل کرے۔

دوسرے حضرت سیدہ کا مقصد یہ ہوگا کہ اگر نوحہ ہوتا رہا تو ہر زمانے کے لوگوں کو میرے فرزند کے مظلوم ہونے کا پتہ چلتا رہے گا۔ تیسرے رونے والوں سے فطرتاً لوگوں کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے حالات کے جویا ہوتے ہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے پوشیدہ حالات ظاہر ہو جاتے ہیں۔

پس جس قوم کی طرف حضرت رسولؐ خدا نے اشارہ فرمایا ہے وہ بحمد للہ! ہم عاشقانِ حسینؑ ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم غمِ حسینؑ میں اتنا روئیں کہ روحِ جناب سیدہؑ شاد ہو جائے۔

مومنین آج محرم کی پہلی تاریخ ہے جناب سیدہؑ کی روح ہمارے عزاخانوں میں آچکی ہے ہم کو چاہیے کہ اپنی نبیؐ زادی کے ساتھ نوحہ و ماتم میں شریک ہوں۔ ہم کو چاہیے کہ اس مظلوم پر جی کھول کر روئیں جس پر بعدِ شہادت رونے والا کوئی نہ تھا۔

حضرات! میں نے یہ کیا کہا کہ رونے والا کوئی نہ تھا۔ رونے والے تو بہت تھے۔ لیکن افسوس صد افسوس ان بیکسوں اور آوارہ وطنوں کو رونے کون دیتا تھا۔ اگر کسی کی آنکھ سے آنسو نکلتا تھا تو اشقیا تازیانوں سے مارتے تھے۔

مومنین! آج کا دن کوئی معمولی دن نہیں آج سے اس مہینہ کا آغاز ہوتا ہے جس کا دسواں دن عاشور کہلاتا ہے۔ عاشور کا نام آتے ہی کربلا کے دردناک واقعات نظر کے سامنے آگئے۔

منقول ہے کہ ایک بار جناب موسیٰ نے عند المناجات بارگاہِ باری میں عرض کی بارِ الٰہی! تو نے اُمتِ محمد مصطفےٰ کو تمام اُمتوں پر کس وجہ سے فضیلت دی ہے۔ جواب ملا دس فضیلتوں کی وجہ سے۔ عرض کی وہ کیا ہیں مجھے بتا تاکہ میں بنی اسرائیل کو ان کے بجالانے کا حکم دوں۔ فرمایا وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، جمعہ، جماعت، قرآن، علم اور فاتہ عاشورہ ہے۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی پروردگار یہ عاشور کیا چیز ہے فرمایا مصیبت حسین بن علیؑ پر رونا ہے اور عزاداری اور ماتم کرنا ہے اے موسیٰ جو بندہ ایسا کرے گا میں ضرور اسے جنت دوں گا جس مومن کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک جاری ہوگا میں اس کو شہید کا ثواب دوں گا۔

حضرتِ موسیٰؑ نے عرض کی خداوندا اس رسول کا فرزند کیسا بیکس و مظلوم ہوگا کہ اس کا ذکر سن کر میرا دل ہل گیا۔ کون بدبخت ہوں گے جو اس برگزیدہ باری کو قتل کریں گے۔ فرمایا وہ اس نبی کی اُمت ہوگی یہ سن کر جناب موسیٰ علیہ السلام نے قاتلانِ حسین پر لعنت کی۔ اللہ اللہ جس حسینؑ کا یہ مرتبہ تھا بنی اُمیہ نے اسی کو آوارہ وطن کر کے طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا۔ تین دن کا بھوکا پیاسا کربلا میں گوسفند قربانی کی طرح اس کو مع اس کے رفقا و انصار کو شہید کر ڈالا۔

بحار الانوار میں ہے کہ جب معاویہ کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹے یزید سے کہا کہ میں نے بڑے بڑے سرکشوں کو زیر کر کے تیری بیعت لے لی ہے لیکن مجھے تین شخصوں کی طرف سے مخالفت کا خطرہ ہے۔ ایک عبداللہ بن عمر۔ دوسرے عبداللہ بن زبیرؓ اور تیسرے حسینؑ بن علیؑ۔ عبداللہ بن عمر کو حسنِ سلوک اور داد و دہش سے موافق بنا لینا۔ عبداللہ بن زبیرؓ کو موقع پاکر قتل کر ڈالنا۔ یہ شیر کی طرح گھات میں بیٹھا ہوا ہے البتہ حسینؑ بن علیؑ کا معاملہ بہت نازک ہے وہ ہرگز تیری بیعت نہ کریں گے وہ بڑے غیور ہیں لیکن کسی طرح کام نہ چلے تو پھر آخری علاج موت ہے۔

جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ کتاب ارشاد میں تحریر فرماتے ہیں کہ ۶۰ھ میں جب معاویہ مر گیا تو یزید نے ولید حاکم مدینہ کو خط لکھا مضمون یہ تھا۔

"کہ جس طرح ممکن ہو حسین ابن علیؑ سے میری بیعت لے اور در صورت انکار ان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔" جب یہ خط ولید کے پاس پہنچا تو اس نے وقت شب حضرت امام حسینؑ کو بلا بھیجا اور حضرت اس طلب کا مطلب سمجھ گئے۔ آپ اس وقت مسجد رسولؐ میں تھے۔ قاصد سے فرمایا تو چل میں آتا ہوں۔ وہاں سے آپ گھر تشریف لائے اور جوانانِ بنی ہاشم کو حکم دیا کہ مسلح ہو کر ساتھ چلو۔ مجھے وقت شب ولید نے بلایا ہے۔ وہ ضرور مجھ سے طالب بیعت ہوگا۔ جب میں دارالامارہ کے اندر داخل ہوں تم سب دروازے پر ٹھہرے رہنا جس وقت میری آواز بلند ہو بے تامل اندر چلے آنا تاکہ وہ اپنا ارادہ میرے ساتھ پورا نہ کر سکے۔ حضرت امامؑ کا یہ کلام سنتے ہی تمام جوانان بنی ہاشم ہتھیار بدن پر سجا کر حضرتؑ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب حضرت، ولید کے پاس پہنچے تو اس نے پہلے معاویہ کے مرنے کی خبر سنائی۔ پھر یزید کا خط پڑھ کر اس کی بیعت کی خواہش کی۔ حضرتؑ نے فرمایا وقت شب ہے کل سب کے سامنے اس مسئلے کو پیش کرنا جو مناسب جواب ہوگا دے دیا جائے گا۔ ولید نے کہا کیا مضائقہ ہے اب آپ تشریف لے جائیں اور کل صبح مجمع عام میں بیعت یزید کا اعلان کر دیں۔ اس وقت دربار میں مروان بھی موجود تھا۔ ولید سے کہنے لگا کیا غضب کرتا ہے حسینؑ کو بیعت کے بغیر نہ جانے دے۔ اگر یہ اس وقت چلے گئے تو پھر تیرے ہاتھ نہ آئیں گے یا تو اسی وقت بیعت کا اقرار لے لے۔ ورنہ ان کا سر کاٹ کے یزید کے پاس بھیج دے۔

اس کی بے ادبانہ تقریر سن کر امام علیہ السلام کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ تیری کیا مجال جو ایسا کر سکے۔ اس نے تلوار میان سے نکالی اور ولید سے کہنے لگا۔ کیا سوچ رہا ہے جلاد کو حکم دے کہ ابھی ان کا سر تن سے جدا کر دے۔ ان کا خون میری گردن پر ہے۔ جب اس شور و غل کی آواز بلند ہوئی تو جوانانِ بنی ہاشم برہنہ تلواریں لیے اندر داخل ہوئے۔ سب سے آگے حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ تھے۔ دونوں نے بڑھ کر چاہا کہ مروان کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھائیں۔ مگر امام علیہ السلام نے روکا کہ ہم اہلِ بیت کا شیوہ نہیں کہ جنگ کی ابتدا اپنی طرف سے کریں۔

راوی کہتا ہے جب سے حضرت، ولید کے پاس تشریف لے گئے تھے جناب زینبؑ، ام کلثومؑ اور دیگر زنانِ بنی ہاشم گھبرائی پھر رہی تھیں۔ بار بار ڈیوڑھی پر جا کر مستفسر حال ہوتی تھیں اور رو کر کہتی تھیں کہ ارے کوئی جا کر خبر لاؤ کہ فرزند رسولؐ کس حال میں ہیں اور کہاں ہیں۔ بار بار دعائیں مانگتی تھیں پروردگارا میرے ماں جائے بھائی کو خیر سے واپس لانا۔

کچھ دیر بعد جب حضرت تشریف لائے تو تمام بی بیوں کو پریشان حال پس در کھڑا پایا۔ حضرتؑ کو دیکھتے ہی جناب زینبؑ گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگیں اور پوچھنے لگیں۔ بھیا جلد بتلایئے آپ کے اور ولید کے

درمیان کیا بات چیت ہوئی حضرتؑ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا "اے بہن اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ مدینۃ النبی حسینؑ سے چھوٹ جائے اور روضۂ اطہر رسولؐ اور قبر طاہرہ بتولؑ سے جدائی ہو۔ آہ! بنی اُمیّہ درپے آزار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں مدینہ میں زندگی بسر کروں۔ یزید نے ولید کے پاس حکم بھیجا ہے کہ جس طرح بنے حسینؑ سے بیعت لے اور اگر بیعت سے انکار کریں تو سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔ بخدا مجھے قتل ہونا گوارا ہے لیکن یزید جیسے بدکار کی بیعت منظور نہیں۔

حضرتؑ کی یہ تقریر سنتے ہی اہلِ حرم میں ایک کہرام بپا ہو گیا ہر ایک بی بی زار زار رو رہی تھی چھوٹے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کو روتا دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ آہ یہ آغاز تھا اس مصیبت عظمیٰ کا جس نے ہمارے رسولؐ کا گھر تباہ کر دیا یہ ہی جوانانِ بنی ہاشم جو آج حسین علیہ السلام کی حفاظت کے لئے خانہ ولید تک گئے تھے اور جن کا حسن صورت و سیرت میں کوئی مثل و نظیر نہ تھا۔ کربلا کی خون آشام زمین پر فدیۂ راہ خدا بن کر سر کٹائے اور خون میں نہائے پڑے تھے کہیں حسینؑ کا گڑیل جوان جو صورت و سیرت میں مثلِ پیغمبر اور شجاعت میں مثلِ حیدرؑ تھا۔ سینہ پر برچھی کا پھل کھائے پڑا تھا۔ کہیں فوج حسینی کا نامور علمدار ثانیٔ حیدر کرار قمر بنی ہاشم سقائے سکینہ حضرت ابو الفضل العباسؑ دریا کے کنارے شانے کٹائے خون میں نہائے پڑے تھے؛ کہیں امام حسن کی یادگار۔ ام فروہ کے باغ کی تمنّا کی بہار قاسمؑ سا نوجوان مظلوم چچا کے بدن کی تاب تواں گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچلا پڑا تھا۔ کہیں جناب زینب کی زندگی کے سہارے عبداللہ بن جعفر کے مہ پارے سر تا پا زخموں سے چور خاک و خون میں اَٹے پڑے تھے آہ! آہ!! ظالموں نے ان برگزیدہ بندوں کو بے جرم و خطا قصور آوارہ وطن کر کے دیارِ غربت میں کس بے دردی سے تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈھی نہیں ملتی آہ! وہ حسینؑ جس نے آغوشِ رسولؐ میں پرورش پائی تھی جس کا خون رسولؐ کا خون اور جس کا گوشت پوست رسولؐ کا گوشت پوست تھا جس کی محبت کو خدا نے اجرِ رسالت قرار دیا تھا بنی اُمیّہ اُس کے خون کے پیاسے بن گئے۔

حضرت رسولؐ خدا کے خاندان کی ڈھارس کے لئے حضرت علیؑ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ موجود تھے حضرت علیؑ جب شہید ہوئے تو امام حسنؑ اور امام حسینؑ دونوں بھائی موجود تھے۔ لیکن امام حسنؑ کے بعد صرف ایک ذات امام حسین علیہ السلام کی رہ گئی تھی۔ تمام خاندان بلکہ تمام اہلِ مدینہ کی نگاہیں ان پر ہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر حضرت رسولِ خدا یاد آجاتے تھے۔ آہ کیسا دل ٹوٹا ہوگا جب امام زخموں سے چور چور رخصت آخر کے لئے خیمہ میں آئے ہوں گے اور فرمایا ہوگا۔ سلام ہو تم پر میرا اے زینبؑ اے ام کلثومؑ اے سکینہؑ اے رباب والے فضہ میری ماں کی کنیز میں تم سے رخصت ہوتا ہوں اور تمہیں خدائے برحق کے سپرد کرتا ہوں۔

آہ! آہ!! ابھی حضرت زنانِ اہل حرم کو رخصت کر کے نکلنے بھی نہ پائے تھے کہ دشمنوں کے تیر خیموں کی طرف آنے لگے یہاں تک کہ کئی تیر خیموں سے پار ہو گئے اور پھر وہ اشقیا پکار پکار کر کہنے لگے اے حسینؑ جلد خیمے سے نکلیے تاکہ ہم تمہارے قتل سے فارغ ہوں۔ یہ طعن آمیز باتیں سن کر زنانِ اہل حرم میں کہرام بپا ہو گیا۔ اور واہ محمداہ۔ واہ علیاہ کے نعرے بلند ہونے لگے آہ ان دل شکستہ بی بیوں اور بالخصوص جناب زینبؑ و امّ کلثومؑ کے دل پر جو گزری ہو گی اس کو کون جانتا ہے خدا نہ کرے کہ کسی خاندان کی بیبیاں اور بچے یوں دیارِ غربت میں جب کہ دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں بے والی بے وارث ہو جائیں۔ گھر تباہ ہوتے ہیں۔ موت آتی ہے مگر ایسی تباہی ایسی بربادی ایسی بے کسی و بے بسی نہ دیکھی نہ سنی۔ ایک دن میں اٹھارہ جنازے ایک گھر سے نکل گئے اور بہتر کے ماتم میں سینہ زنی کرنی پڑی۔ پتھر بھی ہوتے تو ان مصیبتوں میں پانی ہو جاتے۔ یہ ان ہی کے دل تھے کہ صبر و شکر سے ان منزلوں کو جھیل گئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِيْنَ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔

دوسری مجلس

مدینہ سے رخصت

اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾

(الحج ۲۲)

جو بے قصور لوگ اپنے گھروں سے نکالے گئے اس کے سوا ان کا کوئی قصور نہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے اگر خدا بعض قوموں کے ذریعے بعض کو دفع نہ کرتا تو جیسا ئیوں کے گرجے یہودیوں اور مجوسیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی وہ مسجد مسمار ہو کر رہ جائیں جن میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔

کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ آیت جناب رسول خدا۔ علی مرتضیٰ۔ امیر حمزہ اور جعفر طیار کی شان میں نازل ہوئی۔ پھر اس کا حکم جناب امام حسین علیہ السلام کے بارے میں جاری ہوا۔ اور تفسیر قمی میں ہے کہ اس آیت سے مراد امام حسین علیہ السلام ہیں۔ جن کو بے جرم و قصور گھر سے نکالا اس آیت میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں ان سب کا تطابق ذات امام حسین علیہ السلام پہ ہوتا ہے۔ اول یہ کہ وہ اپنے وطن سے بے جرم و خطا نکالے گئے اگر مدینہ سے نہ نکلتے تو حرم رسول میں ہی قتل کر دیئے جاتے اور مدینہ رسول کی حرمت ضائع ہو جاتی۔ دوسرے وہ سب خدا پرست بندے تھے اس بناء پر کفر دوست بنی امیہ ان کے دشمن تھے تیسرے اگر خدا حسینی قوت کو یزیدی قوت سے نہ ٹکراتا تو خدا کا کوئی عبادت خانہ خواہ وہ کسی قوم

سے متعلق ہو اس کو یزید بے تباہ کیے نہ رہتا کیونکہ وہ درحقیقت خدا پرستی کا دشمن تھا، امام علیہ السلام کے ذریعے خدا نے اس کی طاقت کو توڑ دیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "جو کچھ بنی اسرائیل میں ہوا وہ ٹھیک اسی طرح میری اُمت میں بھی ہوگا۔"

چنانچہ جہاں اور واقعات کا تطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہجرت یا جلاوطنی بھی ہے۔

بنی اسرائیل کو پہلے فرعون کے مظالم سے اکتا کر اپنے قدیم وطن مصر کے ترک کردینے پر آمادہ ہونا پڑا۔ وہ قیامت کا وقت تھا جب شام کو جناب موسیٰ نے یہ خبر دی کہ حکم خدا یہ ہے کہ کل صبح سویرے ہم مصر سے نکل جائیں، کیسی پریشانی اور بدحواسی میں یہ رات گزری۔ نہ یہ خبر کہ کہاں جانا ہے نہ یہ معلوم کہ کب تک جانا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتا تھا اور روتا تھا۔ بمشکل تمام وہ رات کٹی۔ صبح ہوتے ہی دریائے نیل کی طرف روانگی ہوئی اُدھر سے فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا۔ آگے دریا پیچھے دشمن۔

یکایک سب گھبرا گئے اور حضرت موسیٰ سے فریاد کرنے لگے۔ بہرحال ترکِ وطن کا انجام اچھا ہوا دشمن غرقِ دریا ہوا اور سب صحیح سلامت پھر وطن آگئے۔

دوسری وہ جلاوطنی تھی جو حضرت شموئیل کے زمانہ میں قوم جالوت کے ہاتھوں ہوئی جب بنی اسرائیل غریب الدیار ہو کر ہر طرف مارے مارے پھرتے تھے تو پھر اپنے نبی سے کہنے لگے کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیجئے تاکہ ہم راہِ خدا میں جہاد کریں۔ انہوں نے کہا۔

کہیں ایسا تو نہ ہو کہ جب تم پر جہاد واجب کیا جائے تو تم نہ لڑو۔ کہنے لگے جب ہم اپنے گھروں اور بچوں سے جدا کئے جا چکے ہیں۔ تو پھر کون سا عذر باقی ہے کہ ہم راہ خدا میں جہاد نہ کریں۔ پھر جب ان پر جہاد واجب کیا گیا تو ان میں سے چند آدمیوں کے سوا سب نے لڑنے سے منہ پھیر لیا

ان دونوں موقعوں پر بنی اسرائیل کو پریشانیاں تو بے حد ہوئیں مگر پلٹ کر آنا سب کو نصیب ہوگیا مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے آئے تھے مگر فتح مکہ کے بعد وہ بخیر وخوبی پھر اپنے وطن پہنچ گئے البتہ کربلا والا قافلہ جو اپنے وطن ان میں سے کوئی مرد سوائے عابد بیمار کے واپس نہ آیا۔

آہ بنی اُمیہ نے ہمارے مظلوم امام علیہ السلام کو سخت گرمی کے موسم میں آوارہ وطن کیا جبکہ پرندے بھی اپنے آشیانوں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ آہ کوئی ایسا ظلم نہ تھا۔ جو ظالموں نے اولادِ رسول سے اٹھا رکھا ہو جب ہم ان تمام مصیبتوں کا تصور کرتے ہیں تو دل سینوں میں اُلٹ جاتے ہیں۔ حضرات ہمارا کیا ذکر ہے ہمارے تمام آئمہ مصائب امام مظلوم علیہ السلام کو یاد کر کے ہمیشہ روتے رہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے

ہیں کہ میرے جد مظلوم امام حسین علیہ السلام کا نام جس بندۂ مومن کے سامنے لیا جائے گا وہ ضرور ان کے مصائب پر آب دیدہ ہوگا۔

بحار میں جارود بن منذر سے روایت ہے کہ ایک روز میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ محرم کا مہینہ تھا حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے میں نے عرض کی یا ابن رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کہ ایسا خاص صدمہ قلب مبارک کو پہنچا ہے کہ آپ اس درجہ رنجیدہ خاطر ہیں کہ اس سے پہلے میں نے کبھی آپ کو اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ حضرت نے ایک آہ سرد کھینچ کر فرمایا کہ آج ماہِ محرم کی پہلی تاریخ ہے یہی وہ زمانہ ہے کہ ہمارا بھلا پھولا باغ ظالموں کی تلواروں سے کاٹا گیا۔ اے جارود اس غم نے ہمارے کلیجے کے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ ہماری نیندوں کو اڑا دیا ہے۔ ہماری خوشیوں کو برطرف کر دیا ہے۔ جب محرم کا چاند نمودار ہوتا ہے تو ہمارے گھروں میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے یہ ایسا غم نہیں کہ ہم اس غم کو بھول جائیں۔

جارود کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا ابن رسول اللہؐ میں آپ سے یہ سوال کر کے سخت نادم ہوا ہوں بیشک یہ زمانہ ہر شیعہ کے لئے رونے رلانے کا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے مجھ سے واقعاتِ کربلا بیان کرنے شروع کئے۔ حضرت بھی زار زار رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے اسی سلسلہ میں امام علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا جارود جب تک مختار نے ابن زیاد اور دیگر قاتلانِ امام حسین علیہ السلام کے سر نہیں بھیجے ہمارے خاندان کی عورتوں نے اپنے سروں میں کنگھی نہیں کی ہاتھ پاؤں میں مہندی نہیں لگائی اور آنکھوں میں سرمہ نہیں لگایا۔ پانچ برس تک ہمارے گھروں سے دھواں اٹھتا نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ ہماری بعض عورتوں نے تو سایہ میں بیٹھنا تک چھوڑ دیا تھا۔ بجائے پکے ہوئے کھانوں کے بھنا ہوا اناج برسوں اس خاندان کی غذا رہا۔ جب ٹھنڈا پانی سامنے آتا تو ستم رسیدہ بی بیاں دھاڑیں مار کر روتی تھیں۔ کیونکر صبر آ سکتا تھا ان لوگوں کو جن کی آنکھوں کے سامنے اٹھارہ جنازے ایک دن میں گھر سے نکلے کیا عیشِ دنیا کی طرف مائل ہو سکتے تھے وہ لوگ جن کے بھرے گھر کی صفائی چند گھنٹے میں ہو گئی۔

مورخین نے جناب رباب اور جناب سکینہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک زندہ رہیں واقعات کربلا کو یاد کر کے شب و روز روتی تھیں۔ انہوں نے سایہ میں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ تمام دن کی دھوپ ان کے سر پر پڑتی تھی جب محلہ کی کوئی بی بی سائے میں جانے کو کہتی۔ تو رو رو کر فرماتیں کیونکر سائے میں بیٹھے وہ دکھیا جس کے شوہر کی لاش کئی دن تک بے غسل و کفن دھوپ میں پڑی رہی ہو۔ آہ! آہ! متواتر دھوپ میں رہنے سے جناب رباب کے

چہرے کا رنگ سانولا ہو گیا تھا۔ اعضا میں اتنی کمزوری بڑھ گئی تھی کہ جہاں بیٹھ جاتی تھیں وہاں سے اُٹھنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔ مزاج میں اتنی خشکی پیدا ہو گئی تھی کہ آنکھوں سے آنسو تک نکلنا بند ہو گئے تھے۔ جناب زینب اور دیگر زنان بنی ہاشم کا یہ حال تھا کہ جب ٹھنڈا پانی سامنے آتا یا کوئی کربلا کا نام لے دیتا تو دل بے قرار ہو جاتا۔

آہ! اس اُمت جفا کار نے اولاد رسول کا مرتبہ ذرا بھی نہ پہچانا تو لوگ اپنے دشمن کی اولاد سے بھی وہ سلوک نہیں کرتے جو ان بدبخت مسلمانوں نے اپنے نبی کی عزت سے کیا۔ خدا وند عالم کا ارشاد ہے ھَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿پ۲۷ رحمن﴾ لیکن افسوس ہمارے رسولؐ کی اُمت نے رسول اللہ کے احسان کی ذرا قدر نہ کی تو آنحضرتؐ کی آنکھیں بند ہوتے ہی ان کے اہل بیت کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اگر مسلمان احسان شناس ہوتے تو اولادِ رسول کی خاک پا کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بناتے۔ جو احسان شناس قومیں ہیں۔ وہ اپنے محسن کے احسان کی اتنی قدر کرتی ہیں کہ پشت ہا پشت تک اس کی اولاد کے ساتھ برابر نیک سلوک کرتی رہتی ہیں۔ ہندوؤں کو دیکھو کیسی احسان شناس قوم ہے جب رام چندر نے لنکا پر چڑھائی کی تو ہنومان نے جو ایک بندر تھا اس کی اس طرح مدد کی کہ اپنی دُم میں ایک مشعل باندھ کر ساری لنکا کو آگ لگا دی۔ ہندو اس احسان کو آج تک نہیں بھولے اور بندروں کو جو اس کی اولاد ہیں دیوتا سمجھ کر پوجتے چلے جاتے ہیں ان کو کھانا دینا، پانی پلانا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی بندر کو مارنا چاہتا ہے تو اس سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اب ان کے مقابلہ میں ان مسلمانوں کی حالت کا تصور کرو جو ہمارے نبیؐ کی اُمت کہلاتے ہیں۔ رسولؐ خدا کی آنکھیں بند ہوتے ہی انہوں نے اولادِ رسولؐ کی طرف سے کیسی آنکھ موڑی کہ دشمن سے بھی کوئی ایسی بے رحمی نہیں کرتا۔

حضرت علی علیہ السلام سے خلافت چھینی جو ان کا جائز حق تھا۔ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے فدک چھینا جو ان کی میراث تھا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام سے بہ مکر و فریب سلطنت غصب کر لی۔ پھر زہر دے کر ان کو شہید کیا۔ ان کے جنازے پر تیر برسائے۔ ان کے بعد پنجتن پاک میں صرف ایک دم حسین علیہ السلام کا باقی رہ گیا تھا۔ ظالموں نے ان کو بھی چین سے نہ رہنے دیا۔

معاویہ کے مرتے ہی بیعت یزید کا زور امام حسین علیہ السلام پر ڈالا جانے لگا اور در صورت انکار قتل کی دھمکی دی گئی۔ جب حضرتؑ کو ان کے ارادہ کا پتہ چلا تو آپ ترک وطن پر آمادہ ہوئے۔

جو لوگ واقعات پر سطحی نظر رکھتے ہیں اور معاملات کے پوشیدہ پہلوؤں پر غور کرنے کی عادت نہیں رکھتے وہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کو مدینہ چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔ یہاں رہ کر جنگ کرنے میں ان کو بہت سی سہولتیں حاصل ہوتیں۔ بکثرت معاون و مددگار مل جاتے۔ بہت سے صحابہ شریک حال

ہو جاتے۔ مدینہ چونکہ حرمِ رسول تھا۔ یزید کو اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ اگر امام حسین علیہ السلام مدینہ کا قیام ترک نہ کرتے تو یقیناً جنگ حرہ کی طرح سرزمینِ مدینہ پر خون کی ندیاں بہتیں۔ اور وہ کشت و خون ہوتا جو تین سال بعد یزید کے سپہ سالار مسلم بن عقبہ کے ہاتھوں ہوا۔ حرمِ رسولؐ کی اس حرمت کے ضائع ہونے کا الزام امام حسین علیہ السلام اپنی گردن پر لینا نہیں چاہتے تھے۔ یزید ایسا مسلمان نہ تھا کہ حرمِ رسولؐ کی حرمت کو ملحوظ رکھتا۔ دوسرے اگر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ اہلِ مدینہ قتل ہو جاتے تو ان کی عورتیں اور بچے یہ کہہ کر فریاد کرتے کہ ہماری تباہی اور بربادی کا باعث حسین علیہ السلام ہوئے۔ نہ وہ مدینہ میں ہوتے نہ ہم پر یہ مصیبت نازل ہوتی۔ امام علیہ السلام یہ الزام بھی اپنے اوپر لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ امام نہیں چاہتے تھے کہ آپ کے ساتھ کوئی شخص شہید ہو۔ جو حسینی مقصد کا صحیح معنی میں عارف نہ ہو۔ تیسرے عالمِ غربت کی شہادت زیادہ اثرانگیز ہو سکتی تھی بہ نسبت وطن کی شہادت کے حسین علیہ السلام اپنے نانا سے سُن چکے تھے کہ ان کا مقتل کربلا ہے۔ بہرحال ان وجوہ سے امام کے لئے ضروری تھا کہ آپ سفرِ غربت اختیار کریں۔

جب حضرت نے ترک وطن کا ارادہ کیا تو پہلے روضہ رسولؐ پر حاضر ہوئے اور رو رو کر فرمانے لگے السلام علیک یا جداہ۔ نانا آپ کا پیارا حسین سلام آخری کے لئے حاضر ہوا ہے۔ نانا آپ کی اُمت نہیں چاہتی کہ میں یہاں رہ کر زیارتِ قبر مبارک کا شرف حاصل کرتا رہوں۔ آپ کے روضۂ انور اور مادرِ گرامی کی قبرِ اطہر کا چھوڑنا اور اس گرمی میں آوارہ وطن ہونا میرے اُوپر نہایت شاق ہے مگر کیا کروں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

نانا! میں آپ کا وہی حسینؑ ہوں جس کو آپؐ نے زبان چُسا چُسا کر پالا تھا جس کے لئے روز عید آپ مرکب بنے تھے، جس کی ناز برداری کے لئے آپؐ نے جنت سے میوے منگائے تھے۔ آہ! آج آپ کا وہی حسین ظالم بنی اُمیہ سے تنگ آ کر ترکِ وطن پر مجبور ہو رہا ہے۔ پہاڑوں کا سفر گرمی کا موسم چھوٹے چھوٹے بچوں اور پردہ نشین عورتوں کا ظالموں کی ایذا رسانی کا خوف وطن چھوٹنے کا غم۔

نانا! اب میرا دل زندگی سے بیزار ہو گیا ہے کاش آپ مجھے اپنی قبر کی آغوش میں لے لیتے اور میں مظالم سے بچ جاتا۔ یہ کہہ کر آپ بے چین ہو کر قبر مبارک سے لپٹ گئے۔ اسی اثناء میں آپ پر غلبہ خواب ہوا آپ نے عالمِ رویا میں دیکھا کہ حضرت رسولِؐ خدا آپ کو اپنی آغوش میں لئے فرما رہے ہیں۔ بیٹا حسینؑ غم نہ کر اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تو جنت میں میرے پاس ہو۔ آہ ظالم بنی اُمیہ نے مجھے قبر میں بھی چین سے رہنے نہ دیا بیٹا میں دیکھ رہا ہوں کہ تو بہت جلد مع اعزہ و انصار سرزمینِ کربلا پر تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کر دیا جائے

گا۔ اے حسینؑ صبر کر اور جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کر تو شہید راہِ خدا ہے۔ بیٹا حسینؑ اب قبر میں مجھے چین کہاں تو جہاں جائے گا میں تیرے ساتھ رہوں گا۔

یہ خواب دیکھ کر حضرتؑ بیدار ہوئے تو قبرِ رسولؐ کو انتہائی ملال کے ساتھ رخصت کیا۔ پھر وہاں سے اپنی مادرِ گرامی کی قبر پر تشریف لائے اور رو رو کر عرض کی اماں جان آپ کا پیارا حسین رخصتِ آخر کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اماں جان آپ کی قبر کی جدائی حسین غریب پر بہت شاق ہے لیکن کیا کروں دشمنانِ دین درپے آزار ہیں وہ نہیں چاہتے کہ میں وطن میں رہ کر آپ کی قبر کی زیارت کا شرف حاصل کرتا رہوں۔ بڑی دیر تک قبرِ مبارک سے لپٹ کر روتے رہے پھر وہاں سے قبرِ امام حسنؑ پر تشریف لائے اور بصد رنج و ملال رو رو کر قبر سے رخصت ہوئے۔

منقول ہے کہ جب حضرت کے اس ارادہ کی خبر اہلِ مدینہ کو ہوئی تو دوستدارانِ اہلِ بیت کے دل ہل گئے۔ جوق در جوق لوگ استفسار کے لئے آنے لگے۔ کنبہ والے حضرت محمد حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ ہم نے سنا ہے کہ فرزندِ رسولؐ مدینہ چھوڑنے کا قصد فرما رہے ہیں۔ ذرا آپ ان کی خدمت میں جا کر اس ارادہ سے ان کو روکیئے۔ پنجتن پاک میں صرف ان ہی کا دم ہے۔ اگر خدا نخواستہ کوئی مصیبت آگئی تو ہم ان کی زیارت کی سعادت سے محروم ہو جائیں گے اور ہمارا کوئی سہارا نہ رہے گا۔ چنانچہ حضرت محمد حنیفہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔ بھائی جان آپ جانتے ہیں کہ آپ سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے آپ ہمارے خاندان کے چشم و چراغ اور ہم اہل بیت کے بزرگ اور سرپرست ہیں۔ آپ کی اطاعت خدا نے ہم سب پر واجب کی ہے۔ بحیثیت چھوٹا بھائی ہونے کے زیبا نہیں کہ بطور نصیحت خدمت میں عرض کروں۔ لیکن کیا عرض کروں فرطِ محبت سے یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ خدا کے لئے ترک وطن کا ارادہ ملتوی کیجئے۔ آپ کے دم سے ہم کو بڑی ڈھارس ہے۔ آپ رسول خدا اور حضرت علی مرتضیٰ کی یادگار ہیں اگر آپ تشریف لے گئے تو ہم سب کا دل ٹوٹ جائے گا اور زندگی وبالِ جان ہو جائے گی۔

حضرت نے فرمایا اے بھائی! تم جو کچھ فرطِ محبت سے کہہ رہے ہو میں اس کی قدر کرتا ہوں لیکن جس بات کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے میرا اب یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بنی امیہ درپے آزار ہیں اگر میں یہاں رہوں گا تو ضرور قتل کر دیا جاؤں گا میں نہیں چاہتا کہ مدینہ رسولؐ میں میرا خون بہا دیا جائے اور اس مقدس شہر کی عظمت خاک میں مل جائے۔

جناب محمد حنفیہ آب دیدہ ہو کر کہنے لگے اچھا اگر آپ سفر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو پھر میری رائے یہ ہے کہ آپ یمن تشریف لے جائیں۔ ہمارے بہت سے دوست وہاں موجود ہیں۔ وہ ضرور آپ کو پناہ دیں گے۔ اور اگر

خدانخواستہ وہاں بھی امن کی صورت نظر نہ آئے تو جنگلوں، گھاٹیوں پہاڑوں کی طرف نکل جایئے اور جب تک یہ فتنہ فرد نہ ہو برابر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کرتے رہیے تاآنکہ حکم خدا ہمارے اور اس کے درمیان جاری ہو۔

حضرتؑ نے فرمایا اے بھائی اگر میں سوراخ مور و مار میں بھی پناہ لوں گا تب بھی بنی اُمیّہ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میں اپنے نانا سے سن چکا ہوں کہ میرا اور میرے ساتھیوں کا خون انتہائی بے دردی سے سرزمین کربلا پر بہایا جائے گا۔

یہ سن کر محمد حنفیہ زار زار رونے لگے۔ اور عرض کی اے بھائی اگر یہ صورت ہے تو پھر عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جایئے۔ یہ گرمی کا موسم ہے راہ میں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں دشمن گھات میں لگے ہوئے ہیں ایسی حالت میں ان کا ساتھ لے جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت نے فرمایا اے بھائی میں تمہاری اس فرمائش کو بھی قبول کرنے سے معذور ہوں کیونکہ مشیت ایزدی یہی ہے کہ یہ بھی راہِ خدا میں اسیر ہوں۔

مومنین جس وقت جناب زینبؑ نے یہ سُنا کہ محمد حنفیہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ امام حسینؑ اپنے ساتھ اہل حرم کو نہ لے جائیں تو بے چین ہو کر محمد حنفیہ کے پاس آئیں اور فرمانے لگیں بھیا محمد خدا کے لئے ہمیں چھوڑنے کی رائے نہ دو۔ زینب اپنے ماں جائے بھائی سے جُدا ہو کر دنیا میں رہنا نہیں چاہتی۔ پنجتن پاک میں صرف ایک دم حسینؑ کا رہ گیا ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ میں ان کو چھوڑ دوں۔ نانا کی یادگار۔ باپ کا ثانی بھائیؑ کی نشانی جو کچھ کہو ایک حسین کا دم ہے وہی سب کی زندگی کا سہارا ہے۔ ہم کس طرح ان کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں۔ زینبؑ ہر مصیبت اٹھانے کے لئے تیار ہے لیکن اپنے پیارے بھائیؑ کی جُدائی پر راضی نہیں۔ یہ سُن کر حضرت محمد بن حنفیہ خاموش ہو گئے اور دیر تک کنبہ کی جدائی کے تصور سے روتے رہے۔

مروی ہے کہ جب مدینہ کی عورتوں کو یہ خبر ہوئی کہ امام علیہ السلام مع اپنے تمام کنبے کے مدینے سے کوچ کرنے والے ہیں تو ہر گھر میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور گروہ در گروہ عورتیں جناب زینبؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں اے دختر زہرا جس طرح ممکن ہو فرزند رسولؐ کو اس ارادے سے روکیئے۔ ہمارے کلیجے آپ لوگوں کی جدائی سے شق ہوئے جاتے ہیں۔ ہم نے اس غم میں کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا۔ ہمارے ہوش و حواس گم ہیں ہماری طرف سے فرزند رسولؐ کی خدمت میں عرض کیجئے کہ وہ ہمارے حال پر رحم فرما کر اپنے ارادے سے باز رہیں۔ ہمارے مرد باہر حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہیں اور ہم آپ کی خدمت میں عرض رساں ہیں۔ بی بی فرزند رسول کے تشریف لے جانے کے بعد مدینہ رسولؐ ویران ہو جائے گا۔ مسجد رسول بے رونق

ہو جائے گی۔ محلہ بنی ہاشم کی طرف پھر کوئی بھول کر رُخ نہ کرے گا۔ جناب زینب نے فرمایا بی بیو! تمہاری ہمدردی قابلِ شکریہ ہے کس کو اپنا وطن چھوڑنا پسند آتا ہے۔ خاص کر اس گرمی کے موسم میں لیکن میرے بھائی ایسے ہی مجبور ہیں کہ بجز ترک وطن کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ بنی امیہ خاندانِ رسولؐ کی تباہی و بربادی پر کمر باندھے ہوئے ہیں۔ حسینؑ سے بیعت یزید طلب کی جارہی ہے۔ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ نبی کا نواسہ ایک بدکار شراب خوار کی بیعت کر کے اس کا فرماں بردار بندہ بن جائے۔ حسین علیہ السلام ہرگز ایسا نہیں کریں گے ان کو مرنا گوارا ہے لیکن بیعت یزید منظور نہیں۔

یہ جواب سُن کر وہ بی بیاں زار زار رونے لگیں اور عرض کرنے لگیں۔ اچھا اگر فرزند رسولؐ جانے پر مجبور تو اپنے ساتھ عورتوں کو نہ لے جائیں۔ جناب زینبؑ نے فرمایا اے بی بیو! خدا کے لئے ایسا نہ کہو ہم کو کسی طرح فرزند رسولؐ کی جُدائی گوارہ نہیں۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ فرزند رسولؐ کی جدائی کے بعد زینبؑ زندہ رہ سکتی ہے۔

مومنین سُنا آپ نے جناب زینبؑ کی محبت کا حال۔ دنیا میں کسی بہن کو اپنے بھائی سے اتنی محبت ہوگی جتنی جناب زینبؑ کو اپنے بھائی سے تھی۔ اس بھائی کی محبت میں کون سی مصیبت تھی جو نہ اُٹھائی۔ مہینوں سفر کیا۔ دھوپ اور لُو کی ایذا جھیلی۔ بھوک پیاس کے صدمے اُٹھائے اپنی اولاد کو بھائی پر قربان کیا۔ سر سے چادر چھنوائی بازوؤں میں رسن بندھوائی۔ درباروں میں سر برہنہ جانا گوارا کیا۔ بازاروں میں تشہیر ہونا اور زندانوں میں بند ہونا سب کچھ گوارا کر لیا۔

خوش نصیب ہے وہ بھائی جسے محبت بھری بہن مل جائے اور قابلِ فخر ہے وہ بہن جسے جان نثار بھائی مل جائے حقیقت یہ ہے کہ باپ کے بعد سچی محبت کا جذبہ بھائی میں اور ماں کے بعد بہن میں پایا جاتا ہے۔ تاریخ ایران میں ایک واقعہ نظر سے گزرا۔ کہ سلطان ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں ایک ہی گھر کے تین آدمیوں کو قتل کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ جب پھانسی کا وقت آیا تو تینوں مجرم لائے گئے تو ایک عورت بلبلاتی آئی اور بادشاہ کے قدموں پر گر کر کہنے لگی۔ ان سب کے ساتھ میرے قتل کا بھی حکم دے۔ کیونکہ ان کے بعد میرا کوئی پرستار باقی نہ رہے گا۔ بادشاہ نے پوچھا یہ تیرے کون ہیں اس نے کہا کہ ایک شوہر ہے ایک بیٹا ہے اور ایک بھائی ہے۔ بادشاہ کو رحم آگیا۔ اچھا میں تیری خاطر سے ایک کو معاف کرتا ہوں جسے چاہے بچالے۔ تینوں آدمی اس کے سامنے کھڑے کئے گئے۔ وہ پہلے شوہر کی طرف گئی شوق بھری نظروں سے دیکھا آبدیدہ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔ اب وہ بیٹے کے سامنے آئی اسے یقین تھا کہ مجھے ضرور بچائے گی وہ اس سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ پیار کیا منہ چوما۔ اور آگے بڑھ گئی اور بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بادشاہ کو اس انتخاب پر تعجب ہوا اور اس کی وجہ پوچھنے لگا۔ اس نے کہا

یہ تینوں مجھے بے حد عزیز ہیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ پہلے دو جن کو چھوڑا ہے ان کا بدلہ مجھ کو مل سکتا ہے۔ میں ابھی جوان ہوں، دوسرا شوہر بھی مل سکتا ہے اولاد بھی ہو سکتی ہے لیکن ماں باپ چونکہ مر چکے ہیں لہذا بھائی ملنا ممکن نہیں۔

یہ ہے بھائی کی محبت۔ کس کی طاقت ہے جو اندازہ کر سکے اس محبت کا جو حسینؑ جیسے بھائی سے زینبؑ جیسی بہن کو تھی۔ بھائی کیسا خلیق امام نبی آخر الزمان کا جانشین فخر بنی ہاشم سید شباب اہل الجنۃ بہن کیسی ثانیؑ زہراؑ غیر متعلق۔ عابدہ و زاہدہ۔ صابرہ و شاکرہ۔ نہ حسینؑ سا کسی بہن کو بھائی ملا نہ زینبؑ سی بہن۔

یہ بات بھی جناب امام حسین علیہ السلام سے ہی مخصوص تھی کہ ان کو بھائی اور بہن دونوں ایسے ملے جن کی نظیر آج تک زمانہ پیش نہ کر سکا۔ واقعۂ کربلا میں ان دونوں نے جس خلوص سے امام مظلوم کی نصرت فرمائی وہ قیامت تک یادگار رہے گی۔ فوجِ حسین کی سب سے بڑی ڈھارس جناب عباس علیہ السلام کا وجود تھا۔ اور عورتوں کی باعثِ تسلی ثانی زہراؑ جناب زینبؑ تھیں۔ جناب زینبؑ فرماتی تھیں کہ جب تک عباسؑ زندہ تھے میں سمجھتی رہی کہ کس کی طاقت ہے کہ میرے ماں جائے بھائی حسینؑ کو شہید اور مجھے اسیر کر سکے۔ لیکن عباسؑ کی شہادت کے بعد میرا دل ٹوٹ گیا اور یقین ہو گیا کہ اب سب کچھ ہو گا۔ بھیّا حسینؑ بھی شہید ہوں گے اور میں بھی اسیر ہوں گی۔

جب کربلا میں فوجیں آنا شروع ہوئیں تو جناب زینبؑ کا یہ معمول تھا کہ جب کوفہ سے کوئی فوج آتی تو جناب عباسؑ کو بلا کر دریافت کرتیں اس فوج کا سردار کون ہے اور اس کے ساتھ اندازاً کتنے آدمی ہوں گے۔ جناب عباسؑ بتاتے رہتے تھے کہ اب فلاں سردار آیا ہے اور اس کے ساتھ اتنی فوج ہے فرماتی ہیں کہ ساتویں محرم کو جو کوفہ سے ایک لشکر آیا تو میرے دل میں ایک غیر معمولی اضطراب پیدا ہوا اور مایوسی چھا گئی۔ میں نے عباسؑ کو بلا کر پوچھا۔ بھیّا عباسؑ آج سرزمین کربلا پر یہ کس سپہ سالار کا ورود ہوا ہے کہ میرا دل خود بخود بیٹھا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اے بہن یہ شمر ذی الجوشن شقی ہے جو چار ہزار کی جمعیت سے آیا ہے۔ یہ سنتے ہی میں زار زار رونے لگی۔ جناب عباسؑ نے پوچھا کہ آپ کے اس غیر معمولی ہراس کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا۔ اپنے نانا پدر بزرگوار اور مادر گرامی سے سنا ہے کہ میرے ماں جائے حسینؑ کا قاتل شمر ہو گا۔ بھیّا عباسؑ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس معرکے میں میرے بھیّا حسینؑ شہید ہو جائیں گے۔

یہ تھی جناب زینبؑ کی محبت۔ لکھا ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام مدینہ سے چلے تھے تو جناب عبداللہ شوہر جناب زینبؑ علیل تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ترکِ وطن کا ارادہ کیا ہے۔ سارا کنبہ ان کے ساتھ جا رہا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان کے ساتھ چلی جاؤں۔ آپ کی علالت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ انہوں نے فرمایا اے بنت زہراؑ

آپ ضرور ساتھ جایئے۔ جس وقت مرض سے افاقہ ہوا میں بھی راہ میں آ کر مل جاؤں گا۔ جناب زینبؑ نے فرمایا میں عون و محمد کو آپ کی تیمارداری کے لئے چھوڑے جاتی ہوں۔

آہ اس محبت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ جب تک عون و محمد راہ میں آ کر نہ ملے اس خیال سے مضطرب رہیں کہ میرے بچے نصرت حسینؑ سے محروم نہ رہ جائیں کس ماں کا کلیجہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اپنے بھائی پر اس طرح قربان کردے جس طرح جناب زینبؑ نے اپنی اولاد قربان کی۔

شبِ عاشور دونوں بچوں کو سامنے بٹھا کر سمجھاتی تھیں اے میرے نونہالو! کل جب جنگ کا آغاز ہوگا تو مرنے سے جی نہ چرانا، خاندان کی لاج رکھ لینا تم جعفر طیار کے پوتے اور حیدر کرار کے نواسے ہو۔ شجاعت کے جوہر دکھا کر شہید ہونا، دیکھو میں کہے دیتی ہوں کہ اگر ماموں کی نصرت میں کوتاہی کروگے تو دودھ نہ بخشوں گی۔ ان سعادت مندوں نے عرض کی۔ اے مادرِ گرامی آپ اطمینان رکھیں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ چنانچہ اس وعدہ کو روزِ عاشور دونوں نے پورا کیا اور باوجود کم سن ہونے کے ایسے لڑے کہ دشمن بدحواس ہوگیا۔ آخر جام شہادت نوش کیا۔

منقول ہے کہ جب جناب زینبؑ نے دونوں بیٹوں کی لاشیں دیکھیں تو سجدہ شکر ادا کیا اور فرمایا پروردگار میں کہاں تک تیرا شکر ادا کروں کہ تو نے زینب کو یہ سعادت دی کہ اس کے بچے تیری راہ میں قربان ہوئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۲۷/۲۶

تیسری مجلس

امام علیہ السلام کی مدینہ سے روانگی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾

سورہ الرحمٰن ۲۷-۲۲/۵۵

دُنیا کی ہر شئے فنا ہونے والی ہے سوائے ذاتِ الٰہی کے کوئی باقی رہنے والا نہیں جو اس دنیا میں آیا ہے ایک دن مرنا ضرور ہے اور چونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں اور جب آجاتی ہے تو ٹلتی نہیں۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ ہر وقت اپنی موت کا خیال پیشِ نظر رکھے اور اعمالِ خیر بجالاتا رہے کیونکہ نیکیوں کے سوا اور کوئی شئے آدمی کے ساتھ جانے والی نہیں۔ انسان کو ایک دن خدا کے سامنے ضرور جانا ہے۔ پس اس کو مرضیٔ خدا کے خلاف کام کرنے سے ڈرنا چاہیے تاکہ پرسشِ اعمال کے وقت اس کو خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

افسوس دُنیا کی محبت نے ہم کو ایسا بے ہوش بنا دیا ہے کہ اللہ کے حقوق کا خیال ہے نہ بندوں کے۔ نہ حلال کی تمیز ہے نہ حرام کی۔ اپنی ضرورتوں میں ایسے اندھے ہو رہے ہیں کہ جس طرح جو ہاتھ آتا ہے اسے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ اس کا قطعاً لحاظ نہیں کہ خدا و رسول کی طرف سے کیا کیا فرائض ہم پر عائد ہیں۔ دنیا کی حرص ایسی ہم پر غالب آگئی ہے کہ اپنے انجام پر نظر نہیں رکھتے۔ ہم اپنے کو صاحبِ ایمان اور ائمہ طاہرین کا پیرو جانتے ہیں حالانکہ ہمارے اعمال ایمان والوں کے اعمال سے بہت دور ہیں۔ جو باپ اپنی اولاد کی پرورش کا سامان نہیں کرتا ان کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا جو اولاد اپنے ماں باپ کے حقوق ادا نہیں کرتی ان کی مطیع نہ

فرمانبردار نہیں جو عورت اپنے شوہر اور جو شوہر اپنے زوجہ کے حقوق کو نہیں پہچانتا جو کوئی اپنے عزیزوں سے صلہ رحم نہیں کرتا وہ مومن کہلانے کے قابل نہیں۔

یہ دنیا چند روزہ ہے اس پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اور اس کے جھگڑوں میں پھنس کر اپنی آخرت نہ برباد کرنی چاہیئے۔ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب آدمی کا سن چالیس برس کا ہوتا ہے تو ایک منادی آسمان سے ندا کرتا ہے کہ اے شخص تیرے کوچ کا وقت قریب آ گیا اپنا زادِ راہ درست کرے۔

ہم کو ذرا سی دیر کے لئے یہ تصور کرنا چاہیے کہ ہمارے کیسے کیسے عزیز دوست اور ہم سن ہماری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے اٹھ گئے۔ گردشِ فلکی نے کیسی کیسی زبردست ہستیوں کو ہمارے سامنے خاک میں ملا دیا کیسے کیسے خاندانوں کے چراغ گل کر دیئے۔ جو کل تک ہمارے گھروں کی رونق اور ہماری محفلوں کی زینت تھے آج وہ منوں خاک کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ جن کا نظر سے اوجھل ہونا دم بھر کے لئے گوارا نہ تھا۔ وہ اب ایسے جدا ہوئے ہیں کہ دوبارہ ان سے ملنے کی آس نہیں۔ ان کی خواب گاہیں خالی پڑی ہیں۔ ان کی جلوہ گاہیں ویران ہیں۔ انہوں نے اس دارِ فانی میں کس محنت و مشقت سے مال جمع کیا تھا کس کوشش و جان فشانی سے زندگی کے ساز و سامان فراہم کئے تھے۔ آہ وہ سب کا سب یہیں دھرا رہ گیا اور جانے والے خالی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ اور انتہائی حسرت سے دنیا کی سب چیزوں کو تکتے چلے گئے۔

اب وہ انتہائی بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اپنی تنگ و تاریک قبر کے اندر پڑے ہوئے خدا کے آخری حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔ نہ بے چاروں کا کوئی مونس نہ ہمدم ہے نہ یار نہ مددگار اب اپنے اعمال پر حسرت و ندامت ہے مگر بے کار، نیک عمل بجا لانے کی حسرت ہے مگر بے سود اس دنیا میں جن لوگوں کو اپنا سمجھتے تھے وہ سب غیر ثابت ہوئے۔ جن چیزوں کو اپنی ملکیت تصور کیا جاتا تھا وہ سب قبضے سے باہر۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مردِ مسلمان کے تین دوست ہیں۔ ایک وہ کہ زندگی بھر اس کا ساتھ دینے والا ہے اور بعد مرنے کے فوراً اس سے جدا ہو جاتا ہے یہ دوست اس کا مال ہے کیونکہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا مال اس کے وارثوں کو پہنچ جاتا ہے پس خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے وارث ان کے مال کو نیک کاموں میں صرف کریں۔ ایسے ہی اولاد کو باقیات الصالحات کہتے ہیں۔ دوسرا دوست اس کی اولاد ہے جو قبر تک ساتھ دینے والی ہے۔ خوش نصیب ہے وہ بندۂ مومن جو صاحبِ اولاد ہو کر مرے اور اس کے بیٹے اپنے باپ کے جنازے کو قبر تک پہنچا دیں۔ تیسرا دوست وہ ہے جو مرنے کے بعد سے قیامت تک اس کے ساتھ رہنے والا ہے اور وہ اس کے اعمالِ خیر ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ انسان جو اپنی زندگی میں اعمالِ نیک بجا لاتا ہے۔

جس طرح یہ تین دوست ہیں اسی طرح انسان کے تین دوست نما دشمن بھی ہیں۔ اوّل وہ مال جو حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ اس کا ہر طرح کا استعمال انسان کے لئے وبال جان آخرت میں بن جاتا ہے۔ یہ بظاہر دوست معلوم ہوتا ہے لیکن در پردہ وہ اس کی اخلاقی اور روحانی زندگی کو تباہ کرتا رہتا ہے۔ دوسرا دشمن بدکار اور نا اہل اولاد ہے جو ماں باپ کو بسا اوقات تمام خاندان کے لئے ننگ و عار ہوتی ہے اور اپنے ماں باپ کی دولت کو ناجائز امور میں صرف کرتی ہے۔ تیسرا دشمن انسان کی بدحالی ہے جو اس کے لئے دنیا و آخرت میں خسران عظیم ہوتی ہے۔

نیک عمل کے لئے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ ہو کیونکہ ریاکاری اور دکھاوے کے لئے جو عمل کیا جاتا ہے وہ خدا کی سرکار میں مقبول نہیں ہوتا، ایسے عمل کے کرنے سے اس کا نہ کرنا بہتر ہے حضرت یہ سمجھنا کہ اعمال کا کوئی دیکھنے والا نہیں ہمارے حال سے کوئی آگاہ نہیں غلط ہے۔ ایک نہیں تین تین آنکھیں دیکھنے والی ہیں۔ جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۖ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾ (سورہ توبہ ۹/۱۰۵)

تم جو چاہو کرو (مگر یہ سمجھتے ہوئے کہ) اللہ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے اور اس کا رسولؐ اور ایمان والے (ائمہ طاہرینؑ) پس ایسی حالت میں کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے عمل کی کھوٹ چھپ سکے۔ ایک جگہ قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے۔ عاملة ناصبة تصلى نارا حامية دکھ سخت سے سخت عمل کرنے والے بھی ہیں جو بجائے نیک جزا پانے کے جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے اور سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ

لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾
(سورہ کہف ۱۸/۱۰۴)

کیا ہم ان لوگوں کا پتہ بتا دیں جو اعمال کی حیثیت سے بہت گھاٹے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیاوی زندگی کی سعی و کوشش سب اکارت ہوگئی اور وہ اس خیالِ خیام میں رہے کہ وہ اچھے اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے پروردگار کی آیتوں سے اور قیامت کے دن اس کے سامنے ہونے سے انکار کیا تو ان کا سب کیا کرایا اکارت ہوگیا۔ تو کیا ہم ان کے لئے قیامت کے دن میزان حساب قائم نہ کریں گے اور جہنم میں جھونک دیں گے۔ ان آیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل میں ریا و نمائش کو دخل نہ دے اور ہر کام کو خلوص اور سچائی سے انجام دے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا ہمیشگی کا گھر نہیں ہے۔ یہ ایک پل ہے ایک گزرگاہ ہے۔ ہماری حیثیت ایک مسافر کی ہے اور مسافر کے پاس جتنا سامان کم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محمد وآل محمد علیہم السلام نے اپنی زندگی کا سازو سامان اتنا مختصر رکھا کہ کسی غریب سے غریب اور نادار آدمی کو رشک نہ آسکتا تھا۔ کیونکہ اس سے کم میں زندگی ہی ممکن نہ تھی۔ کھانے کی یہ صورت تھی کہ لذیذ غذا کھاتے ہی نہ تھے۔ کبھی سوکھی جو کی روٹی نمک کے پانی میں چور کر کھالی۔ کبھی جو کا ایسا آٹا پھانک لیا۔ جس میں آدھی سے زیادہ بھوسی ملی ہوئی تھی کبھی نہ کھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کبھی شدت گرسنگی میں پیٹ پر پتھر باندھ کر غذا کے معاملے میں اس سے زیادہ تقلیل اور بے التفاتی ممکن نہیں۔ لباس کی یہ حالت کہ جا بجا پیوند پر پیوند لگے ہوئے اور بجائے سوت کے خرمے کی چھال کے ریشوں سے سلے ہوئے ایک ایک چادر میں گرمی اور جاڑا دونوں بسر کرتے۔ اس لباس پر کس کو رشک آئے گا۔ اس طریق ماند و بود پر کون حسد کرے گا۔ گھر کا سامان اتنا مختصر کہ اس سے کم ہو نہیں سکتا بستر کی جگہ ایک دباغت کی ہوئی کھال جس پر اونٹ دن میں دانہ کھاتا تھا اور رات کو اسی پر سو رہتے تھے۔ ایک مشکیزہ پانی لانے کے لئے ایک لکڑی یا مٹی کا پیالہ پانی پینے کے لیے ایک یا دو ظرف سالن کے لئے یہ اس لئے اختصار نہ تھا کہ سامانِ آسائش خریدنے پر قدرت نہ تھی۔ چاہتے تو شاہانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر سکتے تھے کچھ نہیں تو اپنی سلطنت کے دور میں تو امراء کی سی زندگی بسر کر سکتے تھے مگر یہاں تو ہر دور یکساں ہی تھا۔

وہ دنیا کی حقیقت کو سمجھے ہوئے تھے، وہ جانتے تھے کہ دنیا کے عیش و آرام کے جھگڑوں میں پھنس کر انسان اپنی عاقبت کھو بیٹھتا ہے اور اس دلدل میں پھنس کر پھر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ دنیا میں آرام کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ بلکہ دوسروں کو آرام دینے حقوقِ خدا اور حقوق الناس کی حفاظت کے لئے۔

دنیا کو جو کچھ امیر المومنین علیہ السلام نے سمجھایا ہے وہ یہ ہے۔

مَا اَصِفُ مِنْ دَارٍ اَوَّلُهَا عَنَاءٌ وَاٰخِرُهَا فَنَاءٌ فِیْ حَلَالِهَا حِسَابٌ وَفِیْ حَرَامِهَا عِقَابٌ مَنِ اسْتَغْنٰی فِیْهَا فُتِنَ وَمَنِ افْتَقَرَ فِیْهَا حَزِنَ وَمَنْ سَاعَاهَا فَاتَتْهُ وَمَنْ قَعَدَ عَنْهَا اَتَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ اِلَیْهَا اَعْمَتْهُ ۔

میں ایسے گھر کی تعریف کیا کروں جس کی ابتدا رنج اور انجام فنا جس کے حلال میں حساب اور حرام میں عذاب جو اس میں غنی ہوا طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا ہوا اور جو محتاج ہوا وہ محزون ہوا جو اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اسے ملتی نہیں اور جو اس سے بیٹھ رہتا ہے وہ اس کے پاس آتی ہے جو اس کے ذریعے سے دیکھے اسے بینا بنا دیتی ہے اور جو اسے دیکھے اسے اندھا بنا دیتی ہے) یہ وہ حقیقت ہے جس کی شرح اپنا روزگار کی عبرت ناک داستانیں ہیں ۔

اہل دنیا پر افسوس ہے کہ اہلِ بیت رسولؐ کی اس مقدس زندگی کی قدر نہ کی ۔ حرص دنیا اس درجہ لوگوں پر غالب آئی کہ انہوں نے اسلامی تعلیم کو پس پشت ڈال دیا اور حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد اولادِ رسولؐ کی طرف سے ایسا رُخ پھیرا کہ ان کے جائز حقوق تو غصب کئے ہی تھے ۔ ان کے روحانی اقتدار کو بھی گھٹانا شروع کر دیا ۔ رسول اللہؐ نے جن کو قرآن کے ساتھ کیا تھا جن کی محبت نجات آخرت کا ذریعہ قرار دی تھی ۔ لوگوں نے ان کی دشمنی کو اپنے اُوپر واجب کر لیا اور وہ ظلم ان پر کئے کہ ان کے تصوّر سے کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے ۔

اہل بیت سے اس بے پرواہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین میں قسم قسم کی بدعتیں رونما ہو گئیں ۔ اور احکام الٰہی مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئے ۔ یہاں تک کہ جب یزید کا زمانہ آیا تو ضلالت کا وہ دور دورہ ہوا کہ خدا کی پناہ جو گناہ پہلے ڈھکے چھپے کئے جاتے تھے وہ کھلم کھلا کئے جانے لگے ۔ جن افعال شنیعہ کو شریعت محمدیہ میں حرام کیا گیا تھا ان سب کو حلال قرار دیا گیا ۔ زنا ۔ شراب ۔ غنا ۔ قتل عمد رقص و سرود ، لہو بازی ، تضحیک و توہین محرمات الٰہیہ کے جواز کا اعلان کر دیا گیا ۔

بنی اُمیہ کی ظالمانہ حکومت کا ایسا رعب مسلمانوں پر چھا گیا تھا کہ باوجود دین اسلام کی اس تباہی اور بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لبوں پر مہر خاموشی لگی تھی ۔ سب کی زبانیں بند تھیں ۔ اگر امام علیہ السلام اس وقت دینِ الٰہی کی مدد کے لئے کھڑے نہ ہو جاتے ۔ تو کچھ دن بعد بجائے دین محمدیؐ کے دین یزیدی دنیا میں رائج ہو جاتا ۔

ہر قوم پر تین وقت آتے ہیں ۔ ایک وہ وقت ہوتا ہے کہ قوم کے اکثر افراد نیکی کو بجا لانے اور حتی الامکان

بدی سے گریز کرتے ہیں۔ یہ کسی نبی کی تعلیم کے قریب کا زمانہ ہے اور یہی خیر القرون کہلاتا ہے دوسرا وہ زمانہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو بدی کرنے سے شرم آتی ہے۔ اگر کسی مجبوری سے کر جاتے ہیں تو ضمیر کی نیش زنی باقی رہتی ہے اور نیکی اور بدی کی حدود جدا جدا رہتی ہیں۔ گناہ کرنے والے اس کا احساس کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ بُرا فعل کیا یہ زمانہ بھی غنیمت ہوتا ہے تیسرا زمانہ وہ آتا ہے کہ نیکی اور بدی کی حدیں مل جاتی ہیں اور بدی نیکی میں شمار ہونے لگتی ہے۔ بدی کرنے والے بدی کو نیکی سمجھ کر کرتے ہیں یہی منحوس وقت تھا جو یزید کے دور میں آیا۔ امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا مقصد یہی تھا کہ حق کو باطل سے جدا کر دیں۔

غور کیا جائے تو امام علیہ السلام نے اسلام پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اگر حضرت اپنی اور اپنے اعزاء انصار کی گراں قدر قربانیاں پیش نہ کرتے تو دنیا بہت جلد دیکھ لیتی کہ دین اسلام ختم ہو کر ایک ایسا دین بن جاتا کہ دنیا کے تمام ادیان اس پر ہنستے اور قہقہے لگاتے امام علیہ السلام کے دل میں دین خدا کا سچا درد تھا۔ ان کے نانا حضرت رسولِ خدا نے اسی دین کی خاطر تئیس سال طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ آپ سے دینِ خدا کی بربادی دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا۔ اور مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لئے کمر ہمت کس کر باندھی اور دنیا کی تمام مصیبتوں کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ آپ جانتے تھے کہ جب تک پوری طاقت کے ساتھ یزید کا مقابلہ نہ کیا جائے گا اسلام کے سر سے یہ بلاٹل نہیں سکتی۔

منقول ہے کہ جب امام علیہ السلام نے مدینہ سے روانگی کا قصد کیا تو بنی ہاشم میں ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ ہر دل اس درد سے بے چین نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ جب حضرتؑ رخصت آخر کے لئے جناب ام سلمہؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے بے اختیار آپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور رو رو کر فرمانے لگیں۔ کہ اے فرزند سنتی ہوں کہ تمہارا ارادہ عراق جانے کا ہے۔ بیٹا جب سے یہ خبر سنی ہے میرا دل فرطِ غم سے غیر حال ہے۔ میں تمہارے نانا حضرت رسولؐ خدا سے سن چکی ہوں کہ میرا فرزند حسینؑ سرزمینِ عراق پر قتل کیا جائے گا۔ حضرت رسولؐ خدا نے مجھے ایک دن تھوڑی سی خاک دی تھی اور فرمایا تھا اے ام سلمہؑ یہ مقتل حسینؑ کی خاک ہے۔ اس کو بحفاظت تمام اپنے پاس رکھو۔ جس روز یہ خاک سرخ ہو جائے سمجھ لینا کہ میرا جگر پارہ حسین قتل ہو گیا۔ بیٹا میں نے بحفاظت اس شیشے میں خاک کو رکھا ہوا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آنحضرتؐ کی پیشن گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ اے حسینؑ اے لختِ جگر میرے اس غم میں میں کیسے صبر کروں گی۔ تمہاری اور سارے کنبہ کی مفارقت مجھے کیونکر گوارا ہو گی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔

اے نانی جان! جو خدا کی مشیت ہے وہ ہو کر رہے گی۔ میں اس سفر میں ضرور شہید ہوں گا اور میرے

اہل بیت اسیر ہو کر در بدر پھریں گے۔ میرا گھر لوٹا جائے گا۔ میں اور تمام عزیز و انصار گوسفندان قربانی کی طرح ذبح کئے جائیں گے۔ اے نانی جان آئیے میں اپنی قتل گاہ کا منظر دکھاؤں۔ یہ فرما کر حضرتؑ نے اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان نظر کرنے کو کہا۔ آہ! آہ!! اب جو جناب اُم سلمہؓ نے دیکھا تو وہ قیامت کا منظر نظر آیا کہ تابِ ضبط نہ رہی چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ دیکھا کہ جا بجا کچھ بوڑھے، کچھ جوان، کچھ بچے سر کٹائے خون میں نہلائے پڑے ہیں۔ ان کے لاشے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اس طرح کچلے گئے ہیں کہ کوئی اپنی اصل حالت پر باقی نہیں رہا ریتی پر جو خیمے نصب ہیں ان میں آگ لگی ہے کچھ بی بیاں سر برہنہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں ہر طرف کو بھاگ رہی ہیں اور کوئی ان بے کسوں کا پُرسانِ حال نہیں۔

الغرض جب جناب ام سلمہؓ کا دل ٹھہرا تو جناب امام حسین علیہ السلام نے وہ تمام امانتیں اور تبرکات جو حضرت رسولؐ خدا نے جناب امیر علیہ السلام کے سپرد فرمائے تھے۔ اور ان سے حضرت تک پہنچے تھے سب جناب اُم سلمہؓ کے سپرد کر کے فرمایا میری شہادت کے بعد جب میرے اہلِ بیت پھر مدینہ آئیں تو یہ سب چیزیں میرے فرزند زین العابدین کے سپرد کر دینا کیونکہ میرے بعد وہی میرے وصی و جانشین ہیں۔

منقول ہے کہ اس زمانہ میں امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی جن کا نام فاطمہ صغرا تھا۔ تپ شدید میں مبتلا تھیں اور اس درجہ ناتواں ہو گئی تھیں کہ کسی طرح حضرت کے ساتھ سفر کرنے کے قابل نہ تھیں حضرت نے اپنے سفر کی خبر کو ان سے اس لئے پوشیدہ رکھا تھا کہ اس صدمہ سے ہلاک نہ ہو جائیں لیکن جب گھر کا سامان بندھنے لگا اور کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں تو فاطمہ صغریٰ کو پریشانی لاحق ہوئی اور ایک ایک بی بی سے کہنے لگیں کہ بابا جان کہاں جانے کا قصد فرما رہے ہیں۔ جناب رباب سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا اے بیٹی تمہارے باپ کو سفر عراق پر جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بیٹی چونکہ تم مریض و ناتواں ہو اور سفر کرنے کے قابل نہیں اس لئے فرزند رسولؐ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ سننا تھا کہ فاطمہ صغریٰ بے چین ہو کر رونے لگیں۔ اماں جان بابا جان کو جلد میرے پاس بھیجئے میں اپنا حالِ زار خود ان سے بیان کروں گی۔ بھلا کیونکر ممکن ہے کہ سارا کنبہ تو حضرت کے ساتھ جائے اور میں اکیلی اس سنسان گھر میں پڑی رہوں۔ اس صورت میں تو میں نہ مرتی ہوں گی تو مر جاؤں گی۔

لکھا ہے کہ جب امام علیہ السلام فاطمہ صغریٰ کے پاس تشریف لائے۔ تو بیمار نے دردناک لہجے میں کہا "بابا جان میں سنتی ہوں کہ آپ آمادہ سفر ہیں۔ فرمایا اے نور دیدہ کیا کروں ظالم بنی اُمیہ مجھے مدینہ رسول میں نہیں رہنے دیتے۔ بیمار نے عرض کی بابا میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ حضرت یہ سُن کر آبدیدہ ہوئے اور بیٹی کو چھاتی سے لگا کر فرمایا صغریٰ میں تم کو ضرور ساتھ لے چلتا۔ لیکن کیونکر لے کر چلوں تم بیماری سے اتنی کمزور ہو کہ سفر کی تکالیف

برداشت نہیں کر سکتیں، یہ سخت گرمی کا موسم ہے لُو چل رہی ہے۔ پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر ہے ایسے سخت سفر میں تندرست لوگ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔ بیماروں کا ذکر ہی کیا۔ میں تم کو اپنی نانی اُم سلمہ کے سپرد کئے جاتا ہوں۔ جب منزلِ مقصود پر پہنچ کر اطمینان کی صورت نظر آئے گی تو فوراً علی اکبر کو بھیج کر تمہیں بلوالوں گا۔

بیمار نے رو کر عرض کی بابا ایک تو میں مرض سے یوں ہی جاں بلب ہوں اگر آپ مجھے ساتھ نہ لے گئے تو کنبہ کی جدائی میں چند ہی روز بعد میرا خاتمہ ہو جائے گا۔ جب یہ بھرا گھر مجھے سونا نظر آئے گا تو میری وحشت اور بے چینی اور زیادہ ہوگی۔ اگر خدا نے چاہا تو تبدیلی آب و ہوا سے مجھے جلد صحت ہو جائے گی۔

آہ مومنین جب فاطمہ صغریٰ بالکل مایوس ہو گئیں تو اپنی پھوپھیوں سے مل کر خوب روئیں ہر ایک سے کہتی تھیں خدا کے لئے بابا سے میری سفارش کرو۔ میں تم سے جدا ہو کر کیوں کر زندہ رہوں گی۔ فاطمہ صغریٰ کی گریہ و زاری اور نالہ و بے قراری پر اہل حرم میں کہرام بپا تھا۔ سب بی بیاں چھاتی سے لگا لگا کر تسلی دیتی تھیں لیکن فاطمہ صغریٰ کو کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ جناب امام حسینؑ بیٹی کی مفارقت کے غم میں نہایت بے چین تھے اور بار بار سمجھاتے اور پیار کرتے جاتے تھے۔ آخر کار فاطمہ صغریٰ کو کسی قدر سکون ہوا تو حضرت نے حکم دیا کہ سامانِ سفر اونٹوں پر بار کیا جائے۔

اس وقت کی حالت کیوں کر بیان کی جائے۔ تمام زنانِ بنی ہاشم جو اہل حرم کو رخصت کرنے کے لئے آئی تھیں سفر کی تیاری دیکھ کر ایسی بے چین تھیں کہ ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، کوئی بی بی روتی تھی کوئی بی بی سینہ کوٹتی تھی۔ امام سب کو تسلی دے کر فرماتے تھے صبر کرو اور فضل خدا پر نظر رکھو۔ وہی جامع المتفرقین ہے وہی حلال مشکلات ہے۔ وہ کہتی تھیں یا ابن رسول اللہ اس مصیبت عظمیٰ میں کیسے صبر آئے۔ آج کا دن ہمارے لئے رسولؐ خدا کی رحلت کے دن سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے کیونکہ جب حضرت نے رحلت فرمائی تھی تو آلِ عبا میں چار شخص تھے جن سے ہم کو بڑی تقویت تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ سب ہم سے جدا ہو گئے۔ اب سوائے آپ کے دم کے ہمارا کوئی پشت پناہ باقی نہیں۔ واحسرتا! اب آپ بھی ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ فرمائیے ہمارے دل کو کیونکر چین آئے۔ آج کا دن ہمارے لئے خاتمہ آلِ عبا کا دن ہے۔ ہمارے دلوں پر آپ کی جدائی کے تصور سے خنجر چل رہے ہیں۔ ہم اس جانگزا غم کو کیسے برداشت کریں۔ فرزند رسولؐ ہم کو اس سفر سے بوئے خیر نہیں آتی اور انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ آپ کے بعد ہم ذلیل و خوار اور بے والی و وارث ہو جائیں گے۔ ہم خدا و رسولؐ کا واسطہ دے کر درخواست کرتے ہیں کہ اس سفر کو ملتوی کیجئے۔ حضرت زنانِ بنی ہاشم کی یہ بے قراری دیکھ دیکھ کر زار زار رونے لگے اور سب کو انتہائی شفقت کے ساتھ صبر و ضبط کی تعلیم دی اور فرمایا مجھے نہایت ملال ہے

کر اپنے اس سفر کو تمہارے کہنے سے ملتوی نہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتیں جب وہ مایوس ہوگئیں زنانِ اہلِ بیت سے گلے مل مل کر خوب روئیں اور ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگیں۔ ہر ایک پر حسرت اور مایوسی چھا رہی تھی۔

گھر میں یہ کہرام بپا تھا اب باہر کا حال سنئے۔ جناب عباس، جناب علی اکبر اور دیگر جوانان بنی ہاشم سواریوں کے اہتمام میں مصروف تھے۔ سامان اونٹوں پر بار کیا جا رہا تھا۔ ہودج باندھے جا رہے تھے۔ ان پر پردے پڑ رہے تھے جب عماریاں تیار ہوگئیں تو حضرت عباس نے خدمتِ امام میں حاضر ہو کر عرض کی کہ سواریاں تیار ہیں اگر حکم ہو تو عورتیں سوار کی جائیں۔ فرمایا اب تاخیر غیر ضروری ہے۔ یہ حکم سنتے ہی جناب عباس نے جوانان بنی ہاشم سے فرمایا۔ قناتیں ہر طرف کھڑی کرو۔ چاروں طرف راستے پر لوگ جا کھڑے ہوں تاکہ کوئی آنے والا ادھر سے نہ گزرے۔ کہ دخترانِ علیؑ و فاطمہؑ سوار ہوتی ہیں۔

آہ! مومنین ایک وقت تو ان مخدرات عصمت و طہارت کی سواری کا یہ اہتمام تھا ایک روز بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام یہی بی بیاں بے مقنعہ و چادر بندیاں ترک و دیلم کی طرح بے عماری و کجاوہ اونٹوں پر سوار بازار کوفہ و شام میں تشہیر کی جا رہی تھیں ؎

شامیاں بستند بازو زینب و کلثوم را
اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہل بیت

آہ! جب بی بیوں کے سوار ہونے کا وقت آیا تو پھر کہرام بپا ہوا ساری بیبیاں جناب زینب و اُم کلثوم جناب اُم رباب و اُم فروہ اور زوجہ جناب عباس وغیرہ سے گلے مل مل کر اس کرب سے روتی تھیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا خاص کر جب اہل حرم فاطمہ صغریٰ کو رخصت کرنے لگے اس وقت ایک ایک بی بی کا فرطِ غم سے عجیب حال ہر ایک دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جناب صغریٰ ہر بی بی سے فریاد کر رہی تھیں کہ خدا کے لئے باباجان سے میری سفارش کرو کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں۔ اس سونے گھر میں مجھ سے ایک دن نہ رہا جائے گا۔ میں کنبہ کے مفارقت کے صدمے سے بے موت مر جاؤں گی۔ ہائے یہ گھر تو مجھے ابھی سے کاٹے کھاتا ہے سب بی بیاں دلاسا دے کر باری باری رخصت ہوتی جاتی تھیں۔

آہ! بیچاری فاطمہ صغریٰ کے دل پر اس وقت کیا گزری ہوگی۔ حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتی تھیں اور رہ جاتی تھیں اپنے ننھے سے بھیا علی اصغر کو گود میں لے کر منہ چومتی اور دھاڑیں مار مار کر روتی تھیں۔ ان کی یہ بے چینی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ آہ! اس وقت کون جانتا تھا کہ یہ دائمی مفارقت ہے۔ یہ ایسے بچھڑ رہے ہیں کہ اب پھر نہ ملیں گے۔

الغرض جب سب بی بیاں رخصت ہوکر گھر سے نکلیں تو جناب فاطمہ صغرا عصا کے سہارے اور دیواروں کے سہارے کنبہ کی روانگی دیکھنے کے لئے گھر سے نکلیں جناب عباسؑ اور جناب علی اکبرؑ نے ہر ایک بی بی کا ہاتھ پکڑ کر بڑی عزت واحترام کے ساتھ ایک ایک بی بی کو سوار کرنا شروع کیا تاکید تھی۔ کہ کوئی نامحرم قریب نہ آنے پائے جب سب بی بیاں سوار ہو چکیں۔ اور قافلہ روانہ ہوا تو دیکھا کہ جناب فاطمہ صغرا افتاں وخیزاں پیچھے پیچھے چلی آتی ہیں۔ اونٹوں کو روکا گیا امام علیہ السلام نے گلے لگا کر پوچھا اب کیوں آئیں۔ بیٹی اب گھر میں جاؤ۔ رو رو کر کہنے لگیں بابا کیا کروں۔ دل نہیں مانتا۔ دل چاہتا ہے کہ ایک بار سب سے پھر رخصت ہولوں اونٹ بٹھائے گئے۔ سب بی بیاں اتریں اور از سر نو فاطمہ صغریٰ سے ملیں بعض مقاتل میں ہے کہ جناب علی اصغر کو گود میں لے کر جناب رباب سے کہنے لگیں۔

اماں جان میرے ننھے بھیا کو میرے پاس چھوڑ دیجئے۔ یہ میرا مونس تنہائی ہوگا۔ اور میرے ہجراں رسیدہ دل کو اس سے تسلی ہوگی۔ میں اس کو زنان بنی ہاشم کا دودھ پلا کر پرورش کرلوں گی جناب رباب نے فرمایا۔

بیٹی یہ چند روز کا بچہ بغیر ماں کے کیسے رہ سکتا ہے۔

الغرض فاطمہ صغریٰ کسی طرح اس بچے کو جدا نہ کرنا چاہتی تھیں۔ جب مجبور کیا گیا تو کہا اچھا یہ جبر مجھ سے نہ لیجئے اگر خوشی سے چلا جائے تو شوق سے لے جائیے۔ ہر بی بی نے کوشش کی کہ علی اصغر بہن کی گود سے جدا ہو جائیں۔ مگر وہ بچہ کسی طرح بہن کو نہ چھوڑتا تھا۔ آخر امام مظلومؑ اشک آنکھوں میں بھرے ہوئے علی اصغر کے پاس آئے اور کان میں کچھ ایسے کلمات کہے کہ حضرت علی اصغر نے فوراً بہن کی گود چھوڑ دی۔ غالباً آپ نے فرمایا ہوگا۔ بیٹا تمہارا نام تو فہرست شہداء میں ہے تم یہاں کیسے رہنا چاہتے ہو۔ مومنین فاطمہ صغریٰ کو علی اصغر کے جدا ہونے کا وہ صدمہ ہوا کہ سر پکڑ کر خاک پر بیٹھ گئیں امام مظلوم علیہ السلام نے فرمایا بیٹی! تم گھبراؤ نہیں جس وقت ذرا سکونِ قلب ہوا میں تم کو ضرور بلالوں گا۔ غرض تسلی دے کر آپ فاطمہ صغریٰ کو گھر میں لے گئے۔

آہ! جب یہ قافلہ روانہ ہوگیا۔ اور فاطمہ صغرا بھرے گھر میں اکیلی رہ گئیں تو اس مریض کے دل پر جو کچھ گزری اس کو کون سمجھ سکتا ہے۔ جو گھر کل تک کھچا کھچ بھرا ہوا تھا آج وہ سونا پڑا ہے۔ نہ کوئی بوڑھا نظر آتا ہے نہ جوان نہ بچہ۔ دو بزرگ بی بیوں کے سوا گھر میں کوئی نہیں۔ ایک جناب ام سلمہ اور دوسری جناب ام البنین یہی اس بیمارِ غم کی ڈھارس تھیں۔ آہ سارے پرستار، سارے ناز بردار گردش روزگار نے چھین لئے۔ صبح سے شام تک منہ ڈھانپے پڑی رہتیں۔ اب زندگی تھی تو صرف اس امید پر کہ ایک دن بھیا علی اکبر مجھے لینے

کے لئے آئیں گے ۔ مہینے گنے جاتے تھے ۔ دن گنے جاتے تھے ۔ آہ جب اس حسرت نصیب دکھیا کی یہ آس ٹوٹی ہوگی جب بہتر کی سنائی کان میں آئی ہوگی ۔ جب یہ سنا ہوگا کہ اس جوان بھائیؑ نے جس کی آمد کے انتظار میں دن رات گزر رہے تھے ۔ سینہ پر برچھی کھا کر جان دی ۔ علی اصغر کی دودھ بڑھائی تیر ستم سے ہوئی ۔ عباسؑ کے شانے قلم کئے گئے ۔ قاسم کی لاش پامال ہوئی ۔ دشمنوں نے سارے خاندان کو بھوکا پیاسا گوسفند قربانی کی طرح ذبح کر دیا تو بیمار ناتوان پر کیا گزری ہوگی ۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

چوتھی مجلس

امام علیہ السّلام کا مکّہ معظّمہ پہنچنا اہلِ کوفہ کے خطوط اور حضرت مُسلمؑ کی شہادت

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝٧

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝٨

سورۂ دہر ۷۶/۸

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نذر خدا سے کر لیتے ہیں اسے پورا بھی کرتے ہیں اور اس روز کے فتنہ سے ڈرتے ہیں جس کا شر بہت طولانی ہے اور خدا کی محبت میں مسکین و یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو محض قربۃً الی اللہ کھلاتے ہیں تم سے بدلہ کے خواستگار ہیں نہ شکر گزاری کے۔

ان آیات کی شانِ نزول میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک بار حسنین علیہم السلام ایسے بیمار ہوئے کہ روز بروز بیماری بڑھنے لگی۔ ایک روز جبریل امینؑ حضرت رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی آپ کے

پیارے نواسوں کے شفایاب ہونے کی تدبیر اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ علیؑ و فاطمہؑ سے کہیں کہ وہ تین روزے نذر مانیں اور جب شفایاب ہو جائیں تو اس نذر کو پورا کریں۔

بعد نمازِ عشا جب آپ پیاری بیٹی کے یہاں تشریف لائے تو جبریل امین کی گفتگو بیان فرمائی۔ اسی وقت حضرت علیؑ اور جناب سیّدہؑ نے منّت مانی کہ یا اللہ اگر ہمارے بچے اچھے ہو جائیں تو ہم تین روزے رکھیں گے۔ جب حسنین علیہ السلام نے یہ بات سنی تو انہوں نے بھی ماں باپ کی طرح نذر مانی۔ اس وقت جناب فضہ بھی موجود تھیں۔ ان کو اپنے شہزادوں سے وہی محبت تھی۔ جو ایک شفیق ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے۔ فوراً انہوں نے بھی اس نذر میں شرکت کی۔

پروردگارِ عالم نے اس نذر کی بدولت بہت جلد دونوں بچوں کو شفا عطا فرمائی۔ اب ایفائے نذر کا وقت آیا۔ پانچوں بزرگوں نے نذر کا روزہ رکھا۔ مومنین حسنین علیہ السلام کے یہ پہلے ہی روزے تھے دنیا میں دستور ہے کہ جب بچوں کے پہلے روزے ہوتے ہیں تو افطار میں بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کنبہ جمع ہوتا ہے بہت سے مومنین افطار کے لئے مدعو کئے جاتے ہیں۔ ماں باپ فطرتاً اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ ہمارے بچے کا پہلا روزہ شاندار ہو۔ لیکن حسنین علیہما السلام کا یہ پہلا روزہ اس شان کا ہوا کہ اس روز سیدہ عالم کے یہاں کھانے کو بھی نہ تھا۔ ایسی حالت میں نبی زادی کیا اہتمام کر سکتی تھیں۔ اہتمام تو بڑی چیز ہے وہاں تو افطار کے بعد بچوں کے لئے نان و نمک کا سہارا بھی نہ تھا۔ دوسری ماں ہوتی تو اس صدمے سے نہ معلوم کیا حال ہوتا۔ لیکن ان کے صبر و ضبط ان ہی کے لئے تھے۔ سوائے خوشنودیٔ خدا وہ دُنیا کی نعمت کے خواہاں نہ تھے لیکن بقائے حیات کے لئے تھوڑی سی غذا کھانا ہر انسان کے لئے ضروری ہے لہٰذا جناب سیدہؑ نے امیر المومنینؑ سے عرض کی کہ اے ابوالحسن آپ کو معلوم ہے کہ آج ہمارے گھر میں کھانے کے لئے کوئی چیز نہیں، اگر ممکن ہو تو اتنی غذا مہیا کیجئے گا کہ افطار کے بعد میرے بچے کھا سکیں گے۔ ان کے یہ پہلے روزے ہیں اور ابھی بستر بیماری سے اُٹھے ہیں۔ وہ بھوک کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ یہ سُن کر امیر المومنینؑ باہر تشریف لائے۔ اور ایک یہودی سے کچھ اون اُجرت پر کاتنے کے لئے لی۔ اور اس کی مزدوری پیشگی لے کر واپس تشریف لائے۔ اور فرمایا اے بنتِ رسولؐ یہ اون لایا ہوں اور اس کی کتائی میں یہ جَو ہیں۔

انہوں نے اس اون کے تین حصّے کئے اور جَو کے بھی۔ پہلے ایک حصّہ اون کا کاتا۔ اور اس کی اُجرت کے تہائی جَو لے کر خود ہی چکّی میں پیسے۔ اس کے بعد آٹا خمیر کر کے خود ہی پانچ روٹیاں پکائیں۔ باوجود یکہ فضّہ جیسی جاں نثار خادمہ موجود تھیں۔ لیکن بادشاہ دین و دنیا کی بیٹی نے یہ سب کام خود ہی انجام دیئے۔ اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مسلمان عورتوں کو یہ سبق سکھانا تھا۔ کہ امورِ خانہ داری کو اپنے ہاتھ سے

انجام دینے میں کبھی شرم نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ محنت و مشقت سے انسان کی صحت قائم رہتی ہے دوسرے ان امیر عورتوں کو جن کی خدمت کے لئے کنیزیں اور مامائیں موجود رہتی ہیں اپنے گھر کا سب بار ان ہی بیچاریوں پر نہ ڈالنا چاہیے۔ بلکہ خود بھی حصہ لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ بھی آدمی ہیں کام کرتے کرتے اکتا جاتی ہیں، یا کبھی کمزوری اور بیماری کی وجہ سے کام کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے تیسری نبی زادی کے اخلاق نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ جس فضہ نے میرے بچوں کی ہمدردی میں تین روزے رکھنا گوارا کیے ہیں اس سے روزہ کی حالت میں یہ کام لوں۔ اس میں شک نہیں کہ احسان شناسی اور محبت کی قدر اہل بیت رسولؐ سے زیادہ کوئی نہ کرسکا۔ انہوں نے عزیزوں سے زیادہ غلاموں اور کنیزوں سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہی وجہ تھی کہ کنیز اور غلام ان کی غلامی کو آزادی سے بہتر جانتے تھے۔

الغرض جب افطار کا وقت آیا تو پانچوں حضرات اپنی اپنی روٹی کھانے کو بیٹھے لقمہ منہ میں دینا ہی چاہتے تھے کہ ایک سائل نے آواز دی، اے اہل بیت رسولؐ میں مدینہ کے مسکینوں میں سے ایک مسکین ہوں۔ اور بھوکا ہوں۔ مجھے کھانا دو خدا اس کے بدلے میں تم کو جنت کے دستر خوان سے عطا فرمائے گا۔ یہ سننا تھا کہ امیرالمومنین علیہ السلام اپنی روٹی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ اس سائل کو دیں۔ جناب سیدہؑ نے عرض کی اے ابوالحسن ایک روٹی شاید اس سائل کے لئے کافی نہ ہو۔ میری روٹی بھی لے جائیے۔ حضرات حسنین علیہما السلام نے دیکھا کہ ماں باپ نے ایک سائل کو اپنے نفس پر ترجیح دی ہے تو ننھے ننھے ہاتھوں پر اپنی اپنی روٹی رکھ کر عرض کرنے لگے۔ بابا جان شاید یہ شخص بال بچوں والا ہو اور دو روٹیاں اس کو کفایت نہ کریں لہٰذا ہماری روٹیاں بھی حاضر ہیں۔ اس کے بعد جناب فضہ نے بھی جو محبت اہل بیت کی برکت سے معرفت الٰہی کے بہترین مدارج پر فائز تھیں اپنی روٹی حضرت امیرالمومنینؑ کے سپرد کی اور حضرت وہ پانچوں روٹیاں اس سائل کو دے کر چلے آئے اور سب نے پانی سے روزے کھولنے پر قناعت کی۔

رسول زادیؑ پر متواتر دو روز نہ کھانے سے ضعف کا غلبہ تھا مگر خوشنودی خدا حاصل کرنے کے لئے اس تکلیف کو بخوشی گوارا کر لیا۔ اور ذرا شکایت سے زبان آشنا نہ کی نہ عبادت میں فرق آیا نہ امور خانہ داری میں۔ اللہ اللہ کیسے صبر و قناعت والے لوگ تھے کہ جس حال میں رہتے شکر بجالاتے۔

بہرحال روز گزشتہ کی طرح جب افطار کرنے کے لئے بیٹھے اور منہ میں لقمہ دینے کا ارادہ کیا تو ایک سائل نے دروازہ پر یہ کہہ کر پھر آواز دی۔ کہ میں ایک یتیم ہوں مجھے کھانا دو۔ حضرات! اول تو یتیم کی آواز سن کر یوں ہی اہل ایمان کا دل تڑپ جاتا ہے اور یہ تو اہل بیت رسولؐ تھے۔ جن سے زیادہ یتیموں پر کوئی شفیق نہ تھا۔ جونہی یہ آواز سب کے کانوں میں پڑی۔ دل ماہی بے آب کی طرح سینوں میں تڑپ گئے اور بدستور

سب نے اپنی اپنی روٹیاں سائل کو نذر کردیں اور پھر پانی سے روزے کھول کر رہ گئے۔ تیسرے دن پھر اسی طرح روٹیاں تیار ہوئیں اور جب کھانا کھانے بیٹھے اور لقمہ رکھنے کا ارادہ کیا پھر ایک سائل نے ندا دی میں ایک بھوکا قیدی ہوں۔ مجھے کھانا دو۔ قیدی کی دردبھری آواز سنتے ہی دل سینوں میں پھر تڑپ گئے اور باوجود تین روز کی فاقہ کشی کے اپنی اپنی روٹیاں سائل کو دے دیں۔

حضرات دیکھا آپ نے اس گھر کی سخاوت کو۔ کیا دنیا میں ان کے علاوہ کوئی اور نظیر بھی ایسی مل سکتی ہے جو بنی نوع انسان کی ایسی ہمدرد ہو۔ جو غریبوں، یتیموں اور اسیروں پر ایسی مہربان اور شفیق ہو۔ جو دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دے۔

يُؤْثِرُونَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ (سورۂ حشر ۹/۵۹)

یہ آیت ان کی ہی شان میں ہے۔ ایسی سخاوت تو فقط آلِ رسول ہی سے مخصوص تھی۔ انہوں نے لذتِ دنیا کو ہمیشہ خدا کی خوشنودی اور بندگان خدا کی حاجت براری کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا۔ مروی ہے کہ جب تین روز اہل بیت علیہم السلام کو اسی طرح گزر گئے۔ تو خداوند عالم نے اپنے رسولؐ پر وحی کی کہ خانہ سیدہؑ میں جاؤ اور سورۂ دہر کی ان کے سامنے تلاوت کرو۔ کہ یہ تمام سورہ ان کی شان میں ہے۔ چنانچہ جب حضرتؐ اپنی بیٹی کے یہاں تشریف لائے تو دیکھا کہ ان سب کا بھوک سے برا حال تھا۔ دونوں نواسے نڈھال پڑے ہیں۔ پھول سے رخسار کملا گئے ہیں آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں اور کھڑے ہونے سے پیر لڑکھڑاتے ہیں۔ آپ نے دونوں بچوں کو گود میں لے کر پیار کیا اور جناب سیدہؑ سے فرمانے لگے۔ بیٹی! میرے بچوں کا بھوک سے یہ حال ہوگیا۔ اگر گھر میں کچھ کھانا موجود نہ تھا تو میرے گھر سے کھانا منگا کر انہیں کھلا دینا چاہیے تھا۔ عرض کی باباجان! مجھے اپنے گھر کے فقروفاقہ کا حال دوسروں سے کہتے شرم آتی ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ اے بیٹی میں تجھے بشارت دیتا ہوں کہ خدا کی بارگاہ میں تم سب کی عبادت مقبول ہوئی۔

بیٹی! تیرا مرتبہ مریم سے زیادہ ہے۔ بیٹی! یہ فضیلت تیرے اور تیرے شوہر اور بیٹوں ہی سے مخصوص ہے کہ خدا نے پورا سورۂ دہر تم لوگوں کی تعریف میں نازل کیا۔ اور چند آیتیں خاص اس واقعہ کے متعلق بیان کیں اور بشارت سن کر سب کے چہرے فرطِ مسرت سے چمک گئے اور اپنی جسمانی تکلیف بھول گئے۔

امام شافعی نے کیا خوب کہا ہے۔

اِلٰی مَا الْاَمْرُ دُ حُتّٰی مَتٰی

فَھَلْ ذُرِّیَّتْ فَاطِمَہ غَیْرُہٗ وَفِیْ غَیْرِہٖ ھَلْ اَتٰی

یعنی اس جوان علیؑ کی محبت میں کب تک لوگ مجھ پر عتاب کریں گے۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ علیؑ کے سوا فاطمہؑ جیسی بی بی کسی کی بھی ہے جس کی شان میں سورہ ہل اتیٰ نازل ہوا ہو۔

اہل بیت علیہم السلام کی یہ خصوصیت یاد رکھنی چاہیے کہ وہ جو بھی کار خیر کرتے ہیں۔ قربۃً الی اللہ کسی سے اپنی نیکی کا بدلہ چاہتے تھے نہ شکر گزاری کیونکہ ان کی ذاتی غرض اس میں شامل نہ ہوتی البتہ جو محبت الٰہی کا تقاضا ہے وہ پورا کرتے تھے۔ دنیا میں ایسے لوگ بکثرت پائے جاتے ہیں جو محض اپنی نام و نمود یا کسی غرض کی بنا پر دوسروں پر احسان کرتے ہیں اور پھر قیامت یہ کہ بار بار جتا کر کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ کیا اور وہ کیا ان کا دل دکھاتے ہیں خدا ایسے احسان کو باطل قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى

سورہ بقرہ ۲۶۴/۲

ترجمہ: ۔ اے ایمان والو اپنی خیرات کو احسان جتانے اور سائل کو ایذا دینے کی وجہ سے اکارت نہ کرو۔

اہل بیت رسالت کا ہر عمل خود غرضی سے چونکہ مبرا ہوتا ہے اس لئے بارگاہ الٰہی میں اس کا اجر بھی پورا ملتا ہے۔ فرش رسولؐ پر شب ہجرت میں امیر المومنین سوئے تو انتہائی خلوص سے۔ خدا نے اس کے صلے میں اپنی مرضی کا مالک بنا دیا اور اس سے بہترین دینی خدمت کو ان لفظوں میں سراہا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ سورہ بقر آیت ۲/۲۰۷

جب معرکہ جنگ میں جم کر لڑے تو یہ سند مل گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾ الصف ۴/۶۱

ترجمہ: ۔ خدا اُن لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پرا باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جب رکوع میں ایک انگوٹھی دے دی تو ولایت کے مالک ہو گئے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

مائدہ ۵/۵۵

ترجمہ:۔ اے ایمان دارو تمہارے مالک اور سرپرست تو بس یہی ہیں۔ خدا اور اس کا رسول اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں اور جس شخص نے خدا و رسولؐ اور انہیں ایمان داروں کو اپنا سرپرست بنایا تو خدا کے لشکر میں آگیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ خدا کا لشکر غالب رہتا ہے۔

جب اپنی ضرورتوں کو دوسروں کی ضرورتوں کو مقدم رکھا تو یوں تعریف ہوئی۔

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۵۹/۹ سورہ حشر

جب مصیبتوں میں صبر کے جوہر پیدا ہوئے تو یوں مدح سرائی کی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

(۲/۱۵۶)

ہم تمہیں کچھ خوف اور کچھ بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں (اولاد) کی کمی سے ضرور آزمائیں گے اور ایسے صبر کرنے والوں پر کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آپڑی تو بول اُٹھے ہم خدا ہی کے ہیں اور اسی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں جب دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کی اور حلم سے کام لیا تو لب قدرت سے یہ آواز آئی۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

سورہ عمران ۳/۱۳۴

ترجمہ: اور جو لوگ خوشحالی اور کٹھن وقت میں بھی خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں اور خدا نیکی کرنے والوں سے اُلفت رکھتا ہے۔

جب اسلام کی طرف سے سبقت کی تو قدرت نے یوں سراہا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۱۲﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۴﴾ (سورہ واقعہ ۵۶/۱۱)

ترجمہ:۔ اور جو آگے بڑھ جانے والے ہیں واہ کیا کہنا وہ آگے ہی بڑھنے والے تھے یہی لوگ خدا کے مقرب ہیں آرام و آسائش کے باغوں میں بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہوں گے اور آخرین میں سے

صداقت کی یوں ثنا ہوئی۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ (سورہ مریم ۱۹/۵۰)

اور ہم نے اپنی رحمت سے ایک لسان صدق قرار دی۔

راہِ خدا میں مال خرچ کیا تو یہ آیت نازل ہو گئی۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ سورہ لبقرہ ۲/۲۷۴

ترجمہ:۔ جو لوگ رات کو دن کو چھپا یا دکھا کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے اجر و ثواب اُن کے پروردگار کے پاس ہے۔ اُن پر نہ کسی قسم کا خوف ہو گا اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے۔

مباہلہ میں نکلے تو نفسِ رسولؐ کا لقب پایا۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ ۳/۶۱ عمران

ترجمہ:۔ پھر جب تمہارے پاس علم قرآن آچکا اس کے بعد بھی اگر تم سے کوئی (نصرانی) عیسیٰ کے بارے میں حجت کرے تو کہو اچھا میدان میں آؤ۔ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنی جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو اس کے بعد ہم سب مل کر خدا کی بارگاہ میں گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں۔ ۳/۶۱ عمران

چادرِ رسول کے نیچے آئے تو قدرت نے ان کی طہارت کی یوں خبر دی۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

اے پیغمبر کے اہلبیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ہر طرح کی برائی سے دور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔ ۲۲/۳۳ احزاب

مال اور نفس اتنے پاکیزہ اور بیش قیمت کہ جنت ان کا مول قرار پائی۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ

ترجمہ:۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا مومنین سے ان کی جانوں اور ان کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ ان کی قیمت ان کے لئے بہشت ہے اسی وجہ سے لوگ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں (کفار کو) قتل کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔

اوصاف علی بہ گفت گو ممکن نیست گنجائش بحر در سبو ممکن نیست
من ذات علی بواجبی کے دانم الا دانم کہ مثل او ممکن نیست

افسوس صد افسوس مسلمانوں نے ایسی مقدس ہمدرد قوم اور اسلام کی سچی خیر خواہ ہستیوں کی کچھ قدر نہ کی۔ حضرت رسول خدا کی آنکھ بند ہوتے ہی یکایک سب کے دل اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے پھر گئے۔ کون سا ظلم تھا جو ان پر نہ ہوا۔ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا حضرت رسول خدا کی رحلت کے بعد چند روز زندہ رہیں۔ مگر ان کو چین سے نہ رہنے دیا۔ اوّل تو ان کے ہلاک کرنے کو شفیق باپ کی جُدائی کا صدمہ ہی کچھ کم نہ تھا۔ پھر لوگوں کا ان دکھیا کو طرح طرح سے ستانا غضب تھا۔ وہ خود فرماتی ہیں۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا
یعنی مجھ پر وہ مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتیں تو صدمے سے راتیں بن جاتے

جناب سیدہؑ ہی پر کیا منحصر ہے اہل بیت علیہم السلام میں ہر ایک کو دشمنوں نے ایسا ستایا کسی کو چین سے زندگی بسر کرنے نہ دی امیر المومنینؑ کی سلطنت میں منافقوں نے کیا کیا رخنے نہ ڈالے آئے دن جنگ ہی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک شقی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ حضرت علی علیہ السلام کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام کا نمبر آیا۔ سلطنت کو آپ سے بہ جبر چھینا گیا۔ آپ کا وظیفہ بند کیا گیا۔ آپ کے دوستوں کو طرح طرح سے ستایا گیا۔ یہاں تک کہ زہر دے کر آپ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ کاش اس پر اکتفا کرتے۔ آہ! آہ!! اس شہید مسموم اور امام مظلوم کے جنازے پر تیر برسائے گئے۔ روضۂ رسول میں دفن نہ ہونے دیا۔

امام حسن علیہ السلام کے بعد پنجتن پاک میں ایک دم حسین علیہ السلام کا باقی تھا۔ دشمنوں کی آنکھوں میں وہ بھی خار کی طرح کھٹکا۔ اور ان کو گوارا نہ ہوا کہ وہ مدینہ رسول میں اپنی زندگی بسر کریں۔ یزید بدکار نے تخت نشین ہوتے ہی آپ سے بیعت طلب کی۔ درصورت انکار درپئے قتل ہوا۔ جب حضرت کو اس شقی کا ارادہ معلوم ہوا تو مدینہ میں اپنا قیام مناسب نہ سمجھ کر مکہ کی جانب سفر کیا کہ وہ حرم خدا ہے اس میں پناہ ملے گی۔ لیکن آہ۔ اس نبی زادہ کو وہاں بھی امان نہ ملی۔

منقول ہے کہ جب امام علیہ السلام مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے۔ اہل کوفہ کے بہت سے خطوط حضرت کی طلب میں آئے مفصّل حال یہ ہے کہ جب معاویہ کے مرنے اور یزید کے تخت نشین ہونے کی خبر اہل کوفہ کو پہنچی تو وہ نہایت مضطرب ہوئے۔ بالخصوص اس خبر سے کہ یزید حسینؑ سے طالب بیعت ہے۔ اور آنحضرت

ترکِ وطن فرما کر مکہ معظمہ تشریف لے آئے تھے۔

ایک دن وہ لوگ سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر میں جمع ہوئے اور خلافتِ یزید کے متعلق ذکر ہونے لگا۔ جناب سلیمان نے فرمایا تم کو معلوم ہو کہ یزید بدکار امام ابرار سے طالبِ بیعت ہوا ہے اور وہ جناب مدینہ سے مکہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ فرزندِ رسولؐ ہرگز یزید جیسے فاسق و فاجر انسان کی بیعت نہ کریں گے۔ اس صورت میں یزید آنجناب کے قتل کا خواہاں ہوگا۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہے کہ امام علیہ السلام کی نصرت کریں۔ اگر تم صدقِ دل سے آمادہ ہو تو آنحضرت کو اپنے ارادہ سے آگاہ کریں۔ اور اگر تمہارے ارادوں میں ضعف ہے تو اس وقت صاف صاف ظاہر کردو تاکہ حضرت ہماری طرف سے دھوکا نہ کھائیں۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ ہم ضرور حضرت کی نصرت کریں گے اور ان کے دشمنوں کو بغیر قتل کیے نہ رہیں گے جنابِ سلیمان نے ان کی ہمت پر مرحبا کہا اور اس مضمون کا ایک خط حضرت امام حسین علیہ السلام کو لکھا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ خط امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں اعیان کوفہ سلیمان بن صرد مسیب بن نجیہ رفاعہ بن شداد اور حبیب ابن مظاہر اور دیگر شیعیان کوفہ کی طرف سے روانہ کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے آپ کے دشمن کو ہلاک کیا۔ اس نے اُمتِ مصطفےٰ پر بڑا ظلم کیا تھا۔ بے شمار مسلمانوں کے حقوق غصب کئے تھے۔ احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی تھی۔ بہت سے بے گناہوں کو قتل کیا تھا۔ مالِ خدا میں تصرف کو جائز رکھا تھا۔ اب اس کا بیٹا یزید جو ایک فاسق و فاجر انسان ہے اس کا جانشین بنا ہے۔ ہم اس کی بیعت ہرگز نہیں کرسکتے۔ ہم تو اپنا ہادی و امام آپ ہی کو جانتے ہیں۔ پس آپ یہاں تشریف لائیے۔ ہم سب آپ کی بیعت کریں گے۔ ہم چونکہ بے امام کے ہیں۔ لہٰذا آپ پر ہماری ہدایت فرض ہے۔ اگر آپ تشریف نہ لائے تو ہم روزِ جزا رسولِ خداؐ سے آپ کی شکایت کریں گے۔

یہ خط عبداللہ بن مسمع ہمدانی اور عبداللہ بن وال کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ دونوں مکہ معظمہ پہنچے اور دسویں ماہِ رمضان کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں خط حاضر کیا اس کے بعد اہلِ کوفہ نے پے درپے ایک سو پچاس خطوط اشرافِ کوفہ کے حضرت کی خدمت میں اور روانہ کئے ان میں سے کچھ شیعیانِ علیؑ کے تھے اور کچھ شیعیانِ عثمان کے جو ایک سیاسی انقلاب کے پیشِ نظر بھیجے گئے تھے۔

حضرت ان خطوط کا جواب دینے میں تامّل فرمارہے تھے۔ کہ ایک روز چھ سو خط اشراف کوفہ کے حضرت کی خدمت میں پہنچے۔ جن میں حضرت کی تشریف آوری پر بہت زور دیا گیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوا کہ بارہ ہزار خط حضرت کے پاس جمع ہوگئے تھے۔ آخر حضرت نے ان کے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں فی الحال تمہاری ہدایت کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ بن عقیل کو روانہ کرتا ہوں۔ یہ میرے اہل بیت میں سے ہیں اور مجھ کو ان پر بڑا اعتماد ہے جب یہ مجھے وہاں کے حالات سے مطمئن کردیں گے تو میں بھی یہاں سے روانہ ہوکر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔

اس خط کو لکھنے کے بعد جناب مسلم کو اپنے پاس بلایا اور فرمایا اے بھائی اہلِ کوفہ جو محتاج ہدایت ہیں تم ان کے پاس جاؤ اور ہدایت کرو اگر وہ لوگ بالاتفاق تمہاری بیعت کرلیں اور ہر طرح تمہاری نصرت و یاری پر آمادہ ہوں اور ان کے اقوال و افعال سے محبّت و خلوص کا پتہ چلتا ہو تو اطلاع دینا میں سب کو لے کر آجاؤں گا۔ اس کے بعد جناب مسلم اور ان کے دو کم سن بچّوں کو جن سے وہ بہت مانوس تھے اس طرح رخصت کیا۔ جیسے کسی سے دوبارہ ملنے کی آس نہ ہو۔ حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور بار بار حضرت مسلم کو سینے سے لگا کر اظہار محبّت کرتے تھے۔

منقول ہے کہ جناب مسلم مکّہ سے روانہ ہوکر پہلے مدینہ منوّرہ آئے اور مسجد رسولؐ میں نماز ادا کی۔ پھر اپنے عزیزوں سے رخصت ہوکر کوفہ کی طرف روانہ ہوئے دو راہبر آپ نے اُجرت پر اپنے ہمراہ لیے وہ غیر راہ سے آپ کو لئے جارہے تھے کہ اتفاقاً راستہ بھول گئے۔ پانی اس راہ میں نایاب تھا۔ ان لوگوں پر پیاس اس قدر غالب ہوئی کہ آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ جناب مسلمؑ نے ان کو وہیں چھوڑا اور حکم امام کی بجا آوری میں کوفہ کی طرف بڑھ گئے۔

جب آپ وہاں پہنچے تو اہل کوفہ کے گروہ وہاں آپ کی خدمت میں آنے شروع ہوگئے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا خط ان کے سامنے پڑھا۔ سب کے دل محبّت سے بھر آئے اور ہر طرح نصرت امام پر اپنی آمادگی ظاہر کی۔ ایک روایت کے مطابق پہلے ہی روز آٹھ ہزار آدمیوں نے آپ سے بیعت کی اس کے بعد ہر روز یہ سلسلہ جاری رہا تاآنکہ چار روز کے اندر اٹھارہ ہزار آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہوگئے۔

جناب مسلم نے ظاہری حالت سے مطمئن ہوکر امام حسین علیہ السلام کو خط لکھا یہاں کے حالات نہایت اطمینان بخش ہیں آپ فوراً تشریف لے آئیں۔ آہ! مومنین حضرت مسلم کو کیا خبر تھی کہ اہل کوفہ چند ہی روز بعد ان سے پھر جائیں گے اور غدّاری اور بے وفائی پر کمر باندھ کر آلِ رسولؐ پر وہ ظلم کریں گے۔ کہ سننے

والوں کے دل دہل جائیں گے۔

جب یزید لعین کو یہ معلوم ہوا کہ مسلم بن عقیل کوفہ آگئے۔ اور لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں نعمان شقی نے حاکم کوفہ کو معزول کر کے ابن زیاد بد نہاد کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس شقی کو اہل بیت رسول سے سخت عداوت تھی۔ وہ بہت جلد منزلیں مارتا رات کے وقت داخل کوفہ ہوا۔ لوگ سمجھے کہ امام حسینؑ تشریف لا رہے ہیں جوق در جوق لوگ استقبال کے لئے نکل پڑے اور خوش ہو کر نعرے مارنے شروع کئے۔ یا ابن رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ آپ ہمارے ہادی دین ہیں۔ ہم چالیس ہزار آدمی آپ کی نصرت کے لئے تیار ہیں لیکن جب آگے بڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ ابن زیاد ہے تو رنج و غم سے عجیب حال ہوا۔ سب اسی وقت پراگندہ ہونا شروع ہو گئے۔

صبح کو ابن زیاد نے شہر میں منادی کرا دی کہ سب لوگ مسجد جامع میں اکٹھے ہوں مجھے ایک ضروری حکم سُنانا ہے۔ جب لوگ جمع ہوئے تو اس نے منبر پر آ کر کہا ایہا الناس امیر المومنین یزید نے مجھے تم پر حاکم بنا کر بھیجا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ جو کوئی میرا حکم نہ مانے اسے میں قتل کر دوں۔ اور جو فرماں بردار ہو اسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دوں۔ یاد رکھو جو کوئی ہمارے دشمن کو اپنے گھر میں پناہ دے گا سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ منبر سے اُتر آیا۔

جب حضرت مسلم کو ابن زیاد کے کوفہ آنے اور یہ حکم سنانے کا حال معلوم ہوا تو آپ مختار کے گھر سے نکل کر ہانی بن عروہ کے گھر تشریف لے گئے۔ لوگ خفیہ طور سے آ کر آپ سے بیعت کرتے تھے۔ اب حضرت مسلم نے ارادہ کیا کہ اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر ابن زیاد سے جنگ کریں۔ لیکن جناب ہانی مانع ہوئے اور کہا اس معاملے میں جلدی نہ کیجئے۔

اسی زمانہ میں شریک بن اعور ہمدانی بھی بصرہ سے ابن زیاد کے ساتھ آئے تھے اور بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے دوست ہانی کے گھر مقیم تھے۔ انہوں نے حضرت مسلم سے کہا کہ ابن زیاد میری عیادت کو ضرور یہاں آئے گا۔

میں اس کو باتوں میں لگا لوں گا جب میں کہوں میرے لئے پانی لاؤ تو آپ فوراً باہر نکل کر اسے قتل کر دیجئے چنانچہ جب ابن زیاد آیا تو دیر تک شریک سے باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے قرارداد کے مطابق پانی مانگا، لیکن جناب مسلم باہر نہ نکلے شریک نے یہ سمجھتے ہوئے کہ وقت نکلا جا رہا ہے۔ ایک شعر پڑھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "موت کا پیالہ پلانے میں جلدی کرنی چاہیے۔ ابن زیاد اس شعر سے متوحش ہوا اور فوراً اُٹھ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد جناب مسلم باہر آئے تو شریک نے کہا کیا وجہ ہوئی کہ آپ اس شقی کے قتل کرنے سے باز

رہے۔ فرمایا دو وجہوں سے میں نے یہ ارادہ نہ کیا اوّل مجھے ناگوار ہوا کہ دھوکے سے قتل کروں اور بنی ہاشم کی شجاعت پر دھبہ لگے۔ دوسرے میں نے یہ سمجھا کہ میری وجہ سے میرا میزبان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا ہانی نے کہا یہ بڑا اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ یقین ہے اب اس بدبخت پر قابو حاصل نہ ہو سکے گا۔

لکھا ہے کہ جب ابن زیاد کو پتہ چلا کہ مسلم بن عقیل ہانی بن عروہ کے یہاں پوشیدہ ہیں تو اس نے جناب ہانی کو بلا کر کہا مسلم کو میرے سامنے حاضر کرو ورنہ میں تمہیں قتل کرا دوں گا۔ یہ سن کر جناب ہانی کو غصہ آگیا۔ فرمایا میں نے مسلم کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے وہ میرے مہمان ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے مہمان کو قتل ہونے کے لئے تیرے حوالے کر دوں تو مجھے قتل سے کیا ڈراتا ہے میرا قتل کرنا آسان نہیں۔ میری قوم تیرے ٹکڑے اڑا دے گی۔ یہ سن کر وہ شقی غصے سے تھر تھر کانپنے لگا اور اپنی چھڑی کو بار بار اسی زور سے ان کے چہرے پر مارا کہ پیشانی اور رخسار سے خون کی دھاریں پھوٹ نکلیں اور تمام کپڑے لہولہان ہو گئے ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔ آخر اس ملعون نے اس مومن پاک کو قتل کرا دیا۔

جب جناب ہانی کی شہادت کی خبر جناب مسلم نے سنی تو بہت دل شکستہ اور غمگین ہوئے اور اسی روز آپ نے ابن زیاد سے مقابلہ کا قصد کیا کئی ہزار آدمی آپ سے نصرت کا وعدہ کر چکے تھے آپ نے ان سب کو کہلا بھیجا کہ آج ہم بعد نماز عشا خروج کریں گے۔ لیکن ابن زیاد کا خوف اہل کوفہ پر ایسا غالب آیا کہ اس رات کو بہت کم لوگ نماز پڑھنے کے لئے آئے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو پیچھے پھر کر دیکھا تو پچیس تیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ اس غداری اور بے وفائی پر آپ بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے۔ اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا اگرچہ اہل کوفہ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے لیکن میرا جو ارادہ ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ چنانچہ نماز عشا کے بعد جب آپ چلے تو بقیہ لوگ بھی کترا کر ادھر اُدھر نکل گئے۔ جب آپ نے مڑ کر دیکھا تو دس آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ چند قدم بعد وہ بھی غائب ہو گئے۔ اب کوئی اتنا بھی نہ تھا کہ وہ آپ کو راستہ بتائے۔

آہ! اب حضرت مسلم بے چارے سرگرداں و پریشان کوفہ کے گلی کوچوں میں پھرتے تھے اور کہیں جائے پناہ نظر نہ آتی تھی۔ بار بار کف افسوس مل کر کہتے تھے کہ میں نے کیا غضب کیا کہ فرزند رسولؐ کو یہاں آنے کے لئے لکھا۔ خدا کرے کہ حضرت ادھر تشریف نہ لائیں۔ الغرض اسی پریشانی میں چلے جا رہے تھے کہ ایک عورت طوعہ نامی اپنے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ آپ نے فرمایا اے کنیز خدا میرا شدت تشنگی سے برا حال ہے کیا یہ ممکن ہے کہ تھوڑا سا پانی مجھے پلا دے۔ یہ سن کر وہ اندر گئی اور پانی لے کر آئی۔ جناب مسلم پانی پی کر دہیں دروازہ پر بیٹھ گئے۔ اس عورت نے کہا اے بندۂ خدا میں نے تیری خواہش کو پورا کر دیا اب تو کس لئے دروازہ

پر بیٹھا ہے۔ زمانہ پُر آشوب ہے اپنے گھر کیوں نہیں جاتا۔

یہ سُن کر جناب مسلم کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس کے دروازے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت دردناک لہجے میں فرمایا۔ اے کنیزِ خدا میں آوارہ وطن پردیسی ہوں۔ نہ یہاں میرا گھر ہے نہ عزیز و اقارب۔ جاؤں تو کہاں جاؤں اور کس سے اپنا دردِ دل کہوں۔ اس نے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ فرمایا اے ضعیفہ! میں مسلم بن عقیل ایلچی امام حسین علیہ السلام ہوں۔ اہلِ کوفہ نے مجھ سے فریب کیا اور پردیس میں میرا سب ساتھ چھوڑ گئے۔ جب اس نے یہ سُنا تو آپ کے قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی۔ آپ میرے سید و سردار ہیں۔ آپ کی میں ادنیٰ کنیز ہوں۔ میرا گھر آپ ہی کا گھر ہے آپ شوق سے تشریف لایئے۔ جو خدمت ممکن ہے انجام دوں گی۔

الغرض طوعہ آپ کو اپنے گھر میں لے گئی اور کھانا لا کر آپ کے آگے رکھا۔ آپ نے فرمایا فرطِ رنج و غم سے میری بھوک جاتی رہی ہے اس وقت کچھ نہ کھاؤں گا۔ صبح کو دیکھا جائے گا۔ طوعہ نے کہا اچھا میں فرش بچھائے دیتی ہوں۔ آرام فرمایئے۔ حضرت مسلم لیٹ تو رہے لیکن تمام رات نیند نہ آئی۔ صبح کو جب طوعہ وضو کے لئے پانی لے کر آئی تو اس نے عرض کی اے میرے سیّد اور مولا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ تمام رات بے چین رہے۔ فرمایا ذرا دیر کو میری آنکھ لگ گئی تھی کہ میں نے اپنے چچا امیر المومنین علی علیہ السلام کو یہ فرماتے سُنا کہ اے مسلم جلد حاضر ہو۔ پس میرا گمان ہے کہ آج کا دن میری عمر کا آخری دن ہے۔

منقول ہے کہ کسی نے ابن زیاد ملعون کو یہ خبر پہنچا دی کہ مسلم بن عقیل طوعہ کے گھر میں پوشیدہ ہیں اس شقی نے محمد بن اشعث کو بلا کر حکم دیا کہ پانچ سو سوار لے کر جا اور مسلم بن عقیل کو گرفتار کر لے اور اگر گرفتاری ممکن نہ ہو تو قتل کر ڈال۔ ابن اشعث فوراً روانہ ہوا۔ جب یہ لوگ طوعہ کے گھر کے قریب پہنچے اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز طوعہ کے کانوں میں آئی تو اس نے جناب مسلم کو خبر دی آپ نے فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ پھر آپ نے اپنی زرہ پہنی اور ہتھیار بدن پر سجا کر مقابلے کے لئے آمادہ ہوئے طوعہ سے فرمایا مجھے ڈر ہے کہیں یہ لوگ تیرے گھر میں نہ گھس آئیں اور میں جنگ کرنے کا موقعہ نہ پاسکوں اس نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کو قتل کریں گے تو میں خود ان سے اس حد تک جنگ کروں گی کہ قتل ہو جاؤں۔

الغرض حضرت مسلم باہر نکلے اور لڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں ایک سو پچاس آدمیوں کو واصلِ جہنم کیا۔ جب محمد بن اشعث نے جناب مسلم کی شجاعت کا یہ حال دیکھا تو ایک سوار کو دوڑا کر ابن زیاد سے اور کمک طلب کی۔ اس نے پچاس سوار اور بھیجے جناب مسلم نے ان سے بھی مقابلہ کیا اور بہت سوں کو مار گرایا۔ لیکن کئی گھنٹے کی متواتر جنگ میں بے شمار تیر حضرت مسلم کے جسم مبارک میں پیوست ہو گئے تھے اور جا بجا

سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے۔ اس حالت میں ایک شقی القلب نے ایسا نیزہ آپ کے منہ پر مارا کہ اُوپر کا ہونٹ کٹ گیا اور آپ کے کئی دانت بھی ٹوٹ کر گر پڑے۔ اسی حال میں کچھ لوگ کوٹھوں پر چڑھ گئے اور پھر ہر طرف سے اس غریب الوطن اور بے یار و مددگار سید پر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ حضرت مسلم اسی حال میں برابر حملے کیے جاتے تھے۔ آخر جب بہت زیادہ زخمی ہو گئے اور کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی تو دشمنوں نے اس شیر بیشۂ شجاعت کو چاروں طرف سے گھیر کر گرفتار کر لیا۔

حضرت مسلم نے فرمایا اے ظالمو! مجھے تھوڑا سا پانی دو کہ میں بہت پیاسا ہوں۔ ایک شقی کو ان کی مظلومی پر رحم آیا اور آپ کو ایک کوزہ آب بھر کر دیا۔ آپ نے پینا چاہا، تو منہ کا خون پانی میں مل گیا۔ حضرت نے وہ پانی پھینک دیا اور فرمایا۔ ہماری قسمت میں پیاسا ہی مرنا لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تو ایک شقی نے از روئے طنز کہا کہ اے مسلم! بہادر اس طرح نہیں رویا کرتے۔ فرمایا او بدبخت! میں جان کے خوف سے نہیں روتا بلکہ اپنے آقا حسین علیہ السلام کے تصور سے روتا ہوں کہ آپ کے ساتھ بچے اور عورتیں بھی ہیں۔ اگر میرے خط پر ادھر چلے آئے تو یہ کوفی ان سے بھی دغا کریں گے۔

اس کے بعد آپ نے محمد بن اشعث سے فرمایا اے شخص میں چاہتا ہوں کہ اس وقت آخر میں میرے ساتھ ایک نیکی کر، اور وہ یہ ہے کہ ایک قاصد امام حسین علیہ السلام کی طرف روانہ کر دے۔ وہ جا کر حضرت امام حسین علیہ السلام سے کہہ دے کہ مسلم بن عقیل دشمن کے ہاتھ میں قید ہو گئے۔ شاید آج شام تک قتل ہو جائیں لہٰذا ادھر آنے کا قصد نہ فرمائیے۔ اہلِ کوفہ سے اُمید وفا نہیں۔ مومنین! مکار ابن اشعث نے اس وقت تو وعدہ کر لیا لیکن وفا نہ کیا اور امام حسین علیہ السلام کو اطلاع نہ پہنچی۔

الغرض جب حضرت مسلم گرفتار ہو کر ابنِ زیاد کے سامنے آئے تو آپ نے اس شقی کو سلام نہ کیا۔ لوگوں نے کہا کہ اے مسلم! امیر کو سلام کرو۔" آپ نے فرمایا۔

" میرا امیر حسین بن علی علیہ السلام کے سوا کوئی نہیں۔ ابن زیاد کو وہ سلام کرے گا جو موت سے ڈرتا ہو۔" ابن زیاد یہ سُن کر غضبناک ہوا اور کہنے لگا۔ " میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔"

آپ نے فرمایا! جانتا ہوں تو ایسا ضرور کرے گا لیکن اتنی مہلت دے کہ میں کسی شخص کو وصیت کروں۔" یہ سُن کر وہ چپ رہا۔ تب آپ نے اس کے درباریوں پر ایک نظر ڈالی۔ عمر سعد بیٹھا ہوا نظر آیا۔ فرمایا اے پسر سعد تیرے اور ہمارے درمیان قرابت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھ سے چند وصیتیں کروں بشرطیکہ تو بجا لانے کا وعدہ کرے۔" اس ملعون نے اول تو اقرار نہ کیا لیکن جب ابن زیاد نے اجازت دی تو سننے پر راضی ہوا۔ حضرت مسلم نے فرمایا کہ۔

۱۔ پہلی وصیت یہ ہے کہ میرے اوپر سات درہم قرض ہے میری زرہ بیچ کر اسے ادا کر دینا۔
۲۔ دوسرے میرے پاس کچھ لوگوں کی امانتیں ہیں وہ واپس کر دینا۔
۳۔ تیسرے فرزندِ رسول حضرت امام حسین علیہ السلام کو لکھ کر بھیجنا کہ ادھر آنے کا قصد نہ فرمائیں۔ ورنہ جو مصیبت مجھ پر گزری ہے وہ ان پر بھی آئے گی۔

عمر سعد نے کہا "پہلی دو باتیں تو مجھے منظور ہیں۔ لیکن حسین بن علی علیہ السلام کو تمہارا پیغام نہ پہنچاؤں گا۔ میں چاہوں گا کہ وہ یہاں آئیں اور قتل کر دیئے جائیں۔"

یہ سُن کر جناب مسلم نے فرمایا "او شقی خدا کی تجھ پر لعنت ہو۔ فرزندِ رسولؐ کے متعلق تو کیسی بدزبانی کر رہا ہے۔"

اس کے بعد ابن زیاد ملعون نے حکم دیا کہ مسلم کو کوٹھے پر لے جا کر قتل کر دو۔ اور ان کی لاش کو اُوپر سے نیچے پھینک دو۔ یہ حکم سنتے ہی ابن زیاد کے غلام دوڑے اور جناب مسلم کو پکڑ کر کشاں کشاں لے گئے۔ جب انہوں نے قتل کے لئے تلواریں بلند کیں تو آپ نے فرمایا اے بدبختو! مجھے اتنی مہلت دو کہ میں دو رکعت نماز ادا کر لوں۔ انہوں نے کہا ہم نہیں جانتے کہ نماز کیا ہے۔ آخر کار انہوں نے اس شیر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر قتل کر دیا اور لاش کو کوٹھے پر سے نیچے پھینک دیا۔

آہ! مومنین ظالم ابن زیاد نے اسی پر بس نہ کی۔ بلکہ حکم دیا کہ مسلم اور ہانی دونوں کی لاشوں کے پیروں میں رسی باندھ کر گلی کوچوں میں گھسیٹا جائے تاکہ لوگ خوف زدہ ہوں۔ اور پھر یزید کی مخالفت کا ارادہ نہ کریں۔ ہائے ایسی بے کسی کی موت کبھی کسی کی نہ ہوگی۔ گھر سے دور، وطن سے دور۔ نہ مونس نہ غم خوار نہ یار نہ مددگار نہ غسل نہ کفن ظالم دونوں لاشوں کو ہر طرف سے گھسیٹتے پھرتے تھے۔ جب یہ خبر قبیلہ مذحج کو پہنچی تو وہ مسلح ہو کر چڑھ آئے۔ اور بہ جبر لاشوں کو چھین کر لے گئے اور غسل و کفن دے کر دفن کر دیا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابن زیاد نے حکم دیا کہ حضرت مسلم کا سر کاٹ کر شہر پناہ کے دروازے پر لٹکایا جائے۔ چنانچہ آپ کا سر مبارک اس وقت تک وہاں لٹکا رہا۔ جب تک اہل حرم قید ہو کر وہاں پہنچے لکھا ہے کہ جب اہل حرم کا لٹا ہوا قافلہ باب الساعات پر پہنچا اور سیدانیوں نے سر جناب مسلم کو دیکھا تو صدائے وامسلماہ وامسلماہ بلند ہوئی۔ خصوصاً رقیہ دختر جناب مسلم کا بڑا غیر حال ہو گیا۔ رو رو کر کہتی تھی۔ ہائے بابا تمہارا سر کس ظالم نے تن سے جدا کیا۔ میری کم سنی پر رحم نہ آیا۔ کاش! میں مر جاتی۔ میں اندھی ہو جاتی کہ آپ کو اس حالت میں نہ دیکھتی۔ میرے بابا میرے پاس آ کر ہماری داستانِ غم تو سُن لیجئے۔ بابا ہمارا گھر تباہ ہو گیا ہے بوڑھے جوان اور بچے سب مارے گئے۔ ہمارے خیموں میں آگ لگائی گئی۔ ہمیں قید کیا گیا۔ آہ! بابا مجھے پتہ نہیں

کہ تمہیں خبر ملی یا نہیں۔ بابا ظالم میرے اونٹ کو تمہارے سر کے قریب نہیں آنے دیتے ورنہ میں تمہارے سر پریدہ کو چھاتی سے لگاتی۔ اور اپنے تڑپتے دل کو تسکین دیتی۔ یتیم مسلم کی یہ باتیں سن کر سب بی بیوں کے دل سینے میں ہل گئے۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔ بیمارِ کربلا علیہ السلام نے بہت چاہا کہ اہل حرم کے اونٹ سر جناب مسلم کے قریب ہو جائیں مگر وہ ظالم نہ مانتے۔ آخر وہ نیزۂ طویل جس پر سر اقدس امام مظلومؑ تھا قریب سر جناب مسلم کے پہنچ کر خولی کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور یا چشم پُرآب بھائیؑ نے بھائیؑ کو دیکھا لبوں کو جنبش ہوئی۔ اس شور و غل میں کون سن سکتا تھا کہ کیا گفتگو ہوئی۔ قیاس کہتا ہے۔

جب جناب مسلمؑ نے اپنی پُر درد کہانی اپنے یتیم بچوں کی تنہائی، بے کسی، کوچہ گردی اور روح فرسا شہادت کی غم بھری داستان سنائی ہوگی۔ پھر سر حسینؑ نے فرمایا ہوگا۔ بھائی مسلم صبر کرو۔ اللہ جزا دینے والا ہے میرے مظلوم برادر کربلا میں ہم پر وہ ظلم ہوئے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آہ رسول کا گھر تباہ ہو گیا۔ بھیا مسلم میرا کڑیل جوان علی اکبر تین دن کا بھوکا پیاسا سینہ پر برچھی کھا کر خاک پر ایڑیاں رگڑ کر میری آنکھوں کے سامنے راہی جنت ہوا۔ میرا شیر سا بھائی حیدر کرار کی یادگار میری فوج کا علمدار میرے بچوں کا سقہ عباسؑ دونوں شانے کٹا کر خون میں نہا کر مجھ سے جدا ہوا۔ بھائی حسنؑ کی یادگار قاسم پامال سُم اسپاں ہوا۔ زینبؑ کے دونوں نونہال پیاس سے تڑپتے جنت کو سدھارے۔ بھائی مسلم انتہا یہ ہے کہ میرا شیر خوار بچہ علی اصغر بھی تیر ظلم کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

کہ تمہیں خبر ملی یا نہیں۔ بابا ظالم میرے اونٹ کو تمہارے سر کے قریب نہیں آنے دیتے ورنہ میں تمہارے سر بریدہ کو چھاتی سے لگاتی۔ اور اپنے تڑپتے دل کو تسکین دیتی۔ یتیم مسلم کی یہ باتیں سن کر سب بی بیوں کے دل سینے میں ہل گئے۔ اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔ بیمار کربلا علیہ السلام نے بہت چاہا کہ اہل حرم کے اونٹ سر جناب مسلم کے قریب ہو جائیں مگر وہ ظالم نہ مانتے۔ آخر وہ نیزۂ طویل جس پر سر اقدس امام مظلوم تھا قریب سر جناب مسلم کے پہنچ کر خولی کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا اور یا چشم پرآب بھائی نے بھائی کو دیکھا لبوں کو جنبش ہوئی۔ اس شور و غل میں کون سن سکتا تھا کہ کیا گفتگو ہوئی۔ قیاس کہتا ہے۔

جب جناب مسلم نے اپنی پُر درد کہانی اپنے یتیم بچوں کی تنہائی، بے کسی، کوچہ گردی اور روح فرسا شہادت کی غم بھری داستان سنائی ہوگی۔ پھر سر حسینؑ نے فرمایا ہوگا۔ بھائی مسلم صبر کرو۔ اللہ جزا دینے والا ہے میرے مظلوم برادر کربلا میں ہم پر وہ ظلم ہوئے کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آہ رسول کا گھر تباہ ہوگیا۔ بھیا مسلم میرا کڑیل جوان علی اکبر تین دن کا بھوکا پیاسا سینہ پر برچھی کھا کر خاک پر ایڑیاں رگڑ کر میری آنکھوں کے سامنے راہی جنت ہوا۔ میرا شیر سا بھائی حیدر کرار کی یادگار میری فوج کا علمدار میرے بچوں کا سقہ عباسؑ دونوں شانے کٹا کر خون میں نہا کر مجھ سے جدا ہوا۔ بھائی حسنؑ کی یادگار قاسم پامال سم اسپاں ہوا۔ زینبؑ کے دونوں نونہال پیاس سے تڑپتے جنت کو سدھارے۔ بھائی مسلم انتہا یہ ہے کہ میرا شیر خوار بچہ علی اصغر بھی تیر ظلم کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

پانچویں مجلس

خانہ کعبہ کی فضیلت

امیر المومنینؑ کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا اور بیت اللہ کی خصوصیات امام حسینؑ کا مکہ سے سفرِ عراق

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

(سورہ آل عمران ۳/۹۶)

ترجمہ:۔ سب سے پہلا گھر جو مکہ میں لوگوں کے لئے بنایا گیا وہ مبارک اور تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔

حضرات خانہ کعبہ وہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیمؑ جیسے برگزیدہ نبی نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ جناب اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے تھے اور جناب خلیل علیہ السلام عمارت بناتے تھے۔ اس کی برکت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ قیامت تک کے لئے عبادت گزاروں کا قبلہ بن گیا۔

اس خانہ کعبہ کو بیت اللہ اور اللہ کا گھر بھی کہتے ہیں۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ اللہ کی ذات جسم و جسمانیات اور مکان و مکانیات سے منزہ اور مبرا ہے۔ اس کو مکان کی کیا ضرورت؟ گھر تو بندوں کے لئے درکار ہے نہ کہ خالق کائنات کے لئے۔ وہ کسی ایک مکان میں محدود ہو کر رہنے والا نہیں بلکہ اپنی قدرتِ کاملہ سے ہر جگہ موجود ہے۔ اس نے اپنا یہ گھر کس لئے بنوایا؟

بات یہ ہے کہ قوم کی زندگی عمل سے ہے اور عمل کی رونق اور جان اجتماع سے ہے اور اجتماع کے لئے ایک مرکز کی ضرورت ہے جہاں متفرق قوتوں کو یکجا کیا جا سکے۔ یہ مرکز متفرق افراد میں انس و محبت کا باعث بھی ہوتا ہے اور ان کی ڈھارس اور تسلی کا سبب بھی کسی فوج میں دلیری سے جنگ و پیکار کی قوت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک لشکر کا جھنڈا کھڑا رہتا ہے۔ یہی جھنڈا فوج کی متفرق قوتوں کو جمع ہونے کا مرکز اور عملی جد و جہد کی جان بنا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قائم رکھنے میں پوری قوت سے کام لیا جاتا ہے اور اس کی تعظیم کرنا ہر سپاہی کا فرض ہوتا ہے۔ اور اسی اہمیت پر نظر رکھتے ہوئے اس کا محافظ یا علم بردار فوج کے اس بہادر سردار کو بنایا جاتا ہے جس کی قوت عمل اور شجاعت و وفاداری پر سب سے زیادہ بھروسہ ہوتا ہے پس خانہ کعبہ در حقیقت مسلمانوں کی زندگی کا ایک بہترین مرکز ہے اور چونکہ ہر عمل سے عبدیت کا اظہار ہوتا ہے۔ لہذا وہ بیت اللہ کے نام سے موسوم ہوا اور چونکہ قیامت تک مسلمانوں کو اس کے ذریعے سے خیر و برکت کی ترغیب دینی مقصود تھی۔ لہذا اس کو خدا نے ایسے ہی لوگوں سے بنوایا جس کی عملی زندگی سب سے بہتر اور عبدیت ہر طرح قابل وثوق تھی۔

مذکورہ بالا آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے اپنے خلیل سے یہ گھر کچھ خاص لوگوں کے لئے بنوایا تھا تاکہ ان کا حسن عمل قیامت تک دوسروں کے لئے باعث سکون ہو چونکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل نے اس مبارک گھر کو تعمیر کیا تھا لہذا اس کا مالک بطور میراث ان ہی کی اولاد کو ہونا چاہیے۔ خدا کی ذات منصف و عادل ہے وہ کسی کو اس کے حق سے محروم نہیں کرتا۔ جناب امیر علیہ السلام کا خانہ کعبہ میں پیدا ہونا اس کی دلیل ہے کہ خدا نے اس بیت کا ان کو اہل سمجھا۔ جب ہی اہل بیت یعنی بیت اللہ کے مالک کہلائے۔ جناب مفتی سید محمد عباس صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے کیا خوب فرمایا ہے ۔

مطلب از انشائے کعبہ بہر میلاد تو بود   ورنہ شخص لامکاں را خانہ کے باشد روا

حضرات خانہ کعبہ میں پیدا ہونا معمولی فضیلت نہیں یہ رتبہ انبیاء کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ کتب تواریخ میں ہے کہ جب مریم علیہ السلام کو درد زہ عارض ہوا تو انہوں نے چاہا کہ ان کا بچہ بیت المقدس کے اندر پیدا ہو۔ لیکن ہاتف غیبی کی ندا کان میں آئی۔ اے مریم یہاں سے باہر جاؤ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶)

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۚ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا

بَشَرًا سَوِيًّا (۱۷)   ترجمہ :۔ اے رسول قرآن میں مریم کا بھی تذکرہ کرو جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر پورب کی طرف والے مکان
۱۷-۱۶/۱۹ مریم   میں جا بیٹھی پھر اس نے ان لوگوں کے سامنے سے پردہ کر لیا تو ہم نے اپنی روح جبرئیل کو بھیجا مریم وہ اچھے خاصے آدمی کی صورت بن کر اہوا

چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پورب کی طرف ایک جگہ چلی گئیں اور جناب عیسیٰ ایک درخت کے نیچے پیدا ہوئے لیکن تھوڑا سا حال حضرت علیؑ کی ولادت کا بھی سُن لیجئے اور فخر سے کہیئے۔

خوشا ما خوشا دین و دنیاے ما   کہ ہم چو علی ہست مولاے ما

منقول ہے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد کو دردِ زہ عارض ہوا۔ تو وہ اس ارادہ سے کعبہ کی طرف گئیں کہ دیوار خانہ کعبہ کو اپنے بدن مبارک سے مس کریں تا کہ ولادت میں سہولت ہو جس وقت قریب دیوار کعبہ کے پہنچیں تو بقدرتِ خدا دیوار خانہ کعبہ شق ہو گئی اور ایک ہاتف کی ندا آئی۔ ادخلی فی البیت بیت اللہ کے اندر داخل ہو جاؤ۔ یہ بشارت سنتے ہی آپ اندر داخل ہو گئیں اور دیوار بدستور ویسے ہی ہو گئی چنانچہ ۱۳ ماہ رجب کو جناب امیر المومنین علیہ السلام خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ آج بھی اس دیوار میں شگاف موجود ہے۔

علی ہچو درہست و کعبہ صدف
کسے را میسّر نہ شد ایں شرف

اہل بیت نبوت سے عداوت رکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ اتفاقی بات تھی کہ جناب فاطمہ کعبہ کے اندر ایسے وقت چلی گئیں جبکہ دروازہ عارض تھا۔ اس میں فضیلت کی کیا بات ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اتفاقی بات تو جب سمجھی جاتی کہ بیت اللہ کا دروازہ کھلا ہوتا اور یہ داخل ہو جاتیں۔ لیکن جب دروازہ بند تھا اور وہ دیوار شق سے گئیں تو یہ امر اتفاقی کیسے ہو گیا۔ اگر آپ اس کو نہیں مانتے تو یہ بتائیے کہ جب سے آج تک ایسا اتفاق پھر کبھی کیوں نہ ہوا۔ بہت سے مسلمان سلاطین ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے حضرت کے فضائل مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور ویسی ہی فضیلتیں دوسروں میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کیا ان سے یہ ممکن نہ تھا

لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ اور یہ فضیلت حضرت علیؑ ہی سے

مخصوص رہی۔ سچ ہے ۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

منقول ہے کہ جب حضرت علی کعبہ میں پیدا ہوئے تو اس وقت جتنے بُت کعبہ کے اندر طاقوں میں رکھے ہوئے تھے سب کے سب اوندھے منہ زمین پر گر پڑے گویا گھر کے مالک کو دیکھتے ہی ناجائز قبضہ کرنے والوں

کے بدن میں تھرتھری پڑ گئی۔ مستند کتابوں میں ہے کہ ولادت کے بعد جناب امیر علیہ السلام نے نہ تو اپنی ماں کا دودھ پیا اور نہ آنکھیں کھولیں جناب فاطمہ بنتِ اسدؑ اس حالت میں حد درجہ متردد ہوئیں۔ دوسرے یا تیسرے روز جب حضرت رسولِ خدا کو ولادت کی خبر پہنچی تو آپ بکمال شوق بیت اللہ میں تشریف لائے اور اپنی چچی سے فرمایا۔ لاؤ میرے بھائی اور میرے قوّتِ بازو کو میری گود میں دو۔ یہ میرا شریکِ کار ہے حضرت کی آواز سنتے ہی مولود کعبہ نے ہمکنار ہونا شروع کیا ؎

ادھر آغوش کی حسرت اُدھر دیدار کا ارماں
علیؑ نے کھول دیں آنکھیں نبیؐ نے ہاتھ پھیلائے

حضرت کی آغوش میں آتے ہی حضرت علی نے آنکھیں کھول دیں اور دنیا میں سب سے پہلے جمال جہاں آرائے رسالت پر نظر پڑی۔ شاید اسی وجہ سے آپ نے اب تک آنکھ نہ کھولی تھی کہ آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ پہلی نظر ان بتوں پر پڑے جو خانۂ کعبہ میں رکھے ہوئے تھے امامت اپنی پہلی نظر چہرۂ رسالت پر ڈالنا چاہتی تھی جب جناب فاطمہ بنتِ اسد نے اپنے بیٹے کی آنکھیں کھلی دیکھیں تو مسرّت سے باغ باغ ہوگئیں۔ جناب رسولِ خداؐ سے فرمانے لگیں۔ اے فرزند! اس بچے نے ابھی تک میرا دودھ نہیں پیا۔ حضور نے فرمایا اے چچی آپ متردد نہ ہوں اس بچہ کی غذا میرے پاس ہے یہ فرما کر آپ نے اپنی زبانِ مبارک حضرت کے منہ میں دے دی۔ آپ نے بڑی رغبت سے چوسنا شروع کیا۔ حضرات یہ لعاب... زبان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمولی لعاب دہن نہ تھا بلکہ علم کا وہ سوتا تھا جو سینہ رسول سے اُبل کر زبان رسول کے ذریعے سے علیؑ کے دل میں پہنچ رہا تھا جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے برسرِ مجمع اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کرتے تھے۔ ھذا مسقط العلم ھذا لعاب رسول اللہ ھذا ما زقنی رسول اللہ (یہ میرا سینہ علم کا خزینہ ہے۔ یہ لعابِ رسولؐ کا اثر ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے مجھے علم اس طرح بھرایا ہے جیسے طائر اپنے بچہ کو بھراتا ہے۔

اس ولادت کے بعد کس کو اس امر میں شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کے سوا کوئی دوسرا اس گھر کا مالک و وارث ہے۔ یہی اہل بیت اور اہل حرم ہیں ان ہی کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے اس گھر کو بنایا تھا غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس علی کا مولود قیامت تک کے لئے اہلِ عالم کا قبلہ قرار پایا اس کا مقابلہ فضیلت میں کون کر سکتا ہے۔

کئی فضیلتیں حضرت علی علیہ السلام کو خدا نے ایسی عطا فرمائی تھیں کہ کسی دوسرے کو اس میں حصہ ملا ہی نہ تھا۔ اوّل خانہ کعبہ میں پیدا ہونا۔ دوسرے جناب سیدہ جیسی بی بی کا شوہر ہونا۔ تیسرے نفسِ رسولؐ ہونا لوگ جو تو خانۂ خدا خانہ کعبہ کی کلید برداری اور حرم میں حاجیوں کو پانی پلا کر ان پر احسانات کیا کرتے تھے

پھر بھلا اس فخر کا کیا ٹھکانا ہے جو حضرت علی علیہ السلام کو مولود کعبہ بننے کی بنا پر حاصل ہوا تھا۔ خداوند عالم نے قرآن میں اس کا یوں ذکر فرمایا ہے۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ (توبہ) یعنی کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس کی فضیلت کی برابر قرار دے لیا۔ جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لایا ہو اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سب برابر نہیں۔ یہ آخری صفتیں جس شان سے حضرت علی علیہ السلام میں پائی جاتی ہیں کسی اور کو کہاں میسر۔ ایمان وہ کہ جنگ خندق میں حضرت رسول خدا نے کل ایمان فرمایا بَرَزَ الْاِيْمَانُ كُلُّهٗ اِلَى الْكُفْرِ كُلِّهٖ آج کل ایمان کل کفر کے مقابل جا رہا ہے۔

کعبہ کی خاص صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی وہ تمام عالموں کے لئے ہدایت ہے۔ ظاہر ہے کہ کعبہ معمولی اینٹ پتھر کا بنا ہوا ایک مکان ہے۔ اور کسی مکان میں بذات ہدایت کی قابلیت نہیں ہوتی۔ اگر بہ حیثیت مکان خانہ کعبہ ہادی بن سکتا ہے تو اس کے اندر بُت داخل نہ ہو سکتے۔ یا جو شخص اس کے اندر داخل ہو جاتا اعلیٰ درجہ کا نیک انسان بن جاتا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ کئی کئی حج کرنے کے بعد بھی بُری باتوں سے نہیں بچتے۔ مثل مشہور ہے۔

"پاجی بطواف کعبہ حاجی نمی شود"

حقیقت یہ ہے کہ کسی مکان کے فضایل صاحب مکان کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جیسا گھر کا مالک و مکین ہوتا ہے ویسی ہی اس کی شہرت ہوتی ہے۔ اس گھر کے اہل بیت چونکہ سب کے سب معصوم تھے اور قیامت تک دنیا میں ان کا سلسلہ باقی رہنے والا تھا اس لئے اس گھر کی صفت هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ بیان کی گئی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس گھر کے مالک اور وارث وہ لوگ ہیں جو تمام عالموں کو ہدایت کرنے والے ہیں۔ چونکہ حضرت علی علیہ السلام کا آنول نال کعبہ کے اندر گڑا ہے۔ لہذا وہی اس کے مالک ہیں اور ان کے بعد ان کی اولاد میں گیارہ امام اس گھر کے مالک ہیں۔ ان ہی سے ہر زمانے کے لوگ ہدایت پاتے ہیں اور قیامت تک ہدایت پاتے رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا آخری مالک یعنی حضرت حجت اسی خانہ کعبہ سے خروج کریں گے۔ اور اسی جگہ اپنے ساتھیوں کو بلائیں گے۔

حضرات کعبہ کی ایک یہ صفت بھی خدا نے بیان فرمائی ہے

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (۹۶) فِيْهِ اٰيٰتٌ

بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ
اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۹۷)
آل عمران ۹۷/۳

ترجمہ: جو اس گھر میں داخل ہوا امن میں آگیا اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خدا کے کعبہ کا حج کریں جن کی استطاعت ہو۔

یعنی جو اس میں داخل ہوگیا امان میں ہے۔ چونکہ خانہ کعبہ کی نسبت خدا کی طرف ہے۔ یعنی وہ خدا کا گھر کہلاتا ہے۔ لہذا قدرت نے اس کا یہ احترام ملحوظ رکھا ہے کہ اس میں داخل ہوجانے والا جب تک اس میں رہے گا کوئی نہ اس کو گرفتار کرسکتا ہے نہ قتل۔ اس مقدس سرزمین کا احترام اس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کوئی وہاں کے پرندوں کو شکار نہیں کرسکتا۔ وہاں کے درخت کی شاخ نہیں کاٹ سکتا۔ وہاں کی گھاس تک نہیں روند سکتا۔ اللہ اللہ جو انسان و حیوان سب کے لئے جائے پناہ ہو اور مقام امن و امان ہو۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس گھر میں غریب الوطن نبی زادہ کو پناہ نہ مل سکے۔

کتب تواریخ میں منقول ہے کہ ماہ شعبان ۶۰ ہجری سے ماہ ذی الحجہ تک امام علیہ السلام مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ جب یزید کو یہ حال معلوم ہوا کہ حسین علیہ السلام مکہ میں ہیں تو اس نے چالیس آدمی حاجیوں کے لباس میں بھیجے کہ ایام حج میں عین کعبہ کے اندر حضرت کو شہید کردیں۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو اس خیال سے کہ حرمت خانۂ کعبہ برباد نہ ہو اور آپ کا خون حرم کعبہ میں نہ بہایا جائے۔ آپ نے احرام حج کو عمرہ سے بدل کر آٹھویں یا نویں ذی الحجہ کو وہاں سے عراق کی طرف روانگی کا قصد فرمایا۔ آہ! مومنین! یہ وہی تاریخ تھی جس میں حضرت مسلم کوفہ میں شہید ہوئے تھے۔

آہ! ہمارے مظلوم امام کو کیا خبر تھی کہ دنیائے اسلام ان پر ظلم کرنے کے لئے اس حد تک کمربستہ ہوگئی ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ان کو پناہ دینا نہیں چاہتی۔ آہ! حضرت کو کیا معلوم تھا کہ ان کا پیارا بھائی ان کا معتمد سفیر پردیس میں اشقیائے امت کے انتہائی ظلم و ستم اٹھا کر راہی جنت ہوا۔

بروایت لہوف اور ابو محمد واقدی زرارہ سے منقول ہے کہ مکہ معظمہ کی روانگی سے تین دن پہلے میں خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوا اور عرض کی یا ابن رسول اللہ سنتا ہوں کہ آپ عراق کی طرف جانے کا قصد رکھتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ حضور اس طرف جانے کا قصد نہ فرمائیں۔ کوفہ کے لوگ شکستہ عہد اور بے وفا ہیں۔ ان کے دل تو آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں دشمن کے حکم پر چلتی ہیں۔ فرمایا اے زرارہ! تم اس بات کو نہیں جانتے جس کو میں جانتا ہوں۔ مجھے خبر مل چکی ہے کہ اگر میں سوراخ مور میں بھی پناہ لوں گا تو بھی ظالم بنی امیہ مجھے وہاں بھی نہ چھوڑیں گے۔ مجھے علم ہے کہ میرے عزیز دن اور

ناصروں میں سے سوائے میرے فرزند علی بن الحسین کے زندہ نہ رہے گا۔ میں حضرت امام حسینؑ سے یہ سُن کر خاموش ہو رہا۔ لیکن میرا دل حضرت کی مصیبت کے تصوّر سے بُری طرح کڑھ رہا تھا۔

صاحب منتخب لکھتے ہیں کہ جب جناب محمد بن حنفیہ کو یہ معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام عازمِ عراق ہیں تو آپ حاضرِ خدمت ہو کر عرض کرنے لگے۔ اے بھائی سُنتا ہوں کہ کل آپ کا ارادہ مکہ سے عراق تشریف لے جانے کا ہے۔ اے بھائی آپ اہلِ کوفہ کے غدار ہونے سے بخوبی واقف ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارے پدر بزرگوار اور برادر عالی مقدار سے جو بدسلوکی کی ہے اس سے مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی کہیں وہی عمل نہ کریں۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں آپ حرم خدا میں پناہ گزیں رہیں۔ امید ہے کہ یہاں آپ کو دشمنوں کے شر سے نجات ملے گی۔ حضرت نے فرمایا مجھے خوف ہے کہ کہیں یزید حرم خدا میں مجھے قتل نہ کرا دے میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے حرمتِ خانہ کعبہ برباد ہو۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ خوف ہے تو یمن کی طرف تشریف لے جائیے وہاں بکثرت آپ کے شیعہ ہیں۔ یزید ہرگز وہاں آپ کے ستانے پر قادر نہ ہو گا۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو آپ پہاڑوں اور جنگل کی طرف نکل جائیں کہ بہ نسبت کوفہ کے، ان مقامات پر امن و امان کی زیادہ توقع ہے۔

حضرت نے فرمایا اے بھائی میں اپنے انجام سے باخبر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ بنی اُمیّہ کی تلواروں سے مجھے کہیں امان نہ ملے گی۔ لیکن چونکہ تم از راہِ شفقت اور محبّت کہہ رہے ہو۔ لہٰذا میں تمہارا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بروایت ابن طاؤس جب صبح کو حضرت کا سامانِ سفر اونٹوں پر بار ہونے لگا تو محمد بن حنفیہ پھر حاضرِ خدمت ہوئے اور بڑی بے تابی سے عرض کرنے لگے۔ آپ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں کچھ توقف کر کے یہاں کے حالات کا جائزہ لیجئے۔ حضرت نے فرمایا اے بھائی! رات میں نے خواب میں نانا کو یہ کہتے سُنا حسین جلد مکہ سے نکل مرضی الہیٰ یہی ہے کہ تجھ کو اپنی راہ میں مقتول دیکھے۔ انہوں نے کہا اچھا اگر آپ جانا ہی چاہتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائیے۔ موسم بہت خطرناک ہے۔ اس سخت گرمی میں پہاڑوں اور ریگستانوں کا سفر کرنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ راستہ میں کوسوں پانی ملتا نہیں پھر ہر قدم پر دشمنوں کا خطرہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ مع اہل و عیال کسی خطرہ میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ نانا نے خواب میں ارشاد فرمایا ہے کہ خدا ان عورتوں کو بھی اپنی راہ میں اسیر دیکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے میرے اہل بیت مجھ سے مانوس اس قدر ہیں کہ کسی طرح میرا تنہا جانا اور مجھ سے دور رہنا گوارہ نہ کریں گے۔ محمد بن حنفیہ مایوس ہو گئے تو کُنبے کی جدائی کے صدمے سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور یکجا حسرت و یاس ایک ایک سے رخصت ہونے لگے۔

ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ بھی حاضرِ خدمت ہو کر عرض کرنے لگے۔ یابن رسول اللہؐ اگر آپ آمادۂ سفر ہیں تو عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائیے۔ حضرت نے فرمایا اے ابن عباس یہ سب امانت حضرت رسولؐ خدا ہیں ہیں۔ انکو تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ دوسرے یہ لوگ مجھ سے اس درجہ مانوس ہیں کہ کسی طرح مجھ سے جُدا ہونا گوارا نہ کریں گے۔ جب ابن عباس سے گفتگو ہو رہی تھی پس پردہ ایک بی بی کے رونے کی آواز آئی اور انہوں نے فرمایا۔ واہ ابن عباس! تم فرزند رسولؐ کو خوب مشورہ دے رہے ہو کہ وہ ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں۔ خدا کی قسم اے ابنِ عباس! ہماری زندگی اور موت حسینؑ کے دم کے ساتھ ہے سوائے اس سہارے کے دُنیا میں ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ ہم کو مرنا گوارا ہے مگر فرزندِ رسولؐ کا ساتھ چھوڑنا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں۔ مومنین آپ سمجھے کہ یہ کس بی بی کی آواز تھی؟ یہ امام حسین علیہ السلام کی دُکھیا بہن جناب زینبؑ تھیں۔

الغرض امام علیہ السلام ۸ ذی الحجہ کو مع اپنے اہل حرم کے عراق کی طرف روانہ ہوئے۔ جب منزل ذات عرق میں نزول اجلال فرمایا تو جناب عبداللہ شوہر جناب زینبؑ مع اپنے دونوں فرزندوں عون و محمد کے وہاں پہنچے۔ دیر تک تنہائی میں حضرت ان سے باتیں کرتے رہے۔ آپ نے جناب عبداللہ سے فرمایا۔ میں تمہارا مدینہ میں رہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ کیونکہ وہاں اہل حرم رسول جناب اُم سلمہؓ اور اور حرم امیرالمومنین علیہ السلام جناب ام البنین اور دیگر مخدرات ہمارے خاندان کی ہیں۔ آپ چونکہ مدینہ میں ذی اثر ہیں لہذا میں آپ کو وہیں رہنے کا حکم دیتا ہوں۔ جب جناب عبداللہ کو واپس ہونا پڑا تو اپنے دونوں فرزندوں کو خدمت امام علیہ السلام میں پیش کر کے فرمایا۔ اے فرزند خبردار تم اپنے ماموں سے ایک منٹ کے لئے جُدا نہ ہونا اور راہِ خدا میں ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنا۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اب میری جگہ فرزند رسول کو سمجھنا۔ یہ کہہ کر جناب عبداللہ تشریف لے گئے۔

بروایت لہوف جب حضرت منزل ثعلبیہ پر پہنچے تو نماز ظہر کے بعد آپ تھوڑی دیر کے لئے سو گئے ناگاہ خواب میں کسی کو کہتے سُنا۔ یہ روانگی میں جلدی کر رہے ہیں اور موت ان کو جنت میں لے جانا چاہ رہی ہے۔ جب حضرت خواب سے بیدار ہوئے تو آپ کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ہویدا تھے۔ ناگاہ جناب علی اکبر خیمہ میں داخل ہوئے اور آپ کی پریشانی خاطر کا سبب پوچھا۔ آپ نے اپنا خواب بیان کیا۔ شہزادے علی اکبر نے عرض کیا بابا جان کیا ہم حق پر نہیں؟ فرمایا ہم ضرور حق پر ہیں۔ تب علی اکبر نے شجاعانہ انداز میں کہا پھر ہم کو موت کی ذرا پرواہ نہیں۔ حضرتؑ نے یہ سُن کر اپنے جوان فرزند کو سینے سے لگایا اور فرمایا اے فرزند خدا تجھ کو جزائے خیر دے۔

اسی کتاب میں ہے کہ دوسرے روز جب حضرت نماز صبح سے فارغ ہوئے تو ابو ہرّہ ازدی کوفہ کی طرف سے آتا ہوا نظر آیا اس نے حضرتؑ کی خدمت میں حاضر ہوکر پہلے تو مودبانہ سلام کیا اور پھر عرض کرنے لگا کہ اے فرزند رسول اس کا کیا سبب ہے کہ آپ اس زمانہ میں حرم خدا کو چھوڑ کر عازم سفر ہوئے ہیں آپ نے فرمایا اے ابو ہرّہ سُن بنی اُمیہ نے ہم سے سلطنت چھینی۔ ہم نے صبر کیا۔ ہمارا مال چھینا ہم نے ضبط کیا لیکن جب دین جان اور آبرو کے خواستگار ہوئے تو مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ ابو ہرّہ کہتا ہے کہ حضرت کی یہ دردناک داستان سُن کر میرے آنسو نکل پڑے۔

بروایت ارشاد جب حضرت منزل حاجر پہ پہنچے تو آپ نے قیس بن سہر سیداوی کو ایک اور روایت کے مطابق عبداللہ بن یقطر کو ایک خط دے کر کوفہ کی طرف روانہ کیا۔ کیونکہ آپ حضرت مسلم کی طرف سے بہت متردد تھے۔ قیس اس خط کو لے کر قادسنہ تک پہنچے تھے کہ حُصینؔ ابن نمیر جو ابن زیاد کی طرف سے امام حسینؑ کی راہ روکنے کے لئے قادسیہ پر پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ جناب قیس کو گرفتار کر لیا اور حضرت کے خط کا تجسّس کرنے لگا۔ قیس نے اس کا ارادہ معلوم کرکے خط کو فوراً چاک کر ڈالا اس پر ابن نمیر کو بڑا غصہ آیا اور اس مومن پاک اعتقاد کو قید کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ ابن زیاد نے ڈانٹ کر کہا تو نے خط کو کیوں چاک کیا۔ انہوں نے کہا اس لئے کہ تو میرے امام کے حالات سے واقف نہ ہو۔ ابن زیاد نے ڈانٹ کر کہا میں تجھے اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک تو ان لوگوں کے نام نہ بتائے گا۔ جن کے نام خط بھیجا گیا تھا۔ قیس نے بتایا میں تجھے کسی ایک کا نام بھی نہ بتاؤں گا۔ یہ سُن کر اس شقی نے حکم دیا کہ قیس کو مسلم بن عقیل کی طرح کوٹھے پر سے گرا کر ہلاک کر دو۔ جب امام علیہ السلام کو قیس کی شہادت کی خبر معلوم ہوئی تو آپ بہت روئے اور ان کی مغفرت کے لئے دُعا کی۔

منقول ہے کہ جب ابن زیاد کو معلوم ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کوفہ کی طرف آ رہے ہیں تو اس شقی نے تمام راستوں پر ناکہ بندی کر دی۔ اور جا بجا پہرے بٹھا کر آنے والوں کا راستہ روک دیا حضرت کو اس بندوبست کی خبر نہ تھی۔ آپ برابر منزلیں طے کرتے چلے آ رہے تھے۔ جناب زہیر بن قین اور ان کے چند ساتھی بھی مکہ سے ہمسفر تھے لیکن کسی منزل پر حضرت کے خیموں کے پاس اپنے خیمے نصب نہ کرتے تھے بلکہ دُور دُور رہتے تھے۔ ایک دن صبح کو وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ امام علیہ السلام کا بھیجا ہوا ایک شخص زہیر بن قین کے پاس آیا اور سلام کر کے کہنے لگا مجھے فرزند رسول الثقلین حضرت امام حسین علیہ السلام نے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی ہر شخص نے اپنا اپنا نوالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور ایسے خاموش ہو بیٹھے کہ گویا کوئی پرندہ ان کے سروں پر بیٹھا ہے۔

بروایت ابن طاؤس زہیر کی بی بی جو پس پردہ بیٹھی تھی جھڑک کر کہنے لگی مرحبا اے زہیر تمہاری حمیت پر کہ فرزند رسولؐ تمہیں طلب فرمائیں اور تم ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو۔ اے زہیر! اگر تمہیں وہاں جانے میں تامل ہے تو اجازت دو کہ میں اپنے امام کی خدمت میں حاضر ہو کر تمہارے بلانے کا سبب معلوم کر لوں۔ یہ سن کر فوراً زہیر اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت نے کچھ دیر ان سے گفتگو کی۔ اب جو زہیر وہاں سے پلٹے۔ تو ان کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں تھے۔ فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ خیمے یہاں سے اکھاڑ کر امام علیہ السلام کے خیموں کے پاس لگائے جائیں۔

اس کے بعد جناب زہیر نے اپنی بی بی سے فرمایا کہ میں نے آج سے اپنے آپ کو امام علیہ السلام کے سپرد کر دیا ہے۔ اب میں اپنی جان حضرت پر فدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔ بہتر یہ ہے کہ طلاق لے کر تم اپنے قبیلے میں چلی جاؤ۔ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ میرے بعد میرے ناموس کی ہتک ہو۔ یہ سننا تھا کہ وہ مومنہ رو رو کر کہنے لگی۔ اے زہیر! مرحبا! تم نے کیا خوب میرے آرام کی صورت نکالی۔ اے زہیر مقام تامل ہے کہ تمہیں اپنی بی بی کی آبرو کا تو اتنا خیال ہے دریں زادیوں کا خیال نہیں عم نہ کرو شوق سے فرزند رسول پر اپنی جان فدا کرو۔ میں دختران علیؑ و فاطمہؑ کی خدمت کروں گی میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا شرف ہو سکتا ہے کہ کنیزوں کی طرح ان کی خدمت میں ہر وقت لگی رہوں۔ اے زہیر مجھ سے یہ ہرگز نہ ہو سکے گا کہ طلاق لے کر یہاں سے چلی جاؤں۔

آہ! آہ! ہمارے امام پر کیسا وقت آ گیا تھا کہ غیر عورتیں ہمدردی کا اظہار کر رہی تھیں، الغرض اس کے بعد جناب زہیر نے اپنے ساتھیوں کو تو رخصت کیا اور خود وہاں سے برابر امام علیہ السلام کے ساتھ رہے تا اینکہ کربلا میں شہید ہوئے۔

کتاب ارشاد میں ہے کہ جب حضرت مقام زرّود میں پہنچے تو ایک شخص کو کوفہ کی طرف سے آتا دیکھا حضرتؑ نے کہا کہ اس سے کوفہ کا حال معلوم کرنا چاہیے۔ چنانچہ کچھ لوگ گئے اور اس کو لے کر حضرتؑ کی خدمت میں آئے۔ آپ نے اس سے پوچھا اے بھائیؑ! تجھے کچھ حال کوفہ کا بھی معلوم ہے اس نے کہا میں وہاں کا کیا حال بیان کروں۔ مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ دونوں شہید کر دیئے گئے۔ اور ان دونوں کے پاؤں میں رسی باندھ کر کوفہ کے بازاروں میں کھینچا گیا اور تمام اہل کوفہ آپ کے خلاف ہیں بہتر یہ ہے کہ آپ یہاں سے پلٹ جائیں۔ اور ہرگز کوفہ کا قصد نہ فرمائیں۔

آہ! آہ!! جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے یہ دل انگیز خبر سنی تو دل تڑپ گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے فرمایا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ نے اولاد عقیل کی طرف دیکھ کر

فرمایا مسلم تو قتل ہوگئے۔ اب تمہاری کیا رائے ہے انہوں نے کہا خدا کی قسم جب تک ہم مسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں ہرگز نہ پلٹیں گے۔ خواہ ہم سب ہی قتل کیوں نہ ہو جائیں۔ حضرت نے فرمایا بے شک مسلم کے بعد اب زندگی کا لطف نہیں آہ! مسلم کی شہادت نے میرے کلیجہ کے ٹکڑے کر دیئے۔ دنیا اس وقت میری آنکھوں کے سامنے اندھیر ہے۔

سید ابن طاؤس اور صاحب ریاض المصائب لکھتے ہیں کہ جب حضرت مسلم کی خبر شہادت امام حسینؑ کو پہنچی تو بحال پریشان خیمے میں تشریف لائے اور دختر جناب مسلم کو جو بہت ہی کمسن تھی اپنے پاس بلا کر پیار کرنے لگے۔ بار بار اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے تھے۔ وہ بچی بھی کبھی عرض کرنے لگی۔ چچا جان آپ اس وقت میرے اوپر اس طرح شفقت فرماتے ہیں جیسے یتیم بچوں پر کی جاتی ہے۔ یہ تو فرمائیے میرے بابا تو خیر سے ہیں یہ سنتے ہی حضرت کو تاب ضبط نہ رہی بے اختیار رو رو کر فرمانے لگے۔ بیٹی! ابھی کوفہ سے خبر آئی ہے کہ تیرا باپ شہید کر دیا گیا۔ آہ! مسلم کی موت نے حسینؑ کو زندہ درگور کر دیا۔

لکھا ہے جب بی بیوں نے حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سنی تو کہرام برپا ہوگیا۔ ہر طرف سے وامسلماہ وامسلماہ کی آواز آرہی تھی۔ خاص کر جناب مسلم کی زوجہ اور اُن کی اولاد کا غم سے برا حال تھا اول تو یوں ہی کسی عزیز کا مرنا دل کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اور پھر یہ غریب الوطنی کی موت آہ کیا حال ہوا ہوگا۔ اہل حرم نے جب یہ سنا ہوگا کہ عالم غربت میں انتہائی بے کسی کے ساتھ جناب مسلم کو شہید کیا گیا اور اس کے بعد ان کی لاش کو گلی کوچوں میں کھینچا گیا۔ اپنے کسی عزیز کی آنکھ ہی سے جو صدمہ انسان کے دل پہ ہوتا ہے۔ اس کو کون نہیں جانتا۔ اس خبر سے جو حال ان بی بیوں کا ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔

آہ! جناب مسلم کی شہادت تباہی و بربادی کا پیش خیمہ تھی۔

حضرات! زوجہ مسلم کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ ایک تو عزیز شوہر کے جدا ہونے کا صدمہ دوسرے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال۔ اول تو یہ معظمہ یوں ہی ان کی جدائی کے صدمے سے رویا کرتی تھیں اب جو یہ خبر سنی ہوگی کہ باپ بھی پردیس میں ان سے جدا ہو گئے تو صدمے سے کلیجہ پھٹ گیا ہوگا یہ خیال دل کو بے چین بنا رہا ہوگا۔ کہ میرے کمسن بچوں پہ باپ کی شہادت کے بعد کیا گزری ہوگی۔ کس سے فریاد کی ہوگی۔ کہاں پناہ لی ہوگی۔ اول تو کمسنی اور پھر بیٹی کی بلا سارا شہر دشمن، کہاں گئے ہوں گے۔ اور کیا کیا ہوگا۔ ان تصورات سے دل ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہوگا۔ دل بے چین ہوگا کہ کسی طرح کوفہ پہنچ کر اپنے پریشان حال بچوں کو چھاتی سے لگالوں۔ آہ! اس دکھیا کو کیا خبر تھی کہ کوفہ میں ان

کے دونوں بچے بھی قتل کر دیئے گئے۔ اور ان کے سر کاٹ کر دربار ابن زیاد میں لائے گئے۔

آہ! اس کوفہ میں آلِ رسولؐ پر کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ جناب مسلمؑ اور ان کے دونوں بچے شہید کئے گئے جناب زینبؑ اور ام کلثومؑ اور دیگر مخدرات ننگے سر بازاروں میں تشہیر ہوئیں۔ ابن زیاد کے بھرے دربار میں مقید کر کے لائی گئیں زندان میں رکھی گئیں۔ غرض وہ مصائب اُٹھائے کہ خدا دشمن پر نہ ڈالے۔

اے اللہ اولادِ رسول اور اس بلا میں گرفتار

جناب مسلمؑ کی شہادت کی خبر سُن کر حسینی قافلہ پر انتہائی مایوسی چھا گئی اور ہر ایک کو اپنی موت قریب نظر آنے لگی۔ بالخصوص مخدرات عصمت وطہارت پر بے حد مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ جناب زینبؑ بار بار امام مظلوم سے آبدیدہ ہو کر فرماتی تھیں۔ بھیا اہلِ کوفہ نے ہمارے ساتھ بڑی غداری کی۔ کیا کوفہ میں ہمارا کوئی مخلص دوست نہیں۔

حضرت فرماتے تھے۔ نہیں بہن مایوس نہ ہو مجھے یقین ہے کہ ہمارے مخلص دوست اگر مارے نہیں گئے تو ضرور ہماری مدد کو آئیں گے۔ بہن ہم کو کیا معلوم کہ وہ کس بلا میں گرفتار ہیں۔ اگر وہ مجبور نہ ہو گئے ہوتے تو ضرور مسلمؑ کی مدد کو آتے۔ بہن پریشان نہ ہو۔ اللہ مددگار ہے اسی پر ہمارا بھروسہ ہے۔

اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیۡنَ ۝ ۱۸/۱۱ وَسَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ۝ ۲۲۷/۲۶

چھٹی مجلس

مہمان نوازی کے فضائل امام علیہ السلام کی حُر سے ملاقات اور کربلا میں ورود

قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم

اَکْرِمُوا الضَّیْفَ وَلَوْ کَانَ کَافِراً

(یعنی اپنے مہمان کا اکرام کرو، اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعتِ اسلام میں مہمان کا خاص مرتبہ ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کے یہاں اگر کوئی بندۂ خدا مہمان ہو اور اپنا رزق اس کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھائے لکھا ہے کہ عرب اتنے بڑے مہمان نواز تھے کہ جب ان کے یہاں کوئی مہمان آجاتا تھا تو سارے گھر میں عید ہو جاتی تھی۔ اس گھر کے تمام مرد و زن بچے اور بوڑھے سب اس کی خدمت کرنا اپنی سعادت جانتے تھے۔ وہ راتوں کو پہاڑوں کے اوپر اس لئے آگ روشن کر دیتے تھے کہ بھولا بھٹکا مسافر ہماری آبادی کا رخ کرے ہمارے یہاں مہمان ہو جائے جو شخص ان کے یہاں مہمان ہو جاتا تھا وہ اس کی جان و مال کے ذمہ دار ہوتے تھے کہ اپنی جان دے دیتے تھے مگر مہمان پر آنچ نہ آنے دیتے تھے۔

منقول ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام اس درجہ مہمان نواز تھے کہ جب تک کوئی مہمان نہ آتا تھا آپ کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کر روز سرِ راہ جا کر کھڑے ہوتے اور ادھر سے گزرنے والے لوگوں سے مہمان ہونے کی درخواست کرتے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ دو دن تک کوئی شخص آپ کا مہمان نہ ہوا اور آپ برابر اس کے انتظار میں بھوکے رہے۔ تیسرے دن آپ حسبِ معمول پھر تلاش مہمان میں نکلے اتفاقاً ایک شخص ادھر سے گزرا۔ آپ نے نہایت لجاجت کے ساتھ فرمایا۔ اے شخص میرا دل چاہتا ہے کہ آج تجھ کو مہمان بناؤں کیا یہ ممکن ہے کہ تو میری اس آرزو کو پوری کر دے اور میری سوکھی روٹی پر قناعت کرے۔

وہ شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کا حال سُن چکا ہوا تھا۔ اس بات کے سننے ہی خوش ہو گیا اور آپ کے ساتھ چلنے لگا۔ جناب خلیل بڑے احترام کے ساتھ اس مہمان کو لے کر اپنے گھر آئے اور اپنے غلاموں کو دستر خوان بچھانے کا حکم دیا۔ جب سب کھانا کھانے کے لئے بیٹھے تو جناب ابراہیمؑ اور آپ کے متعلقین نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر کھانا شروع کیا۔ لیکن مہمان کی زبان سے یہ کلمات نہ سنے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ اے شخص یہ کیا شرط مروّت و انسانیت نہیں کہ جب کھائے تو روزی دینے والے کے نام سے اس کا آغاز کرے اس نے کہا میرے مذہب میں ایسا کرنے کا حکم نہیں، پوچھا اے شخص تو کس دین کا پیرو ہے۔ اس نے کہا میں آتش پرست ہوں۔ یہ سن کر جناب ابراہیمؑ آزردہ خاطر ہوئے۔ اور اس کو دشمن سمجھ کر اپنے گھر سے نہایت ذلّت کے ساتھ نکلوا دیا۔

اس کا گھر سے نکلنا تھا کہ جناب خلیل پر وحی نازل ہوئی کیوں اے ابراہیمؑ کیا مہمان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرنا روا ہے۔ اے ابراہیم اگر وہ دشمن تھا تو میرا نہ کہ تمہارا۔ باوجودیکہ وہ مجھے خدا نہیں مانتا مگر میں نے آج تک اپنی نعمت کو اس پر بند نہیں کیا ۔ باوجودیکہ میں نے اسے پیدا کیا ہے۔ ہر قسم کی آسائش دی ہے۔ مگر وہ میرے بجائے آگ کو سجدہ کرتا ہے۔ تاہم میری رحمت نے اس کو گوارا نہ کیا کہ اپنی روزی سے اُسے محروم رکھوں۔

اے خلیلؑ نہ تو تم نے اسے پیدا کیا ہے نہ تم اس کے روزی رساں ہو۔ نہ تم اس کے معبود ہو پھر بھی تم کو اس پر اتنا غصہ آیا۔ اے ابراہیم وہ صرف اپنی روزی تمہارے دستر خوان پر کھانا چاہتا تھا۔ تم نے اتنی بات بھی گوارہ نہ کی۔ اگر تمہاری طرح ہم بھی اپنے بندوں کو اسی ذلّت و خواری کے ساتھ اپنے دستر خوان کرم سے اُٹھا دیں تو پھر ان کا روزی رساں کون ہے۔

اے خلیلؑ! تم نے یہ امر ہماری مرضی کے مطابق نہ کیا۔ اگر تم ہم کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو اسے راضی کر دو۔ یہ حکم رب جلیل سُن کر جناب خلیلؑ تھر تھر کانپنے لگے۔ اور جس طرح بنا اس کو واپس لائے۔

حضرات! سُنا آپ نے مہمان کا کتنا بڑا رتبہ ہے۔ اسلام نے اس بارے میں بڑی تاکید کی ہے کہ مہمان کی خاطر و تواضع میں کوئی کمی نہ کی جائے۔ اہلِ بیت علیہم السلام کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی مہمان ان کے یہاں آتا تو چاہے وہ خود فاقہ کر لیتے لیکن مہمان کا فاقہ سے رہنا گوارہ نہ کرتے اور جب مہمان رخصت ہونے لگتا تو جو کچھ ممکن ہوتا وہ بطور تحفہ اس کی خدمت میں پیش کرتے۔

حضرت رسولؐ خدا کی نظر میں مہمان نوازی کی اتنی بڑی عزت تھی کہ ایک جنگ کے بعد جب کچھ قیدی آپ کے سامنے پیش ہوئے۔ تو ان میں عرب کے مشہور و معروف سخی اور مہمان نواز حاتم طائی کی بیٹی بھی تھی جب حضورؐ کے سامنے اس کا نام لیا گیا تو آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو۔ اس کا باپ بڑا سخی تھا اور مہمان نواز تھا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ ایسے مہمان نواز کی بیٹی کو قیدی کی صورت میں کھڑا دیکھوں۔

منقول ہے کہ ایک شخص امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اپنے ساتھ بحیثیت خود تحفے لایا کرتا تھا اور کئی کئی روز حضرت کا مہمان رہا کرتا تھا۔ آپ لوازم مہمان داری باحسن وجوہ انجام دیتے تھے ایک بار جو اپنے گھر سے چلنے لگا۔ تو اس کی زوجہ نے کہا کہ اے شخص تو ہمیشہ اپنے امام کی خدمت میں تحفے لے جایا کرتا ہے مگر تیرے امام کبھی کوئی تحفہ تجھے نہیں دیتے۔ یہ سُن کر وہ رونے لگا اور کہنے لگا آہ! تو اس گھر کا کیا حال جانے۔ ہمارے رسولؐ کا گھر کربلا میں لُٹ چکا ہے۔ بچہ۔ جوان۔ بوڑھا اب اس گھر میں کوئی نہیں رہا۔ کربلا میں سب شہید کر دیئے گئے۔ سارے گھر میں صرف ایک مرد میرے سید و مولا امام زین العابدین علیہ السلام کا دم ہے جو رات دن رو رو کر گزارتے ہیں۔ ایسی صورت میں تو کیا ان سے تحفے کی توقع رکھتی ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ جب یہ شخص امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے نماز ظہر کے لئے کنیز سے طشت اور آفتابہ طلب فرمایا تاکہ وضو کریں۔ جب وضو کا پانی طشت میں گرا تو آپ نے اپنے مہمان سے فرمایا دیکھ طشت میں کیا ہے۔ اس نے عرض کیا یابن رسول اللہ یہ تو یاقوت احمر ہیں۔ فرمایا انہیں طشت سے نکال لے اس کے بعد پھر پانی گرا کر فرمایا اب دیکھ کیا ہے اس نے کہا یہ تو زمرد سبز ہے فرمایا یہ بھی اُٹھا لے۔ اور ہماری طرف سے یہ تحفہ اپنی زوجہ کو دے دینا اور کہنا اے زنِ مومنہ ہمارے پاس مال سے کچھ نہیں۔ یہ ہمارے معبود کے تفضلات ہیں جو تجھے بھیجے جا رہے ہیں۔

کیوں حضرات جس گھر سے مہمان نوازی کی تعلیم اس طرح دی گئی ہو۔ افسوس صد افسوس اہل کوفہ نے ان ہی برگزیدگان الہیٰ کو مہمان بلا کر وہ غداری کی کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر ڈھونڈھے نہیں مل سکتی آہ! آہ!! امام حسین علیہ السلام کو خط لکھ لکھ کر بلایا اور جب عراق پہنچے تو نگاہیں پھیر لیں اور وہ

ظلم کئے کہ ان کے تصوّر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

لکھا ہے جب امام حسین علیہ السلام منزلِ شراف سے آگے بڑھے تو یکایک آپ کے اصحاب میں سے کسی نے بآوازِ بلند تکبیر کہی۔ حضرت نے پوچھا اس وقت تکبیر کہنے کا کیا سبب ہے۔ اس نے کہا مجھے دُور سے خرمے کے درخت نظر آرہے ہیں۔ جس سے سمجھتا ہوں کہ پانی ہم سے قریب ہے۔ اب ہم اپنی مشکوں کو بھر لیں گے۔ یہ سُن کر حضرت کے بعض اصحاب نے کہا۔ خدا کی قسم ہم نے اس مقام پر کبھی خرمے کے درخت نہیں دیکھے۔ حضرت نے فرمایا پھر تمہیں کیا معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے بغور دیکھ کر کہا ہمیں تو نیزوں کی انیاں اور گھوڑوں کے کان نظر آتے ہیں۔ یقیناً لشکر ادھر آرہا ہے۔ حضرت نے فرمایا بیشک مجھے بھی ایسا ہی نظر آرہا ہے۔ اگر ہمیں کوئی مقام پناہ کا مل جاتا تو ہم اسے اپنی پس پشت پر لے لیتے اور دشمن کا مقابلہ کرتے۔

اصحاب میں سے ایک نے کہا آپ بائیں طرف میل فرمائیں وہاں مقام ذو حسم ہے وہاں انصار کا قبیلہ رہتا ہے۔ اوّل تو وہ مقام محفوظ ہے دوسرے وہ لوگ ہماری مدد کریں گے حضرت کو یہ رائے پسند آئی اور بائیں طرف کا رُخ کیا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور چلے تھے کہ گھوڑوں کی گردنیں صاف نظر آنے لگیں اور ان کے رُخ بھی ادھر ہی کو ہو گئے جدھر حضرت امام علیہ السلام جا رہے تھے مگر حضرت کا قافلہ ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ حضرت نے حکم دیا کہ خیمے ایستادہ کر کے عورتوں اور بچّوں کو ان میں اتارو اور اس قوم سے مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

دوپہر کا وقت تھا سخت دُھوپ پڑ رہی تھی کہ وہ لوگ جن کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی مع اپنے سردار حُر ابن زیاد ریاحی کے وہاں پہنچے لیکن پیاس سے ان کا غیر حال تھا۔ ایک ایک سپاہی کی جان لبوں پر تھی۔ گھوڑوں کی زبانیں باہر نکل آئی تھیں قریب تھا کہ بے دم ہو کر خاک پر گر پڑیں
امام علیہ السلام کا یہ رحم و کرم دیکھنے کے قابل ہے کہ ان کی یہ حالت تباہ دیکھ کر آپ نے ہاشمی جوانوں کو حکم دیا کہ اس قوم کو اور اس کے حیوانوں کو سیراب کر دو کسی نے عرض کی یابن رسول اللہؐ اوّل تو یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔ دوسرے اگر ہم نے سب پانی ان کو پلا دیا تو پھر ہم کیا پئیں گے ہمارے ساتھ عورتیں اور ننھے بچے ہیں۔ یہ بغیر پانی کے کیونکر رہ سکتے ہیں۔ یہاں اردگرد ہم کو پانی نظر نہیں آتا حضرت نے فرمایا جو کچھ بھی ہو لیکن مجھ سے ان کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ الغرض حضرت کا یہ حکم سنتے ہی جوانانِ علوی و جعفری و عقیلی نے پانی کے بھرے ہوئے مشکیزے اٹھا لئے اور فوج حر کو پانی پلانا شروع کیا جب تمام لشکر سیراب ہو گیا تو ان کے گھوڑوں کے سامنے پانی کے بھرے ہوئے مشکیزے طشتوں میں ڈالے

گئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے خود سقائی کی۔ اور ان لوگوں کو بار بار پانی پلا کر سیراب کیا گیا۔ جب پانی پلانے سے فراغت ہوئی تو نماز ظہر کا وقت آگیا۔ حضرت نے حجاج بن مسروق کو حکم دیا کہ اذان کہیں اس کے بعد آپ نے حُر کے لشکر سے مخاطب ہو کر فرمایا اے قوم میں اپنی خواہش سے اس طرف نہیں آیا بلکہ جب تم لوگوں نے خطوط میری طلب میں بھیجے۔ اور پے در پے قاصد بھیجے تب ادھر کا قصد کیا ہے تم نے بار بار مجھے خطوط میں لکھا کہ ہمارا یہاں کوئی ہادی اور امام نہیں۔ آپ جلد تشریف لائیے کہ ہم ہدایت حاصل کریں۔ پس اگر تم اس قول پر قائم ہو تو میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اپنے عہد و پیمان سے مجھے مطمئن کر کے خوش کرو۔ اور اگر تم میرے آنے سے ناخوش ہو تو میں یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ حضرت کا یہ کلام سن کر سب خاموش ہو گئے اور کسی نے کوئی جواب نہ دیا پس حضرت نے موذن کو اقامت کہنے کا حکم دیا۔ اور آپ کے ہمراہی صفیں باندھ کر نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔ حضرت نے حُر سے کہا کہ تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز ادا کرو۔ انہوں نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا ہم بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ دونوں لشکروں نے حضرت کے پیچھے نماز پڑھی۔ بعد نماز حضرت اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے اور حُر اپنے لشکر کی طرف گئے۔ جب نماز عصر کا وقت آیا تو حضرت پھر خیمے سے برآمد ہوئے اور پھر دونوں لشکروں نے حضرت کے پیچھے نماز پڑھی۔

نماز کے بعد پھر آپ نے لشکر حر کو مخاطب کر کے فرمایا اے لوگو! اگر تم پرہیز گاری اختیار کرو۔ اور اہل حق کا حق سمجھو تو خدائے تعالیٰ تم سے راضی ہوگا۔ لوگو! اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے اور ہمارے حقوق کے متعلق تمہاری رائے بدل گئی ہے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ حُر نے کہا آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں قطعاً اس سے بے خبر ہوں مجھے نہ خطوط بھیجنے کی اطلاع ہے نہ قاصدوں کے روانہ کرنے کی۔ حضرت نے عقبہ بن سمعان سے فرمایا۔ وہ تھیلے لے آؤ جن میں اہل کوفہ کے خطوط ہیں۔ جب وہ تھیلے آئے تو آپ نے حُر کے سامنے رکھ کر فرمایا۔ یہ سب خط اہل کوفہ کے ہیں۔ حُر نے کہا میں ان لوگوں میں سے نہیں جنہوں نے آپ کے پاس یہ خطوط بھیجے ہیں میں ابن زیاد امیر کوفہ کی طرف سے اس امر پر مامور ہوں کہ آپ کا ساتھ کسی طرح اس وقت تک نہ چھوڑوں جب تک کہ آپ کو اس کے سامنے کوفہ میں پیش نہ کردوں حضرت نے فرمایا اے حر تیری موت بہ نسبت تیرے ارادہ کے تجھ سے زیادہ قریب ہے۔

اس کے بعد حضرت نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور سفر کی تیاری کرو۔ سب اصحاب حکم امام کے منتظر تھے ہی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور سامان اونٹوں پر بار کر کے اہل حرم کو سوار کیا اور روانگی پر آمادہ ہوئے۔ حُر کے لشکر نے آگے بڑھ کر راستہ روکا۔ حضرت نے غضبناک ہو کر حُر سے فرمایا۔ تیری ماں تیرے غم میں بیٹھے کیا ارادہ رکھتا ہے۔ حُر نے کہا یا ابن رسول اللہ اگر آپ کے سوا کوئی دوسرا یہ کلمہ

کہا تو میں بھی اس کے جواب میں اس کی ماں کا ذکر ان ہی الفاظ سے کرتا ہوں لیکن آپ کی مادرِ گرامیؑ کے متعلق سوائے کلمۂ خیر اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ آخر تیرا کیا ارادہ ہے۔ انہوں نے کہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کو ابنِ زیاد کے سامنے پیش کر دوں۔ فرمایا میں اس کو ہرگز گوارا نہ کروں گا۔ حُر نے کہا تو میں بھی آپ کا راستہ نہ چھوڑوں گا۔ مجھے پسرِ ابنِ زیاد نے آپ سے لڑنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ صرف کوفہ تک لانے کا بس اگر آپ کو کوفہ جانے سے انکار ہے تو ایسی راہ اختیار کیجئے۔ جو نہ کوفہ کو جاتی ہو اور نہ مدینہ کو تاکہ میں بدنام نہ ہوں۔ میں ابن زیاد کو آپ کے متعلق خط لکھتا ہوں۔ ممکن ہے خدا کی طرف سے کوئی سامان ایسا پیدا ہو جائے کہ آپ مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔

الغرض حضرت وہاں سے بائیں طرف کو روانہ ہوئے۔ لشکرِ حر بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ راستہ میں حُر نے کہا۔ فرزندِ رسول مجھے اس امر کی فکر ہے کہ اگر آپ نے جنگ کا قصد کیا تو یہ لوگ آپ کو بغیر قتل کئے نہ چھوڑیں گے۔ حضرت نے فرمایا وائے ہو تجھ پر تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ اے حُر۔ میں ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہوں۔

جب حُر نے دیکھا کہ حضرت کسی طرح اس کی رائے پر عمل کرنے والے نہیں تو اپنے لشکر کو حضرت کے لشکر سے جُدا کر کے ایک دوسری راہ اختیار کی۔ کتاب منتخب مجالس میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کا ورود سرزمینِ کربلا میں ہوا۔ تو یکایک آپ کا گھوڑا چلتے چلتے رُک گیا ہر چند حضرت نے گھوڑے کو مہمیز کیا مگر اس نے قدم نہ اُٹھایا۔ آپ اس گھوڑے سے اُتر پڑے اور دوسرا گھوڑا بدلا۔ مگر وہ بھی آگے نہ بڑھا بروایت ابو مخنف آپ نے چھ گھوڑے بدلے۔ لیکن ایک نے بھی قدم نہ اُٹھایا۔ تب آپ نے وہاں کے لوگوں سے پوچھا۔ اس مقام کا کیا نام ہے انہوں نے کہا اسے غاضریہ کہتے ہیں۔ فرمایا اس کا کوئی دوسرا اور نام بھی ہے؟ کہا اس کو نینوا بھی کہتے ہیں۔ فرمایا اس کے علاوہ بھی کوئی نام ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کو کربلا بھی کہتے ہیں۔ یہ سُن کر حضرت نے ایک آہ سرد دلِ درد سے کھینچی۔ اور آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ واللہ یہی ہمارے قتل ہونے کی جگہ ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمارے نوجوان اور بوڑھے تین دن کے بھوکے پیاسے زخموں سے چور چور ہو کر خاک و خون میں لوٹیں گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیں گے۔ پھر ساتھیوں سے فرمایا ہمارا سفر تمام ہوا۔ اونٹوں کو بٹھا دو اور بیبیوں اور بچوں کو اتار دو۔ بخدا یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارا خون پانی کی طرح بہایا جائے گا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہماری قبریں بنیں گی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ہم روزِ قیامت اُٹھیں گے۔ یہی ہماری وعدہ گاہ ہے جس کی خبر میرے نانا نے مجھے دی تھی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت کو یہ علم ہوا کہ یہ زمین کربلا ہے تو تھوڑی سی خاک وہاں کی اُٹھا کر پہلے خود سونگھی۔ اس کے بعد جناب زینبؑ کو سنگھائی۔ وہ گھبرا کر کہنے لگیں۔ بھیا اس خاک کو پھینکو۔ مجھے اس سے آپ کے خون کی بو آتی ہے۔ میرا دل سخت بے چین ہے۔ جلد اس سرزمین سے آگے بڑھو۔ حضرت نے رو کر فرمایا اے بہن اب کہاں جائیں گے ہمارا سفر تمام ہوا۔

بروایت مناقب حضرت کا کربلا میں ورود ۲ محرم کو روز چہارشنبہ یا پنج شنبہ ۶۱ ہجری میں ہوا۔ روایت منتخب جب حضرت کو یہ علم ہوا کہ یہ مقام کربلا ہے تو آپ گھوڑے سے اُتر پڑے اور نہایت دردناک لہجے میں آپ نے چند اشعار اس مضمون کے پڑھے۔

اے دنیا وائے ہو تیرے اُوپر تو عجب بے وفا دوست ہے کہ انسان کو صبح و شام تجھ سے رنج پہنچتا ہے۔ اے دُنیا تو نے کیسے کیسے حق پسند اور صداقت شعار لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ لیکن پھر بھی تجھ کو قناعت نہیں ہوتی اور برابر لوگوں کو ہلاک کئے چلی جا رہی ہے۔ بے شک ہر زندہ کو یہ راہ درپیش ہے جو میرے سامنے آنے والی ہے۔ بے شک ہر امر کی انتہا خدائے جلیل تک ہے۔

حضرت بار بار ان اشعار کو پڑھتے تھے یہاں تک کہ جناب زینبؑ نے بھی ان اشعار کو سنا گھبرا کر حضرت کے پاس آئیں اور رو رو کر عرض کرنے لگیں۔ اے بھائی کاش اس دُکھیا بہن کو موت آجاتی تاکہ آپ سے ایسا یاس آمیز کلام نہ سنتی۔ اے یادگار گزشتگان۔ اے سرپرست درماندگان آپ اس وقت ایسے کلام فرما رہے ہیں جیسا اپنی زندگی سے مایوس انسان کہتا ہے آہ! آہ! آج کا دن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے نانا حضرت رسولؐ خدا اور پدر بزرگوار علی مرتضیٰؑ نے قضا کی ہے۔ آج میرے دل پر وہی رنج و غم طاری ہے جو میری مادرِ گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ اور میرے بھائی حسن مجتبیٰ کی رحلت کے دن ہوا تھا۔ میں سمجھتی ہوں آج خاتمہ پنجتن ہے۔ بھیا آپ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے فرمایا ہاں بہن تمہارا خیال درست ہے میری زندگی کی مدت عنقریب ختم ہونے والی ہے اور موت میرے سامنے آ رہی ہے۔

یہ سنتے ہی جناب زینب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اُن کی آواز سن کر تمام عورتوں میں کہرام بپا ہو گیا۔ حضرت سب کو تسکین دینے لگے اور فرمانے لگے اپنے کو اس غم سے ہلاک نہ کرو۔ دُنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کو نہیں آیا۔ ایک دن ہر شخص کو موت کا جام پینا ہے۔ یہ سن کر جناب زینب اور اُمّ کلثوم نے عرض کی۔ اے بھائی اگر آپ کو اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے تو ہم کو ہمارے بابا کے روضہ پر پہنچا دیجئے کیونکہ ہم سے آپ کا قتل ہونا نہ دیکھا جائے گا۔ آہ بھائی ہم بے کسوں کا آپ کے بعد کون ہوگا۔ حضرت نے فرمایا اے بہن اگر میرا اختیار ہوتا تو تم کو میں اس بلا میں کیوں پھنساتا۔ اے بہن صبر کرو اور جو مصیبت

سر پر آئے اسے برداشت کرو کہ پیش خدا صابروں کا بڑا اجر ہے۔ اے بہن مرضیٔ خدا میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ خدا کی مشیت یہی ہے۔ کہ وہ اپنی راہ میں مجھے مقتول دیکھے۔ انسان کو صبر ہی ہر حال میں بہتر ہے۔

کشکول عاملی میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام وارد کربلا ہوئے تو آپ نے قبیلہ بنی اسد کے چند سرداروں کو جو کربلا کے زمیندار تھے بلاکر فرمایا۔ ہمارا ارادہ اس سرزمین پر آباد ہونے کا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے ہاتھ یہ زمین بیع کردو۔ انہوں نے کہا کہ حکم امام کی تعمیل میں کیا عذر ہے۔ لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ اس سرزمین پر جو نبی یا وصی آیا اس نے ضرور تکلیف اُٹھائی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ آپ یہاں قیام کا ارادہ نہ فرمائیں۔ یہ جگہ رہنے کی نہیں۔ حضرت نے ان سے فرمایا۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ قیامت تک ہماری خوابگاہ یہی زمین ہو۔ الغرض آپ نے ساٹھ ہزار درہم میں چار مربع میل زمین مول لے لی۔ اس کے بعد وہ کل زمین بطور تصدق ان ہی زمینداروں کو عطا فرمادی۔ لیکن دو شرطوں کے ساتھ اوّل یہ کہ جس جگہ میری اور میرے اصحاب کی قبریں بنائی جائیں تو تم کبھی اس پر زراعت نہ کرنا اور دوسرے یہ کہ ہمارے شیعوں میں سے کوئی شخص اگر ہماری قبور کی زیارت کو آئے تو اس کو تین دن مہمان رکھنا اور میرے زائروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔

حضرات! ہمارے امام علیہ السلام نے تین دن مہمان رکھنے کی شرط شاید اس لئے لگائی تھی کہ جب ہمارے شیعوں کو تین دن راحت ملے گی تو وہ ضرور تصور کریں گے کہ ہمارے امام مظلوم کو اس سرزمین پر تین روز آب و دانہ نہ ملا تھا۔ آہ آہ! مومنین ہمارے مظلوم آقا نے تو اپنے زائروں کے لئے یہ اہتمام کیا لیکن اشقیائے اُمت نے زائرین امام کو وہ اذیتیں پہنچائیں کہ ان کے بیان سے دل ہلتا ہے چنانچہ منقول ہے کہ متوکل عباسی کے زمانے میں کسی کو اجازت نہ تھی۔ زیارت قبر امام علیہ السلام کا شرف حاصل کرے جو لوگ اس حکم کی خلاف ورزی کرکے پہنچتے تھے۔ ان کو کوڑوں سے مارا جاتا تھا۔ ان کے گھر لوٹ لئے جاتے تھے۔ ایک مدت تک زائرین امام علیہ السلام پر طرح طرح کے ظلم و تشدد ہوتے رہے تھے۔

قبروں کے بارے میں حضرت نے بنی اسد سے یہ شرط کی تھی کہ زراعت نہ کرنا تاکہ میری قبر کا نشان باقی رہے لیکن کیسے شقی اور بدبخت تھے وہ لوگ جو اپنے کو مسلمان کہہ کر نواسۂ رسولؐ کی قبر کا نشان تک باقی رکھنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ متوکل عباسی ملعون نے کئی بار قبر امام مظلوم علیہ السلام کے مسمار کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس کی یہ ظالمانہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔

ایک بار اس شقی نے بہت بڑا لشکر کربلا بھیجا تاکہ قبروں کو مسمار کرکے وہاں ہل چلادے اور فرات کا

پانی بہا کر بالکل نام و نشان مٹا دے۔ لکھا ہے جب فرات کا پانی کاٹ کر لائے تو وہ قبر منور کے چاروں طرف گھوم کر رہ گیا۔ گویا اس ظلم پر اپنی حیرانی کا اظہار کر رہا تھا۔ پانی کو شرم آگئی۔ کہ جب میں زندگی میں ان پیاسوں تک نہ پہنچ سکا تو اب مرنے کے بعد کیا منہ لے کر جاؤں ؎

اے آب خاک شو کہ ترا آبرو نہ ماند
آزردہ رفتہ انہ تو لب تشنہ حبیبؑ

آہ! مومنین یہی فرات کا پانی تھا کہ جس کو روزِ عاشورہ چھوٹے چھوٹے بچے تڑپ رہے تھے اور ہمارے امام حسین علیہ السلام کا یہ حال تھا کہ پیاس کی شدت سے بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرتے تھے ؎

از آب ہم مضائقہ کردند کوفیان
خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا!
بودند دام و دو ہمہ سیراب و مے کمید
خاتم ز قحطِ آب سلیمان کربلا

مقتل ابو مخنف میں ہے کہ جب ابن زیاد کو معلوم ہوا کہ امام علیہ السلام کوفہ کی طرف تشریف لا رہے ہیں تو سرداران لشکر کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اے گروہ عرب تم کو لازم ہے کہ دنیاوی دولت و منصب حاصل کرنے کی طرف مائل ہو پس تم میں کون بہادر ایسا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ کا سر کاٹ لائے اور اس کے صلے میں یزید کی سرکار سے مستحق دولت و اکرام ہو۔ اس بدانجام کا یہ کلام سُن کر کسی نے جواب نہ دیا۔ دوسری بار اس نے پھر کہا جو حسینؑ کا سر کاٹ کر لائے گا۔ اس کے عوض میں بیس برس تک حکومت رے پر قابض رہے گا۔ یہ سُن کر ابن سعد ملعون اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔ اے امیر مجھے ایک رات کی مہلت دے میں کل اس کا جواب دوں گا۔ اس ملعون نے منظور کیا۔ عمر بن سعد وہاں سے اپنے گھر آیا۔

جب اس عاقبت برباد کے اس ارادہ کی خبر مشہور ہوئی تو بہت سے لوگ اس کے پاس جا کر کہنے لگے وائے ہو تجھ پر اے پسر سعد تو فرزند رسول الثقلین حضرت امام حسین علیہ السلام سے لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے حالانکہ تیرا باپ سعد سادس الاسلام تھا اس بے حیا نے ان سے تو کہہ دیا کہ آپ لوگ اطمینان رکھیں میں یہ کام نہ کروں گا لیکن دل میں مردد تھا کہ اگر قتل حسین گوارا نہیں کرتا تو ملک رے میرے ہاتھ سے جاتا ہے آخر کار ملعون نے حکومت کو اختیار کیا اور دوسرے دن پسر زیاد سے جا کر کہا اے امیر میں اس عظیم الشان خدمت کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ ابن زیاد نے خوش ہو کر کہا۔ بیشک تو ہی اس کام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ اب تجھے لازم ہے کہ بہت جلد یہاں سے روانہ ہو جا اور جہاں کہیں بھی حسینؑ بن علیؑ تجھے ملیں

ان کو گھیرے اور ہرگز مہلت نہ دینا۔ اور ان پر اور ان کے رفقاء پر پانی بند کر دینا۔ پھر ان کو قتل کر کے میرے پاس بھیج دینا۔

ابن زیاد نے پہلے چھ ہزار سواروں کی جمعیت سے ابن سعد کو روانہ کیا۔ اس کے بعد عروہ بن قیس کو دو ہزار سواروں کے ساتھ پھر سنان ابن انس کو چار ہزار کے ساتھ، پھر شمر ذی الجوشن کو چار ہزار کے ساتھ روانہ کیا۔ راوی کہتا ہے کہ ساتویں محرم تک چالیس ہزار بروایت ستر ہزار فوج کوفہ سے آکر جمع ہو گئی۔ اس کے بعد جو شخص اس کے سامنے آیا اسے کربلا روانہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ فوجوں کی کثرت سے کربلا کا میدان پُر ہو گیا۔

کتب مقاتل میں ہے کہ جوں جوں فوجوں کی آمد کا حال اہل حرم کو معلوم ہوتا تھا ان کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ خاص کر ہماری شہزادی جناب زینبؑ کا حال سب سے زیادہ خراب تھا۔ بار بار امام علیہ السلام کو بُلا کر پوچھتی تھیں۔ کیوں بھائی آپ کی نصرت کے لئے بھی کوئی آیا ہے۔ حضرت نے فرمایا اے بہن یہ سب میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اس عالم غربت میں ہماری مدد کو کون آئے گا۔ آہ! مومنین اس فوج بدشعار کی آمد سے جناب رباب مادر جناب علی اصغر کو وہ صدمہ پہنچا کہ ان کا دودھ خشک ہو گیا پے در پے رسالوں کی آمد کی خبریں اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے نبی زادیوں کے دل سینوں میں ہلا دیئے تھے۔ آہ! بھوکے پیاسے مجاہدوں کے لئے جن کی تعداد کل بہتر تھی۔ ظالموں کی یہ ٹڈی دل فوج جمع ہوئی تھی۔ لیکن سبحان اللہ کیسے بہادر تھے رفقائے حسین علیہ السلام کہ فوج کی اس کثرت سے ذرا ان کے دل پر خوف و ہراس نہ تھا۔ اور تین دن کی بھوک و پیاس میں وہی آن بان اور شجاعانہ شان تھی۔

منقول ہے کہ جب میدان کربلا میں کوفہ و شام کی فوجیں داخل ہوتی تھیں اور زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے لرزتی تھی تو جناب زینب حضرت عباسؑ سے دریافت فرماتی تھیں۔ اب کون سردار آیا ہے؟ جناب عباسؑ اس کا نام بتا دیتے تھے۔ جس روز کربلا میں شمر ذی الجوشن کا داخلہ ہوا تو جناب زینبؑ کا اضطراب خود بخود زیادہ بڑھا۔ حضرت عباسؑ کو بلا کر دریافت کرنے لگیں کہ اے بھائی آج یہ کون سردار آیا ہے کہ میرا دل خود بخود رنج و غم سے بیٹھا جاتا ہے اور وہ پریشانی لاحق ہے کہ بیان نہیں کر سکتی جناب عباسؑ نے فرمایا۔ اے بہن آج شمر ذی الجوشن کئی ہزار کی جمعیت سے آیا ہے۔ آہ! مومنین جوں ہی جناب زینبؑ نے شمر کا نام سُنا ایک آہ سرد دلِ پُر درد سے کھینچی اور آنکھ میں آنسو بھر لائیں چونکہ یہ خبر سن چکی تھیں کہ حضرت کا قاتل شمر ہو گا۔ لہذا اب بھائی کی طرف سے حضرت زینبؑ کو مایوسی ہو گئی

جناب فضہ سے کہا کہ تم میرے بھائی سے جا کر کہو کہ اس وقت زینبؑ کا غیر حال ہے ذرا دیر کے لئے خیمہ میں سے ہو جائیے۔ جب حضرت تشریف لائے تو جناب زینبؑ بے اختیار گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگیں۔ حضرت نے فرمایا اے بہن تمہاری اس غیر معمولی بے چینی کا سبب کیا ہے؟ فرمایا اے بھائی اب تک تو میں سمجھتی تھی کہ شاید آپ دشمنوں کے خطرے سے بچ جائیں۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کی جان بچنے والی نہیں۔ حضرت نے پوچھا "اے بہن! تم نے کیسے سمجھا" زینبؑ رو رو کر کہنے لگیں سنتی ہوں کہ آج آپ کا قاتل شمر بھی کربلا میں آگیا۔

آہ! مومنین امام حسین علیہ السلام اس وقت اپنی ستم رسیدہ بہن کو کیونکر تسکین دیتے کیونکہ وہ تو پوری طرح اصل حال سے آگاہ تھیں۔ آپ خاموشی سے سر جھکائے کھڑے رہے۔ جناب زینبؑ دیر تک گلے میں باہیں ڈالے کھڑی رہیں۔ اس وقت خیمۂ امام میں کہرام بپا تھا کسی کے ہوش بجا نہ تھے آخر امام علیہ السلام نے فرمایا۔ مرضیٔ خدا میں کسی کا زور نہیں تم سب کو خدا کی رضا پر راضی ہونا چاہیے مرضی الٰہی میں کسی کا زور نہیں۔ اگر خدا کو یہی منظور ہے کہ میں اس کی راہ میں انتہائی ظلم و ستم سے شہید کیا جاؤں تو میرے لئے اس سے زیادہ سعادت کا موقع نہیں۔ تم سب کو اس مصیبت عظیم میں صبر کرنا چاہیے صبر کا اجر عند اللہ بہت زیادہ ہے۔

صاحب مصائب الائمہ لکھتے ہیں کہ جب فوجیں جمع ہو گئیں اور عمر بن سعد نے خاطر خواہ بندوبست کر لیا۔ تو اس نے کثیر بن شہاب کو بلا کر کہا تو حسین بن علی کے پاس جا کر دریافت کر کہ وہ کس ارادے سے تشریف لائے ہیں۔ یہ سن کر کثیر ملعون حضرت کے لشکر گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب خیمہ قدس کے قریب پہنچا تو ابو ثمامہ صیدادی نے بڑھ کر ڈانٹا۔ کہ او شقی بے اجازت کیوں بڑھتا چلا آتا ہے۔ اس نے کہا پسر سعد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔" فرمایا۔ ٹھہر جا میں اپنے امام سے اجازت لے لوں۔ اگر بے اجازت قدم آگے بڑھایا تو سر تن سے جدا کر دوں گا۔" یہ سن کر وہ شقی رک گیا اور جناب ابو ثمامہ نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "مولا! کثیر ملعون حاضر خدمت ہونا چاہتا ہے۔ آپ اس شقی سے باخبر رہیں۔ وہ بڑا شریر النفس ہے۔" حضرت نے فرمایا۔

"آنے دو اللہ میرا حافظ و مددگار ہے۔"

اللہ اکبر ابو ثمامہ کو امام غریب سے کس قدر محبت تھی۔ کہ جب کثیر کو لے کر چلے اور امام علیہ السلام کے خیمے کے قریب پہنچے تو فرمایا اے شقی! اپنی تلوار مجھے دے کہ میں تیری طرف سے مطمئن نہیں" اس نے کہا سبحان اللہ۔ کہیں سپاہی اپنا ہتھیار بھی کسی کو دیتا ہے۔ اگر تم مسلح مجھے جانے نہ دو گے تو میں واپس

چلا جاؤں گا۔

خیمہ کے اندر اس تکرار کی آواز امام علیہ السلام نے سُنی تو درِ خیمہ پر آ کر فرمایا! ابو ثمامہ اگر یہ نہیں مانتا تو اسی طرح آنے دو۔" ابو ثمامہ نے حکم امام سے مجبور ہو کر آگے تو بڑھنے دیا، مگر احتیاطاً اس کی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھے رہے تاکہ بے ادبی نہ کر سکے۔ کیوں مومنین کہاں تھے ابو ثمامہ صیدادی جیسے جان نثار جب شمر ملعون خنجر کھینچے امام علیہ السلام کے سینۂ اقدس پر سوار تھا۔

الغرض کثیر ملعون خدمتِ امام میں آیا۔ تو اس نے کہا "مجھے پسر سعد نے یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے کہ آپ کس ارادے سے یہاں تشریف لائے ہیں۔" آپ نے فرمایا۔ میں اپنی خوشی سے ادھر نہیں آیا۔ جب اہلِ کوفہ نے متواتر خطوط اور قاصد بھیجے تب میں نے ادھر کا قصد کیا۔ کثیر یہ جواب سُن کر پسر سعد کے پاس آیا۔ جب وہ حضرت کی تشریف آوری سے آگاہ ہوا تو اس نے ابن زیاد کو ایک خط لکھا اور حضرت کے اس ارادے سے آگاہ کیا۔ جب اس خط کو ابنِ زیاد نے پڑھا تو کہنے لگا کہ حسینؑ اب ہمارے چنگل سے نکلنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ پھر اس نے جواب میں لکھا۔

"اے پسر سعد تجھے لازم ہے کہ اس خط کے ملتے ہی حسین بن علی کو بیعتِ یزید پر مجبور کر اگر وہ انکار کریں تو ان سے جنگ کر اور ان کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیج دے۔" جب یہ خط پسر سعد کو ملا تو اس نے حضرت سے بیعت کا سوال ہی نہ کیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ آپ ہرگز اس کو منظور نہ کریں گے۔

یہ خط روانہ کرنے کے بعد ابن زیاد نے تمام شہر میں ڈھنڈورا کرا دیا کہ جو شخص اپنے گھر میں رہے گا اور کربلا میں لڑنے کے لئے نہ جائے گا اس کا خون مجھ پر حلال ہوگا۔ اس حکم کو سنتے ہی تمام اہلِ کوفہ ذلیل گئے۔ اور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر کربلا کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ نویں محرم تک بہ کثرت لوگ کربلا میں جمع ہو گئے۔

منقول ہے کہ جب امام مظلوم نے تمام میدان کربلا سواروں اور پیادوں سے بھرا ہوا پایا تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اب اہلِ حرم کی محافظت بہت ضروری ہے۔ اے سعادت مند و کھڑے ہو جاؤ اور میرے ساتھ خیمہ گاہ کی پشت کی طرف خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دو۔ تاکہ دشمن ادھر نہ آ سکے۔ یہ سُن کر تمام اصحاب اٹھ کھڑے ہوئے اور بہت جلد خندق کھود کر اس میں آگ روشن کر دی اس وقت ایک سوار لشکر سعد سے باہر آیا اور کہنے لگا۔ اے حسین! آتش آخرت سے قبل آتشِ دنیا کی طرف بہت جلدی کی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے غضب ناک ہو کر جواب دیا۔ اے دشمنِ خدا آتشِ دنیا و آخرت

ہمارے اجسام کو مس نہیں کر سکتی۔ کیونکہ خدا نے ہم پر آگ کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر آپ نے اپنے اصحاب سے پوچھا۔ یہ شقی کون ہے؟ کسی نے کہا۔ یہ ملعون جبیرہ کلبی ہے۔ حضرت نے اس شقی کے لئے بد دعا کی کہ اے خداوند عالم! جلد اس کو آگ کی طرف کھینچ۔ ابھی حضرت کی یہ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ اس ملعون کا گھوڑا بدکا اور سر کے بل اسے خندق میں گرا دیا۔ چند منٹ کے بعد وہ شقی داخلِ جہنّم ہوا۔

مقتل ابومخنف میں ہے کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام نے یہ دیکھا کہ ہزارہا اشقیائے اُمت قتل پر آمادہ ہیں تو آپ نے عمر سعد کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ میں چاہتا ہوں کہ آج کی شب دونوں لشکروں کے درمیان تجھ سے بات چیت کروں اور جو امر بلحاظ دُنیا و آخرت تیرے لئے بہتر ہو۔ وہ تجھ سے بیان کروں پسر سعد نے اس بات کو منظور کیا اور رات کے وقت وہ حضرت کی ملاقات کو آیا۔ آپ نے فرمایا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ تو میرے قتل پر آمادہ ہے۔ حالانکہ تو خوب جانتا ہے کہ میرے نانا حضرت رسولِ خدا اور میری ماں فاطمہؑ نورِ دیدۂ رسولؐ ہیں۔ اے پسر سعد تجھے خدا کا خوف نہیں کہ مجھے بے قصور قتل کرنا چاہتا ہے تیرے لئے بہتر صورت یہی ہے کہ میرے لشکر میں شامل ہو جا کہ باعث خوشنودی ہے خدا اور رسولؐ پر۔ اس نے کہا کہ اگر میں ایسا کروں گا تو ابن زیاد میرا گھر تک کھدوا ڈالے گا۔ حضرت نے فرمایا تو اس کا غم نہ کر میں اس سے بہتر گھر تجھے مدینہ میں دلوا دوں گا۔ اس نے کہا میری تمام املاک ضبط ہو جائے گی۔ فرمایا اس کی پروا نہ کر میں تجھے سرزمین حجاز میں اس سے بہتر جاگیر و زمین دینے کا ذمّہ دار ہوں۔ یہ سُن کر وہ خاموش ہو گیا آپ نے فرمایا تیرے سکوت کی کیا وجہ ہے کیا تو میرے قتل کا پختہ ارادہ کر چکا ہے اس نے کہا ہاں مجھے آپ کا قتل ہی منظور ہے۔ تاکہ اس سے فارغ ہو کر حکومت رَے پر قابض ہو جاؤں اور ستّر ہزار سوار میرے ماتحت رہیں۔ حضرت نے فرمایا اے شقی خدا تجھ کو تیرے فرش پر ذبح کرے۔ اور روزِ قیامت تجھ پر سخت عذاب نازل کرے۔ بخدا مجھ کو یقین ہے کہ تجھ کو رَے کے گیہوں کھانے نصیب نہ ہوں گے اور وہاں کی حکومت بھی تجھ کو نہ ملے گی اور تو انتہائی مایوسی میں داخل جہنّم ہو گا۔ اس شقی نے بطور تمسخر کہا۔ اگر گندم نہ ملے گی تو میرے لئے جَو ہی کافی ہیں۔

یہ بے حیائی کا جواب سُن کر حضرت نے اس شقی کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ دوسرے دن صبح سے پسر سعد نے امام علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر سختی کرنا شروع کر دی نہر فرات پر ہر طرف سے پہرے بٹھا دیئے اور نگہبانوں کو تاکید کر دی کہ خبردار اب لشکر حسین میں پانی کا ایک قطرہ نہ جائے۔

آہ! آہ!! مومنین وہ گرمی کی فصل وہ کربلا کی جلتی ریت نہ کہیں درخت کا سایہ نہ کہیں امن کی جگہ

کھلے میدان میں امام مظلوم کے خیمے برپا تھے۔ ہر طرف سے گرم ہوا کے تھپیڑے لگتے تھے۔ یوں ہی ایک ایک گھڑی قیامت کی گزر رہی تھی۔ آہ! کیا حال ہوا ہوگا جب پانی بھی بند ہوگیا ہوگا۔ لیکن پانی ایسی چیز نہیں کہ انسان اس کے بغیر زندہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی اس نعمت کو اتنا عام کر دیا ہے کہ جہاں زمین کھودو پانی نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ جابجا زمین پر چشمے اور دریا بہا دیئے ہیں۔

منقول ہے کہ جنگِ صفین میں معاویہ نے لشکرِ امیرالمومنین پر پانی بند کر دیا تھا اور جابجا گھاٹوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ لیکن جب امیرالمومنین علیہ السلام کا اس پر قبضہ ہوا تو آپ نے حکم دیا کہ لشکرِ معاویہ پر پانی بند نہ کیا جائے۔ کسی نے کہا یا امیرالمومنینؑ۔ جب یہ لوگ ہمارے ساتھ بدسلوکی کرچکے ہیں تو ہم اب جواب میں ان کے ساتھ ایسا کیوں نہ کریں۔ آپ نے فرمایا میری حمیت تقاضا نہیں کرتی کہ خدا کی ایسی نعمت سے ان کو باز رکھوں جس کے بغیر ان کی زندگی محال ہے۔

افسوس صد افسوس جس علیؑ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ یہ رحیمانہ برتاؤ کیا تھا کربلا میں اس کی اولاد پر پانی بند تھا اور چھوٹے چھوٹے بچے پیاس کی شدت سے تڑپ رہے تھے۔ بار بار خیام امام سے آوازِ العطش العطش بلند ہوتی تھی۔ بچے خالی کوزے خیمہ گاہ کے دروازے پر لے کر آتے تھے اور نہایت دردناک لہجے میں فریاد کرتے تھے۔

خدا کے لئے تھوڑا سا پانی لاکر ہمارے سوختہ دلوں کو ٹھنڈا کرو۔ ہمارے کلیجے شدتِ تشنگی سے کباب ہو رہے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ بات کرنے کی طاقت نہیں۔ جانیں لبوں پر آگئی ہیں۔ خدا کے لئے ہمارے اوپر رحم کرو۔ کیوں مومنین! جب اصحابِ حسینؑ بچوں کی ان دردناک آوازوں کو سنتے ہوں گے۔ تو ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اپنی بے کسی اور بے لبسی پر نظر کر کے تڑپتے دل ہاتھوں سے پکڑ کر رہ جاتے ہوں گے۔ ہائے ان اشقیائے اُمت کے ہاتھوں اولادِ رسولؐ کیسی سخت مصیبت میں مبتلا ہوگئی تھی وہ ظالم انسان نہ تھے بلکہ حیوانوں سے بدتر تھے کہ معصوم بچوں کو جو اولادِ رسولؐ تھے۔ اس بے دردی سے تڑپا رہے تھے۔

لکھا ہے کہ پیاسے بچے سوکھی زبانیں اپنے ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اور فرطِ ضعف سے لڑکھڑاتے ہوئے ایک ایک خیمہ میں پانی تلاش کرتے پھر رہے تھے اور سوکھے مشکیزے کھول کھول کر دیکھتے تھے کہ شاید چند قطرے پانی کے کہیں سے مل جائیں۔ مگر آہ! آہ!! ان بے کسوں کی یہ مراد کہیں پوری نہ ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ جب خیمہ جنابِ زینبؑ میں پہنچے اور رو رو کر پانی مانگا تو ان کا غم سے عجب حال ہوا۔ ایک ایک بچہ کو چھاتی سے لگا کر ان سب کو تسلی دیتیں اور پھر ان

سب کو لے کر خود تلاشِ آب میں نکلیں کہ شاید انصار کے کسی خیمے میں پانی ہو۔ مگر آہ جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک آہ سرد بھر کر رہ گئیں اور بچوں کا یہ حال ہوا کہ غش کھا کر گرنے لگے۔ آہ! کافروں کی اولاد سے بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو مسلمانوں نے اپنے نبی کی اولاد سے کیا۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۱۸/۱۱ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷/۲۶

ساتویں مجلس

یتیموں پر شفقت اور حالِ شہادت پسرانِ حضرت مسلمؑ

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

ضحیٰ ۹۳/۹

ترجمہ:۔ تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کرتے رہنا۔

حدیث پاک میں ہے کہ جو شخص یتیم پر رحم نہیں کرتا روزِ قیامت اس کی جگہ جہنم ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب کوئی یتیم نالہ کرتا ہے تو عرشِ الٰہی کانپ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یتیم بچوں کے لئے بڑی مصیبت ہے جس طرح کوئی درخت بغیر جڑ کے [illegible] نہیں رہ سکتا اسی طرح یتیم ہونے کے بعد بچوں کی شگفتگی جاتی رہتی ہے۔ خدا نہ کرے کہ بچے کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جائے یتیم ہو کر بچے کے تمام جذبات مر جاتے ہیں اور اس کی تمام آرزوؤں کا خون ہو جاتا ہے پھر دنیا میں کوئی ناز اُٹھانے والا اور سچے دل سے پیار کرنے والا باقی نہیں رہتا اسی لئے اس کا دل حد درجہ

نازک ہو جاتا ہے اور وہ بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ہے۔

ایک اور حدیث پاک میں یوں ارشاد ہے کہ یتیم کے سامنے اپنی اولاد کا منہ نہ چومو۔ تمہارے اس عمل سے اس کو اپنا باپ یاد آئے گا۔ اور اس کے دل پر چوٹ لگے گی۔

خداوند عالم نے صدقات میں ذوی القربیٰ کے بعد یتیموں کا درجہ رکھا ہے۔ یعنی انسان کو چاہیے کہ اپنے مال سے راہِ خدا میں جو کچھ دینا چاہتا ہو سب سے پہلے تو اپنے رشتہ داروں کی حاجت براری کرے اور ان سے جو بچے وہ ان یتیموں کا ہے۔ منقول ہے کہ ایک روز حضرت رسولؐ خدا کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ایک طرف سے کسی یتیم بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لوگوں سے پوچھا یہ کس کا بچہ ہے۔ اور کیوں رو رہا ہے۔ انہوں نے کہا یہ ایک بیوہ کا فرزند ہے۔ کسی بات پر ہٹ کی ہے اس پر اس کی ماں نے اسے مارا ہے۔ فرمایا اس بچہ کی ماں سے جاکر کہو کہ اس بچہ کو نہ مارا کرے۔ اس کے رونے سے مجھ کو اذیت ہوتی ہے۔ اگر یہ کسی وقت اپنی کسی بات کا اظہار کرے تو اس کو مجھ سے بیان کر دیا کرے۔ میں اس کے پورا کرنے کا ذمہ دار ہوں۔

مروی ہے کہ ایک امیر کبیر کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک یتیم بچے کے پیر میں کانٹا چبھا ہوا ہے اور وہ اس کی تکلیف سے بلبلا بلبلا کر رو رہا ہے وہ بیتاب ہو کر اس کے پاس پہنچا اور کانٹا اس کے پیر سے نکال کر اس پر شفقت کا اظہار کیا۔ وہ بچہ اور زیادہ رونے لگا۔ اس نے کہا اے لڑکے میں نے تیری تکلیف کو دور کیا ہے نہ کہ کوئی ایذا پہنچائی ہے کہ تو اتنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس وقت اپنے باپ کی شفقت یاد آگئی ہے وہ بھی اسی طرح میرے سر پر ہاتھ پھیرا کرتا تھا۔ یہ سننا تھا کہ وہ بزرگ بے چین ہو گئے اور اسے چھاتی سے لگا کر دیر تک روتے رہے اور پیار کرتے رہے۔ چند روز کے بعد اس نیک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ وہ باغِ جنت میں حوران بہشتی کے ساتھ جنتی لباس زیب تن کئے ٹہل رہا ہے۔ اس نے پوچھا اے دوست تو یہ تو بتا تو نے ایسے کیا عمل کئے تھے جن کی جزا میں یہ اعلیٰ مرتبہ ملا۔ اس نے کہا یہ صرف اس عمل خیر کی جزا ہے جو میں نے ایک بار ایک یتیم کے پیر سے کانٹا نکالا تھا۔ اسی کا صلہ خدا نے مجھے یہ دیا ہے۔

منقول ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اتنے بڑے یتیم نواز تھے کہ آپ اپنی خلافت کے زمانہ میں خود یتیموں اور بیواؤں کے گھر جاجاکر ان کی خدمات انجام دیتے تھے۔ حضرت کا یہ معمول تھا کہ نماز مغربین کے بعد روٹیوں اور خرموں کی زنبیل کندھوں پر رکھ کر بیواؤں اور یتیموں کے دروازے پر دستک دے کر اپنے آنے سے ان کو آگاہ کرتے۔ جب بیوہ عورتیں اور یتیم بچے کھانا لینے کے لئے آتے تو آپ اپنا منہ پھیر لیتے تاکہ

لینے والوں کو شرم نہ آئے۔ تمام زمانہ خلافت میں آپ اس خدمت کو یوں ہی انجام دیتے رہے اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ رات کو کھانا پہنچانے والا کون ہے۔ البتہ ماہ رمضان کی انیسویں شب کو جب حضرت مسجد کوفہ میں زخمی ہوئے اور دوسری رات کو ان کے گھروں میں کھانا نہ پہنچا تو بہت سے یتیم بچے جو بھوک سے بلبلا رہے تھے اپنی ماؤں سے دریافت کرنے لگے آج وہ ہمارا شفیق باپ کیوں نہیں آیا جو ہر رات ہمارے لئے روٹیاں اور خرمے لایا کرتا تھا۔ اگر کچھ پتا معلوم ہو تو بتا دو۔ ہم خود جا کر اپنی روزی لے آئیں۔ اور اگر وہ ہم سے ناخوش ہو گئے ہوں تو ان سے عفو تقصیر کے خواستگار ہوں۔ مائیں کہتی تھیں۔ اے فرزندو! ہمیں خدا کے اس برگزیدہ بندہ کا کچھ پتہ نہیں نام بتانا تو درکنار۔ اس نے تو آج تک اپنی صورت بھی نہیں دکھائی کہ تم کو کچھ نشان دے سکیں۔ الغرض یہ جواب سُن کر وہ یتیم بچے ملول و مایوس ہو کر رہ گئے۔

حضرات اس کا پتہ اکیسویں ماہ رمضان کو چلا جب امیرالمومنین علیہ السلام کا جنازہ گھر سے نکلا لوگوں نے دیکھا بہت سے یتیم بچے اور بیوہ عورتیں ساتھ ہیں اور واہ ابتاہ (واہ) دار ثاہ کے نعرے مارتی چلی جاتی ہیں، بچے فریاد کرتے ہیں۔ اے امیرالمومنین! ہم کو پہلے سے معلوم نہ تھا کہ ہر شب کو ہم کو کھانا پہنچانے والے اور ہمارے حال پر پدرانہ شفقت کرنے والے آپ تھے۔ ہم نے آپ کی شفقتیں دیکھ کر اپنے باپوں کو بھلا دیا تھا! آہ! ہم پر اب رحم کون کرے گا اور ہمارے حال پر آپ کی جیسی شفقت کون کرے گا ان کی فریاد سُن سُن کر لوگوں کے کلیجے منہ کو آنے لگے۔

منقول ہے کہ ایک بار امیرالمومنین علیہ السلام ایک بازار کی طرف سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک عورت کو دیکھا کہ غلہ کی بوری سر پر رکھے چلی جا رہی ہے اور بوجھ زیادہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دور رُک کر دم لیتی ہے آپ فوراً اس کے پاس پہنچے اور فرمایا اے ضعیفہ کیا تیرا شوہر نہیں کہ اس خدمت کو انجام دے۔ اس نے عرض کی کہ میں بیوہ ہوں اس لئے گھر کا سب کام کاج مجھ کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ کا دل تڑپ گیا اور آپ نے اس کا بوجھ اپنے سر پر لاد لیا اور اس کے ساتھ اس کے گھر تک گئے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آپ امیرالمومنین علیہ السلام ہیں۔ جب آپ نے اس کی یہ حاجت براری کر دی تو اس نے اپنے حال پر شفیق پا کر شکریہ ادا کیا۔

حضرت نے فرمایا "اے ضعیفہ میرا دل ابھی تیری خدمت سے سیر نہیں ہوا"

اس نے کہا اے شخص میرے چند چھوٹے چھوٹے بچے ہیں وہ بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ اگر اتنی شفقت میرے حال پر ہو جائے کہ ذرا دیر آپ انہیں بہلائیں تو میں تھوڑا سا آٹا پیس لوں اور روٹی پکا لوں۔ آپ نے فرمایا بچے اپنی ماں سے ہی خوب بہلتے ہیں۔ تو ان کو بہلا میں تیرا سب کام انجام

دے دوں گا۔

جب حضرت وہاں سے چلنے لگے تو اس عورت نے کہا۔ اے بھائی کم سے کم اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔ حضرت نے فرمایا نام سے تجھے کیا کام میں نے جو کچھ کیا ہے خوشنودی خدا کے لئے کیا ہے۔ یہ کہہ کر آپ وہاں سے تشریف لے گئے۔

اتفاقاً ہمسایہ کی ایک عورت حضرت کو کام کاج کرتے دیکھ رہی تھی۔ جب حضرت چلے گئے تو اس نے اپنی ہمسائی سے کہا کم بخت تو جانتی نہیں کہ یہ کون بزرگ ہیں جن سے تو خدمت لے رہی تھی۔ یہ ہمارے بادشاہِ وقت امیر المومنین علی علیہ السلام ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ عورت دوڑی ہوئی حضرت کے قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی۔ اے امیر المومنین مجھے معاف فرمایئے نادانستہ میں نے آپ سے یہ خدمت لی ہے حضرت آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ "اے ضعیفہ! اس کا خیال نہ کر۔ اگر تو میری خدمت سے خوش ہوئی ہے تو خدا سے دعا کر کہ وہ علی سے راضی رہے۔"

حضرات! سنا آپ نے امیر المومنین علیہ السلام کی مہمان نوازی کو آہ! آہ!! جو بزرگ ایسے یتیم پرور تھے۔ ان کے خاندان کے یتیم بچوں پر اشقیائے اُمت نے وہ وہ ظلم کئے کہ سننے والوں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ اس وقت مجھے مسلم بن عقیل کے دو آوارہ وطن بچے یاد آ گئے۔ ہائے ان کے چھوٹے چھوٹے سن اور ان کی بھولی بھولی صورتیں۔ ماں دور باپ سے جدا، آوارہ وطن، دشمن کا ملک نہ کوئی یار نہ مددگار نہ مونس نہ غمخوار ہر وقت دشمن کے ظلم و ستم کا خطرہ جان جانے کا اندیشہ۔ کس سے اپنا درد کہیں کس سے فریاد کریں۔ آہ دونوں بھائی باپ کی شہادت کے بعد کوفہ کے گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرتے تھے۔ ذرا کہیں پتہ کھڑکتا تو ننھے سے دل سینوں میں دھڑکنے لگتے۔ رات سر پر آ گئی اور ان بے چاروں کو کوئی پناہ کی جگہ نہ ملی۔ ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتے۔ ٹھوکریں کھاتے چلے جاتے تھے کہ ایک عورت دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کے پاس جا کر منت و سماجت کرنے لگے۔

اے کنیزِ خدا ہم یتیم و بے کس و بے بس، بے یار و مددگار ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو آج کی رات ہم کو اپنے گھر میں پناہ دے۔ ان کی بھولی بھالی صورتیں اور پریشان حالی پر رحم آ گیا۔ شفقت سے پوچھنے لگی اے بچو تم کون ہو اس پُر آشوب زمانے میں یوں مارے مارے پھر رہے ہو۔ ڈرتے ڈرتے سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگے۔ اے کنیز خدا۔ ہم یتیم بے بس و بیکس و بے یار و مددگار ہیں۔ اگر تو کسی سے ہمارا حال نہ کہے تو اپنا درد دل تجھے سنائیں۔ اس نے کہا تم ڈرو مت جہاں تک ممکن ہو گا تم کو حفاظت سے رکھوں گی۔ جب یہ شفقت دیکھی تو کہنے لگے۔ اے مادرِ مہربان! ہم مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں۔ ہمارے باپ

شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس شہر میں ہمارا کوئی دوست نہیں کہ اس کے یہاں جا کر پناہ لیں۔ کوفہ کا چپّہ چپّہ ہمارا جانی دشمن ہے۔ کہاں جائیں اور کس سے اپنا حال کہیں۔ وہ عورت محبِ اہل بیت تھی۔ جوں ہی یہ سُنا کہ جناب مسلمؑ کے فرزند ہیں تڑپ گئی وہ دونوں کو چھاتی سے لگا کر پیار کرنے لگی اور تسلّی دے کر کہنے لگی اے فرزندو! گھبراؤ مت میرا گھر تمہارا ہی گھر ہے میں تم کو اپنی آنکھوں پر جگہ دوں گی۔

الغرض وہ مومنہ دونوں کو ساتھ لے گئی۔ منہ ہاتھ دھونے کے لئے پانی حاضر کیا۔ پریشان بالوں سے گرد و غبار دُور کیا پھر کھانا لا کر سامنے رکھا۔ بچوں نے کہا ہم کو کھانے کی خواہش نہیں۔ ہمیں کوئی جگہ بتا دے کہ ہم تھکے ماندے پڑ رہیں۔ کئی راتوں سے ہم نہیں سوئے۔ آج دن بھر چلتے چلتے پیر درد کرنے لگے اس نے کہا مجھے صرف اتنا کھٹکا ہے کہ میرا داماد جس کا یہ گھر ہے ابن زیاد کا دوست اور آلِ رسولؐ کا دشمن ہے۔ اگر وہ آ گیا تو معلوم کیا غضب ڈھائے۔ بچوں نے کہا رات زیادہ ہو گئی ہے شاید اب نہ آئے۔

الغرض اس نے ایک حجرہ میں فرش بچھا کر دونوں بچوں سے کہا تم یہاں آرام کرو۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا بچّے تھکے ماندے تو تھے ہی گلے میں باہیں ڈال کر سو رہے۔ نصف رات گزرنے کے بعد حارث ملعون جو اس گھر کا مالک آیا اور غصّے میں اپنے ہتھیار اِدھر اُدھر پھینک دیئے اور فرش خواب پر لیٹ رہا۔ ضعیفہ نے کھانے کے لئے پوچھا۔ اس نے کہا مجھے بھوک نہیں۔ آج تمام دن پسرانِ مسلم بن عقیل کی تلاش میں گھومتا رہا لیکن افسوس وہ میرے ہاتھ نہ لگے اور میں انعام سے محروم رہ گیا۔ وہ کہنے لگی۔ اے شخص اب سو جا۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ الغرض وہ غم میں بھرا ہوا لیٹ رہا۔

اب تھوڑا سا حال بچوں کا سنیئے۔ پہلے چھوٹا بھائی خواب سے چونکا اور بڑے بھائی کو جگا کر کہا کہ میں نے اس وقت بہت ہولناک خواب دیکھا ہے۔ بابا جان! ابھی ابھی یہاں تشریف فرما تھے مجھے چھاتی سے لگا کر کہہ رہے تھے۔ جانِ پدر گھبراؤ مت! اب تم بہت جلد میرے پاس آنے والے ہو۔ بڑے بھائی نے کہا یہی خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔ الغرض دونوں بھائی اپنے باپ کو یاد کر کے رونے لگے۔ مومنین! جب ان کے رونے کی آواز حارث ملعون کے کان میں پہنچی تو چونکا ہوا اور ضعیفہ سے پوچھنے لگا کہ یہ کس کے رونے کی آواز ہے۔ اس نے کہا پڑوس میں کوئی بچّہ رو رہا ہو گا۔ تو اس کا کیوں خیال کرتا ہے۔ اس جواب سے اس کی تسلّی نہ ہوئی۔ شمع روشن کر کے حجرے کے اندر داخل ہوا۔

اس ملعون نے پاس جا کر پوچھا تم کون ہو؟ بچوں نے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہا اے شخص اگر تو ہم پر رحم کرنے کا وعدہ کرے تو ہم تجھ سے اپنا حال بیان کریں۔ اس نے وعدہ کیا۔ بچوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اے شخص ہم مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں۔ بے کس اور غریب الدیار ہیں۔ تیرے گھر میں آ کر پناہ لی ہے۔

اُمید ہے کہ تو ہماری کم سنی پر رحم کرے گا۔

یہ سنتے ہی وہ ملعون مسکرایا اور کہا سبحان اللہ میں تمہاری تلاش میں کئی روز سے مارا مارا پھر رہا ہوں اور تم میرے ہی گھر میں چھپے ہوئے ہو۔ یہ کہہ کر دونوں کے نرم و نازک بازو پکڑے اور بہ جبر کھینچتا ہوا حجرے باہر لایا۔ اس وقت بچوں کی بے تابی دیکھی نہ جاتی تھی۔ بار بار خوشامد کرتے اور بہ منت و زاری کہتے تھے۔ اے شخص ہم یتیم ہیں۔ سیّد ہیں آوارہ وطن ہیں۔ ہماری حالت پر رحم کر۔ ہمارے لئے یتیمی اور غریب الوطنی کا ہی درد بہت کافی ہے۔

ایک طرف تو بچے اس طرح فریاد کر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ ضعیفہ انتہائی خوشامد کر رہی تھی مگر اس شقی نے ایک نہ سُنی اور بچوں کو رسیوں سے باندھ دیا اور چپ چاپ پڑ کر سو رہا وہ بچے تمام رات ستون سے بندھے کھڑے رہے اور وہ زنِ مومنہ بیچاری رات بھر اُن کے پاس بیٹھی روتی رہی۔ جب صبح نمودار ہوئی تو حارث ملعون نے اپنے بدن پر ہتھیار سجائے پھر بچوں کو کھولا! آہ!! ان کے نازک بدنوں پر جا بجا رسی کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ شقی دونوں کے گیسو پکڑ کر گھر سے باہر جانے لگا۔ بچے تڑپ گئے اور ضعیفہ رو رو کر فریاد کرنے لگی اور بے تابانہ بچوں سے لپٹ گئی اور کہنے لگی میں تو اس طرح بچوں کو اپنے گھر سے باہر نہ جانے دوں گی۔ او بدبخت ذرا لالچ میں آ کر آخرت کا دائمی عذاب مول نہ لے۔ اے ظالم یہ سیّد زادے ہیں۔ یتیم ہیں مہمان ہیں ان کو کہاں لئے جاتا ہے۔ وہ شقی یہ بات سُن کر جھنجلایا اور تلوار نیام سے نکال کر اسی وقت مومنہ کا کام تمام کر دیا۔ آہ چھوٹے بچوں نے جب اس مومنہ کا خون بہتے دیکھا تو قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑیں۔

حارث ملعون نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھ کر بہت تیزی سے بچوں کو کھینچا اور گھر سے باہر ہو گیا راستے بھر بچے روتے رہے اور فریاد کرتے چلے جا رہے تھے۔ راہ میں جو کوئی ان کو اس حال میں دیکھتا تھا تڑپ جاتا تھا اور حارث ملعون سے ان کے چھوڑنے کی سفارش کرتا تھا۔ آہ! آہ!! خاندانِ رسولؐ سے اس ظالم کو کیسی عداوت تھی اور مال دنیا پر کس درجہ فریفتہ تھا۔ کسی کی بات کان نہ لگی۔ اور بچوں کو کشاں کشاں لئے چلا ہی گیا تا آنکہ وہ نہر کے کنارے پہنچا۔

بچوں نے اس سے پوچھا اے شخص اتنا تو بتا دے کہ اب تیرا کیا ارادہ ہے۔ اس نے کہا اب میں تم کو یہاں قتل کر دوں گا اور تمہارے سر ابن زیاد کے پاس لے جاؤں گا تاکہ وہ مجھے انعام و اکرام سے مالا مال کرے۔

بچوں نے کہا اگر تو مال و زر کی طمع میں ایسا کرتا ہے تو ہم کو غلام بنا کے جہاں چاہے بیچ لے۔ ہم

ایسی جلس نہیں کہ کوئی ہمارا خریدار نہ ہو۔
اس نے کہا۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔ بچوں نے کہا اگر یہ منظور نہیں تو ہمارے ساتھ مدینہ کو چل ہم اپنی مادرِ گرامی اور عزیزوں سے تیری شفقت کا حال بیان کر کے تجھے اتنا مال دلوا دیں گے تو اپنی تمام عمر آرام سے بسر کرے۔ اس نے کہا مجھے یہ بھی منظور نہیں۔ آہ! مومنین جب بچوں نے دیکھا کہ وہ شقی کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو اس سے بہ منت کہنے لگے۔ اچھا اگر تجھے ابن زیاد ہی سے انعام حاصل کرنا ہے تو ہمیں زندہ اس کے سامنے لے جا۔
اس نے کہا۔ وہ تمہیں زندہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس نے تمہارے سر لانے کا حکم دیا ہے۔
آہ! یہ سنتے ہی معصوم بچوں کے ننھے ننھے دل سینوں میں دھڑکنے لگے۔ اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ ایک بھائی دوسرے سے مل کر رونے لگا۔
اس شقی نے بہ جبر دونوں کو جدا کیا اور کہا بس رو چکے اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔
بڑے بھائی نے کہا اے ظالم قتل سے پہلے ہمیں اتنی مہلت دے کہ دو رکعت نماز ادا کر لیں
اس نے تیوری بدل کر کہا۔ کہ نمازوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ یہ نمازیں تمہاری موت کو نہیں روک سکتیں۔
بچوں نے کہا اے شخص! ہم موت کو ٹالنے کے لئے نماز نہیں پڑھ رہے۔ بلکہ سجدہ میں سر دینا چاہتے ہیں اور موت سے قبل یادِ الٰہی کرنا ہمارے خاندان کا آئین ہے۔
اس نے کہا میں تمہارے خاندانی آئین کو پسند نہیں کرتا۔
بڑے بھائی نے کہا اے ظالم! تو نے ہمارا کوئی کہنا اب تک نہیں مانا۔ اچھا اتنا تو مان لے کہ پہلے مجھے قتل کر ڈال۔ کیونکہ اپنے چھوٹے بھائی کا بہتا ہوا خون مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ چھوٹے نے کہا کہ پہلے میرا سر قلم کریں اپنے بڑے بھائی کا خون کن آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔
الغرض اس شقی نے اپنی تلوار میان سے نکال کر بڑے بھائی کا سر تن سے جدا کیا اور اس کی لاش کو دریا میں پھینک دیا۔ لکھا ہے کہ وہ لاش اس وقت تک پانی کے اوپر تیرتی رہی جب تک چھوٹے بھائی کی لاش پانی میں نہ پھینکی گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں ایک جگہ ہوئے اور بھائی نے بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور دونوں لاشے پانی میں بہہ گئے۔
منقول ہے کہ جب حارث ملعون دونوں بچوں کے خاک و خون میں اٹے ہوئے سر ابن زیاد بدنہاد

کے سامنے آیا اس نے جب یہ معصوم سر دیکھے تو اپنی انتہائی شقاوت اور سنگدلی کے باوجود ان کی بھولی بھالی صورتیں دیکھ کر تڑپ گیا اور کہنے لگا او ظالم یہ کس کے معصوم بچے ہیں جن کو ذبح کر کے لایا ہے۔ اس نے کہا اے امیر یہ تو مسلم بن عقیل کے فرزند ہیں۔ میں نے تیری خوشنودی کیلئے یہ کام کیا ہے جو دنیا میں ظالم سے ظالم انسان بھی نہ کر سکتا۔ اب حسب وعدہ اپنے انعام واکرام سے مجھے مالامال کر۔ اس نے غضب ناک ہو کر کہا اے شقی تو کیسا شقی القلب ہے کہ ان کم سن بچوں پر تجھے ذرا رحم نہ آیا۔ اے شخص میں نے کب ان کے قتل کرنے کا حکم دیا تھا اگر تو جیتا پکڑ لاتا تو میں ان کی کم سنی پر رحم کھا کر انہیں قتل نہ کراتا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

آٹھویں مجلس

تفسیر آیہ مودت و حال شب عاشور

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (٢٣)

(۲۳/۴۲ شوریٰ)

ترجمہ: (اے رسول) کہدو میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہلبیتؑ) کی محبت کے سوا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اور جو نیکی کرے گا ہم اس کی خوبی میں اضافہ کردیں گے۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور قدرداں ہے۔

مفسرین نے آیت کی شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک بار کچھ لوگ حضرت رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ اے خدا کے برگزیدہ رسولؐ آپ نے تبلیغ رسالت میں بڑے بڑے مصائب اُٹھائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کو کچھ عوض اس کا دیں۔ ہماری جاگیریں ہمارا مال و دولت حاضر ہے۔ ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہر شخص اپنی دولت میں سے ۱/۴ حصّہ آپ کی خدمت میں پیش کر دے۔ اُمید ہے کہ آپ اس کو منظور فرمائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا بغیر وحی الٰہی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد آپ پر وحی ہوئی حضرت نوحؑ نے بھی بحکم خدا اجر رسالت طلب فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (٧٢)

۷۲/۱۰ سورہ یونس

ترجمہ: اگر تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا تو میرا کیا بگاڑ دگے میں تم سے تبلیغ کی کوئی اُجرت تو مانگتا نہیں میرا اجر تو اللہ پر ہے۔ اسی کی طرف سے مجھے حکم دیا گیا ہے۔

حضرات ہمارے رسول کا جو اجر رسالت معین کیا گیا ہے وہ رسول کی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ وہ ایک ایسا اجر ہے جس کو ہر مسلمان امیر ہو یا غریب، مرد ہو یا عورت، بیمار ہو یا تندرست، سفر میں ہو یا حضر میں ہر وقت باآسانی ادا کر سکتا ہے۔ پھر اس اجر میں خاص خوبی یہ ہے کہ اجر دینے والے کا اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ سراسر فائدہ ہے۔ کیونکہ رسول خدا کے وہ ذوی القربیٰ جن کی محبت اجر رسالت قرار دی گئی ہے، معصوم بندے ہیں۔ ان کی ہدایت میں ضلالت کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مسلمانوں کو بے شک اسی صراط مستقیم پر چلانے والے تھے جس پر ثابت قدم رہنے کے لئے ہم پانچ وقت کی نماز میں خدا سے دُعا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حدیث الثقلین میں حضرت رسولؐ خدا نے صاف طور پر یہ امر بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ حضرت فرماتے ہیں۔ ایها الناس میں تم میں دو برگزیدہ چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک کتاب خدا اور دوسرے میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔ پس اگر تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے تو ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہونے والے نہیں تا ایں کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔

خداوند عالم نے اجر رسالت جو ذوی القربیٰ کی محبت کو قرار دیا اس میں راز یہ ہے کہ محبت مقتضی اطاعت ہے یعنی جب لوگ ذوی القربیٰ رسول کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دیں گے تو لامحالہ ان کی اطاعت بھی کریں گے اور جب اطاعت کریں گے تو ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کہیں بہتر ہو سکتا۔ کیونکہ اس میں قیامت تک کے لئے مسلمانوں کی ہدایت کا بندوبست ہے اگر مال دنیا کو اجر رسالت قرار دیا جاتا تو وہ روحانی انوار و برکات کا صحیح معنی ہیں۔ اجر نہیں قرار پا سکتا تھا۔ جو حضرت رسولِ خدا نے تیئیس سال کے اندر انتہائی محنت و مشقت کے ساتھ مسلمانوں کو پہنچائے تھے۔ دوسرے انسان مال کی طرف بالطبع حریص ہے اگر اس کو اجر رسالت قرار دیا جاتا تو جس طرح خمس و زکوٰۃ سے بچنے کے لئے حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں۔ اس طرح ادائے اجر رسالت میں بھی چہ میگوئیاں کرتے۔ علاوہ بریں یہ اجر ایک محدود حالت میں ہو جاتا۔ یعنی صرف مالدار لوگ ہی اس کو ادا کر سکتے اور غریب لوگ اس سعادت سے محروم رہتے۔ خدا نے چاہا کہ ایسے رسول کی رسالت کا اجر جو کافۃ الناس کی طرف بھیجا گیا ہو۔ ایسی چیز کو قرار نہ دیا جائے جس کو کوئی تو ادا کر سکے۔ اور کوئی نہیں۔ دوسرے اگر مال دینا اجر رسالت قرار پاتا تو عہد رسالت کے لوگ اس کو خدمت رسول میں پیش کر کے رہ جاتے اور دوسروں کو اس میں شرکت کی سعادت نصیب

نہ ہوتی برخلاف ذوی القربیٰ کی محبت کے کہ قیامت تک ہر مسلمان ہر وقت اور ہر زمانہ میں اس اجر کو بہتر سے بہتر صورت میں ادا کر سکتا ہے۔

۱۲۷/۲۶ شعراء

قرآن مجید میں اور انبیاء کے اجر رسالت کا بھی ذکر ہے جو ان الفاظ میں ہے۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یعنی میرا اجر رسالت صرف اللہ پر ہے جو تمام عالموں کو پالنے والا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے پیغمبر آخر الزماں کے اور کسی نبی کا اجر رسالت اس کے ذوی القربیٰ کی محبت کو قرار نہیں دیا گیا جس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ دیگر انبیاء کے ذوی القربیٰ میں عمومیت کے ساتھ یہ صلاحیت نہ تھی کہ ان کی محبت اجر رسالت قرار پاتی۔ یا یہ وجہ ہو کہ اور انبیاء کے بعد سلسلۂ نبوت جاری رہا ہو۔ لیکن حضورؐ پر چونکہ نبوت ختم ہو گئی۔ لہٰذا آپؐ کے مشن کی تکمیل کے لئے کچھ ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو عصمت کے زیر سایہ سلسلۂ ہدایت جاری رکھ سکیں۔ اور فطری قاعدے کے مطابق جب تک ان کی محبت نہ ہو گی۔ ان کی اطاعت نہ ہو گی اور جب اطاعت نہ ہو گی تو مشن کی تکمیل نہ ہو گی۔

مذکورہ بالا آیت میں ذوی القربیٰ سے مراد جناب فاطمہ زہراؑ حضرت علی مرتضیٰؑ اور ان کے بعد گیارہ امام ہیں جو اہل بیت اور عترتِ رسول بھی کہلاتے ہیں۔ قیامت تک ہدایت خلق ان ہی سے وابستہ ہے فخر الدین رازی اور دوسرے علمائے اہل سنت نے لکھا ہے کہ اہل بیت رسول پانچ باتوں میں شریک رسولؐ ہیں اول طہارت، دوسرے وجوب مودت، تیسرے صلوٰۃ چوتھے سلام اور پانچویں تحریم صدقہ ابو طلحہ شافعی نے کتاب مطالب السئول فی مناقب آل رسولؐ میں لکھا ہے کہ صحاح و مسانید میں سعید بن جبیر سے اور انہوں نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب آیہ مودت نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ یہ کون ہیں؟ جن کی محبت واجب کی گئی ہے۔ فرمایا علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے دونوں بیٹے۔ ثعلبی نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ نے نظر کی علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کی طرف اور فرمایا ان سے جنگ کرنے والا مجھ سے جنگ کرنے والا اور ان سے صلح کرنے والا مجھ سے صلح کرنے والا۔ جاننا چاہیے کہ یہ لوگ جن کی مودت کا اس آیت میں سوال کیا گیا ہے وہ ذوی القربیٰ ہیں۔ پس ہر وہ شخص کہ متصف ہو قربیٰ سے وہ منصوص علیہا مودت کا مستحق ہے۔ کیونکہ جو حکم کسی سبب پر مرتب ہو۔ جہاں کہیں یہ سبب موجود ہو گا وہ بھی ہر عمل میں ثابت ہو گا۔ اور اگر سبب مودت میں شریک ہو تو ان کے درجات کو دیکھا جائے گا جو رسول اللہ سے زیادہ قریب ہو گا اس کا سبب مودت میں زیادہ قوی ہو گا۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ولایت کا درجہ دیگر درجات سے زیادہ راجح ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آئمہ کو زیادتی منقبت اور علو مراتب میں جو حصہ ملا ہے وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی وجہ سے ملا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جناب فاطمہ حضرت رسولؐ خدا کو سب سے زیادہ

محبوب تھیں۔ اولاً یہ آپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ دوسرے آپ بہ علم نبوت جانتے تھے کہ ان سے اور ان کی نسل سے اسلام کی کیسی بہترین خدمت ہونے والی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی شخص کی محنت کا اجر یا تو خود اس شخص کو ملتا ہے یا اس کی اولاد کو تمام کنبہ میں تقسیم نہیں ہوا کرتا۔ کس قدر عقلی فیصلے سے دُور ہے یہ بات کہ ذوی القربیٰ میں تمام قریش کو شامل کر لیا جائے جس میں فساق و فجار ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ جب کہ ذوی القربیٰ رسولؐ کی مودت ایمان کا جزو ہے بلکہ اصل ایمان ہے اور یہ محبّت اجر رسالت ہے تو جن لوگوں نے اجر رسالت ادا نہیں کیا ان لوگوں نے گویا رسول سے بغاوت کی اور جن لوگوں نے ایسا کیا انہوں نے گویا رسول کو رسولؐ ہی نہیں مانا۔ لہٰذا تمام اعمال ان کے بیکار گئے۔ اسی لئے شاعر نے کہا ہے۔ ع

بے حُبِ اہل بیت عبادت حرام ہے

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسولِ خداؐ نے فرمایا اے علیؑ! تم کو دوست نہ رکھے گا مگر مومن اور تم سے عداوت نہ رکھے گا مگر منافق۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے حسنین علیہم السلام کے متعلق فرمایا اے خدا میں ان دونوں کو دوست رکھتا ہوں تو بھی ان کو دوست رکھ جو ان کو دوست رکھے۔ یہ ذوی القربیٰ جن کی محبّت کو واجب قرار دیا گیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر شریعت اسلام کی حفاظت کا دار و مدار ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ حمایت دین میں سب سے پیش پیش رہے۔ جب کوئی دین الہٰی پر سخت بار آکے پڑا ان ہی حضرات نے آگے بڑھ کر اس بلا کو روکا۔ اگر ان حضرات میں ہدایت کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو حضرت رسولِ خدا کبھی ہرگز اس درجہ محبوب نہ رکھتے۔

افسوس مسلمانوں کی اس حالت پر کہ زبان سے تو یہ کہتے تھے کہ ہم رسولؐ خدا کا اتباع کرتے ہیں۔ لیکن ان کا عمل، عمل رسولؐ کے بالکل خلاف تھا۔ بخدا اگر مسلمان ذرا بھی اس اُلفت و محبّت کا لحاظ کرتے جو حضرت رسولِ خداؐ کو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ تھی تو کربلا کا قیامت خیز ہنگامہ کبھی پیش نہ آتا۔

آہ! آہ!! جس حسین کو اشقیائے اُمّت نے اس بے دردی سے شہید کیا وہ وہی حسینؑ تھے جن کی محبّت خدا نے مسلمانوں پر واجب کی تھی وہ وہی حسینؑ تھے جن کو رسولؐ خدا نے اپنی چھاتی پر رکھ کر پالا تھا۔ جن کے لئے روز عید حضورؐ اونٹ بنے تھے یہ وہی حسینؑ تھے جن کو حضرت رسولؐ خدا اگر ایک دن نہ دیکھتے تو بے چین ہو جاتے۔ یہ وہی حسینؑ تھے جن کو شانوں پر بٹھا کر حضورؐ صحابہ کے مجمع میں تشریف لاتے تھے۔

منقول ہے کہ ایک بار آنحضرتؐ سے عید کے روز امام حسین علیہ السلام نے کہا۔ نانا جان آج عید کا دن ہے۔ مدینہ میں سب بچے اپنے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر عید گاہ کو جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی اونٹ نہیں کہ اس پر سوار ہو کر جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا اے حسینؑ تو آزردہ نہ ہو۔ تیرا اونٹ میں ہوں۔ یہ کہہ کر حسین کو اپنے کندھوں پر سوار کیا۔ پھر حسین نے کہا نانا جان اور سب بچے تو اپنے اپنے اونٹوں کی نکیلیں پکڑے ہیں۔ ہمارا اونٹ کیسا ہے کہ اس کی نکیل ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ حضرتؐ نے فوراً اپنے گیسوئے مبارک حسینؑ کے ہاتھوں میں دے دیئے اور فرمایا بیٹا! لو تمہارے اونٹ کی نکیل یہ ہے۔ پس حسینؑ جدھر گیسوؤں کو حرکت دے کر چلنے کا اشارہ کرتے تھے۔ حضورؐ فوراً اسی طرف مڑ جاتے تھے۔ پھر حسینؑ نے کہا نانا جان سب کے اونٹ بولتے ہیں۔ ہمارا اونٹ کیسا ہے کہ بولتا ہی نہیں۔ یہ سن کر حضرتؐ نے عف عف اپنی زبانِ مبارک سے کہنا شروع کیا۔ پھر رسولؐ اکرم نے اپنے پیارے نواسے حسینؑ کو شانوں پر بٹھائے باہر تشریف لائے۔ دروازے پر عمرؓ کھڑے تھے کہنے لگے اے حسینؑ! تمہارا مرکب کیا ہی اچھا ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا اے عمرؓ مجھ سے بھی تو یہ کہو کہ اے رسولؐ آپ کا راکب کیا ہی اچھا ہے۔

مروی ہے کہ ایک بار حضرت رسولؐ خدا مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔ کہ امام حسین علیہ السلام وہاں پہنچ گئے۔ بچے تو تھے ہی سجدہ کی حالت میں آنحضرتؐ کی پشتِ مبارک پر سوار ہو گئے۔ حضرتؐ نے ذکر سجدہ کو طول دینا شروع کیا یہاں تک کہ آپ نے ستر مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ ارشاد فرمایا اور جب تک حسینؑ خود پشتِ مبارک پر سے نہ اترے برابر سجدہ میں ذکر فرماتے رہے۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو کسی صحابی نے پوچھا۔

"یا رسولؐ اللہ آج حسینؑ نے آپؐ کو بڑی زحمت دی۔ میں نے کئی بار چاہا کہ آپ کی پشتِ مبارک سے ان کو ہٹا دوں۔ لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ شاید آپ کو ناگوار ہو۔ فرمایا اے شخص جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہمارے بڑوں پر بھی رحم نہیں کرتا اے شخص تو حسینؑ کے مرتبے کو اتنا نہیں جانتا جتنا میں جانتا ہوں۔

منقول ہے کہ ایک روز حضرت رسولؐ خدا اپنے زانو پر امام حسن کو بٹھائے ان کے دہنِ مبارک پر بوسے دے رہے تھے کہ امام حسینؑ بھی آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ نے ان کو بھی زانو پر بٹھا لیا اور ان کے گلوئے مبارک کو چومنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد حسینؑ ملول ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی والدہ گرامی سے جا کر کہا۔ اماں جان ذرا میرے منہ کو تو سونگھیے کیا اس سے بدبو آتی ہے۔ جناب سیدہؑ نے سونگھ کر فرمایا بیٹا! تمہارے منہ میں بدبو کا نام بھی نہیں۔ عرض کی پھر کیا وجہ ہے کہ نانا جان بھائی حسنؑ کا تو منہ چومتے

ہیں اور میرا گلا اب میں ناناجان کے پاس کبھی نہ جاؤں گا فرمایا۔ بیٹا میرے ساتھ چلو۔ باباجان سے میں اس کا سبب معلوم کروں گی۔ پس امام حسینؑ کا ہاتھ پکڑے ہوئے حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کرنے لگیں باباجان میرا حسینؑ آپ سے اس بات پر رنجیدہ ہے کہ آپ اس کا منہ کیوں نہیں چومتے۔ آہ مومنین یہ سننا تھا کہ حضرت رسولؐ خدا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمانے لگے۔ اے نور دیدہ! اس کی وجہ نہ پوچھو۔ اس کے سننے سے تجھے قلق ہوگا۔ جناب سیدہؑ نے عرض کی اب اس کے سننے سے میرا دل اور زیادہ بے چین ہو رہا ہے جلد بیان فرمایئے تب حضور اکرمؐ فرمانے لگے اے بیٹی! میں اس لئے چومتا ہوں کہ میری اُمت کے اشقیا اس کو زہر دے کر شہید کریں گے اور اس کے کلیجے کے ٹکڑے منہ سے باہر آئیں گے اور حسینؑ کا گلا اس لئے چومتا ہوں کہ اس کو تین دن کا بھوکا پیاسا گوسفند قربانی کی طرح ذبح کیا جائے گا۔ اس کا گلا خنجر ظلم سے کاٹا جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا اے بیٹی۔ اس کا قصور کچھ نہ ہوگا، بنی اُمیہ محض رشک و حسد کی وجہ سے قتل کریں گے۔

مومنین جس وقت کی حضرت رسولؐ خدا نے خبر دی تھی۔ وہ ۶۱ھ کا محرم تھا۔ افسوس صد افسوس جس حسینؑ کی محبت خدا نے اجر رسالت قرار دی تھی۔ جس حسینؑ کو رسولؐ خدا نے جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ ایک دن وہی حسینؑ کربلا میں نرغہ اعدا میں گھرے ہوئے طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھا رہے تھے لاکھوں اشقیا ان کے قتل پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ ساتویں محرم سے امام مظلوم اور ان کے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا تھا۔ رہ رہ کر خیموں سے آواز العطش العطش بلند ہو رہی تھی۔ بی بیوں کی حالت حد درجہ غیر تھی۔ جب ننھے ننھے بچے پیاس کی شدت سے فریاد کرتے تھے تو سننے والوں کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ہائے نازوں کے پلے بچے کربلا میں آ کر کیسی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

کتاب کنز المذاہب واقدی میں ہشام بن محمد سے منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ گروہ بدشعار کسی طرح ان کے قتل سے باز نہیں آتا تو بغرض اتمام حجت آپ قرآن کو لے کر اس گروہ کے سامنے تشریف لائے اور فرمایا۔ اے قوم یہ کتاب خدا تمہارے اور ہمارے درمیان حکم ہے اس کو پڑھو اور سمجھو کہ خدا نے ہماری مودت تم پر فرض کی ہے۔ ہماری اطاعت کا تم کو حکم دیا ہے۔ اے قوم بتا کہ میرا خون کیوں حلال سمجھا گیا ہے۔ ایہا الناس کیا میں تمہارے رسولؐ کا نواسہ نہیں ہوں۔ کیا تم نے میرے جدا مجد کی یہ حدیث نہیں سُنی کہ حسنؑ و حسینؑ جوانان جنت کے سردار ہیں۔

آہ! کیسے سنتے تھے۔ وہ لوگ کہ حضرت کا یہ کلام سُن کر کہنے لگے۔ ہم یہ نہیں جانتے ہیں لیکن جب تک آپ یزید بن معاویہ کی بیعت نہ کریں گے۔ ہم ہرگز آپ کے قتل سے دست بردار نہ ہوں گے یہ سُن کر امام مظلوم

لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہتے ہوئے خیمہ گاہ کی طرف واپس ہوئے۔ یہ واقعہ نویں محرم کا ہے اسی تاریخ کو بعد زوال شمر ملعون لشکر گاہ حسینی کی طرف بڑھا اور بآواز بلند کہنے لگا کہاں ہیں میری بہن کے فرزند عبداللہ جعفر و عباس ذرا دیر کے لئے میرے پاس آئیں کہ میں ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جب کسی ناصر حسین نے جناب عباسؑ کو یہ خبر سنائی تو آپ نے فرمایا کہ اس شقی سے جا کر کہہ دو کہ ہم تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتے ہمارے تیرے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ جب امام مظلوم کو معلوم ہوا کہ عباسؑ اس سے بات کرنے پر تیار نہیں تو آپ نے بلا کر فرمایا کہ اے بھائی یہ امر مروت کے خلاف ہے کہ تم کو بلائے اور تم نہ جاؤ۔ اگرچہ یہ مرد فاسق و فاجر ہے مگر رشتہ دار ہے۔ مناسب ہے کہ اس کے پاس جا کر معلوم کرو کہ وہ کیا کہتا ہے۔ حکم امام سن کر جناب عباس مع اپنے بھائیوں کے شمر ملعون کے پاس گئے۔ اور پوچھا کیا کہنا چاہتا ہے اس بے حیا نے کہا اے میری بہن کے فرزندو میں نے ابن زیاد اور پسر سعد سے تمہارے لئے امان حاصل کر لی ہے پس تم کو لازم ہے کہ میرے ساتھ چلو اور حسینؑ کا ساتھ دے کر خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اگر تم میرے ساتھ چلو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ پسر سعد سے سفارش کر کے لشکر کی سرداری دلوا دوں گا یہ سننا تھا کہ جناب عباس غصہ سے کھر کھر کانپنے لگے اور اسے جھڑک کر فرمایا۔

تَبَّتْ يَدَاكَ وَ لُعِنَ مَا جِئْتَ بِهٖ مِنْ اَمَانِكَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ اَتَأْمُرُنَا اَنْ نَتْرُكَ اِمَامَنَا وَ سَيِّدَنَا الْحُسَيْنَ بْنَ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ وَ نَدْخُلَ فِيْ طَاعَةِ اللُّعَنَاءِ وَ اَوْلَادِ اللُّعَنَاءِ اَتُؤْمِنُنَا وَ ابْنُ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَا اَمَانَ لَهٗ!

تیرے ہاتھ قطع ہوں اور اے دشمن خدا تیرے امان پہ لعنت تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اپنے امام اور سردار پسر فاطمہ زہرا کو چھوڑ دیں اور ایک مرد فاسق کی اطاعت میں داخل ہو جائیں کیا تو ہمیں امان دیتا ہے اور فرزند رسول کے لئے امان نہیں۔

کتاب تبر المذاہب میں ہے کہ شمر یہ جواب سن کر غضب ناک ہوا اور اس نے واپس جا کر عمر سعد سے کہا کہ اب حسینؑ پر حملہ میں دیر نہ کرنی چاہیے۔ ابھی لشکر کو حکم دے کہ یکبارگی حملہ کر کے ان سب کا خاتمہ کر دیں چنانچہ شمر کے ورغلانے سے پسر سعد اپنے خیمے سے نکل کر لشکر میں گیا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ اے لشکر خدا اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ میں تم کو جنت کی بشارت دیتا ہوں۔ یہ سنتے ہی تمام لشکر بدن پر ہتھیار سجا کر حملے کے لئے تیار ہو گیا۔

امام حسین علیہ السلام اس وقت خیمے کے دروازے پر تشریف فرما تھے کہ یکایک آپ نے دیکھا کہ لشکر

یزید گھوڑے بڑھائے چلا آرہا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت اٹھ کھڑے ہوئے اور جناب عباس کو بلا کر فرمایا تم فوراً کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بڑھو اور ان ظالموں سے پوچھو تمہارے ادھر آنے کا سبب کیا ہے۔ چنانچہ جناب عباس مسلح سوار لے کر جن میں ہاشمی نوجوانوں کے علاوہ جناب زہیر بن قین اور حبیب ابن مظاہر بھی تھے روانہ ہوئے اور لوگوں کی راہ روک کر کہا۔ کیا ارادہ ہے۔؟ انہوں نے کہا ہمارے امیر کا حکم ہے کہ اوّل تو ہم تم سے بیعتِ یزید کا اقرار لیں اور اگر نہ مانو تو جنگ کر کے تم میں سے ایک ایک کو قتل کر دیں۔

جناب عباس نے فرمایا ٹھہرو تمہارا مقصد معلوم ہو گیا میں اپنے بھائی ابو عبداللہ الحسینؑ کی خدمت میں جا کر یہ بات عرض کرتا ہوں۔ یہ سن کر وہ ستم شعار رک گئے اور حضرت عباسؑ گھوڑا بڑھا کر امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں کا قول بیان کیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ اے بھائی تم ان لوگوں کے پاس جاؤ اور جہاں تک ممکن ہو کہہ سن کر ان لوگوں سے ایک رات کی مہلت اور مانگو کہ ہم یہ رات عبادتِ الٰہی اور دعا و استغفار میں بسر کریں۔ پس جناب عباس پھر اس قوم کی طرف واپس ہوئے اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی خواہش بیان کی۔

بروایت منتخب عمر سعد نے شمر ملعون سے پوچھا۔ تیری کیا رائے ہے مہلت دی جائے یا نہیں۔ اس ملعون نے کہا۔ میں امیر ہوتا تو ہرگز مہلت نہ دیتا۔ یہ سن کر عمرو بن حجاج نے کہا۔ اے شمر وائے ہو تیرے اوپر۔ بخدا اگر یہ لوگ ترک دیلم کے کفار بھی ہوتے اور ہم سے مہلت مانگتے تو ہم ضرور قبول کر لیتے۔ چہ جائیکہ یہ سب آلِ محمدؐ ہیں اگر ایک رات کی مہلت مانگتے ہیں تو اس کے منظور کرنے میں کیوں تامل ہے۔ یہ سن کر پسر سعد کو شرم آئی اور جناب عباسؑ سے کہنے لگا۔ اچھا حسینؑ سے جا کر کہہ دیجئے کہ میں نے ان کو ایک رات کی مہلت دی۔

حضرات اصحاب امام علیہ السلام کیسے بہادر اور صاحب جراءت و ہمت تھے کہ جب یہ خبر ملی کہ صبح کو جنگ ہونا طے پا گیا ہے تو شوقِ شہادت میں رنگ ان کے چہروں کے نکھر گئے اور ایک دوسرے سے اس طرح خوش ہو کر ہم کلام ہونے لگے۔ گویا روزِ عید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے نیک باوفا صاحبانِ ایمان متقی اور پرہیزگار اصحاب امام علیہ السلام کو ملے تھے نہ کسی نبی کو ملے اور نہ رسولؐ کو ملے یہاں تک حضرت رسولِ خداؐ کو بھی ایسے بہادر اور باوفا اصحاب کب تھے۔ جنگ احد میں باوجودیکہ آپ فتح کی بشارت سُنا رہے تھے پھر بھی لوگ آپ کو میدان میں تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور امام مظلوم نے بار بار یہ فرمایا تھا کہ روزِ عاشور میرے ساتھیوں میں کوئی نہ بچے گا۔ پھر بھی ان میں سے کسی نے امام کا دامن

اپنے ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ کسی شاعر نے ان کی شجاعت و ہمت کی تعریف میں خوب کہا ہے ؎

قَوْمٌ اِذَا نُوْدُوْا لِدَفْعِ مُلِمَّةٍ ۔۔۔ وَالْخَيْلُ بَيْنَ مُدَعَّسٍ وَمُكَرْدَسِ
لَبِسُوا الْقُلُوْبَ عَلَى الدُّرُوْعِ وَاَقْبَلُوْا ۔۔۔ يَتَهَافَتُوْنَ عَلٰى ذِهَابِ الْاَنْفُسِ

یعنی سبحان اللہ کیا شجاع و بہادر تھے انصار و اقربائے حسین کہ جب مصیبت میں ان کو آواز دی گئی کہ فرزندِ رسولؐ کی نصرت کو چلو تو انہوں نے فوجوں کی کثرت کا خیال نہ کیا اور فوراً اپنے قلوب کو اپنی زرہوں پر پہن کر مقابلے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یعنی ان کے دل ایسے مطمئن تھے کہ مضبوطی میں لوہے سے بھی بڑھ گئے تھے۔ اور جان دینے میں اس طرح ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔ حضرات جب ہی تو ان کا یہ مرتبہ ہے کہ معصوم زیارتِ عاشورہ میں فرماتے ہیں۔

اَلسَّلَامُ عَلٰى اَنْصَارِ اَبِيْ عَبْدِ اللّٰهِ بِاَبِيْ اَنْتُمْ وَاُمِّيْ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضُ الَّتِيْ فِيْهَا دُفِنْتُمْ وَفُزْتُمْ فَوْزًا عَظِيْمًا فَيَا لَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔

(یعنی سلام ہو میرا ابوعبداللہ الحسینؑ کے انصار پر میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں۔ تم پاک ہو گئے اور وہ زمین بھی پاک ہو گئی جس میں تم دفن ہوئے اور تم کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور تمہارے درجے پر فائز ہوتا اللہ اکبر اس مرتبے کا کیا کہنا کہ معصوم اس کی آرزو کرتے ہیں۔

ابن شبیب سے منقول ہے کہ ایک روز میں امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ مولا کیسے خوش نصیب تھے وہ لوگ جنہوں نے امام حسینؑ کے ساتھ شہادت پائی۔ مولا کوئی صورت ایسی بھی ہے کہ ہم لوگ بھی نصرتِ حسین علیہ السلام کا ثواب حاصل کر سکیں۔ فرمایا ہاں صدقِ دل سے میرے جدِّ مظلوم کو یاد کیا کرو اور کہا کرو يَا لَيْتَنِيْ مَعَكَ يَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ لے ابوعبداللہ میں کاش آپ کے ساتھ ہوتا پس خدائے تعالیٰ تم کو نصرتِ حسین علیہ السلام کا ثواب عطا کرے گا۔ پھر حضرت نے فرمایا اس کلمہ کا ثواب اس لئے ہے کہ میرے جدِّ مظلوم روزِ عاشورہ اپنے دوستوں کو مخاطب کر کے مقامِ شوق میں اس طرح فرماتے تھے ؎

لَيْتَكُمْ فِيْ يَوْمِ عَاشُوْرَا جَمِيْعًا تَنْظُرُوْنِيْ
كَيْفَ اَسْتَسْقِيْ لِطِفْلِيْ فَاَبَوْا اَنْ يَرْحَمُوْنِيْ

یعنی اے میرے شیعو! کاش تم دیکھتے کہ میں نے اپنے شش ماہی بچے کے لئے کس طرح اس قوم جفاکار سے پانی مانگا تھا لیکن انہوں نے مجھ پر رحم کھانے سے انکار کر دیا۔ منشا امام علیہ السلام کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آقائے مظلوم نے اپنا ہمدرد سمجھ کر کربلا میں ہم کو اس طرح یاد کیا تو ہمارا بھی فرض ہے کہ حضرت کی آواز پر لبیک کہیں اور حضرت کی نصرت کی آرزو کرتے رہیں۔

الغرض اصحاب حسین علیہ السلام نے روز عاشورہ وہ کام کیا کہ دنیا حیرت میں آگئی۔ منقول ہے کہ شب عاشور امام علیہ السلام نے اپنے اصحاب کو ایک خیمہ میں جمع کر کے، فرمایا۔ اے باایمانو! تم نے اب تک جو ہمدردی میرے ساتھ کی ہے خدا تم کو اس کی جزا دے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے۔ کہ ہمارے اور اس قوم جفاکار کے درمیان اب صلح کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ہم نے صرف ایک رات کی مہلت ان سے طلب کی ہے۔ صبح کو ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ہے۔ میں تم کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ بلکہ صاف بتا دیتا ہوں کہ کل میں اور میرے ساتھی شہید کر دیئے جائیں گے۔ یہانتک کہ میرا شیرخوار بچہ بھی قتل ہو جائے گا۔ سوائے میرے فرزند علیل علی ابن الحسینؑ کے کوئی باقی نہ رہے گا۔ پس میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری وجہ سے ہلاک ہو۔ میں نے اپنی بیعت تم لوگوں کی گردنوں سے اٹھا لی ہے۔ میں بخوشی اجازت دیتا ہوں جس کا دل چاہے اس پردہ شب میں چلا جائے کہ ابھی راہیں کھلی ہیں اور بہتر ہو کہ میرے اقرباء میں سے ایک ایک کو ساتھ لے لے۔ کیونکہ یہ اشقیاء صرف میرے ہی خون کے پیاسے ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ اگر تم یہاں رہ گئے اور کل میری آواز استغاثہ سن کر میری مدد نہ کی تو خداوند عالم تم کو اندھے منہ جہنم میں دھکیل دے گا۔

یہ فرما کر آپ نے اس شمع کو گل کر دیا جو خیمہ میں روشن تھی۔ تاکہ جانے والوں کو شرم نہ آئے اور منہ چھپائے چلے جائیں۔ یہ کلام سن کر کچھ لوگ تو چلے گئے اور جو کامل الایمان اور ثابت قدم تھے۔ وہ رونے لگے۔ اور ہاتھ باندھ کر عرض کی یا ابن رسول اللہؐ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ ایک جان کیا چیز ہے اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو آپ کے قدموں پر نثار کر دیں۔ اے سبط! آقا ہمارے لئے آپ کی نصرت میں جان دینے سے زیادہ اور کوئی سعادت نہیں ہو سکتی۔ ہم آخر وقت تک آپ کا ساتھ دیں گے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا:

جَزَاکُمُ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاء

بیشک تمہاری وفاداری اور حق پرستی سے یہی امید ہے۔

جناب سکینہ بنت الحسین راوی ہیں کہ جب میرے پدر بزرگوار اصحاب کے مجمع میں یہ فرما رہے

تھے اور آپ نے چراغ گل کر دیا تو میں نے دیکھا کچھ لوگ اُٹھ کر جانے لگے۔ میں گھبرائی ہوئی اپنی پھوپھی جناب زینبؑ کے پاس آئی اور رو رو کر عرض کرنے لگی اے پھوپھی اماں غضب ہو گیا لوگ بابا جان کا ساتھ چھوڑ کے جا رہے ہیں۔

ہائے جناب زینبؑ کے دل کو کیسی لگی تھی۔ یہ سنتے ہی بے چین ہو گئیں اور جناب فضہ کو بلا کر کہا میرے ماںجائے کے پاس جاؤ اور میری طرف سے عرض کرو کہ ذرا دیر کے لئے خیمہ میں ہو جایئے۔ چنانچہ جب حضرت تشریف لائے تو بہن نے بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور رو رو کر عرض کرنے لگیں۔ بھیا سنتی ہوں کہ آپ کے ساتھی ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ اے بہن! تم غم نہ کرو۔ میرے جو حقیقی ناصر ہیں وہ موجود ہیں۔ شہزادی نے کہا اے بھائی! جو لوگ رُکے ہوئے ہیں ان کی وفاداری پر آپ کو پورا پورا اعتماد بھی ہے۔

فرمایا اے بہن! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جیسے نیک وفادار اصحاب مجھے ملے ہیں دنیا میں کسی نبی کو ملے نہ وصی کو۔

حضرات کسی نے یہ خبر حبیب ابن مظاہر کو پہنچا دی۔ حبیب گھبرا کر خیمے سے نکلے اور اصحاب امام کے خیموں کے درمیان کھڑے ہو کر فرمانے لگے۔ اے انصار حسین کیا چین سے خیموں میں بیٹھے ہو۔ غضب ہو گیا۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی کو تمہاری وفاداری پر اعتماد نہیں آؤ! آؤ ہم مل کر در خیمہ پر چلیں اور دختران علیؑ و فاطمہؑ کو اپنی وفاداری کا یقین دلائیں۔

حبیب ابن مظاہر کی یہ بات سن کر تمام انصار حسین علیہ السلام اپنے اپنے خیموں سے نکل آئے اور حبیب کے ساتھ امام علیہ السلام کے دروازے پر آئے اور با آواز بلند کہا

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَبَیْتِ النُّبُوَّۃِ وَ مَعْدِنِ الرِّسَالَۃِ

مومنین آج تک اس دروازہ کی یہ قدر و منزلت تھی کہ بڑے بڑے کامل الایمان لوگ فخر سے سلام کرتے تھے لیکن کل بعد شہادت امام حسین علیہ السلام اسی گھر کو اشقیائے اُمت نے آگ سے جلا دیا اور اہل حرم کو اس بیدردی سے لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ رہی۔ الغرض جب انصار کے سلام کی آواز جناب زینبؑ نے سُنی تو پوچھا میرے بھائی کے انصار خدا ان پر رحمت نازل کرے کس غرض سے آئے ہو۔ میرا ان کو سلام کہو۔

انصار امام نے عرض کی ہماری طرف سے دختران جناب فاطمہؑ کی خدمت میں عرض کرو کہ آپ کے بھائی کے ناصر و مددگار آپ کو یہ یقین دلانے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ جب تک ہماری شہ رگ میں خون کا

آخری قطرہ بھی باقی رہے گا اپنے مظلوم آقا کی نصرت سے پہلو تہی نہ کریں گے۔ شہزادی ذرا صبح تو ہونے دیجئے۔ پھر آپ کو ہماری وفاداری کا حال معلوم ہو جائے گا۔ یہ سُن کر جناب زینب کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ سب بی بیوں نے خوش ہو کر ان کے لئے دُعائے خیر کی۔

منقول ہے کہ شب عاشور حبیب ابن مظاہر نے انصار حسینؑ کو اپنے خیمے میں جمع کیا اور فرمایا۔ دوستو! تم کو معلوم ہے کہ کل دشمنانِ آل محمدؐ سے جنگ ہے۔ یہ سب جفا شعار اولاد رسولؐ کا خون بہانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ دوستو! اگر ہماری آنکھوں کے سامنے اولاد رسول میں سے ایک بچّہ بھی قتل کر ڈالا گیا تو پھر روز حشر حضرت رسولؐ خدا کو منہ دکھانے کا موقع نہ رہے گا۔

جناب زہیر نے پوچھا پھر تمہاری کیا رائے ہے؟ حبیب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اقربائے حسینؑ سے پہلے اپنی جانیں آل رسولؐ پر قربان کر دیں۔ تاکہ اولاد رسولؐ کا خون ہماری آنکھوں کے سامنے نہ بہایا جائے۔ سب نے بالاتفاق کہا۔ اے حبیب! آپ کی رائے بہت درست ہے۔ انشاء اللہ کل کو اقربائے حسینؑ سے پہلے اپنی جانیں ہم امام مظلوم پر نثار کر دیں گے۔

کسی نے یہ خبر جناب عباسؑ کو پہنچا دی۔ آپ نے جوانانِ بنی ہاشم کو اپنے خیمہ میں جمع کر کے فرمایا۔ اے بیشہ شجاعت کے شیرو! اے ہاشمی اور علوی جوانو! تم نے سُنا ہے کہ انصار حسینؑ نے کیا ارادہ کیا ہے وہ چاہتے ہیں کہ ہم سے پہلے امام مظلوم پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اے غیرت دارو! اگر ایسا ہوا تو کل دنیا طعنہ دے گی کہ حسینؑ نے پہلے غیروں کو کٹوا دیا اور اپنوں کو بچا رکھا۔ خاندانِ رسالت کے لئے یہ بات سخت بدنما ہو گی۔

یہ سُنتے ہی حضرت علی اکبر اُٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی چچا جان سب سے پہلے جان دینے کے لئے میدانِ کارزار میں، میں نکلوں گا۔ جناب قاسم نے عرض کی یہ کیسے ممکن ہے کہ غیر تو ہمارے سامنے شہید ہوں اور ہم اپنی جانوں کو بچائے رکھیں۔ سب سے پہلے شہید ہونے کو میں نکلوں گا۔ غرض اسی طرح ہر جوان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت عباسؑ نے ان کی ہمتوں پر آفریں کہی۔

صاحب بحر البکا لکھتے ہیں کہ روز عاشور جب دونوں طرف کی فوجیں میدان میں نکل کھڑی ہوئیں اور فوج مخالف کی طرف سے مبارز طلبی ہونے لگی۔ تو اصحاب امام علیہ السلام نے سامنے آ کر اجازت جنگ حاصل کرنی چاہی لیکن حسینؑ کی غیرت تقاضا نہ کرتی تھی کہ اپنے جگر پاروں اور عزیزوں کے ہوتے ہوئے غیروں کو اجازت دیں۔ آپ نے سب سے پہلے اپنے کڑیل جوان بیٹے پر نظر ڈالی اور فرمایا "یا بنی تقدم" اے بیٹا! سب سے پہلے تم میدان کارزار میں جاؤ۔ یہ سُنتے ہی حضرت علی اکبر جانے پر آمادہ ہوئے

یہ دیکھ کر جناب سعید جناب مسلم بن عوسجہ اور جناب بریرا مام مظلوم کے قدموں پر گر پڑے اور رو رو کر عرض کرنے لگے ۔ مولا! یہ ہماری تلواریں حاضر ہیں ۔ پہلے ان سے ہمارے گلے کاٹ دیجیے پھر علی اکبر کو میدان میں بھیجئے ۔ ہم سے ہرگز یہ نہ دیکھا جائے گا کہ ہمارے ہوتے ہوئے شہزادہ لڑنے کو جائے ۔ مولا خدا کے لئے علی اکبر کو روکیئے ۔ ورنہ ہم سب اپنی تلواروں سے گلے کاٹ کر مر جائیں گے ۔ اے فرزند رسولؐ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم کھڑے دیکھا کریں اور شبیہ رسولؐ خاک میں مل جائے ۔" جب انصار حسینؑ نے انتہائی بے چینی کا اظہار کیا ۔ تو مجبوراً امام مظلوم علیہ السلام نے علی اکبر کو رک جانے کا حکم دیا ۔

آہ! مومنین کہاں تھے انصار حسین مظلوم جب یہی شہزادہ علی اکبر شبیہ پیغمبر ظالموں کے نرغہ میں گھرا تھا ہر طرف سے تیغ و تبر اور خنجر و نیزہ کے وار ہو رہے تھے گھوڑے سے گرتے ہوئے حسینؑ مظلوم کو پکار رہا تھا یا ابتاہ ادرکنی اے بابا جان خبر لیجئے کہ میں نے اپنی جان آپ پر نثار کی ۔ یہ سنتے ہی حضرت نے کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیا اور آہ سرد بھر کر فرمایا بابنیّ علی الدنیا العبدک العفد ۔ بیٹا! تیرے بعد اس زندگانی دنیا پر خاک ہے ۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۱۱/۱۸ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷/۲۶

نویں مجلس

تفسیر آیہ ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسہم

حالات شب عاشور

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ہُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۱﴾

(سورہ توبہ ۹/۱۱۱)

بے شک اللہ نے مومنین کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید کر لیا ہے۔ یہ لوگ راہ خدا میں لڑتے ہیں اور خود بھی مر جاتے ہیں۔ یہ خدا کا پکا وعدہ ہے جس کا ذکر توریت انجیل اور قرآن میں لکھ دیا گیا ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا اور کون ہے پس تم اپنی (خرید) فروخت سے جو تم نے خدا سے کی ہے خوشیاں مناؤ یہی تو بڑی کامیابی ہے (جن سے خدا نے یہ معاملہ کیا ہے)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کربلا والوں کی جان و مال کی قیمت جنت ہے پس جب امام حسین علیہ السلام اور ان کے اصحاب نے جان بیچ کر جنت خرید لی تو اب ان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں۔ ایک حدیث میں ہے۔ جو کوئی غم حسینؑ میں روئے یا رلائے یا رونے

والوں کی صورت بنائے تو جنّت اس پر واجب ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام پر سچے دل سے وہی روئے گا یا رُلائے گا یا کم از کم رونے والوں کی صورت بنائے گا جس کو حضرت کی ذات سے محبت ہوگی۔ وہ حضرت کا دوست ہوگا۔ جنّت چونکہ حسینؑ کی ہو چکی ہے لہٰذا وہ ضرور اپنے دوستوں کو عطا فرمائیں گے۔ پس جنّت درحقیقت دوستیِ حسینؑ کا صلہ ہے۔ حسینؑ کی جان کی قدر و قیمت کوئی خدا سے پوچھے۔ جس نے جنّت جیسی گراں قدر چیز کو اس کی قیمت قرار دیا۔

امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقا کی جانوں کے علاوہ ایک اور جان بھی خدا نے خرید کی ہے اور اس کا صلہ اپنی مرضی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞

۲/ بقرہ ۲۰۷-۲۰۸

اور لوگوں میں خدا کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں اور خدا ایسے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو اسلام میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی جان مرضیِ الٰہی کے خریدنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں۔ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت شب ہجرت حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ اس کے متعلق یہ ہے کہ جب کفار قریش نے حضرت رسول خدا کے قتل کے ارادے سے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو حضرتؐ پر وحی ہوئی کہ اے رسول کفار نے ایسا کیا ارادہ کیا ہے۔ تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی یعنی علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سُلا کر غارِ ثور کی طرف چلے جاؤ۔ پس آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو بلا کر فرمایا۔

اے علی۔ حکم خدا یہ ہے کہ آج کی رات میں تم کو اپنے بستر پر سُلا کر چلا جاؤں۔ عرض کی کہ میرے اس عمل سے آپ کی جان بچتی ہے تو ایک کیا ہزار جانیں آپ پر قربان۔ آپ ضرور تشریف لے جائیں۔ یہ سن کر حضورؐ خوش ہوئے اور آپ کے پاس جو امانتیں اہل مکہ کی تھیں حضرت علیؑ کی سپردگی میں دے کر فرمایا میں تین روز غار ثور میں قیام کرنے کے بعد مدینہ کو روانہ ہو جاؤں گا۔ تم یہ سب امانتیں لوگوں کے سپرد کر کے چلے آنا اور راہ میں

مجھ سے مل جانا اس کے بعد حضرتؐ نے وہاں سے روانگی کا قصد کیا۔

مومنین یہ ایک عجیب ہولناک وقت تھا۔ کفار قریش برہنہ تلواریں لئے خانۂ رسالت کا محاصرہ کئے اس ارادہ سے کھڑے تھے کہ جس وقت آپ گھر سے برآمد ہوں فوراً آپ کو ہلاک کر دیں۔ پس بحکم خدا آپ بیت الشرف سے برآمد ہوئے اور ایک مٹھی خاک ان کی طرف پھینکی۔ جس کے اثر سے وہ ایسے اندھے ہوئے کہ حضورؐ ان کے درمیان سے نکلے چلے گئے اور ان کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ حضرتؐ کے تشریف لے جانے کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام آپ کی یمنی چادر اوڑھ کر آپ کے بستر پر لیٹے رہے۔ چونکہ خانۂ رسالت کی دیواریں نیچی تھیں۔ اس لئے کفار بار بار اُچک اُچک کر دیکھتے تھے کہ حضرت گھر میں موجود ہیں یا نہیں۔ جب حضرت علیؑ کو فرشِ خواب پر لیٹا ہوا پاتے تھے تو ان کو اطمینان ہو جاتا تھا۔ وہ تمام رات اس خیال سے کھڑے رہے کہ حضرت باہر نکلیں تو قتل کریں۔

حضرت علی علیہ السلام کی یہ شجاعت دیکھنے کے قابل تھی۔ کہ باوجودیکہ کفار برہنہ تلواریں لئے کھڑے تھے اور قتل ہو جانے کا پورا اندیشہ تھا مگر آپ بڑے اطمینان سے سوتے رہے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو نہ معلوم خوف سے رونے لگتا یا چیخ و پکار مچا دیتا! کم از کم تارے ہی گنتا رہتا۔ جنابِ علیؑ کے پاس خوف کہاں۔ ایسا بہادر تو سرزمینِ عرب پر پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ وہ تو حمایت دین میں سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے بڑے اطمینان سے سوئے اور خوب سوئے۔ کسی نے امیرالمومنین علیہ السلام کو تمام رات عبادت کرتے ہوئے پوچھا۔ حضرت آپ کسی رات کو چین سے بھی سوئے ہیں فرمایا۔ ہاں شبِ ہجرت۔ اللہ اللہ جو رات سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ علیؑ اسی رات کو سب سے زیادہ چین سے سوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت کو خدا کی حمایت کا پورا پورا یقین تھا۔

مختصر یہ کہ جو مرتبہ اوروں کو رو رو کر نہ ملا وہ آپ نے سو سو کر لیا اور جو اَمر دوں کو مر مر کر حاصل نہ ہوا وہ آپ نے لڑ لڑ کر پالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسول کی وہ سچی مواسات و ہمدردی تھی جو کسی دوسرے سے بن نہ پڑتی تھی۔ تمام خاندانوں بلکہ مسلمانوں میں صرف ایک علیؑ ہی ایسے شخص تھے جن پر حضرت رسول خدا صحیح معنی میں اعتماد کر سکتے تھے۔ یہ معمولی بات نہ تھی۔ اگر کوئی ڈرپوک آدمی اس موقع پر ہوتا تو کفار مکہ کے خوف سے اس بھید کو کھول دیتا تو آج ہی رسالت کا خاتمہ ہو جاتا۔ علاوہ بریں اگر علیؑ کی جگہ کوئی اور شخص اس خدمت کو انجام دینے کے لئے مقرر کیا جاتا تو ضرور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ آنحضرتؐ خود تو اپنی جان بچا کر چلے گئے اور مجھے خطرہ میں چھوڑ گئے۔ علی علیہ السلام کے دل میں یہ شیطانی وسوسے آ ہی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ آپ نفسِ رسولؐ تھے اور آنحضرتؐ کی رسالت پر دل سے ایمان لائے ہوئے تھے۔

منقول ہے کہ جب علی علیہ السلام سے یہ دین خدا کی بے لوث خدمت انجام پارہی تھی تو خداوند عالم نے اپنے ملائکہ مقربین سے فرمایا میں نے تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ قرار دی پس تم میں سے کون ایسا ہے کہ اپنی عمر کو اپنے بھائی کے حق میں منتقل کر دے۔ یہ سن کر ملائکہ خاموش ہوگئے۔ تب خداوند عالم نے فرمایا۔ دیکھو جس کام کو تم نہیں کر سکتے ہو۔ وہ میرا بندہ علیؑ کس شوق سے انجام دے رہا ہے۔ یہ عبد خاص ہے وہ اپنی جان کو راہِ خدا میں بیچے ہوئے کیسے اطمینان سے اپنے بھائی کے فرش پر سو رہا ہے۔ اچھا اے میرے ملائکہ تم زمین پر جاؤ اور تمام رات علیؑ کی حفاظت کرو۔ چنانچہ جبرئیل و میکائیل سرہانے کی طرف اور اسرافیل اور عزرائیل پائینتی کی طرف تھے اور تمام رات یہ کلمات کہتے رہے۔ بشارت ہو تم کو اے علی بن ابی طالبؑ کہ تمہاری جاں نثاری اور وفاداری پر خلاق عالم فخر کرتا ہے خوشحال تمہارا اے پسر ابو طالبؑ کہ درگاہ الٰہی میں تمہاری یہ سچی خدمت مقبول ہوئی۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ذات امیر المومنین علیہ السلام پر سب سے زیادہ اعتماد تھا اگر آپ کی وفاداری اور آپ کی جرأت کے متعلق ذرا بھی شبہ ہوتا تو یہاں تنہا نہ چھوڑتے بلکہ اپنے ساتھ لے جاتے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کم سے کم ایک رات کفار قریش کو علی کی ذات پر رسول کا گمان ہوتا رہا۔ اور ایسے بھی لوگ تھے جن پر باوجود پرانا مسلمان ہونے کے مشرک کا گمان ہوتا رہا

وزعم انہ من المشرکین۔

الغرض جب کفار قریش سے ضبط نہ ہو سکا تو بے باکانہ بیت رسالت میں درآئے اور چاہتے تھے کہ تلواریں سونت کر آپ کا کام تمام کر دیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے ایک شجاعانہ انداز میں انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھے۔ اب تو ان کو سخت حیرت ہوئی۔ پوچھنے لگے بتاؤ محمدؐ کہاں ہیں۔ فرمایا کیا تم ان کو میرے سپرد کر گئے تھے جو لینے کو آئے تھے۔ جہاں کہیں ہوں پتہ چلا لو وہ لوگ جناب امیر علیہ السلام کو چھوڑ کر اس خیال سے فوراً چل دیئے کہ ابھی محمدؐ دور نہ گئے ہوں گے۔ ہم راہ میں جا پکڑیں گے۔

یہ تھی وہ بے مثال دینی خدمت جس کے صلہ میں سرکار الٰہی سے حضرت علیؑ کو آیہ ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ کی سند ملی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے علیؑ کا نفس مول لے لیا ہے اور اپنی مرضی بطور قیمت علی کو دے دی ہے پس اب علیؑ کا نفس خدا کا نفس بن گیا اسی لئے نفس اللہ کہلائے اور خدا کی مرضی علی کی چیز ہوگئی جس طرح خدا کو یہ حق ہے کہ جہاں چاہے علی کے نفس سے کام لے۔ خواہ بدر میں لڑائے یا اُحد میں۔ خندق میں کام لے یا خیبر میں۔ علی کو انکار کا حق نہیں اسی طرح علی کو یہ حق ہے کہ مرضی الٰہی کو جہاں چاہیں صرف کریں چونکہ علی اپنا نفس خدا کے ہاتھ بیچ چکے

تھے۔ لہذا شب ہجرت بڑے اطمینان سے سوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس کی چیز ہے وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اس نے حفاظت کی اور بہترین صورت میں حفاظت کی۔

یہ نکتہ بھی خاص طور سے یاد رکھنے کی قابل ہے علیؑ کا نفس خدا کا نفس بن چکا تھا لہذا حضرت نے عمر بھر اس سے خدا ہی کا کام لیا۔ اپنی ذاتی خواہشوں کو ہمیشہ اس سے الگ رکھا۔ اس کا ثبوت کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک جنگ میں آپ نے دشمن پر غلبہ حاصل کیا اور سینہ پر قتل کے ارادے سے بیٹھے تو اس نے اپنا لعاب دہن حضرتؐ کی طرف پھینکا۔ آپ فوراً اس کے سینے سے اٹھ کھڑے ہوئے کسی نے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا۔ فرمایا میں اس کو خوشنودی خدا کے لئے قتل کرنا چاہتا تھا میری کوئی ذاتی غرض شامل نہ تھی۔ اب چونکہ اس نے اپنا لعاب دہن میری طرف پھینکا تو میرا جذبۂ انتقام جوش میں آیا پس میں فوراً اس سے جدا ہوگیا تاکہ میرا نفس اس میں شامل نہ ہو۔

حضرات علی کا نفس بھی عجیب نفس تھا خدا نے چاہا کہ میرا نفس ہو کر رہے اور رسول نے چاہا کہ میرا نفس بن کر رہے۔ یہ خصوصیت اس نفس کو حاصل تھی کہ بزم قدس کی زینت کی صلاحیت بھی رکھتا تھا اور بزم رسالت کو زینت دینے کے قابل بھی تھا آیہ ومن الناس من یشری نے نفس اللہ بننے کی سند عطا فرمائی اور آیۂ مباہلہ نے نفس رسول بننے کی بشارت دی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ من الناس من یشری سے معلوم ہوا ہے کہ علی نے اپنا نفس بیچا۔ عنوان مجلس جو آیہ ان اللہ اشتری سے ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ان نفوس کو خود خرید کیا ہے بہت فرق ہے اس بات میں کہ ایک شخص نے اپنی مرضی سے کسی چیز کو بیچنا چاہا اور اس امر میں کہ خریدار اپنی خواہش سے کوئی شے خریدے ان دونوں آیتوں سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کربلا والوں کے نفوس کا مرتبہ علی سے زیادہ تھا۔

جواب کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی صناع خاص چیز تیار کرتا ہے تو پہلے بطور نمونہ اہل نظر خریداروں کے سامنے بخوشی پیش کرتا ہے۔ لیکن جب خریدار کو مال پسند آجاتا ہے تو خریدنے کی خود خواہش کرنے لگتا ہے بلاشبہ یہاں یہی صورت سمجھو۔ اول جناب امیر علیہ السلام نے شب ہجرت اپنا نفس پیش کیا وہ خریدار کو ایسا پسند آیا کہ اس نے طے کرلیا کہ اس گھر کے جتنے نفوس ہوں گے وہ سب ہمارے ہیں۔ کربلا کے کل نفوس اس نے خرید لیے۔

اللہ اکبر ایسے مقدس نفوس جن کو خداوند عالم نے خرید فرمالیا۔ ایک روز اشقیا کے ہاتھوں سخت سے سخت مظالم برداشت کر رہے تھے۔ کون سی تکلیف تھی جس کا ان کو سامنا نہ تھا۔ تین روز کی بھوک پیاس تھی

جان و مال و آبرو کا خوف بھی تھا مگر واہ رے عاشقانِ خدا جان فروشو! کیا کہنا تمہارے شوق عبادت کا کہ ایسی حالت میں جبکہ انسان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے تم ایک لمحہ یادِ خدا سے غافل نہ ہوئے۔ امام مظلوم علیہ السلام نے ایک دن کی مہلت اس لئے حاصل کی تھی کہ زندگانی دنیا کا آخری دن آنے سے پہلے خوب جی بھر کر یادِ خدا کر لیں۔ چنانچہ وہ تمام رات ان خاصانِ الٰہی نے یادِ خدا میں گزار دی۔ کہیں تلاوت کلام اللہ تھی تو کہیں رکوع و سجود، کہیں تسبیح و تہلیل کہیں تذکر و تشکر۔

منقول ہے کہ ہر خیمے سے ذکر الٰہی کی آوازیں کربلا کے کھلے میدان میں اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے سے بھنبھناہٹ کی آواز ہوتی ہے یہ ساری رات حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کو جاگتے گزری آج ان سرفروشوں کو وہ خوشی تھی جو بچوں کو عید کی رات کو ہوا کرتی ہے۔

عبدالرحمٰن بن ربہ سے بریر نے مذاجیہ کلام کیا۔ انہوں نے کہا اے بریر یہ وقت دل لگی کا نہیں۔ بریر نے جواب دیا۔

لَقَدْ عَلِمَ قَوْمِیْ مَا اَحْبَبْتُ الْبَاطِلَ كَهْلًا وَلَا شَابًّا وَاِنَّمَا اَفْعَلُ ذٰلِكَ اسْتِبْشَارًا بِمَا نَصِيْرُ اِلَيْهِ فَوَاللّٰهِ مَا هُوَ اِلَّا اَنْ نَلْقٰى هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ اَسْيَافَنَا نُعَالِجُهُمْ سَاعَةً ثُمَّ نُعَانِقُ الْحُوْرَ الْعِيْنَ۔

میری قوم جانتی ہے کہ میں غلط بات کو دوست نہیں رکھتا نہ جوانی میں نہ بڑھاپے میں۔ جو کر رہا ہوں۔ اس منزل کی خوش خبری دینے کے لئے جس کی طرف جا رہے ہیں۔ خدا کی قسم یہ لوگ ہیں کیا ہم ان کی سرکشی کا علاج تلواروں سے کریں گے اور پھر حوران جنت سے معانقہ کریں گے۔ یہ تھے انصار حسینؑ کے حوصلے اور یہ تھا ان کے دلوں میں شہادت کا جوش۔

کتاب لہوف میں ہے کہ شب عاشور امام حسین علیہ السلام نے اس طرح بسر کی کہ برابر تسبیح و تہلیل کی آواز خیمہ سے بلند تھی۔ کتاب ارشاد میں شیخ مفید علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں شب عاشورہ اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا اور میری پھوپھی جناب زینبؑ میری تیمار داری میں مصروف تھیں۔ اس وقت میرے پدر بزرگوار خیمہ میں تنہا تھے۔ صرف جون غلام ابوذر غفاریؓ آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ تلوار آپ کے سامنے تھی اور آپ اسے صاف کر رہے تھے اور بار بار چند اشعار بے ثباتی دنیا کے متعلق کچھ ایسے دردناک لہجہ میں پڑھ رہے تھے کہ میرا دل الٹنے لگا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرے پدر بزرگوار کو اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی ہے میری پھوپھی جناب زینبؑ سے برداشت نہ ہو سکا۔ روتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور بے تابی سے حضرتؑ کے خیمہ کی طرف چلیں کہ ان کو سر ڈھانپنے

کا ہوش، نہ تھا۔ چادر زمین پر لٹک رہی تھی۔ جب حضرت کی خدمت میں پہنچیں تو رو رو کر کہنے لگیں کاش کہ مجھے موت آجاتی کہ آج کا دن میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتی۔ مجھے آج یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میری ماں فاطمہ زہراؑ اور میرے باپ علی مرتضیٰؑ کا انتقال ہوا ہے۔ آہ! آہ! بھرے کنبے میں ایک دم آپ کا ایسا ہے کہ اس سے بیکسوں کو ڈھارس ہے۔ آپ ہی ہمارے سرپرست اور بزرگوں کی یادگار باقی رہ گئے ہیں اب آپؑ اپنی موت کی خبر دے رہے ہیں تو بہن کی جان پر بن گئی ہے۔ مجھے اب یقین ہو رہا ہے کہ آپ کا سایہ عنقریب ہمارے سر سے اٹھنے والا ہے۔ آہ! اس عالم غربت میں ہم بےکسوں کا حامی و مددگار کون ہوگا۔ دشمن ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہم کس سے فریاد کریں۔ کون ہماری دادرسی کو آئے گا۔

بہن کا یہ حسرت ناک کلام سن کر امام مظلوم کا دل تڑپ گیا۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا اے بہن صبر سے کام لو اور بھائی کی بےکسی اور بےیاری پر نظر رکھو۔ اے بہن اگر میرا اختیار ہوتا تو کیوں سب کو اس بلا میں اپنے ہاتھوں پھنساتا۔ اے بہن شکستہ دل کو سنبھالو۔ تمہاری بےقراری اور گریہ وزاری سے یہ سب عورتیں بدحواس ہو جائیں گی۔ اے بہن موت ایک دن سب کو آنی ہے۔ سوائے ذات خدا کوئی باقی نہ رہے گا۔ اے بہن خیال تو کرو۔ میرے نانا، باپ اور ماں جو مجھ سے بہتر اور افضل تھے جب وہی اس دُنیا میں نہ رہے تو میں کیا ہمیشہ رہ سکوں گا۔ الغرض اس قسم کی باتیں کر کے اپنی معصوم بہن کو تسکین دی اور امام زین العابدینؑ کے خیمہ کی طرف بھیجا۔

اس کے بعد حضرت خیمہ سے برآمد ہوئے اور اصحاب باوفا کو بلا کر فرمایا کہ سب اپنے خیمے ملا کر استادہ کریں اور طنابیں ایک دوسرے سے باندھ لیں۔ پس بحکم امامؑ خیام اہل حرم کے گرد تمام اصحاب نے اپنے اپنے خیمے نصب کئے۔ تاکہ دشمن اگر حملہ آور ہوں تو اہل حرم تک نہ پہنچ سکیں۔ پھر حضرتؑ نے چاہا کہ خیموں کے اندر اپنے اصحاب کا حال معلوم کریں۔ سب سے پہلے آپ انصار کے خیموں کی طرف تشریف لے گئے۔ ایک خیمہ کے قریب جا کر دیکھا کہ بچپن کے دوست حبیب ابن مظاہر ہتھیار بدن پر سجائے اس طرح تیار بیٹھے ہیں گویا ابھی ان کو جنگ کے لئے جانا ہے۔ غلام سامنے کھڑا ہے۔ جب تلاوت کلام پاک سے فارغ ہوئے تو غلام نے عرض کی۔ اے میرے سید و آقا آپ نے کئی روز سے اپنی ریش مبارک کو خضاب نہیں کیا اگر حکم کریں تو خضاب لے آؤں۔ حبیب نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا۔ اب میری یہ ڈاڑھی انشاءاللہ کل نصرت حسینؑ میں سر کے خون سے خضاب ہوگی۔ امام مظلوم یہ سن کر رو دیئے۔ اور وہاں سے آگے بڑھے۔

اب آپ زہیر بن قین کے خیمے کے سامنے تھے۔ دیکھا کہ جناب زہیر کے خیمہ میں ابو ثمامہ صیداوی بھی تشریف فرما ہیں۔ جناب زہیر ان سے پوچھ رہے ہیں کیوں ابو ثمامہ اب کتنی رات باقی ہوگی۔ وہ جواب دیتے ہیں نصف سے زیادہ رات باقی ہے۔ جناب زہیر نے یہ سُن کر فرمایا۔ اللہ اللہ یہ رات کتنی طولانی ہوگئی کہ کسی طرح کٹنے میں ہی نہیں آتی۔ خدایا جلد صبح نمودار ہو کہ میں حسینؑ کے قدموں پر جان نثار کرسکوں۔ جناب ابو ثمامہ بطور مزاح فرماتے ہیں۔ اے زہیر عالمِ پیری میں حورانِ جنّت سے ہم آغوش ہونے کا کتنا شوق ہے وہ مسکرا کر جواب دیتے ہیں۔ جنّت کی حوروں کا شوق تو بے چین نہیں بنا رہا بلکہ اپنے آقا مظلوم کی نصرت میں شہید راہ خدا بننے اور حضرت رسولؐ خدا سے سرخ رو ہونے کا شوق اس درجہ ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔

یہ سُن کر امام علیہ السلام نے زہیر کے حق میں دعائے خیر کی اور وہاں سے بڑھ کر مسلم ابن عوسجہ کے خیمے کے سامنے پہنچے دیکھا کہ یہ بوڑھا مجاہد کمر کسے اور بدن پر ہتھیار سجائے صبح کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہے اور بار بار خدا سے دُعا کرتا ہے۔ خداوندِ عالم مجھے نصرتِ حسین میں کامیاب کرنا۔ اس کے بعد آپ کا رُخ وہب کے خیمہ کی طرف ہوا۔ دیکھا کہ مادرِ وہب بیٹے کو سامنے بٹھائے سمجھا رہی ہے۔ دیکھو بیٹا! کل مجھے روحِ جناب فاطمہؑ سے شرمندہ نہ کرنا۔ بیٹا میں نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا تھا کہ دینِ خدا کا فدیہ بناؤں۔ اے وہب اگرچہ تو جوان ہے اور تیری شادی کو بھی ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ جانتی ہوں کہ تیرے دل میں بہت سے ارمان ہیں مگر پھر بھی اے وہب تو مجھے میرے سیّد و آقا سے زیادہ پیارا نہیں، بیٹا میرے مولا پر سخت وقت آپڑا ہے اس وقت تو اپنی جان کو فرزند رسولؐ سے زیادہ عزیز نہ رکھ۔ جناب وہب عرض کر رہے ہیں۔ اے مادرِ گرامی! آپ اطمینان رکھیں۔ میں آپ کے دودھ کی قسم کھاتا ہوں کہ نصرتِ امام میں ہرگز کوتاہی نہ کروں گا۔ اور جب تک اپنی جان قربان نہ کردوں گا میدان سے نہ ہٹوں گا۔ آہ! آہ!! یہ دلدوز اور جگر سوز منظر دیکھ کر امام مظلوم نے ایک آہ سرد دل پر درد سے کھینچی اور دیر تک خیمہ وہب کے قریب کھڑے روتے رہے۔

جب انصار کے خیموں کا باری باری معائنہ فرما چکے تو اب اپنے عزیزوں کے خیام کی طرف رخ کیا پہلے اُم فروہ مادرِ جناب قاسم کی طرف آئے دیکھا کہ بیوہ بھاوج نے اپنے یتیم بیٹے کو بنا سنوار کر سامنے بٹھایا ہے اور فرما رہی ہیں۔

"بیٹا تو اپنے مرے باپ کی نشانی ہے۔ میں نے تجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے۔ تیرے جوان ہونے کے ارمان میرے دل میں تھے لیکن بیٹا اب وہ حسرت و یاس سے بدل گئے۔ اب دیکھیا ماں کے دل میں اس کے

سوا کوئی ارمان نہیں۔ کہ تجھے راہِ خدا میں شہید دیکھوں۔ بیٹا تمہارے مظلوم چچا نرغہ اعدا میں گھر چکے ہیں ہم سب پر ایک سخت وقت پڑا ہے۔ اگر اس وقت تمہارے باپ زندہ ہوتے تو مظلوم بھائی کی ہر طرح مدد کرتے اب تم ان کے قائم مقام ہو۔ اپنے باپ کے اس فرض کو ادا کرو۔ دیکھو بیٹا کل جب بازار موت گرم ہو تو مرنے سے جی نہ چرانا اور مجھے روح علیؑ و فاطمہؑ سے روز حشر شرمندہ نہ کرنا۔ جناب قاسم ہاتھ جوڑ کر عرض کر رہے ہیں کہ اے مادرِ گرامی۔ آپ مطمئن رہیے۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس وقت بے کسی میں اپنے چچا کا ساتھ چھوڑ دوں۔ حالانکہ انہوں نے باپ کی طرح مجھے شفقت سے پالا ہے۔ صبح تو ہونے دیجیے آپ دیکھیں گی کہ آپ کا یہ کمسن فرزند کس طرح شجاعت ہاشمی کے جوہر دکھا کر اپنی جان اپنے چچا کے قدموں پر قربان کرتا ہے۔

آہ! آہ! مومنین کیا وقت مظلوم کربلا پر آ گیا تھا۔ کہ مخدرات عصمت و طہارت اپنی آنکھوں کے تاروں اور کلیجے کے ٹکڑوں کو یوں جان دینے پر آمادہ کر رہی تھیں۔ بیوہ بھاوج کے یہ کلمات سن کر امام مظلوم کا دل ہل گیا اور زار زار روتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھے۔ اب آپ خیمہ جناب زینبؑ کے سامنے تھے۔

مومنین کیونکر عرض کروں کہ اس خیمے کے پاس آ کر کیا منظر دیکھا۔ جناب زینبؑ اپنے دونوں بیٹوں کو آراستہ کر کے بیٹھی ہیں اور فرما رہی ہیں اے فرزندو! حسین کو ماموں نہ سمجھنا۔ انہوں نے تم پر باپ سے زیادہ شفقت کی ہے۔ اے فرزندو کل قربانی آلِ محمد کا دن ہے۔ دیکھو نصرت حسین میں اگر تم نے ذرا بھی کوتاہی کی تو ہرگز اپنا دودھ نہ بخشوں گی اور تمہاری صورت دیکھنے کی روادار نہ ہوں گی۔ دیکھو بچو سمجھائے دیتی ہوں کہ ایسا نہ کرنا کہ فوجوں کی کثرت دیکھ کے ڈر جاؤ۔ تم اس علیؑ کے نواسے ہو جس نے احد، بدر و خندق خیبر جیسے معرکے سر کیے ہیں۔ تم جعفر طیار کے پوتے ہو جو ہمیشہ فوج رسولؐ کے علمدار رہے اور جنہوں نے نصرت دین میں اپنے بازو کٹوا کر طیار لقب حاصل کیا۔ اے عون و محمد تمہارے بیکس ماموں پر بڑا سخت وقت ہے جہاں تک ہو سکے کل جلد از جلد اپنے ماموں پر فدا ہو کر اس بلا کو رد کر دینا۔

ماں کی یہ تقریر سن کر دونوں بچے ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ اے مادر گرامی ہماری کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم کے خلاف قدم اٹھا سکیں۔ کیا ہم ماموں جان کے مرتبے سے آگاہ نہیں۔ کیا ہم ماموں جان کی شفقتیں نہیں دیکھ رہے۔ کل آپ دیکھیں گی کہ علیؑ کے نواسے اور جعفر طیار کے پوتے کس دلیرانہ شان سے لڑتے ہیں۔

اس کے بعد امام مظلوم روتے ہوئے ایک اور خیمہ کے پاس آئے۔ آہ کیا عرض کروں کہ یہ خیمہ کس کا تھا اور حسین نے کیا دردناک منظر دیکھا

مومنین یہ خیمہ ام لیلیٰ اور جناب علی اکبر شبیہ پیغمبرؐ کا تھا۔ دیکھا کہ اُم لیلیٰ نے اپنے کڑیل جوان کو آراستہ کر کے سامنے بٹھائے ہوئے ہیں شمع جل رہی ہے اور دُکھیا ماں بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہے۔

"بیٹا کل تیری چاند سی صورت خاک میں مل جائے گی۔ آہ! مجھے کیا خبر تھی کہ میری اٹھارہ برس کی کمائی کربلا کے میدان میں لوٹ لی جائے گی۔ آہ بیٹا حسرت بھری ماں کو تیرے بیاہ کا بڑا ارمان تھا۔ دل چاہتا تھا کہ تمہاری چاند سی دُلہن گھر میں بیٹھی دیکھتی خدا کسی ماں پر یہ وقت نہ لائے جو تمہاری دُکھیا ماں پر آ پڑا ہے۔ فرزند رسولؐ نرغہ میں گھر چکے ہیں راہ چارہ مسدود ہو گئی ہے۔ اب سوائے جان دینے کے کوئی صورت نہیں۔ اے علی اکبر اولاد اسی دن کے لئے ہوتی ہے کہ ماں باپ پر کوئی بلا آئے تو اس کو رد کر دے۔ بیٹا! تم ماشاءاللہ جوان ہو۔ اس وقت بے کسی میں باپ کی مدد کرو۔"

جناب علی اکبر ایک شجاعانہ انداز میں فرما رہے ہیں اماں جان آپ کیوں اس قدر رنجیدہ ہیں حیدری شیروں اور ہاشمی جوانوں کے سامنے ان نامردوں کا لشکر کیا حیثیت رکھتا ہے۔ بخدا جب ہماری تلواریں نیاموں سے نکلیں گی تو یہ روباہ صفت اس طرح ہمارے سامنے سے بھاگتے نظر آئیں گے جیسے شیروں کے سامنے سے ہرنوں کا غول۔ امام مظلوم کے دل پر ماں بیٹوں کی یہ گفتگوسن کر چھری چل گئی۔ زار زار رونے لگے اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ۱۵۶/۲ البقرہ

اب حضرت ابوالفضل العباسؑ کے خیمے کے پاس آئے۔ دیکھا کہ قمر بنی ہاشم یادگار شیر خدا عباس بن علیؑ اپنے خیمے میں بیٹھے تلوار پر صیقل کر رہے ہیں اور ایک گوشہ میں جناب ام کلثوم بیٹھی رو رہی ہیں۔ ناگاہ جناب عباسؑ کی نظر دُکھیا بہن پر جا پڑی۔ فوراً اٹھ کر بہن کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

اے خواہر محترم! آپ کیوں رو رہی ہیں۔ یہ سنتے ہی جناب اُم کلثومؑ کی ہچکی بندھ گئی اور فرمانے لگیں۔

"بھیا عباسؑ! تم ہی انصاف کرو کیونکر گریہ وزاری نہ کروں کل قربانی آل محمدؑ کا دن ہے۔ ہر بی بی اپنی اولاد کو میرے مظلوم بھائی پر قربان کرے گی۔ اُم فروہ قاسم کو دُلہا کریں گی۔ رباب علی اصغر کو اُم لیلیٰ علی اکبر کو۔ میری بہن زینبؑ اپنے دونوں بیٹوں عون و محمد کو۔ آہ اُم کلثومؑ کیسی بدنصیب ہے

کہ اس کے کوئی فرزند نہیں کہ اپنے بھائی پر نثار کرے۔ اپنی بدنصیبی پر جس قدر روؤں کم ہے۔ یہ سُن کر حضرت عباس بے قرار ہوگئے اور بکمال منت و زاری عرض کرنے لگے۔ اے بہن! آپ کیوں اس درجہ رنجیدہ اور ملول ہیں عباسؑ تو حاضر ہے۔ آپ شوق سے کل مجھے فدیۂ حسین بنائیں یہ سُن کر جناب اُم کلثومؑ کے چہرے پر آثار بشاشت نمایاں ہوئے۔ امام مظلوم اُم کلثومؑ کو گلے لگا کر دیر تک روتے رہے۔

مروی ہے کہ جب اہل حرم قید سے چھوٹے اور دمشق میں مکان لے کر صفِ ماتم بچھائی تو زینبؑ کی خواہش پر شہیدوں کے سر یزید نے بھجوائے جس شہید کا سر آتا تھا جس بی بی سے اس کا قریبی رشتہ ہوتا تھا وہ بڑھ کر اسے لے لیتی تھی۔ جب جناب قاسم کا سر آیا تو اُم فروہ بڑھیں اور آغوش میں لے لیا۔ جب علی اکبر کا سر آیا تو اُم لیلیٰ نے بڑھ کر لیا۔ حضرات! جب حضرت عباسؑ کا سر آیا تو بیتاب ہو کر اُم کلثوم بڑھیں۔ بھیّا عباسؑ آیئے آپ میری آغوش میں آیئے۔ آپ میری طرف سے فدیہ راہ خدا لے بھے بہن بھائی کی اس ملاقات پر کہرام بپا ہوگیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ١١/١٨ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ٢٦/٢٢٧

دسویں مجلس

تفسیرِ آیہ وَلَیسَ البِرُّ بِاَن تَاتُوا البُیُوتَ الخ

وبیان علم امیر المومنینؑ و حالِ شبِ عاشور

و شہادت حضرت حُرؑ

وَلَیسَ البِرُّ بِاَن تَاتُوا البُیُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلٰكِنَّ البِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاتُوا البُيُوتَ مِن اَبوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُم تُفلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

(سورہ بقرہ ۲/۱۸۹)

یہ کوئی نیکی ہی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشتوں سے آؤ بلکہ نیکی تو اُس شخص کے لئے ہے کہ جو پرہیزگاری اختیار کرے اور گھروں میں داخل ہو اُن کے دروازوں سے۔ اور خدا سے ڈرتے رہو تاکہ اپنی مُراد کو پہنچو۔

اس آیت کا پہلا حصہ خلیفہ ثانی کی شان میں ہے اور دوسرا حصرت علی کی شان میں ابن ابی عدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ چھپ چھپ کر لوگوں کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔ ایک روز حسب عادت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر کے اندر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ یہ فوراً دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ دیکھا ایک مرد و عورت شراب پی رہے ہیں۔ ڈانٹ کر کہا کہ اے خدا کے دشمنوں کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا یہ کام خدا پر مخفی ہے۔ اس مرد نے جواب دیا اے امیر المومنین میں نے تو صرف ایک ہی خطا کی

ہے مگر آپ نے تو پے در پے تین گناہ کئے ہیں۔ انہوں نے غضب ناک ہو کر کہا وہ کیسے ؟ اس نے کہا سنئیے۔ خدا فرماتا ہے۔ تاتو البیوت من ابوابھا ۔ یعنی گھروں میں آنا چاہو تو دروازے سے آؤ۔ اور آپ نے یہ غضب ڈھایا کہ دیوار پھاند کر تشریف لے آئے۔ دوسرے جب گھروں میں داخل ہو تو اس کے اہل پر سلام کرو۔ آپ نے ایسا نہیں کیا۔ تیسرے خدا کہتا ہے کہ احوال المسلمین کا تجسّس نہ کرو۔ آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ یہ سن کر خلیفہ بہت شرمندہ ہوئے اور وہاں سے چپ چاپ فوراً نکل آئے۔

دوسرے حصے سے اس آیت کے مراد یہ ہے کہ علوم کو غیر مقررہ طریقے سے حاصل کرو۔ کیونکہ صورت ایسی ہے کہ جیسے بجائے دروازے کے کوئی پشت مکان سے آ کودے اور بطریق اہلبیت علیہ السلام مروی ہے کہ آلِ محمد علیہم السلام ابواب اللہ ہیں۔ ان کے ذریعے سے دعائیں قبول ہوتی ہیں ان کے وسیلے سے لوگ ہدایت پاتے ہیں ان ہی کو قرآن میں اہل الذکر کہا گیا ہے۔

مَا اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷﴾

(الانبیاء ۲۱/۷)

ہم نے ان سے پہلے جن بستیوں کو ہلاک کیا تھا (وہ معجزہ دیکھ کر) ایمان لے آئے۔ تو (یہ) کیا ایمان لے آئیں گے) اے رسول ہم نے تم سے پہلے بھی آدمیوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا ہم ان کے پاس وحی بھیجا کرتے تھے (جیسے تمہارے پاس بھیجتے ہیں) اگر تم غور نہیں کرتے تو عالموں سے پوچھ لو۔

یہی وہ عالم ربانی ہیں جو پوری کتاب کا علم اپنے سینے میں رکھتے ہیں۔ یہی وہ امام مبین ہیں جن کے اندر اللہ نے ہر شئے کا احصا کر دیا ہے۔

نہج البلاغہ میں جناب امیر علیہ السلام نے ایک خطبہ میں فرمایا ہے کہ لوگوں نے فتنوں کے دریاؤں میں غوطہ مارا ہے اور بجائے سنت پر عمل کرنے کے بدعات پر عامل ہو گئے ہیں۔ اسی زمانہ میں مومنین منقبض ہیں اور جھوٹے اور گمراہ لوگ زبان درازی کر رہے ہیں۔ ہم شعائر اسلام ہیں۔ ہم رسول کے اصحاب

ہیں۔ ہم خزانہ ہائے علوم کے دروازے ہیں۔ گھروں میں نہیں آیا جاتا۔ مگر دروازوں سے۔ جو دروازوں کو چھوڑ کر ادھر اُدھر سے آئے گا وہ چور کہلائے گا۔

ترمذی میں ہے وہاں سے جامع الاصول میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا۔

انا مدینۃ العلم وعلی بابھا من اراد العلم فلیاتہ من الباب

یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ پس جو علم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ دروازے سے آئے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام کا علم کس پایہ کا تھا۔ جب ہی تو آپؑ کو شہر علم نبی کا دروازہ کہا گیا۔ سب جانتے ہیں گھر اور شہر کی حالت کا آئینہ دروازہ ہوا کرتا ہے۔ اگر کسی گھر کا دروازہ ٹوٹا پھوٹا ہو تو دیکھنے والوں کی نظر میں اس گھر کی وقعت گر جاتی ہے۔ اسی لئے سمجھ دار لوگ اپنے گھر کا دروازہ شاندار بنوایا کرتے ہیں۔ جب مٹی کے گھر کے لئے شاندار دروازہ درکار ہے تو بھلا شہر علم نبی کے لئے بہترین در کیوں نہ درکار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ علم سے بہتر دروازہ مدینۃ العلم نبی کے لئے سکتا تھا۔

اللہ اکبر اس شخص کے علم کا کیا ٹھکانہ ہے جس کو حضرت رسول خدا نے اس طرح پڑھایا ہو جیسے طائر اپنے بچے کو بھراتا ہے۔ چنانچہ جب امیر علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔

ھذا اسفط العلم ھذا لعاب رسول اللہ ھذا ما زقنی رسول اللہ زقا

اپنے سینہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ علم کی گٹھری ہے۔ یہ لعاب رسول کا اثر ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کو رسول نے اس طرح بھرایا ہے جیسے طائر بچہ کو بھراتا ہے اس میں ایک لطیف نکتہ قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ یہ نہیں فرمایا کہ مجھے رسول خدا نے اس طرح پلایا جس طرح ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے۔ کیونکہ دودھ ماں کی چھاتی میں بہت سی تبدیلی کے بعد بنتا ہے اور طائر اپنے بچے کو جو بھراتا ہے وہ بجنسہ وہی دانہ ہوتا ہے۔ جو خود چگتا ہے پس حضرت کا مقصد اس فرمانے سے یہ ہے کہ حضرت رسول خدا نے جو کچھ خدا سے خدا سے حاصل کیا وہی بے کم و کاست مجھے عطا فرما دیا۔

کس کی طاقت ہے کہ علم امیرالمومنین علم امیرالمومنین علیہ السلام کا حال بیان کر سکے۔ ابن عباسؓ کہا کرتے تھے۔ علی عالم علمہ رسول اللہ نعلمنی من علمہ علی وعلم علی من علم نبی وعلم نبی من علم اللہ وما علمی وعلمہ جمیع اصحاب محمد فی علم علی الا لقطرۃ فی سبعۃ ابحر۔ یعنی علی ایسے عالم ہیں جن کو رسول اللہ نے تعلیم دی ہے پس میرا علم علی کے علم سے

ہے اور علی کا علم نبی کے علم سے ہے اور نبی کا علم خدا کے علم سے ہے اور میرا اور اصحاب محمد کا علم علی کے علم کے مقابلے میں ایسا ہے جیسا ایک قطرہ سات سمندروں کے مقابل اور دوسرے موقع پر بھی ابنِ عباس نے فرمایا ہے کہ علم کے سات حصے ہیں۔ ان میں سے چھ حصے علی کو ملے ہیں اور ایک حصہ تمام دنیا کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک رات امیر المومنین علیہ السلام نے سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کرنی شروع کی۔ یہانتک کہ صبح نمودار ہو گئی۔ آپ نے فرمایا اے ابن عباس اگر رات ختم نہ ہوتی تو میں برابر بیان کرتا رہتا۔ لو شئت الاوقرت سبعین بعیراً من تفسیر فاتحۃ الکتاب اگر میں چاہوں تو صرف سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کردوں۔ اے ابن عباسؓ آگاہ ہو کہ جو کچھ پورے قرآن میں ہے وہ سورہ الحمد میں ہے اور جو کچھ الحمد میں ہے وہ بسم اللہ میں ہے میں ہے اور جو بسم اللہ میں ہے وہ بائے بسم اللہ میں ہے اور جو بائے بسم اللہ میں ہے وہ نقطہ بائے بسم اللہ میں ہے اور انا النقطہ تحت البا میں وہ نقطہ ہوں جو اس ب کے نیچے ہے۔ اس سے حضرت کا مقصد یہ تھا کہ تمام قرآن کا علم میرے سینے میں ہے جب ہی تو آپ برسرِ منبر فرمایا کرتے تھے۔ سلونی قبل ان تفقدونی جو چاہو مجھ سے پوچھ لو قبل اس کے کہ تم مجھے نہ پاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ کون آیت مفصل ہے کون مجمل کون محکم ہے کون متشابہ کون ناسخ ہے کون منسوخ۔ کون عام ہے کون خاص، کون سفری ہے کون حضری کون دن میں نازل ہوئی اور کون رات میں۔ حضرت کا یہ فرمانا کہ جو تمام قرآن مجید میں ہے۔ وہ نقطہ بائے بسم اللہ میں ہے جن لوگوں کو قرین عقل معلوم نہیں ہوتا وہ سمجھ لیں کہ درخت برگد کا تخم کتنا چھوٹا ہوتا ہے اگر ہم کہیں کہ اس کے اندر ایک بہت بڑا درخت معہ اپنے تنے شاخوں اور برگ و بار کے چھپا ہوا ہے تو کسی کو یقین نہ آئے گا لیکن حقیقتاً ہے ایسا ہی۔ اگرچہ ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اگر یہی رائی کے دانے کے برابر تخم اچھی زمین میں دبا دیا جائے تو پوشیدہ درخت اس میں سے نکل آئے گا اور پھر ایک شاخ سے ہزار ہا برگ و بار پیدا ہو جائیں گے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ نے مجھے ایک ہزار باب علم کے تعلیم فرمائے۔ اور ہر باب سے ایک ایک ہزار باب علم کے میرے اوپر منکشف ہو گئے۔ ایک موقع پر حضرت نے یہ بھی فرمایا ہے۔ واللہ اگر میرے لئے مسند حکومت بچھا دی جائے اور میں اس پر بیٹھوں تو اہلِ توریت کے درمیان ان کی توریت سے اور اہل انجیل کے درمیان ان کی انجیل سے اور اہل قرآن کے درمیان ان کے قرآن سے وہ فیصلہ کروں گا کہ ہر کتاب اپنے منہ سے بول اٹھے گی کہ

علیؑ نے وہی فیصلہ کیا ہے جو خدائی فیصلہ ہے۔

ایک بار خلیفہ ثانی کے عہد میں دو عورتوں کے ایک ہی گھر میں دو بچے پیدا ہوئے ایک کے لڑکا اور دوسرے کے لڑکی۔ لڑکی والی عورت نے یہ چالاکی کی کہ اپنی لڑکی لڑکے سے بدل لی اور یہ ظاہر کیا کہ یہ لڑکا میرے یہاں پیدا ہوا ہے۔

لڑکے والی فریاد کرتی ہوئی خلیفہ کے دربار میں آئی ان کی سمجھ میں اس کا فیصلہ نہ آیا تو حسب عادت جناب امیر علیہ السلام کی طرف رجوع کیا آپ نے فرمایا اس کا فیصلہ بہت آسان ہے دونوں عورتوں کا دودھ دو شیشیوں میں لے کر وزن کرو۔ جس کا دودھ بھاری ہو اس کا لڑکا اور جس کا دودھ ہلکا ہو اس کی لڑکی ہوگی۔ خلیفہ نے کہا یہ حکم آپ نے کہاں سے بیان کیا؟ فرمایا قرآن سے۔ خدا فرماتا ہے

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہے۔ ۱۱/۴ نساء

یہ جواب سن کر خلیفہ حیرت زدہ رہ گئے اور کہنے لگے۔ یا علی آپ صدور احکام میں بہت جلدی کرتے ہیں۔ آپ کو یہ خوف نہیں ہوتا کہ جلدی میں کوئی غلط فیصلہ ہو جائے۔ فرمایا اے عمرؓ تمہارے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔ انہوں نے بے تامل کہا۔ پانچ۔ فرمایا اے ابو حفص۔ تم نے جواب میں جلدی کی۔ انہوں نے کہا کیا یہ بات سوچنے کی ہے یہ ہاتھ میرے سامنے ہے فرمایا اے عمر آگاہ ہو کہ جس طرح یہ پانچ انگلیاں تمہارے سامنے ہیں اسی طرح کائنات کا ورق میرے سامنے ہے پس غلطی کیسے ہوگی۔

ایک بار معاویہ نے بادشاہ روم کو لکھا کہ میں خلیفہ رسولؐ ہوں اب تمہارا خراج میری طرف آنا چاہیے۔ کوفہ سے امیر المومنین علیہ السلام نے ایسا ہی لکھا۔ بادشاہ نے وزیر سے مشورہ کیا کہ اب کیا ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ پہلے اس بات کا امتحان ہونا چاہیے کہ یہ شخص خلیفہ رسول ہے یا نہیں مسلمانوں کی دینی کتاب قرآن ہے۔

لہٰذا اسی قرآن سے اس مسئلہ کا جواب طلب کیا جائے اگر صحیح جواب دے تو سمجھنا چاہیے کہ جانشین رسول ہیں ورنہ جھوٹا ہے۔ بادشاہ نے کہا تم ہی سوال بناؤ۔ وزیر نے کچھ سوچنے کے بعد کہا اس سے پوچھنا چاہیے کہ "لاشئے" کیا چیز ہے۔ چنانچہ ایک قاصد اس سوال کے ساتھ دمشق کو روانہ کیا گیا جب معاویہ نے یہ سوال سنا تو حیران رہ گیا۔ اپنے وزیر عمرو بن عاص سے کہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اس نے کہا کہ اس کی ترکیب آسان ہے آج کل جنگ صفین کے لئے علی بن ابی طالبؑ کو گھوڑوں کی ضرورت ہے۔ تم اپنے اصطبل کا نہایت

قیمتی گھوڑا کسی کے ہاتھ کو نہ بیچو۔ وہ اس کو علیؑ کے سامنے پیش کرے جب وہ قیمت پوچھیں تو "لاشئے" کہہ دے پس جو کچھ وہ دیں تو آیت قرآنی سے اس کا ثبوت طلب کرے اور وہی جواب مع اس ثبوت کے بادشاہ روم کے پاس بھیج دے۔ معاویہ اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور فوراً ایک قیمتی عربی گھوڑا ساز و یراق سے آراستہ کر کے ایک شخص کے ہمراہ کوفہ کو روانہ کیا۔

جب یہ شخص وہاں پہنچا تو اتفاق سے اس وقت امیر المومنین علیہ السلام مع امام حسن علیہ السلام اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا۔

"بیٹا اس شخص سے معلوم کرو کہ گھوڑا بیچتا ہے۔" امام حسن علیہ السلام نے پوچھا تو اس نے کہا ہاں بیچتا ہوں۔ مگر تمہارے ہاتھ نہیں۔ پوچھا پھر کس کے ہاتھ۔ اس نے کہا علی کے سوا اور کسی کو نہ دوں گا۔ امام حسن علیہ السلام نے فرمایا۔ آمیں تجھ کو ان تک پہنچا دوں۔ جب آپ اس کو حضرت کی خدمت میں لے کر آئے اور آپ نے قیمت پوچھی تو اس نے وہی کہا "لاشئے" آپ نے امام حسن علیہ السلام سے مسکرا کر فرمایا۔

"اس گھوڑے کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لو اور ایک مٹھی بھر ریت اس کے دامن میں ڈال دو۔" اب تو وہ شخص بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا۔ واہ اتنے بڑے ڈیل ڈول والے گھوڑے کی قیمت اور ایک مٹھی ریت میں تو "لا شئے" لینا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "لا شئے" تو یہی ہے۔ اس نے پوچھا ثبوت کیا ہے۔ فرمایا قرآنِ کریم کی یہ آیت

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾ (النور ۹۹/۲۴)

جو لوگ کافر ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان کا چمکتا ہوا ریت جسے پیاسا دور سے پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس آتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا (اور پیاسا تڑپ کر مر جاتا ہے) اور اس نے خدا کو اپنے پاس موجود پایا۔ خدا نے جس کا حساب چکا دیا اور خدا تو بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

وہ شخص یہ سن کر خاموش ہوگیا اور گھوڑا امیرالمومنینؑ کے حوالے کرکے شام کی راہ لی۔ وہاں معاویہ تو انتظار میں ہی تھا۔ اس کے پہنچتے ہی کہا کیا لایا ہے۔ اس نے کہا یہ مٹھی بھر خاک ہے جیسے امیر کے منہ پر ڈال دوں جیسے وزیر کے۔ معاویہ علیؑ کے علم قرآن پر حیران ہوگیا اور وہی جواب قاصد روم کے حوالے کرکے بھیجا۔ جب قاصد وہاں پہنچا تو بادشاہ نے کہا کہ اتنے دن کیوں لگائے۔ اس نے کہا کہ یہ جواب اونٹ پر لد کر کوفہ سے دمشق پہنچا وہاں سے میرے حوالے ہوا پس بادشاہ نے کہا جہاں سے یہ جواب آیا ہے وہیں خراج بھیجو۔

بیہقی نے مشاہیر صحابہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی اٰدَمَ فِیْ عِلْمِہٖ وَاِلٰی نُوْحٍ فِیْ تَقْوَاہُ وَاِلٰی اِبْرَاھِیْمَ فِیْ حِلْمِہٖ وَاِلٰی مُوْسٰی فِیْ ھَیْبَتِہٖ وَاِلٰی عِیْسٰی فِیْ عِبَادَتِہٖ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی وَجْہِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍؑ۔

یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ آدمؑ کو علم میں نوحؑ کو ان کے تقویٰ میں ابراہیمؑ کو ان کے حلم میں، موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں اور عیسیٰؑ کو ان کی عبادت میں دیکھے تو اس کو چاہیے کہ علیؑ کے چہرے کی طرف نظر کرے یعنی انبیائے سابقین کے سب کمالات اس کو علیؑ کی ذات میں مل جائیں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ آدمؑ علم میں وہ درجہ رکھتے تھے کہ اس کی بدولت تمام ملائکہ پر شرف حاصل ہوا یہاں تک کہ انہوں نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا۔ اسی علم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سجدۂ آدمؑ کا حکم دیا۔ ملائکہ حضرت آدمؑ سے اگرچہ بلحاظِ عمر اقدم تھے، بلحاظ عبادت افضل تھے۔ بلحاظ تجربہ اعلیٰ تھے۔ لیکن حضرت آدمؑ چونکہ ان سے علم میں افضل تھے لہٰذا سن کی کمی کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ اور ان کی کم سنی سے ان کے رتبہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام اگرچہ سن میں بہ نسبت اور صحابہ کے کم تھے مگر بلحاظِ علم سب سے زیادہ تھے۔ پس ان کا مرتبہ کیوں کر کوئی پا سکتا ہے۔

پھر علم کے علاوہ ان میں نوحؑ کا تقویٰ بھی تھا۔ ابراہیمؑ کا حلم بھی تھا۔ موسیٰؑ کی ہیبت بھی تھی۔ عیسیٰؑ کی عبادت اور زہد بھی تھا۔ ان سب فضیلتوں کے ہوتے ہوئے کسی صحابی کو ان پر ترجیح نہیں ہو سکتی۔ صحابہ تو رہے ایک طرف وہ انبیاء سے بھی افضل تھے چونکہ بقاعدہ فصاحت و بلاغت حضرت رسول خدا نے انبیاء کے اس وصف کا ذکر کیا ہے جس میں ان کو کمال حاصل تھا پس ایسے اوصاف میں مساوات دیگر امور کی مساوات سے بے پرواہ کرتی ہے کیونکہ ذاتِ امیرالمومنین علیہ السلام میں تمام انبیاءِ سابقین کے مخصوص اوصاف پائے جاتے تھے لہٰذا وہ ضرور ان سے افضل قرار پائے حضرت

آدمؑ کے قصے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا ملنا علمیت پر موقوف ہے۔ اسی لئے ملائکہ کے احتجاج کی طرف خدا نے توجہ نہ فرمائی اور آدمؑ کو خلیفہ بنا دیا۔ جس طرح خلافت آدمؑ کے بارے میں ملائکہ کی نہ چلی۔ اسی طرح علیؑ کے مخالفین بھی خلافت منصوصہ نہ پا سکے۔ فلینظر الی وجہ علی بن ابی طالب میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ فضائل علی میں ایسے اُبھرے ہوئے تھے کہ چہرے سے پھوٹ نکلے تھے یعنی اوروں کے اندر وہ مخفی تھے اور علیؑ کے اندر وہ جلی تھے اسی لئے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہو گیا اتنا فرمانے پر بس نہیں کیا بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ مابعد زمانہ کے لوگ جو علیؑ کی زیارت سے محروم رہیں گے اس عبادت کے ثواب سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ فرمادیا کہ ذکر علیؑ عبادت۔ پھر یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ علی کا ذکر جرم ہو جائے گا۔ یہ بھی فرمادیا۔ حُبّ علیؑ عبادت۔ یعنی علی کی محبت عبادت بھی ہے۔ چونکہ محبت مخفی طور پر دلوں میں رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ہر زمانے والے اس عبادت کا ثواب پاتے رہیں گے۔

حضرات! یہی اوصاف تھے۔ جنہوں نے امیر المومنین علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں رشک و حسد کی آگ بھڑکا دی تھی۔ چونکہ وہ ان کمالات میں حضرت کا مقابلہ تو نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا دینی مدارج گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ روحانی اقتدار لوگوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ان کی موجودگی میں ہم کو دینی پیشوائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ یزید امام حسین علیہ السلام کے دَرپے قتل ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک حسین علیہ السلام دنیا میں موجود ہیں۔ وہ ملعون خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔

افسوس صد افسوس بجائے اس کے کہ مسلمان اہل بیت علیہم السلام کے علم و فضل سے روحانی برکات حاصل کرتے۔ ان کے ایسے دشمن ہوئے کہ جب تک کربلا میں اس گھر کو اچھی طرح تباہ و برباد نہ کر لیا چین نہ آیا آہ! کون سی تکلیف تھی جو دشمنان دین نے ان مقدس ہستیوں کو نہ پہنچائی تھی کربلا میں تو وہ وحشیانہ مظالم ہوئے جن کے تصوّر سے کلیجہ لرزتا ہے۔ بہتر بے کسوں کو لاکھوں درندے گھیرے ہوئے تھے۔ دوسری محرّم سے نبی کے نواسے پر چڑھائی شروع ہوئی اور دس محرّم تک پنجتن پاک کا خاتمہ ہو گیا۔

مومنین روز عاشور کی صبح وہ صبح تھی کہ آسمان ہدایت کے تابندہ ستارے زمین نینوا پر شام کو غروب ہو گئے اور برج رسالت کے آبدار موتی خاک میں بکھر گئے۔ یہ وہی صبح تھی جس کے بعد امام حسینؑ

اور ان کے رفقاء کو دوسری صبح دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ نبی کا ہرا بھرا باغ پامال کیا گیا۔ نبی زادیوں کے سر سے چادریں چھینی گئیں۔ علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیوں کو قید کیا گیا۔ آہ یہ صبح معمولی صبح نہ تھی بلکہ قیامت کی صبح تھی۔ اس کا حال کربلا والوں سے پوچھیئے

منقول ہے کہ امام علیہ السلام نے چونکہ تمام رات عبادت الہٰی میں گزاری تھی اس لئے قریب صبح ذرا دیر کے لئے آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہولناک خواب دیکھ کر بیدار ہوگئے اور اپنے اصحاب سے فرمایا میں نے اس وقت خواب میں دیکھا ہے کہ چند کتے مجھ پر حملہ آور ہیں۔ ان میں ایک ابلق کتا سب سے زیادہ حملہ کر رہا ہے اور مجھ پر چڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ میرا قاتل مبروص ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اپنے جدامجد حضرت رسولؐ خدا کو یہ فرماتے سُنا۔ بیٹا حسین تو شہید آلِ محمدؐ ہے اے فرزند تمام اہل آسمان اور ساکنان ملاء اعلیٰ تیرے آنے کی خوشیاں کر رہے ہیں۔ پس اے نور دیدہ اب اپنے آنے میں تاخیر نہ کر۔ اور جلدی اپنے کو مجھ تک پہنچا۔ پس اس کی تعبیر یہی ہے کہ میری شہادت کا وقت اب قریب آگیا ہے۔ یہ سُن کر تمام اصحاب حد درجہ ملول ہوئے۔

سید ابن طاؤس اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب صبح عاشور نمایاں ہوئی۔ تو آپ نے شہزادہ علی اکبر کو اذان دینے کا حکم دیا اور اپنے انصار سے فرمایا۔ مصلّے بچھاؤ تاکہ ہم سب مل کر فریضۂ الہٰی کو ادا کرلیں۔ اس کے بعد ہمیں نماز بجماعت پڑھنے کا موقع نہ ملے گا۔

یہ حکم سنتے ہی عاشقان الہٰی کے مصلّے برابر میں بچھ گئے۔ پانی کہاں تھا جو وضو کرتے تیمم کر کے سب اپنے اپنے مصلّوں پر آگئے۔ جناب علی اکبر شبیہ پیغمبرؐ نے باآواز بلند اذان دینی شروع کی۔ آہ! جب یہ آواز خیام اہلِ حرم میں پہنچی ہوگی۔ تو مخدرات عصمت و طہارت بالخصوص جناب زینبؑ و اُم کلثومؑ اور اُم لیلیٰ کے دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی کہ اب یہ آواز نہ کبھی سنائی دے گی اور یہ اذان دینے والا ہمیشہ کے لئے ہم سے جُدا ہو جائے گا۔

الغرض اذان کے بعد مسلم ابن عوسجہ نے اقامت کہی اور امام مظلوم کے پیچھے ناصران حسینؑ نے صفیں باندھیں اور عبادت الہٰی میں مشغول ہوگئے۔ حضرت روز عاشورہ کی یہ جماعت دیکھنے کے قابل تھی۔ امام مظلومؑ کی یہ نماز اپنے رفقاء کے ساتھ آخری نماز تھی۔ چشم فلک نے ایسی نماز کہاں دیکھی ہوگی۔ جس میں ایک ایک مصلی بادہ عرفان سے سرشار تھا۔ یہ معمولی لوگوں کی جماعت نہ تھی۔ یہ خدا کے ان سچے پرستاروں کی جماعت تھی جو حمایت دین میں مرنے پر کمربستہ کھڑے تھے۔ یہ ان خداشناسوں کی جماعت تھی۔ جن کے خضوع اور خشوع میں باوجود تین دن کی بھوک و پیاس کے ذرہ برابر کمی نہ آئی۔

اس جماعت میں قرآن کے حافظ بھی تھے۔ قرآن کے قاری بھی تھے۔ مفسر و محدث بھی تھے۔ بڑے بڑے عباد اور زہاد بھی تھے اور شریعت اسلام کے محافظ بھی تھے۔ نبیؐ اور علیؑ کی صحبتوں سے فیض اٹھانے والے بھی تھے۔ جوانانِ جنت کے سردار بھی تھے۔ بچے سے لے کر جوان اور جوان سے لے کر بوڑھے تک سب زیورِ صلاح و تقویٰ اور زہد و ورع سے آراستہ تھے۔

کتاب کامل میں بروایت حبسی امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ صبح عاشورہ امام حسینؑ نے مع اپنے اصحاب کے نمازِ صبح ادا کی۔ اس کے بعد حضرت اپنے انصار کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میرے وفادار دوستو آج ہمارے قتل کا دن ہے پس تم کو چاہیے کہ اس بلائے عظیم پر صبر کرو۔ اس دنیا میں خاصانِ خدا پر بلائیں نازل ہوتی رہی ہیں اور انہوں نے صبر و ہمت سے انہیں جھیلا ہے۔ خدا کی سرکار میں صبر کرنے والوں کا بڑا اجر ہے۔

منقول ہے کہ اس طرف تو امام علیہ السلام بعد نمازِ صبح اپنے اصحاب کو صبر و شکر کی تعلیم دے رہے تھے اور ادھر لشکر سعد میں جنگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حضرتؑ نے جناب بریر ہمدانی کو بلا کر فرمایا کہ تم جاؤ ایک بار اس قوم بدشعار کو سمجھاؤ۔ شاید یہ لوگ راہِ راست پر آجائیں۔

پس بروایت بحار جناب بریر اس قوم جفاکار کے سامنے آئے اور فرمایا۔ لوگو خدا سے ڈرو اور ایسا کام نہ کرو جس سے خدا و رسولؐ کے غضب میں گرفتار ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ امام حسین علیہ السلام کون ہیں؟ اے بدبختو! یہ تمہارے نبی کے نواسے ہیں۔ وائے ہو تم پر جس نبیؐ کا تم کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسے کے قتل کا ارادہ رکھتے ہو۔ کیا تمہارے اس عمل سے حضرت رسولؐ خدا خوش ہوں گے۔ اے قوم ان خیموں میں تمہارے رسولؐ کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں ہیں جن پر تین روز سے تم نے پانی بند کر رکھا ہے۔ اے ظالمو اتنے ہی ظلم پر بس کرو اور ان کو زیادہ مصیبت میں نہ ڈالو۔ کسی قوم نے اپنی نبی کی اولاد کے ساتھ ایسا برا سلوک نہیں کیا جیسا تم نے اپنے نبی کی اولاد سے کر رہے تھے۔ اے قوم دنیا چند روزہ ہے۔ خدا سے ڈرو۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ تم خدا کے حضور سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

جناب بریر کی یہ تقریر سن کر اس ناخدا ترس قوم نے جواب دیا کہ اے بریر! بجائے ہم کو سمجھانے کے تم حسینؑ بن علیؑ کو کیوں نہیں سمجھاتے اگر وہ بیعت یزید کر لیں۔ تو ابھی ان کو تمام مصائب و آلام سے نجات مل سکتی ہے۔

بریر نے فرمایا استغفر اللہ وہ جناب ہرگز اس امر کو گوارا نہ کریں گے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ

جہاں سے آئے ہیں وہاں واپس چلے جائیں۔ اے اہلِ کوفہ وائے ہو تم پر کہ تم نے خط بھیج کر فرزند رسول کو اپنی طرف بلایا اور وہ جناب جب اس طرف متوجہ ہوئے تو اب تم ان کے قتل پر کمر بستہ ہو؟ کیا عرب کی مہمان نوازی یہی ہے کہ تم نے ان پر اور ان کی اولاد اور اصحاب پر تین روز سے پانی بند کر رکھا ہے خدا تم کو روزِ قیامت سیراب نہ کرے تم کیسے ظالم اور ستم شعار لوگ ہو۔

یہ سن کر ایک شخص نے جواب میں کہا اے بریر ہماری سمجھ میں نہیں آیا تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کے بعد کئی جفا کاروں نے بریر پر تیر پھینکے۔ جب اس قوم کی بے حیائی دیکھی تو مجبوراً جناب بریر واپس آگئے۔

الغرض جب حضرتؑ کو اس قوم بدشعار کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی تو آپ نے اپنی مختصری فوج کو تیار کرنا شروع کیا۔

بروایت ارشاد حضرت کی کل فوج بتیس سوار اور چالیس پیادے تھے آپ نے جناب زہیر کو میمنہ کا سردار بنایا اور جناب حبیب ابن مظاہر کو میسرہ کا۔ فوج کا علم حضرت ابوالفضل العباسؑ کو عطا فرمایا۔

جب دونوں طرف سے فوجیں آراستہ ہوگئیں تو عمر سعد شقی نے ایک تیر چلہ کمان میں جوڑ کر لشکرگاہ حسین مظلوم کی طرف پھینکا اور کہا اے قوم گواہ رہنا کہ سب سے پہلے فوجِ حسینؑ کی طرف تیر پھینکنے والا اور اس جنگ کی ابتدا کرنے والا میں ہوں۔ اس کے بعد اس قوم جفاکار نے مبارز طلبی شروع کی حضرتؑ نے پھر بغرض اتمام حجت اس جاہل قوم کو سمجھانا مناسب جانا۔ آپ دونوں لشکروں کے درمیان تشریف لائے اور فرمایا۔

''اے قوم کیا میں نے تم میں سے کسی کو قتل کیا ہے جس کا بدلہ تم لینا چاہتے ہو۔ کیا میں نے کسی کا مال چھین لیا ہے یا کسی کو زخمی کیا ہے جس کے قصاص میں تم میرے درپے ہو۔ کیا میں نے شریعت اسلام کو تبدیل کیا ہے جس کی سزا دینی ضروری جانتے ہو۔ اے شیث ابن ربعی اے حجار بن الحر اے قیس بن اشعث، اے یزید بن الحارث کیا تم نے مجھے خطوط میں نہیں لکھا تھا کہ اب درختوں کے پھل پک گئے ہیں۔ باغ سرسبز ہیں۔ بہار کے دن ہیں۔ لشکر آپ کی نصرت کے لئے موجود ہیں۔ آپ ضرور ہماری طرف تشریف لائیے۔ کیا تم اپنے خطوط کا مضمون بھول گئے؟ کیا تمہارے دین میں مہمان کی یہی قدر کی جاتی ہے۔ جو تم میری کر رہے ہو۔

یہ سن کر قیس اشعث ملعون نے جواب دیا کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو امیرالمومنین یزید کی بیعت کر لیجئے ورنہ ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائیے۔ اس بدبخت ازلی کا یہ کلام

سُن کر آپ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے واپس تشریف لائے۔ ابھی حضرتؑ نے اپنے کسی ناصر کو اذنِ کارزار عطا نہ فرمایا تھا کہ حر بن یزید ریاحی کے آنے کا شور ہوا واقعہ یہ ہے کہ شبِ عاشور جب خیامِ حسینؑ میں العطش العطش کا شور مچا ہوا تھا۔ حُراس وقت اپنے خیمے کے سامنے کسی تردّد میں ٹہل رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے خیمے سے دور نکل گئے۔ بار بار ان آوازوں پر کان لگاتے تھے جو خیامِ حسینی سے بلند ہو رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد جب ادھر سے واپس ہوئے تو راہ میں بھائیؑ سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت جناب حر کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور رفتار و گفتار سے انتہائی بدحواسی ظاہر ہو رہی تھی۔ بھائیؑ نے پوچھا کیا بات ہے اس وقت میں تم کو بہت زیادہ پریشان پا رہا ہوں۔ جناب حر نے کہا ذرا کچھ دور میرے ساتھ چلو جب خیمہ گاہ سے قریب ہوئے تو حُر نے اپنے بھائیؑ سے کہا۔ ذرا کان لگا کر سنو تو یہ آوازیں کیسی ہیں۔ انہوں نے کہا یہ تو خیامِ حسینؑ سے صاف آواز العطش العطش آ رہی ہے۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپ رہے ہیں۔ جناب حُر یہ سُن کر رونے لگے۔ اور سینہ پر ہاتھ مار کر کہا کہ اولادِ رسولؐ کی تکلیف کا باعث میں ہوا۔ نہ میں فرزندِ رسولؐ کو گھیر کر کربلا میں لاتا نہ یہ لوگ اس بلا میں گرفتار ہوتے۔ میرا کلیجہ ان بچوں کی فریاد سُن سُن کر پھٹا جاتا ہے جی میں آتا ہے کہ سینہ میں خنجر مار کر مر جاؤں۔ تُف ہے ایسی زندگی پر کہ اولادِ رسولؐ تو پیاس سے تڑپے اور ہم سیر سیراب رہیں۔ بھائیؑ نے کہا پھر کیا ارادہ ہے۔ حُر نے فرمایا بس اب تو عذاب الٰہی سے بچنے کی صرف یہی تدبیر ہے کہ جلد از جلد اپنے کو امام علیہ السلام کے قدموں پر ڈال دوں اور اپنی گزشتہ گستاخی کو معاف کرا کے ان کی نصرت و حمایت میں جان قربان کر دوں۔

بھائیؑ نے کہا جزاک اللہ اس وقت تم نے وہ بات کہی جو میرے دل میں تھی۔ حر نے فرمایا پھر دیر کیا ہے۔ خیمہ میں چل کر گھوڑوں پر زین کسو اور فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ ابھی لڑائی کا آغاز نہیں ہوا۔ میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے اپنی ہی جان امام علیہ السلام کے قدموں پر نثار کر دوں بھائیؑ نے کہا بسم اللہ میں بھی تیار ہوں۔ الغرض جناب حُر مع اپنے بھائیؑ فرزند اور غلام کے اور بعض کے نزدیک تن تنہا لشکر امام مظلوم علیہ السلام کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہاں امام مظلومؑ سے آپ کے رفقاء اور انصار اجازتِ کارزار طلب کر رہے تھے اور آپ فرما رہے تھے۔ ٹھہرو ابھی مجھے اپنے ایک دوست کی آمد کا انتظار ہے۔ لوگ حیران تھے کہ اس وقت بے کسی میں کون ہماری مدد کو آنے والا ہے۔ ناگاہ لشکرِ پسر سعد کی طرف سے گرد نمودار ہوئی۔ امام علیہ السلام

نے جناب عباسؑ سے فرمایا کہ تم استقبال کو جاؤ۔ حُر بن یزید ریاحی عفو کو آرہا ہے۔ یہ حکم سنتے ہی جناب عباسؑ علمدار گھوڑا بڑھا کر اس طرف روانہ ہوئے۔ جب حُر نے جناب جناب عباسؑ کو اپنی طرف آتے دیکھا تو گھوڑے پر سے اتر پڑے۔ اور بکمال انکساری عرض کرنے لگے۔

"یا ابا الفضل العباسؑ میں خدمت امام علیہ السلام میں عفو تقصیر کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ فرزند رسولؐ الثقلین حضرت امام حسین علیہ السلام سے میری سفارش فرما دیں۔ سخت نادم ہوں کہ میں ان کو مجبور کر کے کیوں اس طرف لایا۔"

الغرض جناب عباسؑ مع حُر کے خدمت امام مظلومؑ میں حاضر ہوئے۔ حُر سر جھکا کر اور ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے زار زار آنسو بہہ رہے تھے۔ حضرت نے جوشِ محبت میں حُر کو چھاتی سے لگا لیا اور فرمایا۔" اے حُر میں نے تیری خطا معاف کی۔ خدا بھی تیری تقصیر معاف کرے۔ حُر نے عرض کی۔ یا بن رسولؐ اللہ! اب اتنی آرزو دل میں اور باقی ہے کہ سب سے پہلے حضورؑ کے قدموں پر یہ غلام اپنی جان نثار کر دے۔ پس اجازتِ کارزار مرحمت ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ اے حُر تو ہمارا مہمان ہے۔ میں نے مہمان نوازی کی کوئی رسم ابھی ادا نہیں کی۔ کیونکر اجازت دوں۔ اے حُر تو ایسی مصیبت کے وقت ہمارا مہمان ہوا ہے کہ ہم تین دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ حُر نے عرض کی کہ حضور مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میرا دل زندگانی دنیا سے ایسا سیر ہو گیا ہے کہ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

الغرض امام علیہ السلام سے اذن کارزار حاصل کر کے سب سے پہلے جناب حُر گھوڑے کو دوڑاتے میدانِ کارزار میں تشریف لائے اور اہل کوفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"اے اہل کوفہ تمہاری مائیں تمہارے ماتم میں بیٹھیں کس قدر شرم کی بات ہے کہ تم نے اس عبد صالح کو بھلا دیا جو تمہارے نبی کا نواسہ ہے۔ اے بے حیاؤ پہلے تو تم نے خط پر خط بھیج کر بلایا اور جب وہ اِدھر تشریف لے آئے تو تم ان کے دشمن ہو گئے۔ اے بے غیرتو! عرب کی حمیت کیا ہوئی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج تم اپنے مہمان کے لئے تلواریں تیز کر رہے ہو۔ افسوس وہ پانی جسے یہود و نصاریٰ بلکہ سگ و خوک تک پی رہے ہیں اور تم نے اپنے رسولؐ کی ذرّیت پر بند کر رکھا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے جاں بلب ہو رہے ہیں اور تم کو ذرا رحم نہیں آتا۔ تم اپنے خیموں میں مزے سے بیٹھے آبِ سرد اور خوش گوار پی رہے ہو اور تمہارے مہمان پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترس رہے ہیں۔ اے بے غیرتو اگر تم اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتے تو حسینؑ بن علیؑ کو اجازت دو کہ وہ جس طرف چاہیں چلے جائیں۔

جناب حر کی اس تقریر کا اس قوم بدانجام نے بجائے زبان کے تیروں سے جواب دیا۔ جناب حُر

کو طیش آگیا۔ چند اشعار رجز کے جوش میں پڑھ کر اس قوم بدکار پر حملہ آور ہوئے اور تھوڑی دیر میں بہت سے ناریوں کو واصلِ جہنم کیا۔ یہ غیر معمولی شجاعت دیکھ کر عمر بن حجاج نے فوجِ یزید کو ڈانٹ کر کہا۔ احمقو! کیا کر رہے ہو کہ اس جوان سے ایک ایک کرکے لڑ رہے ہو۔ یہ تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر لشکر حسینؑ میں گیا ہے۔ اگر علیحدہ علیحدہ لڑو گے تو ہرگز کامیاب نہ ہوگے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے چاروں طرف سے گھیر لو اور پتھر مار مار کر اس کا کام تمام کر دو۔ یہ سن کر بہت سے نابکار اس شیر غضب ناک کی طرف بڑھے۔

اب ہر طرف سے پتھر اور تیر برسانے شروع کر دیئے۔ جناب حُرؑ بھی انتہائی غضب میں ان پر حملہ آور تھے حتیٰ کہ ۴۵ آدمی اس مجاہد راہِ خدا نے قتل کر ڈالے لیکن اس کا جسم بھی تیروں کی بھرمار سے بُری طرح زخمی ہوگیا۔ اللہ رے بہادری کہ اس حالت میں بھی جس طرح ممکن ہوا اپنے کو لشکر گاہ حسینیؑ میں پہنچایا۔ اور خدمتِ امام میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے یابن رسول اللہ آپ اپنے اس غلام سے راضی ہیں۔ حضرتؑ نے گلے لگا کر فرمایا۔ اے حُر میں تجھ سے راضی ہوں میرا خدا بھی تجھ سے راضی ہو۔ لے حُر اب تم ٹھہرو کہ سارا بدن زخموں سے چور چور ہے۔ حُر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ مولا! اب غلام کو نہ روکیئے۔ میرا دل درجہ شہادت کا مشتاق ہے۔

الغرض جناب حُر پھر میدان میں تشریف لائے اور ایک پر جوش رجز پڑھ کر حملہ کیا۔ اتفاقاً ایک ظالم نے ان کے گھوڑے کے پیر کاٹ دیئے۔ اور وہ بے بس ہو کر زمین پر گر پڑے۔ آواز دی یابن رسولؐ اللہ ادرکنی اے فرزند رسولؐ اللہ خبر لیجئے کہ میں جاں بلب ہوں۔ شاید زیارتِ آخری کا شرف حاصل کر لوں۔ حُر کی یہ آواز سنتے ہی مظلوم کربلا میدان قتال کی طرف روانہ ہوئے۔

مقتل ابو مخنف میں ہے کہ قبل اس کے کہ آپ وہاں پہنچیں۔ دشمنوں نے حضرت حر کا سر کاٹ کر لشکرِ حسینؑ کی طرف پھینک دیا۔ حضرت وہیں ٹھہر گئے اور جناب حسینؑ نے جناب حُر کا خون بھرا ہوا سر اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اپنے دامن سے چہرہ کی خاک پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ اے حُر خدا کی قسم تیری ماں نے تیرا نام خوب ہی رکھا تھا۔ بے شک تو آتشِ دوزخ سے آزاد ہے۔

کتاب امالی میں جناب صدوق علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں کہ جب امام علیہ السلام حُر کے پاس پہنچے تو رمق جان باقی تھی۔ آپ نے حُر کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور فرمایا۔

"اے حُر مبارک ہو تو آتش دوزخ سے آزاد ہے۔ اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

لَنِعْمَ الْحُرُّ حُرُّ بَنِیْ رِیَاحٍ　　صَبُوْرٌ عِنْدَ مُخْتَلَفِ الرِّمَاحِ

قبیلہ بنی ریاح کا حر کیا ہی اچھا ہے
وہ نیزوں کی مار کے وقت بڑا ہی صابر تھا
وَنِعْمَ الْحُرُّ حُرُّ بَنِیْ رِیَاحٍ
فَجَادَ بِنَفْسِہٖ عِنْدَ الصِّیَاحِ
کیا ہی اچھا ہے حر جب اس نے حسین کو پکارا
اور صبح سویرے ہی راہی جنت ہوا
وَنِعْمَ الْحُرُّ فِیْ رَہْجِ الْمَنَایَا
اِذَا لْاَبْطَالُ تَخْفِقُ بِالصِّفَاحِ
کیا ہی اچھا حر موت کی گرم بازاری میں ہے
جب کہ بڑے بڑے بہادر شمشیر زنی کر رہے تھے

فَیَا رَبِّ اَضِفْہُ فِی الْجِنَانِ!
اے خدا تو اسے جنت میں مہمان بنا
وَزَوِّجْہُ مَعَ الْحُوْرِ الْمِلَاحِ
اور حسین حوروں سے اس کی تزویج کر

منقول ہے کہ اسی حالت نزع میں حضرت حرؑ نے اپنی آنکھ کھولی اور امام مظلوم کے چہرے پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور جنت کی راہ لی۔

مومنین! جب خیام اہل بیت میں یہ خبر پہنچی تو اہل حرم نے اس طرح لاش پر نوحہ خوانی کی جیسے کسی عزیز خاص پر کی جاتی ہے۔

"اے فرزند رسولؐ کے پہلے جاں نثار خوشا حال آپ کا کہ رسولؐ کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں آپ پر ماتم کرتی ہیں۔"

آہ جناب حر کے آنے سے جناب زینبؑ کو بڑی مسرت ہوئی تھی، وہ سمجھی تھیں کہ شاید حر کے آنے سے اس قوم پر کچھ اچھا اثر پڑے گا اور بھائی کے سر پر آئی بلا ٹل جائے گی۔ لیکن، جناب حر کی شہادت کے بعد وہ ہلکی سی جھلک بھی مایوسی سے بدل گئی۔

حضرات! کتنے خوش نصیب تھے انصار اور اقربائے امام مظلوم علیہ السلام جب گھوڑے سے گرتے تھے تو فرزند رسولؐ خود جا کر ہر ایک کی لاش اٹھا لاتے تھے۔ اور سیدانیاں نوحہ و ماتم کرتی تھیں۔

مگر آہ! جب امام مظلوم زخموں سے چور چور ہو کر خاک پر گرے تو اس وقت ان کی لاش کو اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ آہ مصیبت زدہ سیدانیوں کو نوحہ و بکا کرنے کی مہلت بھی نہ ملی۔

حضرتؑ کا فرق مبارک تن سے جدا کرتے ہی نیزہ پر بلند کر دیا گیا اور قتل الحسینؑ

کے نعرے مارنے لگے۔

کیا نوحہ و ماتم کرتی وہ دکھیاری بی بیاں جن کے لوٹنے اور غارت کرنے کے لئے دشمن خیموں میں در آئے تھے۔ اور اس بے دردی سے لوٹ رہے تھے کہ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔

بالی سکینہ کے کان چیر کر گوشوارے تک کھینچ لے گئے کاش! اسی پر بس کرتے۔ انہوں نے تو یہ غضب ڈھایا کہ خیموں میں آگ لگا دی۔ آہ بے کس بی بیاں اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھیں۔ کہ بار بار وا محمداہ وا علیاہ کے نعرے مارتی تھیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ ھود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

گیارہویں مجلس

تفسیر آیۂ مباہلہ فضائل امیر المومنین علیہ السلام

اور

شہادت جناب وہب

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

(آل عمران ۳/۶۱)

(اگر یہ لوگ تم سے ان کے بارے میں جھگڑا کریں تو ان سے کہو آؤ ہم بھی اپنے بیٹوں کو بلائیں تم بھی اپنے بیٹوں کو بلاؤ۔ ہم بھی اپنی عورتوں کو بلائیں تم بھی اپنی عورتوں کو بلاؤ۔ ہم بھی اپنے نفسوں کو بلائیں تم بھی اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر خدا کے سامنے گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں)

اس آیت کی شان نزول میں لکھا ہے کہ ایک بار نصارائے نجران حضرت رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بحث کرنے لگے۔ ہر چند حضرتؐ نے سمجھایا کہ تم سخت گمراہی میں ہو کر حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ ان کی مثال آدمؑ کی سی ہے جس طرح خدا نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا اسی طرح عیسیٰؑ کو پیدا کیا ہے۔ آدمؑ تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ جب وہی خدا کے بیٹے نہ ہوئے تو حضرت عیسیٰ کیسے ہو گئے۔ مگر وہ نہ مانے۔ آخر طے پایا آؤ مباہلہ کریں اور فریق اپنے مخالف پر لعنت کرے

تاکہ جو جھوٹا ہو اس پر عذاب الٰہی نازل ہو۔ پس حضرت رسولؐ خدا نے چادر کے نیچے علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ حسینؑ کو جمع کیا اور درگاہِ الٰہی میں عرض کی۔

اللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ (خداوندا! یہ ہیں میرے اہل بیت) اسی وجہ سے اصحاب کسا کہلاتے ہیں۔

یہ واقعہ جناب اُم سلمہ کے گھر کا ہے۔ جب اس چادر کے نیچے جناب اُم سلمہ نے پنجتن پاک کو دیکھا تو چاہا وہ بھی اس فضیلت میں شریک ہوں۔ حضرت کے قریب جا کر کہنے لگیں۔ کیا میں بھی اس فضیلت میں شریک ہو سکتی ہوں۔ فرمایا تم خیر اور نیکی پر ہو مگر اس چادر میں داخل نہیں ہو سکتیں۔

غور کے قابل یہ بات ہے کہ جب رسولؐ کی وہ بی بی جو سب سے زیادہ نیک تھیں اصحاب کسا میں داخل نہ ہو سکیں تو بھلا ان بی بیوں کا داخلہ اس چادر میں کیسے ہو سکتا تھا جن کی مذمت میں کھلم کھلا قرآن کی آیتیں موجود ہیں۔ اس چادر میں صرف وہی لوگ تھے جو اہل بیت رسولؐ تھے۔ یہ سب کے سب معصوم تھے۔ کفر و شرک سے بَری تھے۔ اہلِ طہارت تھے۔ ان کی ہی شان میں آیۂ تطہیر نازل ہوئی۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ازواج رسولؐ بھی اہل بیت میں داخل ہیں۔ انہوں نے نہ اہل بیت کے معنی پر غور کیا اور نہ آیت تطہیر کے مفہوم کو سمجھا۔ بھلا آیت تطہیر میں نبی کی وہ بی بیاں کیونکر داخل طہارت الٰہیہ کا مصداق بن سکتی ہیں۔ جن کی شان میں فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا! (تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہو گئے) موجود ہے۔

حدیث کسا سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ساکنان ملاء اعلیٰ نے اصحاب کسا پر رحمت الٰہی کا نزول دیکھا تو تعجب سے کہنے لگے۔ خداوندا! یہ چادر کے نیچے کون لوگ ہیں۔ فرمایا اے میرے ملائکہ قسم ہے اپنی عزت و جلال کی۔ میں نے آسمان کو نہیں بنایا اور زمین کو نہیں بچھایا سورج کو نہیں چمکایا۔ چاند کو نہیں جگمگایا مگر ان پانچ کی محبت میں۔ یہ فاطمہؑ ہیں اور ان کے باپ ان کے شوہر اور ان کے بیٹے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس مجمع میں نبیؐ بھی موجود تھے اور امام بھی اور تعارف کا قاعدہ یہ ہے کہ بڑی ہستی سے کرایا جاتا ہے مگر یہاں ایسا نہیں۔ ضرور اس میں مصلحت ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس مجمع کے مَردوں کا تو ذکر ہی کیا جو عورت ہے وہ بھی اس پایہ کی ہے۔ کہ اس کے ذریعہ سے نبوت و امامت کا تعارف کرایا جا رہا ہے اب اس مقدس بی بی کے فضائل پر غور کیجئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عام عورتوں میں جو عیب بالعموم پائے جاتے ہیں وہ اس بی بی میں نہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ عورتوں میں تین عیب پائے جاتے ہیں۔

اوّل وہ ناقص العبادت ہیں دوسرے ناقص العقل ہیں تیسرے ناقص الحظ ہیں۔ یعنی انہیں میراث میں کم ملتا ہے مگر جناب فاطمہ زہراؑ ان تینوں عیبوں سے پاک ہیں وہ ناقص العبادت نہیں کیونکہ ان کا تعلق ان نجاستوں سے نہیں۔ جن کے باعث ہر ماہ عبادت سے رک جاتی ہیں۔ دوسرے وہ ناقص العقل نہیں کیونکہ مباہلہ میں آنحضرتؐ کی گواہ وہ علیؑ کے برابر تھیں ورنہ عموماً عورت کی گواہی شریعت اسلام میں آدھی سمجھی جاتی ہے۔ تیسرے وہ ناقص الحظ بھی نہ تھیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے باپ کا پورا ترکہ پایا۔ غور کیجئے جو بی بی اس طرح زنانِ عالم میں ممتاز ہو۔ اس کا شوہر کیسا ہونا چاہیے۔ تین باتیں اس کی بھی ایسی ہونی چاہئیں کہ دنیا کے کسی مرد میں نہ پائی جائیں۔ صاحب ارجح المطالب نے باب مصاہرت میں حسب ذیل حدیث نقل کی ہے۔

يَا عَلِيُّ أُوْتِيتَ ثَلَاثًا مَا أُوتِيَ أَحَدٌ مِثْلَكَ وَلَا أَنَا أُوتِيتُ مِنْهُمْ مِثْلِي وَلَمْ أُوتَ أَنَا مِثْلِي وَأُوتِيتَ زَوْجَتُكَ الصِّدِّيقَةَ بِنْتِي وَلَمْ أُوتَ مِثْلَهَا وَأُوتِيتَ حَسَنًا وَحُسَيْنًا مِنْ صُلْبِكَ وَلَمْ أُوتَ مِنْ صُلْبِي مِثْلَهُمَا أَنْتُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْكُمْ

اے علیؑ! تم کو تین چیزیں ایسی ملیں جو دنیا میں کسی کو نہیں ملیں۔ یہاں تک مجھے بھی تم کو مجھ جیسا خسر ملا۔ مجھے اپنی مثل نہ ملا۔ تمہیں صدیقہ بی بی میری بیٹی ملی۔ مجھے ایسی بی بی نہ ملی۔ تمہارے صلب سے حسن و حسین جیسے بیٹے پیدا ہوئے میرے صلب سے نہ ہوئے۔ پس تم مجھ سے ہو اور میں تم سے۔ (اس حدیث میں حضرت نے دو اہم مسئلوں کو حل فرما دیا۔ اوّل یہ کہ حضرت کے ایک ہی بیٹی تھی۔ ورنہ یہ نہ فرماتے کہ تم کو مجھ جیسا خسر ملا ہے۔ وہ دوسروں کو نہیں ملا۔ اگر آپ کسی اور کے بھی خسر ہوتے تو یہ نہ فرماتے کہ تم کو مجھ جیسا خسر ملا۔ ورنہ دوسرا داماد کہتا کہ اس فضیلت میں تو میں بھی شریک ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ حل کیا کہ آپ کی کوئی بی بی صدیقہ نہ تھی۔

الغرض حضرت رسولِ خدا اپنے اہل بیت کو جو اصحاب کسا ہیں لے کر اسی طرح مباہلہ کو نکلے کہ امام حسینؑ آپ کی گود میں تھے۔ امام حسن علیہ السلام کی انگلی پکڑے تھے۔ آپ کے پیچھے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور ان کے پیچھے حضرت علی علیہ السلام تھے۔ یہ گویا آیہ مباہلہ کی عملی تفسیر تھی۔ جس ترتیب سے وہاں ذکر ہے اسی ترتیب سے رسولؐ ابنا و نسا اور نفس کے مصداق کو لے کر نکلے

ہیں۔ آپ اپنے اہل بیت سے فرماتے جاتے تھے جب میں بددعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنا حضرتؐ کو اپنی دعا کے رد نہ ہونے کا یقین تھا۔ اتنا ہی ان کی آمین نہ رد ہونے کا تھا۔

اس سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابل غور رہے کہ آنحضرتؐ نے بھرے کنبے اور ہزاروں اصحاب کی موجودگی میں ان چار ہی کا انتخاب کیوں کیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہی صرف چار ہستیاں تھیں جن کی آمین کے قبول ہونے میں حضرتؐ کو ذرا بھی شبہ نہ تھا دوسرے نہ یہ کوئی مادی جنگ تھی کہ تمام صحابہ کو ساتھ لے کر نکلتے نہ کوئی دعوت تھی کہ خاندان والوں کو ساتھ لے جاتے بلکہ یہ ایک روحانی جنگ تھی۔ رسالت کی تصدیق کا معاملہ تھا لہٰذا ایسے ہی لوگوں کو لے جانا چاہئے تھا۔ جو کبھی جھوٹ بولے ہی نہ ہوں جنہوں نے سوائے خدا کے کبھی کسی اور کو معبود بنایا ہی نہ ہو۔ ورنہ جھوٹا جھوٹے پر کیا لعنت کرے گا یا جس نے دوسرے کو معبود یا شریک کار خدا سمجھ لیا ہو وہ بھلا انصار کو کیا جھٹلا سکے گا۔ علاوہ بریں ایک بات اور بھی ہے۔ حضرت رسول خدا میں دو جنبے تھے ایک بشریت کا اور دوسرے رسالت کا بشریت کے رشتہ دار اور تھے اور رسالت کے اور بس اپنی رسالت کی گواہی کے لئے ان ہی کو لے گئے۔ جو نور رسالت کے جزو تھے اور جن کو لفظ من کے ساتھ ہمیشہ اپنی ذات سے نسبت دیتے رہے مثلاً یَا عَلِیُّؑ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ الرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِّنِّیْ اَلْحَسَنُؑ مِنِّیْ اَلْحُسَیْنُؑ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِؑ۔

ہر اولاد یوں تو ماں باپ کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت ہی نہ تھی ایک ایک کا نام لے کر اس نسبت کو بتانا ثابت کر رہا ہے کہ یہ اظہار اس لئے نہیں تھا کہ یہ جسم مادی کے ٹکڑے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ جسم رسالت کے ٹکڑے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ یہی وہ ایک نرالی فضیلت اہل بیت کی ہے جس کے بارے میں ان کا سخت سے سخت دشمن بھی چوں وچرا نہ کر سکا اور آیہ مباہلہ میں کسی کو کسی تاویل کی گنجائش نظر ہی نہیں آئی جو ساتھ میں جانے والے تھے۔ ہر ایک کو ان کے نام بتانے ہی پڑتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ کسی زن و مرد کو شامل کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

نصارائے نجران کے سردار نے اپنی قوم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر محمدؐ مباہلہ کے لئے غیروں کو کو لائیں تو سمجھ لینا کہ ان کو اپنی صداقت پر پورا بھروسہ نہیں اور اور اگر اپنے خاص رشتہ داروں کو لے آئیں تو سمجھ لینا کہ ان کو اپنی صداقت پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ قطعاً عذاب الٰہی سے بے خوف ہیں۔ چنانچہ حضرت رسولؐ خدا کو اس شان سے آتے دیکھا تو کہنے لگے۔ یَا مَعْشَرَ النَّصَارٰی اِنِّیْ لَاَرٰی وُجُوْھًا لَوْ سَاَلُوْا

اللہ ان یزیل الجبل لازالہ واللہ۔

(اے نصرانیو! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ خدا سے پہاڑ کے ہٹنے کا سوال کریں تو خدا ضرور ہٹا دے گا۔ تم ہرگز ان سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ ایک نصرانی بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا۔ بہتر ہے کہ تم جزیہ دینا قبول کر لو۔

جو لوگ صرف قرآن کے کافی ہونے کے قائل ہیں۔ وہ ذرا سمجھیں کہ آنحضرتؐ تین روز متواتر اس قوم کو آیات قرآنی سے یہ سمجھاتے رہے کہ حضرت عیسٰیؑ ابن اللہ نہیں۔ ان مثل عیسٰی کمثل آدم خلقہ من تراب (عیسٰیؑ کی مثال آدمؑ کی سی ہے جن کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا مگر ان کی سمجھ میں نہ تو یہ بات آئی اور نہ آنحضرتؐ کا نبی صادق ہونا سمجھ میں آیا۔ لیکن جب حضرتؐ نے قرآن کے ساتھ اہل بیت کو بھی شامل کر لیا تو چہرے دیکھتے ہی اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔

مومنین صداقت اس کو کہتے ہیں کہ پنج تن پاک کے چہروں سے پھوٹ نکلی تھی۔ اور دوستوں کا کیا ذکر دشمن اس کی گواہی دے رہے تھے۔ جب لعنت خدا کا ذبین پر ہونے والی تھی تو اس قوم نے تصدیق کر دی کہ یہ کاذبین نہیں بلکہ صادقین ہیں اور حکم خدا یہ ہے کہ کونوا مع الصادقین (سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) تو جن مسلمانوں نے ان کا ساتھ چھوڑ کر دوسروں کا ساتھ دیا تو وہ یقیناً جھوٹوں کے پیرو تھے اور نتیجے میں ان کو ضلالت و گمراہی حاصل ہوئی۔

اس آیت میں چار امر فضیلت امیر المومنین علیہ السلام پر دال ہیں۔ اول حضرت علیؑ کی رسول خدا سے قربت منزلت یعنی نفسِ رسول قرار پانا۔ دوسرے حضرت رسولؐ خدا کا ان کی دعا سے مدد طلب کرنا۔ تیسری نصاریٰ کے پادری کا یہ اقرار کرنا کہ وہ مقرب ایزدی ہیں چوتھے حضرتؐ کا انفسنا میں داخل ہونا نہ کہ ابناءنا میں زمخشری کا یہ خیال غلط ہے کہ آیۂ مباہلہ میں نفس سے مراد نفس رسولؐ ہے کیونکہ کسی کا اپنے نفس کو بلانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور جب حضرت علیؑ نفس قرار پائے تو خلافت ثابت ہوئی۔ کیونکہ ان کو حضرت رسولؐ خدا کے سوائے نبوت و رسالت کے ہر منزلت و مرتبہ میں مساوات حاصل ہو گئی

اہل بیت علیہم السلام کی مساوات بہت سے امور میں حضرت رسولؐ خدا سے ثابت ہے جیسا کہ فخر الدین رازی نے اسرار التنزیل میں لکھا ہے کہ آلِ محمدؐ پانچ چیزوں میں آنحضرتؐ کے ساتھ شریک ہیں اول سلام رسولؐ کے لئے ہے السلام علیک ایھا النبی اور اہل بیت کے لئے ہے۔ سلام علی آل لیس دوسرے صلواۃ میں اللھم صل علی محمد و آل محمد تیسرے طہارت میں رسول کے لئے طٰہٰ اور اہل بیت کے لئے ہے ویطھرکم تطھیرا چوتھے تحریم

صدقہ ہیں۔ یعنی صدقہ جس طرح محمدؐ پر حرام ہے اسی طرح آلؑ پر حرام پانچویں وجوب مودۃ میں رسولؐ کے لئے ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی چھٹے رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ امان ہیں۔ اُمّت کے لئے عذاب الٰہی سے رسولؐ کے لئے خدا فرماتا ہے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ اور اپنے اہل بیت کے لئے رسولؐ نے فرمایا ہے۔ النجوم امان لاھل السماء اھل بیتی امان لامتی سارے آسمان کے لئے امان ہیں اور میرے اہلبیت میری اُمّت کے لئے۔ ساتویں بحالت جنابت مسجد نبوی میں جانا صواعق محرقہ میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا۔

اے علی میرے اور تمہارے سوا کسی کو بحالت جنابت اس مسجد کے اندر جانا جائز نہیں۔ آٹھویں حضرت علی کا دروازہ مسجد کی طرف کھلا رہنا۔ چنانچہ ابن عباس سے مروی ہے کہ رسولؐ خدا نے ان تمام اصحاب کو جن کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے بند کرنے کا حکم دیا۔ پس علیؑ کے سوا سب کے دروازے بند ہوگئے اس پر لوگ ناخوش ہوئے اور حضرت سے شکایتاً کہا۔ آپ نے اپنے تمام اصحاب و اعمام کے دروازے بند کرا دیئے لیکن علیؑ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ حضرتؐ نے ان کے جواب میں فرمایا میں نے نہ تو ان کے دروازے بند کئے اور نہ علیؑ کا کھلا رکھا جو کچھ ہوا حکم خدا سے ہے

نکتہ:- علیؑ کا دروازہ خانہ خدا کی طرف کھلا رہا۔ اور ان کا طریقہ خدا کی طرف منتہیٰ ہوا پس وہ اس بات کے لائق ہیں کہ ان کی اقتدا کی جائے نہ کہ وہ لوگ جن کے دروازے بند ہوئے اور جوار الٰہی سے دور ہوئے۔ پس خوش خبری ان لوگوں کو جنہوں نے حضرت رسولؐ خدا کے بعد ایسے گھر کی طرف رجوع کی۔ جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک وہ دروازہ جو مدینۃ العلم کی طرف پہنچاتا ہے اور دوسرا جو اہل بیتؑ کی طرف کھلا ہوا ہے۔ اور کیا ہی اچھا تھا۔ اس کا مالک جو خانہ خدا ہی میں پیدا ہوا اور خانۂ خدا ہی میں شہادت پائی ؎

شد فیض دو سرا از در علی بے بہرہ آنکہ گشت جدا از در علی

یکشور مصطفےٰ در حید ز مسجدش

یعنی کہ میرسی بخدا از در علی

نویں مقاتلت علیؑ تاویل القرآن میں رسولؐ کے ساتھ اہل بیت کو مساوات حاصل ہے جیسا کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا۔

یا علی انک تقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیلہ۔

اے علیؑ! تم تاویل قرآن پر اس طرح قتال کرو گے جس طرح میں نے تنزیل پر کیا ہے۔

دسویں اولویت۔ چنانچہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔
مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ۔ یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔
گیارہویں مواخات میں جیسا کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا ہے۔
يَا عَلِيُّ أَنْتَ أَخِيْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ اے علی! تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔
بارہویں حب و بغض و سب و ایذا میں چنانچہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا ہے۔
مَنْ اَحَبَّ عَلِيًّا فَقَدْ اَحَبَّنِيْ وَمَنْ اَبْغَضَ عَلِيًّا فَقَدْ اَبْغَضَنِيْ وَمَنْ سَبَّ عَلِيًّا فَقَدْ سَبَّنِيْ وَمَنْ اٰذٰى عَلِيًّا فَقَدْ اٰذَانِيْ۔
جس نے علی کو دوست رکھا اس نے مجھ کو دوست رکھا، جس نے علی کو دشمن رکھا اس نے مجھ کو دشمن رکھا، جس نے علی کو بُرا کہا اس نے مجھے بُرا کہا اور جس نے علی کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔
بیہقی نے فضائل صحابہ میں روایت کی ہے کہ ایک دن جو علی علیہ السلام حضرت سرورِ انبیاء کی خدمت میں آئے تو آپ نے فرمایا: هٰذَا سَيِّدُ الْعَرَبِ۔ یہ سردارِ عرب ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ آپ سید العرب نہیں۔ فرمایا میں سید العالمین ہوں۔ اور یہ سید العرب ہیں پس سیادت میں بھی مساوات ہوئی۔
چودہویں اصل میں ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا الناس من اشجار شتّٰی وانا علی من شجر واحد۔ یعنی لوگ مختلف درختوں سے ہیں اور میں اور علی ایک درخت سے ہیں اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا۔
عَلِيٌّ مِنِّيْ وَاَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَلَا يُؤَدِّيْ عَنِّيْ اِلَّا عَلِيٌّ
یعنی میں علی سے ہوں اور علی مجھ سے۔ میری طرف سے کوئی پیغام نہیں پہنچا سکتا مگر علیؑ
پندرہویں درجات آخرت میں مساوات حضرت رسول خدا نے فرمایا۔ یا علی! تم اور میں روزِ قیامت ایک درجہ میں ہوں گے۔ ان ہی فضائل کی بناء پر حضرت رسول خدا نے فرمایا اے علی جو تم سے محبت نہ کرے گا وہ جنت کی بو نہ سونگھ سکے گا۔ چنانچہ صاحب ارجح المطالب نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَنَّ اَعْبَدَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ مِثْلُ مَا قَامَ نُوْحٌ فِيْ قَوْمِهٖ وَكَانَ لَهٗ مِثْلُ اُحُدٍ ذَهَبًا

مَا اَنْفَقَہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَطَالَ فِیْ عُمُرِہٖ حَتّٰی یَحُجَّ اَلْفَ حَجٍّ عَلٰی قَدَمَیْہِ ثُمَّ قُتِلَ بَیْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃِ مَظْلُوْمًا ثُمَّ لَمْ یُوَالِکَ یَاعَلِیُّ لَمْ یَشُمَّ رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ وَلَمْ یَدْخُلْہَا (اخرجہ الدیلمی)

فرمایا حضرت رسولؐ خدا نے کہ اگر کوئی شخص اتنی طولانی زندگی بسر کرے جتنی نوحؑ نے بسر کی اور کوہ اُحد کے برابر سونا راہِ خدا میں نثار کر دے اور اتنی طولانی عمر پائے کہ پیادہ ایک ہزار حج بجا لائے اور صفا و مروہ کے درمیان مظلوم قتل ہو لیکن اے علی اگر تم سے محبت نہ رکھتا ہو تو وہ جنت کی بُو نہ سونگھے گا۔ اور اس میں داخل نہ ہوگا۔

حضرات نے آپ سنے فضائل و مناقب امیرالمومنین علیہ السلام۔ غور کیجئے۔ جب حضرتؑ اتنی باتوں میں حضرت رسولؐ خدا سے مساوات رکھتے تو آپ کا جانشین آپ سے بہتر کون ہو سکتا تھا۔ افسوس ہے کہ بعد رحلت رسول مسلمانوں نے ان فضائل کا ذرا لحاظ نہ کیا اور امیرالمومنین علیہ السلام کو وہ اذیتیں پہنچائیں کہ ان کے تصور سے کلیجہ لرزتا ہے۔ کس قدر افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ وہ علیؑ و فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ جنکو کہ رسولؐ خدا بھی روز مباہلہ اپنی نبوت کی تصدیق کے لئے نکلے تھے اور جو نص قرآنی صادقین میں داخل تھے۔ فدک کے بارے میں ان سب کی گواہی رد کر دی گئی اور ارباب حکومت نے ان سب کو جھوٹا سمجھا۔

صواعق محرقہ میں ہے کہ شوریٰ کے موقع پر امیرالمومنین نے اپنے استحقاق خلافت کے ثبوت میں آیہ مباہلہ کو پیش کر کے اصحاب شوریٰ سے فرمایا تھا کہ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم میں کوئی، حضرت رسولؐ خدا سے بلحاظ قربت مجھ سے زیادہ ہے۔ میں وہ شخص ہوں جس کو حضرت رسولؐ خدا نے اپنا نفس قرار دیا اور جس کے بیٹوں کو اپنا بیٹا اور جس کی عورتوں کو اپنی عورتیں کہا ان سب نے اقرار کیا کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کو یہ قرابت حاصل نہیں۔

مگر افسوس شوریٰ کمیٹی کے ممبر کتنے چالاک اور صداقت سے دُور تھے کہ زبان سے تو حضرتؑ کی فضیلت کا اقرار کرتے لیکن عملاً حضرت کو ان کے حقوق سے محروم کرتے ہیں۔ کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا چنانچہ اسی چالاکی اور عیاری کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت تیسری بار بھی اپنے حق سے محروم رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت علیؑ کو صرف ان کے جائز حق ہی سے محروم نہیں کیا بلکہ پوری کوشش اس بارے میں کی کہ حضرتؑ کے

فضائل و مناقب سے لوگ قطعاً ناآشنا رہیں اور جو روحانی اقتدار ان کو عہد رسالت میں حاصل تھا، ان کو روز بروز کم کرتے جائیں۔ یہانتک کہ کربلا میں اہل حرم کے اقتدار کا بالکل ہی خاتمہ ہوگیا۔ اہلبیت کے متعلق بے شمار احادیث رسولؐ خدا کی زبان سے سُن کر کسی مسلمان کو یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک دن یہ بزرگان الٰہی اور مقربان حضرت رسالت پناہی اس کس مپرسی کے عالم میں جا پڑیں گے کہ تین روز کے بھوکے پیاسے نرغۂ اعدا میں گھرے ہوں گے۔ طرح طرح سے اپنے حال زار کو بیان کرکے رحم کی درخواست کرتے ہوں گے۔ لیکن رحم کرنا تو بڑی بات ہے کوئی ان کی بات کان دھر کر نہ سنتا تھا۔

منقول ہے کہ جناب بریر نے روز عاشورہ اس قوم بدشعار کے مقابل جو تقریر فرمائی تھی اس میں یہ بھی کہا تھا کہ اے قوم! تم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو قارئین قرآن ہیں۔ کیا تم نے آیہ مباہلہ کو نہیں پڑھا اگر پڑھا ہے تو بتاؤ آیۂ مذکور میں ابناء نا سے کیا مُراد ہے؟ کیا رسولؐ اللہ روز مباہلہ حسنؑ و حسینؑ کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ اے قوم یہ وہی حسینؑ ہے جو روز مباہلہ خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا گواہ بن کر نکلا تھا آج تم نے اس کا رتبہ اتنا پست کر دیا ہے کہ اس کی بات کان دھر کر بھی نہیں سنتے۔ یہ سُن کر لشکر پسر سعد سے ایک شقی نکلا اور کہنے لگا۔ اے بریر! تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہم کچھ نہیں جانتے کہ حسینؑ کون ہیں۔ چونکہ اس شخص نے امیرالمومنین یزید بن معاویہ کے خلاف بغاوت کی ہے لہٰذا اس کا قتل ہم پر واجب ہے۔ یہ سُن کر جناب بریر کو سخت غصہ آیا اور گھوڑا دوڑا کر ایک نیزہ اس کے سینے پر ایسا مارا کہ وہ اسی وقت بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔

مومنین حضرت بریر ہمدانی بڑے پایہ کے مومن صالح اور متقی و پرہیزگار بزرگ تھے۔ اصحاب امام مظلوم میں ان کا خاص مرتبہ ہے۔ لکھا ہے کہ شب عاشور جب چھوٹے چھوٹے بچے در خیمہ پر خالی کوزے ہاتھوں میں لئے آواز العطش العطش بلند کر رہے تھے تو جناب بریر اپنے خیمہ میں مشغول عبادت تھے بچوں کی یہ آواز سُن کر ان کا دل لرز گیا۔ بے تابانہ خیمہ سے نکلے اور اصحاب امام کو جمع کرکے کہنے لگے۔ دوستو! وائے ہو تمہاری اس حالت پر کہ اولاد رسولؐ تشنگی سے تڑپ رہی ہے اور ہم اپنے کانوں سے اس کی فریاد سُن رہے ہیں سب نے کہا کہ اے بریر بے شک ان کی آواز سے کلیجہ منہ کو آتا ہے زندگی وبال جان ہو رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بچوں کی تکلیف کیوں کر دُور کریں۔ جناب بریر نے فرمایا۔ یہ وقت شب ہے نہر کے پہرہ دار سو رہے ہوں گے۔ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلو اور جس طرح بن پڑے مشکیزوں میں پانی بھر کر لاؤ۔ واللہ اگر ایک بچہ بھی پیاس سے ہلاک ہوگیا تو روز قیامت جناب رسولؐ خدا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ میں اس کام کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ جن کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے۔ یہ سُن کر

دو شخص جناب بریر کے ساتھ چلے ۔ بریر نے ایک سوکھا مشکیزہ اٹھا لیا ۔ پہلے در خیمہ پر آئے اور بچوں کو پیار کرنے لگے ۔ اے بچو! گھبراؤ مت ۔ ہم تمہارے لئے پانی لینے جاتے ہیں یا تو اب پانی لے کر آئیں گے ۔ ورنہ تمہیں زندہ صورت نہ دکھائیں گے ۔ تم اپنے ننھے ننھے ہاتھ بارگاہ الٰہی میں اٹھا کر خدا سے دعا کرو کہ ہم کو اس کوشش میں کامیاب کرے ۔ یہ کہہ کر جناب بریر اور ان کے ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر نہر فرات کی طرف روانہ ہوئے ۔

وہاں پہنچے تو ایک سردار نے جو مخالف فوج کا تھا ٹوک کر کہا ۔ "کون آتا ہے ۔؟" بریر نے اس کی آواز پہچان لی ۔ اور کہا اے عبداللہ بن ربعی میں ہوں ۔ بریر بن خضیر ہمدانی اس لئے آیا ہوں کہ نہر سے اپنی پیاس بجھاؤں ۔ اس نے جواباً کہا ۔" اے بریر! چونکہ تم میرے قبیلہ سے ہو ۔ لہٰذا اتنی اجازت دے سکتا ہوں کہ تم اور تمہارے ساتھی نہر سے اپنی پیاس بجھا لیں ۔ مشکیزوں میں پانی بھر کر نہ لے جانے دوں گا ۔ جناب بریر نے فرمایا اے عبداللہ دل والے ہو ۔ تجھ پر میرے اوپر تو تجھے رحم آتا ہے لیکن اولاد رسولؐ پر نہیں آتا ۔ آہ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے اس طرح تڑپ رہے ہیں کہ ان کی فریادوں سے دل ہلے جاتے ہیں ۔ یہ سن کر عبداللہ کے دل پر اثر ہوا کہنے لگا کہ اچھا اے بریر اس وقت بہت سے پہرہ والے سو رہے ہیں ۔ خاموشی سے اپنی مشکوں کو بھر لو اور جلد واپس جاؤ ۔

الغرض جناب بریر نہر میں داخل ہوئے اور پانی کو دیکھتے ہی دل پر چھری چل گئی ۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی پیاس کی شدت کا تصور کر کے زار زار رونے لگے اور اپنے دل سے کہا اگر شدتِ تشنگی سے میرا کلیجہ کباب ہو رہا ہے لیکن جس طرح پیاسا آیا ہوں ۔ اسی طرح پیاسا واپس جاؤں گا جب تک اولادِ رسولؐ سیراب نہ ہو پانی میرے اوپر حرام ہے ۔ یہ کہہ کر جناب بریر نے پانی سے مشکیزہ بھرا اور خوش خوش وہاں سے نکلے ۔ ایک سپاہی نے ان کو پہچان کر شور مچایا کہ اے پہرہ دار کیا بے خبر سو رہے ہو ۔ بریر ہمدانی لشکر حسینؑ کو پانی لے جانا چاہتے ہیں جلد انہیں گھیر کر پانی چھین لو ۔ اس شقی کی آواز سنتے ہی تمام پہریدار چونک پڑے اور چاروں طرف سے بریر اور ان کے ساتھیوں کو گھیر لیا ۔

سبحان اللہ اصحاب حسین علیہ السلام کیسے بہادر تھے کہ تینوں بہادروں نے تلواریں نیام سے نکال کر ان اشقیاء سے لڑنا شروع کیا ۔ یہاں تک کہ بہت سے ناریوں کو واصل جہنم کیا ان کی بے پناہ تیغ زنی دیکھ کر وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور جناب بریر صحیح سلامت مشکیزہ لئے ہوئے خیمہ گاہِ حسینی میں داخل ہوئے مومنین اس وقت جناب بریر کی خوشی کی انتہا نہ تھی ۔ دور سے ہی باآواز بلند پکارنا شروع کیا ۔ اے بچو! مبارک ہو کہ بریر تمہارے لئے نہر سے پانی لے آیا ۔ اے پیاسے بچو! جلد اپنے اپنے کوزے لے کر آگے بڑھو اور اپنے سوکھے گلے تر کرو ۔ جوں ہی یہ آواز ان پیاس کے مارے بچوں کے کان میں پہنچی ۔ خوشی سے عجب حال ہوا

بے تابانہ اپنے کوزے لے کر دیر خیمہ پر آ گئے۔ اور بریر کو دعائیں دینے لگے۔

جناب بریر نے وہ مشکیزہ جلدی سے ان کے سامنے ڈال دیا۔ آہ آہ رات کی تاریکی میں بچے گھبرا کر جو اس مشکیزے پر گرے تو دہانہ اس کا کھل گیا اور سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ اس وقت پیاسے بچوں کی بے چینی دیکھنے کے قابل تھی۔ رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ اسے بریر غضب آ گیا۔ جو پانی آپ ہمارے لئے لائے تھے وہ سب بہہ گیا اور ہم سب بدستور پیاسے کے پیاسے رہ گئے۔ مومنین ہماری جانیں ان بچوں پر قربان ہوں۔ ہائے کیا شدت کی پیاس تھی کہ ہر ایک بچہ کوشش کر رہا تھا کہ اپنا سوکھا گلا اس تر زمین پر رکھ دے۔

حضرات! یہ رات جناب بریر نے انتہائی بے چینی میں بسر کی۔ چاہتے تھے کہ جلد صبح ہو جائے تو قوم جفا کار سے اس بدکرداری اور ستم شعاری کا بدلہ لوں۔ چنانچہ روز عاشورہ جناب حُر کی شہادت کے بعد جناب بریر خدمت امام مظلومؑ میں حاضر ہوئے۔ اور اذن کارزار حاصل کر کے میدان میں آئے پہلے نہایت جوش میں چند اشعار بطور رجز فرمائے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

میں بریر بن خضیر ہمدانی ہوں میری شجاعت کا تمام عرب میں سکہ بیٹھا ہوا ہے آج میں تم کو اپنی شمشیر کے جوہر دکھاؤں گا۔ اور چُن چُن کر تمہارے بہادروں کو قتل کر دوں گا۔ جس کو حوصلہ ہو۔ وہ میرے مقابلہ کے لئے نکلے۔

اس کے بعد دشمن پر حملہ آور ہوئے اور تھوڑی دیر میں تیس اشقیا کو واصل جہنم کیا۔ جناب بریر کی غیر معمولی شجاعت دیکھ کر دشمن کی فوج میں ہل چل پڑ گئی جب ایک ایک کو مقابلے کی جرأت نہ ہوئی تو بحکم عمر سعد سب نے ایک بار اس شیر پر حملہ کر دیا اور چاروں طرف سے گھیر کر نیزہ و شمشیر کے وار شروع کر دیئے یہاں تک کہ جناب بریر سر سے پاؤں تک زخمی ہو گئے۔ جب گھوڑے پر ٹھہرنے کی تاب نہ رہی تو آواز دی۔

یابن رسول اللہ ادرکنی

اے فرزند رسولؐ میری مدد کو آیئے کہ میں نے اپنی جان آپ پر نثار کی۔

یہ سن کر امام علیہ السلام مع چند رفقاء کے بریر کے پاس پہنچے لیکن آہ آہ!! حضرت کے پہنچنے سے پہلے راہی جنت ہو گئے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام جناب بریر کی لاش لے کر خیمہ میں آئے۔

لکھا ہے کہ جب بچوں کو معلوم ہوا کہ بریر کی لاش آئی ہے تو سب اس کے گرد جمع ہو گئے اور بے اختیار رونے لگے اور کہنے لگے۔ اے بریر! تم ہمارے لئے سقہ بنے، اے بریر تم نے ہماری وجہ سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں

امّ کو تمہاری وجہ سے بڑی ڈھارس تھی۔
سید ابن طاؤس لکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کے بچے بربر کی لاش پر اس طرح نوحہ خوانی کر رہے تھے جس طرح کوئی اپنے عزیز خاص پر کرتا ہے۔ ان کی فریاد وزاری اور نوحہ و بیقراری سُن کر رفقائے امام حسینؑ کے دل سینوں میں ہلے جاتے تھے۔ بالخصوص جب یہ کہتے تھے۔ اے بربر! ہم پیاسے ہیں اب ہمارے لئے کون پانی لائے گا۔
منقول ہے کہ بچوں کی یہ فریاد سُن کر وہب بن عبداللہ کی والدہ گرامی کا دل تڑپ گیا اور درِ خیمہ سے آواز دی۔
اے وہب! ذرا دیر کے لئے میرے پاس آؤ۔ وہب یہ سُن کر دوڑے۔ اس زن مومنہ نے کہا، اے وہب! تم دیکھ رہے ہو کہ اولادِ رسولؐ کا پیاس کی شدّت سے کیا حال ہو رہا ہے۔ بیٹا! اب تاخیر کا محل نہیں میرے آقا سے جس طرح بنے اجازت لے کر میدان میں جاؤ۔ اور ان لعینوں کو مار کر نہر سے پانی لاؤ۔ مجھ سے بچوں کی یہ بے تابی نہیں دیکھی جاتی! اے وہب یہ جان چرانے کا وقت نہیں بلکہ لڑنے کا ہے۔ میرا آقا اس وقت سخت مصیبت میں ہے۔ میری دلی تمنّا ہے کہ تم ان پر اپنی جان قربان کر کے روحِ جناب سیدہ سے مجھے سرخرو کرو۔
لکھا ہے کہ جناب وہب کی شادی کو کل سترہ روز ہوئے تھے ان کی بی بی بھی کربلا میں ان کے ساتھ تھیں ماں کی یہ تقریر سُن کر جناب وہب نے عرض کی۔ اے مادر گرامی آپ اطمینان رکھیں۔ میں ابھی اپنی زوجہ کو رخصت کر کے خدمت امام علیہ السلام میں اذن کارزار کے لئے حاضر ہوتا ہوں آہ! اس مومنہ کے دل کو کیسی لگی تھی کہنے لگی۔
اے وہب زوجہ سے رخصت ہونے کو تو میں منع نہیں کرتی لیکن اتنا کہے دیتی ہوں کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں ان کی باتوں میں نہ آنا۔ اے وہب! اگر تم زوجہ کے کہنے سے رُک گئے تو یاد رہے کہ اپنا دودھ نہ بخشوں گی اور روزِ قیامت خدا و رسول سے تمہاری شاکی ہوں گی۔
الغرض جناب وہب وہاں سے اپنی زوجہ کے پاس آئے اس زن مومنہ نے کہا جانے سے تو نہیں روکتی صرف اتنا پوچھتی ہوں مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہو۔ وہب نے کہا اگرچہ تمہاری جُدائی مجھ پر بہت شاق ہے اور یہ جانتی بھی ہو کہ دائمی مفارقت ہے اور شادی کے بعد تمہارا کوئی ارمان پورا نہیں ہوا۔ لیکن کیا کروں کچھ ایسا وقت آپڑا ہے کہ تم سے جدائی کے بغیر چارہ نہیں میں تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں تم میری شہزادی جناب زینبؑ و ام کلثومؑ کی خدمت کرتی رہنا۔ اور جو بلا دشمنوں کی بدولت آئے اسے خوشی سے جھیلنا تاکہ خوشنودی خدا حاصل ہو۔

اس بے چاری نے کہا بہتر ہوتا کہ مجھے میرے قبیلے میں پہنچادیتے۔

وہب نے کہا کہ ہر طرف سے راستے بند ہیں۔ دشمن چاروں طرف سے نرغہ کئے ہوئے ہیں کسی طرح ممکن نہیں کہ تم کو یہاں سے نکال لے جاسکوں۔ وہ بے چاری یہ سُن کر خاموش ہوگئی۔

کتب مقاتل میں ہے کہ جناب وہب کو اپنی زوجہ سے بات چیت میں جو ذرا دیر لگی۔ تو ان کی والدہ گھبرا گئیں اور پکار کر کہنے لگیں۔ بیٹا! تم نے بڑی دیر لگائی۔ جلد ہتھیار بدن پر سجا کر میدان میں جاؤ فرزند رسول تمہارے منتظر ہیں۔ اے وہب یہ وقت اطمینان سے باتیں کرنے کا نہیں خبردار بی بی کی باتوں میں نہ آنا ورنہ روز محشر خدا و رسولؐ سے تمہاری شکایت کروں گی۔ وہب یہ سُن کر گھبرا گئے اور فوراً اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے۔ اے مادر گرامی! آپ اطمینان رکھیں میں کسی طرح جاں نثاری میں کوتاہی نہ کروں گا اللہ اکبر مادر وہب کیسی کامل الایمان اور عاشق حسینؑ خاتون تھیں کہ بیٹے سے فرمانے لگیں۔ اے فرزند تیری ماں کو تو اسی وقت اطمینان ہوگا۔ جب تک راہِ خدا میں تجھے شہید دیکھ نہ لے گی۔

الغرض جناب وہب اپنی ماں سے رخصت ہوکر خدمتِ امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے اور اذن جہاد طلب کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ اے جوان کیوں کر تجھے اذن کارزار دوں' تیری ماں اور تیری بی بی کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچے گا۔ وہب نے عرض کی کہ یا ابن رسول اللہؐ میری والدہ نے مجھے تاکید کے ساتھ بھیجا ہے۔ ان کی دلی تمنّا ہے کہ مجھے راہِ خدا میں شہید دیکھیں۔ حضرتؑ یہ سُن کر کچھ دیر تک خاموش رہے مادرِ وہب درِ خیمہ سے دیکھ رہی تھیں باآواز بلند کہنے لگیں۔

اے میرے مظلوم آقا آپ اپنے اس غلام کو اذن جہاد کیوں نہیں عطا فرماتے۔ شاید آپ کو میرے ملال کا خیال ہو۔ آقا میری ساری بضاعت یہی ہے۔ میں خوشی سے اپنے اس اکلوتے فرزند کو آپ کے قدموں پر نثار ہونے کے لئے پیش کرتی ہوں۔ اگر عورتوں سے جہاد ساقط نہ ہوتا تو میں خود ان دشمنانِ دین سے لڑنے کے لئے نکلتی۔ اس زنِ مومنہ کی یہ تقریر سُن کر امام علیہ السلام چشم پُرآب ہوئے اور دُعائے خیر سے یاد فرما کر وہب کو میدان میں جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

جناب وہب شیر کی طرح میدان میں آئے اور رجز پڑھ کر اس قوم جفاکار پر حملہ کیا پہلے ہی حملہ میں چالیس ناریوں کو فی النار کیا۔ لیکن خود بھی زخموں سے چور چور ہوگئے۔ اس حالت میں جس طرح ہوسکا اپنی مادر گرامی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی اے مادر گرامی آپ میری اس خدمت سے خوش ہوئیں یا نہیں۔

اس زن مومنہ نے کہا اے وہب خدا تجھ کو اس عملِ خیر کی جزا دے۔ مگر میں تو اسی حالت

میں راضی ہوں گی جب راہِ خدا میں تجھ کو شہید دیکھوں گی۔
بیٹا! پھر میدان میں جاؤ اور راہِ خدا میں جہاد کرو۔ چنانچہ جناب وہب پھر میدان میں آئے اور اس قوم پر حملہ کیا اب کی بار انیس سوار اور بارہ پیادے قتل کئے۔ لیکن ایک شقی کی ضرب سے ان کا بایاں ہاتھ قلم ہوگیا۔
اسی اثناء میں جناب وہب نے دیکھا کہ ان کی زوجہ چوب خیمہ لے کر خیمہ سے باہر نکل آئی ہیں اور دشمنوں سے لڑنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ وہب نے گھوڑا بڑھا کر کہا۔ تم نے کیا غضب کیا خیمہ سے نکل آئیں فوراً واپس جاؤ کہ یہ امر میرے لئے باعثِ سبکی ہے۔ اس زنِ مومنہ نے کہا ہرگز واپس نہ ہوں گی تا این کہ میں بھی تمہارے ساتھ جامِ شہادت نوش نہ کروں۔
وہب یہ سُن کر بہت گھبرائے اور بآوازِ بلند کہا: "اے فرزندِ رسولؐ اپنی اس کنیز کو رد کیجئے"۔ امام علیہ السلام فوراً آگے بڑھے اور زوجۂ وہب کو سمجھا بجھا کر واپس لے آئے۔
اس کے بعد وہب نے پھر جنگ شروع کی۔ ان کی یہ دلیری دیکھ کر پسرِ سعد نے فوج کو حکم دیا کہ اس جوان کو چاروں طرف سے گھیر کر قتل کر ڈالو۔ چنانچہ کئی ہزار سوار ایک بار اس مومنِ دیندار پر ٹوٹ پڑے اور ہر طرف سے نیزہ و شمشیر کے وار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جناب وہب گھوڑے سے زمین پر تشریف لے آئے اور اسی وقت راہیِ جنت ہوئے۔ دشمنوں نے سر کاٹ کر لشکرِ امام کی طرف پھینک دیا۔ مادرِ وہب نے جب دیکھا کہ وہب کا سر پھینکا گیا ہے تو آگے بڑھیں اور سر کو اُٹھا کر سینے سے لگایا پیار کیا پھر دشمن کی طرف یہ کہہ کر پھینک دیا کہ جو شے راہِ خدا میں دی جاتی ہے اس کو واپس نہیں لیتے۔ اس کے بعد چوب خیمہ لے کر بڑھیں اور دو ظالموں کو مار کر واصلِ جہنم کیا۔ امام علیہ السلام ان کے پاس پہنچے اور فرمایا۔ اے مادرِ وہب خیمہ میں جاؤ اور جہاد عورتوں سے ساقط ہے۔ انشاء اللہ روزِ قیامت تم مع اپنے فرزند کے داخلِ جنت ہوگی۔ کتاب امالی میں ہے کہ جناب وہب کی شہادت کے بعد ان کی زوجہ لاش پر پہنچیں اور ان کے چہرے سے خاک و خون صاف کر کے کہنے لگیں۔ اے وہب شرطِ محبت یہ ہے کہ جنت میں میرے بغیر داخل نہ ہونا۔ اے وہب خدا تم کو جزائے خیر دے کہ تم نے نصرتِ فرزندِ رسولؐ میں اپنی جان قربان کی۔ ابھی وہ لاش پر بین کر رہی تھی کہ ایک شقی نے ایسا گرز مارا کہ اس مومنہ کا سر شق ہوگیا۔ یہ پہلی بی بی تھیں۔ جو لشکرِ امام علیہ السلام میں سے قتل کی گئیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۸/ ۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷ شعراء

بارہویں مجلس

تفسیر آیۂ مَن یَرتَدَّ مِنکُم عَن دِینِهٖ

حضرت علیؑ کے

فضائل اور شہادت حبیب ابنِ مظاہرؓ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (المائدہ: ۵/۵۴)

اے ایمان والو جو کوئی تم میں سے اپنے دین (ایمان) سے پھر جائے (ہمیں کوئی پرواہ نہیں عنقریب تمہاری جگہ) خدا کچھ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اُس سے محبت کرتے ہیں۔ مومنین سے ملتے ہیں تو بڑی انکساری سے کفار کے مقابل ہوتے ہیں تو بڑے کرارے نظر آتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال نہیں کرتے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

یہ آیت ایک گروہ کی مذمت میں ہے اور ایک گروہ کی منقبت میں کچھ لوگ ایسے تھے کہ حضرت رسولؐ خدا

دھمکانے کے لئے کہا کرتے تھے۔ اگر آپ فلاں کام ہمارے مشورے کے مطابق نہ کریں گے تو ہم اسلام کو ترک کرکے یہود و نصاریٰ سے جا ملیں گے یا مشرکین کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ خداوند عالم ایسے گروہ سے کہتا ہے اگر تم مرتد ہو جاؤ گے تو ہمیں اس کی کچھ پروا نہیں۔ کیونکہ تم کیا اور تمہارا ایمان کیا ہم تمہارے بجائے ایسے خالص الایمان لوگوں کو لے آئیں گے جو اللہ کو دوست رکھنے والے ہوں گے اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہوگا اور جو مومنوں سے جھک کر ملتے ہوں گے اور کافروں کے مقابل بڑی شان سے آتے ہوں گے وہ راہ خدا میں جہاد کرتے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا قطعاً خیال نہ کرتے ہوں گے۔

اللہ اکبر اس قوم کے علو مرتبت اور کمال انسانیت کا کیا ٹھکانا ہے کہ جس کا مدح و ثنا خلاق عالم اس شان سے کرے دنیا کے لوگوں کی تعریف اور ہے اور خالق کی تعریف اور ہے تعریف ہے اور پوری تعریف ایک مکمل قصیدہ ہے کہ لسان قدرت پر جاری ہوگیا ہے دنیا ایسی ہستیوں کے اعزاز و اکرام پر کیوں نہ مجبور ہو اور کیوں نہ ان کو اسلام کی مایہ ناز ہستیاں قرار دے۔ اسلامی سطح پر ان ممدوحین ایزدی کے ہم پہلو کون ہوسکتا ہے یقیناً اصحاب رسولؐ میں سب سے بالاتر مرتبہ اس قوم کا ہوگا۔

آئیے اب اس امر پر غور کریں کہ وہ کون لوگ ہیں جن میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ہم صرف ایک صفت کو بیان کرکے اس کا حقیقی مصداق بتانا چاہتے ہیں۔ اگر کل صفتوں کو بیان کریں گے تو طول ہوگا۔

پہلی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ اللہ کو دوست رکھنے والے ہیں۔ اور اللہ ان کو محبت خدا کا دعویٰ کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس دعوے میں تو سچے وہی لوگ سمجھے جائیں گے جن سے خدا بھی محبت کرتا ہو یعنی پلٹی ہوئی محبت ہو۔ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہوں اور اللہ ان کو ع

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

ہم کو ایسے ہی لوگوں کی تلاش ہے۔ پہلے خدا کے قول سے یہ دکھایا جاتا ہے کہ اللہ سے محبت کرنے والے کون ہیں۔ سورہ دہر میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا یعنی وہ لوگ (علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ) اللہ کی محبت میں مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل بیت علیہم السلام محبت خدا رکھنے والے تھے۔ اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے یا نہیں۔ محبت کی جانچ کا بہترین موقع جنگ ہے۔ ورنہ عیش کے وقت تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست در پریشان حالی و درماندگی

پس ہم ایک جنگ ہی کے موقع سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہیں جو خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتے ہیں۔ اور خدا و رسول ان کو یہ عقیدہ زبان رسالت نے جنگ خیبر میں حل کر دیا۔ جب انتیس روز تک خیبر کا قلعہ فتح نہ ہوا اور مسلمان یہودیوں سے لڑنے کی تاب نہ لاکر بھاگ بھاگ آئے۔ تو ایک روز حضرتؐ نے فرمایا:-

لاعطین الرایۃ غداً رجلاً کراراً غیر فرار یحب اللّٰہ ورسولہ ویحبہ اللّٰہ ورسولہ

(کل میں اپنا علم ایسے شخص (مرد) کو دوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا اور بھاگ کر آنے والا نہ ہوگا اور وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو دوست رکھنے والا ہوگا۔ اور اللہ اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔

جب حضرتؐ کی زبان سے یہ کلمات ادا ہوئے تو بزدل نامردوں کے دل میں بھی اس آرزو نے چٹکی لی کہ کل یہ علم ہم ہی کو مل جائے۔ کیونکہ اس کا ملنا اس کی سند ہوگا کہ وہ اللہ کا دوست ہوگا اور کرار غیر فرار ہے باوجودیکہ فوج اسلام کے بڑے بڑے بہادر اور نامور سپاہی پچھلے دنوں بار بار اپنی طاقت کو یہودی فوجوں کے مقابل آزما چکے تھے اور پے در پے فراری ہونے کے لئے لمبے لمبے سرٹیفکیٹ پا چکے تھے اور رسولؐ کو اپنے سے مایوس کر چکے تھے لیکن پھر بھی ان عالی حوصلہ غیرت مندوں کے دل سے یہ آرزو نہ گئی۔

الغرض صبح نمودار ہونے سے پہلے ہی کچھ لوگ بدن پر ہتھیار سجا کر شجاعانہ انداز سے خیمۂ رسالتؐ کے سامنے آکر اس اُمید میں ٹہلنے لگے کہ شاید ہمارا ڈیل ڈول درازیٔ قد اور سپاہیانہ شان نظر رسالتؐ میں کھپ جائے اور خیمہ سے برآمد ہوتے ہی سب سے پہلے یہ علم ہم ہی کو عطا کر دیں۔ حضرت رسولؐ خدا نے اپنے خیمہ مبارک میں سے ان لوگوں کی اس ادا کو دیکھا اور مسکرانے لگے۔

ان لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علیؑ کی آنکھیں چونکہ پُرآشوب ہیں اور وہ جنگ کرنے کے قابل نہیں لہذا ہم ہی ہیں تری محفل میں کوئی اور نہیں "، لیکن جس کی قسمت میں تمام ازل نے یہ فضیلت لکھی ہی نہ ہو، وہ کمزور اُمیدوں کے سہارے اس منصب جلیلہ پر کیوں کر فائز ہو سکتا ہے۔ غرض نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد جب لوگوں نے حضرتؐ پر تقاضا شروع کیا کہ حضور کسی کو علم عطا فرمایئے۔ تاکہ ہم فوج ظفر موج لے کر بڑھیں اور منکرو ناکام دشمن کا کام تمام کرکے لفتح و فیروزی واپس آئیں اور حضورؐ سے دادِ شجاعت لیں آج سے پہلے سرکار رسالتؐ نے مسلمان نمازیوں کی یہ جبینی اور کمر بندی اور بے پناہ جوش کسی اور دن نہ دیکھا تھا اور دنوں تو یہ عالم تھا کہ جس سردار کو بلا کر مقابلے کے لئے بھیجنا چاہتے تھے وہی پہلو بچانے لگتا آج باسی کڑی کو یہ اُبال آیا کہ پچھلے کارنامے سب نسیاً منسیاً ہو گئے تھے اس لئے کہ حدیث رسولؐ سُن لی تھی اور اس اُمید میں بھیرے نہ سمائے

تھے کہ اگر یہ فضیلت ہاتھ آگئی تو پشت ہا پشت کی فضیلت کے لئے کافی ہوگی۔ اور اس مخصوص مدح کو جھنڈوں پر گانے پھریں گے۔

جب زیادہ تقاضا ہوا تو آنحضرتؐ نے فرمایا این اخی علی بن ابی طالبؑ یعنی میرے بھائی علی بن ابی طالبؑ کہاں ہیں۔ لوگوں نے کہا وہ تو آشوبِ چشم میں مبتلا ہیں۔ ابھی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ حضرت علی علیہ السلام سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ حالت آپ کی یہ تھی کہ دونوں آنکھوں پر ورم تھا اور اندر سُرخی بہت زیادہ تھی حضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ تمہارا کیا حال ہے۔ عرض کی حضورؐ کی زیارت سے محروم ہوں۔ یہ سُن کر آپ نے لعاب دہن آپ کی دونوں آنکھوں پر مل کر فرمایا۔ افتح عَیْنَیْکَ یا بن ابی طالبؑ۔ یعنی اے علیؑ آنکھیں کھول دو۔ کھولیں تو نہ سُرخی تھی نہ ورم ساری تکلیفیں دور ہوگئیں اور ایسی دور ہوئیں کہ حضرت علیؑ فرماتے تھے اس کے بعد پھر کبھی میری آنکھیں دُکھی ہی نہیں۔

پس حضرتؐ نے اپنا علم نصرت شیم حضرت علیؑ کو دے کر فرمایا اے علی تم جاؤ اور دشمنوں سے لڑو۔ یہ سُن کر پہلے امیدوار کہنے لگے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہم سمجھتے تھے کہ علم عین سے ملے گا۔ یہاں بدقسمتی سے (الم الف) سے ملا۔

حضرت علیؑ علیہ السلام فوراً علم لے کر گھوڑے پر سوار ہوگئے اور میدانِ کارزار کا رُخ کیا۔ چند قدم چل کر ٹھہر گئے اور اسی طرح میدان کا رُخ کئے ہوئے پوچھا۔ یا رسولؐ اللہ کب تک لڑوں فرمایا حتیٰ لفتح اللّٰہ علیٰ یدیک۔ یہاں تک لڑو کہ اللہ تمہارے دونوں ہاتھوں پر فتح دے۔ آج یہ مدت العمر میں پہلا موقع تھا کہ حضرت علیؑ علیہ السلام حضرت رسولؐ خدا کی طرف پشت کر کے کلام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کرار غیر فرار کا لقب پا کر آپ نہیں چاہتے تھے کہ برائے نام بھی میدان کی طرف پشت کریں۔ الغرض حضرت میدان میں آئے اور شانِ حیدری دکھانے کے لئے ایک چٹان پر زورِ بازو سے علم کو گاڑ دیا۔ پتھر کی کیا طاقت تھی کہ شیرِ الٰہی کے علم کی نوک کو روک سکتا تھا موم بن کر اپنے سینے میں جگہ دے دی۔

شاید دشمنانِ اہلِ بیت علیہم السلام یہ سُن کر ناک بھوں چڑھائیں۔ لیکن ان کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پتھر رسالت اور امامت کے رتبہ شناس ہیں وہ بظاہر بےحس ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے خالق کے برگزیدہ بندوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم کا نشان اپنے سینے پر لے لیتے ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کے عصا کو پہچان کر اپنے اندر سے پانی کے چشمے نکال دیتے ہیں وہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دست مبارک کو پہچان کر کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ پس اگر علیؑ کے نیزے کو پہچان کر اپنے سینے میں جگہ دے دی تو کیا محل تعجب ہے۔

الغرض پتھر میں علم کو گاڑ کر آپ نے بطور رجز چند اشعار پڑھے جن کا پہلا شعر یہ ہے۔

اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَا
ضِرْغَامُ آجَامٍ وَلَیْثٌ قَسْوَرَہ

یعنی میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے میں بیشہ شجاعت کا شیر ہوں جس کو بہادری کا دعویٰ ہو میرے سامنے آئے۔

لکھا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کے اس شجاعانہ رجز سے میدانِ خیبر گونج اٹھا اور بڑے بڑے بہادر یہودیوں کے دل سینوں میں لرز گئے۔ یہودیوں کو اپنے دو نامور بہادروں مرحب اور حارث پر بڑا غرہ تھا اور ان ہی کی معرکہ آرائی سے گھبرا کر ہر روز مسلمانوں کے قدم اکھڑ جاتے تھے حضرت نے سب سے پہلے ان ہی دونوں کو اپنے مقابلے کے لئے بلایا اور بہت جلد دونوں کو تہہ تیغ کر کے خیبر کا وہ عظیم الشان معرکہ سر کیا جو انیس روز سے مسلمانوں کے ہوش گم کئے ہوئے تھا جب یہودی شکست کھا کر میدان سے بھاگے تو انہوں نے قلعہ میں جا کر پناہ لی اور دروازہ بند کر لیا۔

یہ ایک ایسا آہنی دروازہ تھا جس کے کواڑ اتنے وزنی تھے کہ چالیس آدمی مل کر کھولتے اور بند کرتے تھے اس کے بعد ایک چوڑا اور گہرا خندق تھا جس پر آمد و رفت کے لئے تختوں کا ایک پل بنا تھا۔ یہودیوں نے اندر داخل ہو کر وہ پل توڑ دیا۔ جب حضرت علی علیہ السلام گھوڑے پر سوار وہاں پہنچے تو دروازہ بند پایا آپ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور آپ نے اللہ اکبر کہہ کر دروازے پر ہاتھ مارا آپ کی انگلیاں لوہے میں در آئیں اور آپ نے اس زور سے جھٹکا دیا کہ وہ دروازہ اکھڑ کر سپر کی طرح آپ کے ہاتھ میں آ گیا۔

شانِ امامت سے بے خبر لوگ اس واقعہ کو بعید از عقل جان کر ناک بھوں چڑھایا کرتے ہیں لہذا ان کو سمجھانے کے لئے ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ معجزہ تو ہوتا ہی وہ ہے جو سمجھ میں نہ آئے۔ اگر معجزہ سمجھ میں آجایا کرتا تو ہر شخص ویسا ہی کر لیا کرتا اور پھر وہ معجزہ ہی نہ رہتا۔ معجزہ کا ظہور طاقت بشری سے نہیں ہوتا بلکہ الوہی طاقت سے ہوتا ہے۔

جناب داؤد کے لئے خدا نے لوہے کو اتنا نرم بنا دیا تھا کہ وہ آسانی سے زرہ کے حلقے بنا لیا کرتے تھے قرآن کہتا ہے وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ہم نے داؤد کے لئے لوہے کو نرم بنا دیا پس جس طرح وہاں ایسا ہوا تھا یہاں بھی ہوا جناب امیر علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔ مَا قَلَعْتُ بَابَ خَیْبَرَ بِقُوَّةٍ جِسْمَانِیَّہ بَلْ بِقُوَّةٍ رَبَّانِیَّہ۔ یعنی قلعہ خیبر کا دروازہ میں نے جسمانی قوت سے نہیں اکھاڑا بلکہ ربانی قوت سے اکھاڑا ہے۔

تعجب ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ حالانکہ رات دن کا مشاہدہ ہے کہ بجلی کا ایک پتلا سا

تار جس کے اندر برقی کرنٹ دوڑتا ہوا ہوتا ہے کیسے کیسے عجیب کرشمے دکھاتا ہے۔ بڑے بڑے وزنی انجن ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا ہے ریل اور ٹرام کار یں چلاتا ہے۔ یہ سب باریک تار ے ظاہر ہیں تنے نہیں بلکہ اس قوت برقی سے جو اس میں دوڑتی ہے پس علی علیہ السلام نے اگر خدائی طاقت کی بناء پر ایسا کر کے دکھایا تو کیا محل تعجب ہے۔

دروازے کے بعد جو خندق تھا اس کی وجہ سے لشکر اسلام کو قلعہ میں داخل کرنا ناممکن تھا آپ مع آہنی دروازے کے خندق میں کود گئے داہنے ہاتھ میں تلوار تھی اور بائیں ہاتھ میں فولادی در بصورت سپر پہلے آپ نے اس در کو خندق کے ایک کنارے سے ملایا اور مسلمان سپاہیوں سے فرمایا تم اس پر آجاؤ جب بہت سے آدمی اس پر کھڑے ہوگئے تو آپ نے اس در کو خندق کے دوسرے کنارے سے ملا کر ان لوگوں کو اتار دیا اور اس طرح کل فوج خندق کے پار کر دی۔ یہ بھی کوئی قابل انکار بات نہیں آصف برخیا وزیر حضرت سلیمان جن کو کتاب خدا کا تھوڑا سا علم تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پر بلقیس کو مع اس کے تخت کے اٹھا کر شہر سبا سے لائے تھے پس علی کے لئے جن کے سینے میں کتاب خدا کا پورا پورا علم تھا اور من عندہ علم الکتاب کے مصداق تھے کون سی بڑی بات تھی۔ اس پار کرنے میں مسلمانوں کو بتانا تھا کہ ایک دن یونہی پل صراط سے پار اتار دیں گے۔

مومنین دیکھا آپ نے رسول کا یہ حکم کہ برابر لڑے جانا جب تک اللہ تمہارے دونوں ہاتھوں پر فتح نہ دے۔ علی علیہ السلام نے کس طرح پورا کیا۔ ایک ہاتھ میں تلوار تھی اس سے دشمن کو قتل کر کے فتح حاصل کی اور دوسرے ہاتھ سے خیبر کا در اکھاڑا۔

بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ تمام اصحاب میں صرف ایک ذات علیؑ کی ایسی تھی۔ جو سچا مصداق اس آیت کا بن سکے کہ اللہ ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جن کو وہ دوست رکھتا ہوگا۔ اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے اس کے پہلے فرد علیؑ ابن ابی طالبؑ ہیں۔ حضرت رسول خدا نے روز خیبر یہی الفاظ اعادہ فرمائے اور علیؑ کو علم دے کر تمام مسلمانوں پر وہ واضح کر دیا کہ صحیح معنی میں رسولؐ کو دوست رکھنے والا اور خدا و رسولؐ کا سچا محبوب بھی ایک شخص ہے۔

اب ذرا محبت الہی کی انتہائی منزل بھی دیکھ لیجئے۔ ایک بار کسی نے حضرت رسولؐ خدا کو بھنا ہوا طائر بطور تحفہ پیش کیا۔ انس بن مالک خادم رسولؐ ناقل ہیں کہ جب حضرت دوپہر کے وقت اس طائر کو کھانے کے لئے بیٹھے تو آپ نے فرمایا۔ اللھم ائتنی باحب خلقک الیک ۔ اے میرے پروردگار اپنے سب سے زیادہ محبوب بندہ کو میرے پاس بھیج تاکہ میرے ساتھ یہ طائر کھائے۔ یہ حدیث

نہایت معتبر اور موثق طریقے سے وارد ہوئی ہے۔ جناب سرکار حجتہ الاسلام علامہ سید حامد حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ نے عبقات الانوار کی ایک پوری جلد اسی حدیث طیر کے متعلق لکھی ہے اور اس میں بکثرت راویان اہل سنت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ یہ حدیث خصائص نسائی میں امام نسائی نے درج کی ہے۔

انس کہتے ہیں جب میں نے حضرتؐ سے یہ کلمات سُنے تو فوراً بھاگا ہوا دروازہ پر گیا کہ اگر اس وقت میرا کوئی دوست ادھر سے گزر رہا ہو تو اس کو بُلا کر خانہ رسالتؐ میں داخل کردوں تاکہ خدا کا سب سے زیادہ محبوب بندہ وہی قرار پائے۔ میں نے سوراخ در سے جھانکا لیکن اتفاق سے کوئی صاحب گزر رہے ہی نہیں میں واپس ہونے والا ہی تھا کہ کسی نے دق الباب کیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کون صاحب ہیں؟ آواز آئی میں ہوں علیؑ بن ابی طالبؑ۔ اے انس دروازہ کھول دو کہ حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ سن کر میں حیرت میں آگیا کہ میرا مقصد کچھ اور تھا اس لیے مجھے اس وقت علیؑ کا آنا ناگوار ہوا۔ میں نے کہا یا علیؑ یہ وقت حضورؐ کے آرام کا ہے۔ یہ کہہ کر میں اندر گیا تو آنحضرتؐ نے اپنی زبان مبارک سے پھر وہی کلمات ارشاد فرمائے میں پھر بھاگا ہوا دروازہ پر پہنچا لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نظر نہ پڑا۔ حضرت علیؑ نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے پھر ٹال دیا۔ جب اندر آیا تو پھر حضرتؐ کو یہی کہتے سُنا میں پھر دوڑا ہوا دروازہ پر پہنچا۔ اس مرتبہ بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ علی علیہ السلام نے پھر دق الباب کیا۔ میں نے کہا اے علیؑ! میں بار بار کہے جاتا ہوں آپ کو شاید میرے کہنے کا یقین نہیں آتا کہ بار بار تشریف لا رہے ہو۔ یہ سُن کر آپ کو غصہ آیا اور فرمایا اے انس کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اندر کا حال مجھ سے پوشیدہ ہے۔ انس دروازہ کھول دو۔ حضرتؐ بار بار مجھے یاد فرما رہے ہیں۔ انس کہتے ہیں کہ میں نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا اور حضرت علی علیہ السلام اندر داخل ہوئے ان کو دیکھتے ہی آپؐ کا چہرہ بشاش ہوگیا اور فرمایا اے علیؑ میں بار بار تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ تم کہاں تھے کہ اتنی دیر میں پہنچے۔ آپؑ نے فرمایا یا رسول اللہ میں تو ہر بار حاضر ہوا لیکن انس نے روک دیا۔ یہ سُن کر آپؐ انس پر ناراض ہوئے۔ اس کے بعد آپؐ نے علیؑ کے ساتھ وہ طائر تناول فرمایا۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب حضرت علی علیہ السلام تھے۔

خدا کی محبت کا تعلق صحیح معنی میں ان لوگوں سے ہوتا ہے جو رسولؐ کا سچا اتباع کرنے والے ہیں

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٣١ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٢

(آل عمران ۳۱،۳۲/۳)

اے رسولؐ لوگوں سے کہدو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے (اے رسول) کہہ دو کہ تم اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو پس اگر تم نے روگردانی کی تو اللہ انکار کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

رسولؐ کے اتباع کا پورا پورا حال میدانِ جنگ میں کھلتا تھا۔ پس جو لوگ میدانِ جنگ میں رسولؐ کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوں جو رسالتِ رسولؐ میں شک کرتے ہوں وہ ہرگز ہرگز تابعین رسولؐ نہیں اور جب تابعین میں سے نہیں تو خدا کے محبوب بندے بھی نہیں۔ پورا پورا اتباع کرنے والے خدا و رسولؐ کا حضرت علی علیہ السلام تھے کہ سفر میں حضر میں صلح میں جنگ میں۔ صحت میں مرض میں ہر حالت میں کبھی ایک آن کے لئے بھی حضرت علیؑ نے آنحضرتؐ کے خلاف نہ ایک قدم اٹھا اور نہ ایک کلمہ زبان سے کہا۔

حضرات خدا کی محبت کوئی معمولی چیز نہیں۔ یہ بڑے بڑے اولیاء و اصفیا کے لئے مقام غبطہ رہی ہے ہر شخص اس محبت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ معمولی محبتیں جب زور پکڑ جاتی ہیں تو انسان اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اور سوائے اپنے محبوب کی تصویر کے ہر طرف سے اس کا خیال ہٹ جاتا ہے پھر خدائی محبت کے زور کا تو ٹھکانا ہی کیا ہے۔

علامہ دمیری نے کتاب حیوٰۃ الحیوان میں لکھا ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰؑ کا گزر پہاڑ کی طرف ہوا دیکھا کہ ایک عابد تنہا ایک عبادت خانہ میں بیٹھا ہوا عبادت کر رہا ہے۔ کثرت ریاضت سے کمر خمیدہ ہو گئی ہے اور بدن سوکھ گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا تو یہاں کب سے ہے اس نے کہا ستر برس گزر چکے۔ صرف ایک حاجت درگاہِ خدا میں رکھتا ہوں مگر اب تک پوری نہ ہوئی۔ کیا میں یہ امید کروں کہ آپ درگاہ الٰہی میں میری سفارش کر دیں گے۔

آپ نے پوچھا تیری حاجت کیا ہے اس نے کہا میں چاہتا ہوں کہ خدا اپنی خالص محبت کا ایک ذرہ مجھے عطا فرما دے۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہ سن کر اس کے لئے دعا کی۔ آپ کی دعا قبول ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ وہاں سے چلے گئے۔ کئی روز کے بعد واپسی میں پھر اس صومعہ کی طرف سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ عبادت خانہ گرا پڑا ہے اور اس کے نیچے کی زمین شق ہو گئی ہے۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس شگافہ زمین کے اندر تشریف لے گئے دیکھا کہ وہ عابد اس گڑھے میں کھڑا ہوا ہے اور منہ کھولے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے سلام کیا۔ مگر اس نے جواب نہ دیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کی حالت پر سخت تعجب کیا اور عرض کی اے پروردگارِ عالم! اس تیرے بندے کا کیا حال ہے؟ ہاتف نے ندا دی۔ اے عیسیٰؑ اس نے ایک ذرہ ہماری محبت

کا مانگا تھا۔ مگر ہم نے یہ سمجھ کر کہ یہ ہماری محبت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنی محبت کے ستر ہزار حصوں میں سے ایک حصہ اس کو دے دیا ہے۔ دیکھتے ہو کیسا حیران بن گیا ہے اگر ہم اپنی محبت زیادہ دے دیتے تو اس کا کیا حال ہوتا۔

محبت کی علامتیں چار ہیں۔ اوّل بدن کی لاغری۔ رنگ کی زردی اور مزاج میں تغیر اس خوف میں کہ محبوب ہم سے ناراض تو نہیں۔ لیکن یہ بات ان ہی کے لئے ہے جن کو یہ معلوم نہ ہو کہ ان کا مرتبہ پیش محبوب کیا ہے۔ نہ ان لوگوں کے لئے جو اپنی حالت کا پوری پوری طرح اندازہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جناب امیر علیہ السلام سے کسی نے پوچھا یہ کیا تمام عابدوں اور خدا کے محبوں کے چہرے زرد ہو جاتے ہیں اور جسم سوکھ جاتے ہیں۔ آپ کا چہرہ ہشاش بشاش ہے اور آپ کا بدن سب سے زیادہ قوی۔ حالانکہ آپ کا مرتبہ وہ ہے کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ فرمایا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی منزلت پیشِ محبوب کیا ہے اور میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ پس میں نے اپنے دل کی آنکھ سے اسے دیکھ لیا۔ چونکہ اسے اپنے سے راضی پایا اس لئے خوف دور ہو گیا۔ جب اس نے خود فرما دیا۔ یحبھم ویحبونہ تو اب ہراس کیسا؟۔

مقام تقرب میں تو حضرت ہشاش بشاش رہتے تھے۔ لیکن مقام عبدیت میں یہ عالم تھا کہ وقت عبادت رنگ چہرہ مبارک کا اڑ جاتا تھا اور خوفِ الٰہی سے بدن تھر تھر کانپتا تھا۔ ایک بار آپ حج کو تشریف لے گئے اور ارادہ کیا کہ تلبیہ کہیں پس آپ تھر تھر کانپنے لگے۔ چہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور غش کھا کر گر پڑے جب افاقہ ہوا تو لوگوں نے اس کا سبب پوچھا فرمایا مجھے خوف ہوا کہ میں لبیک کہوں اور خدا کہے۔ لالبیک ولاسعدیک اور جب وضو کرتے تھے تو چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ اور جب نماز پڑھتے تھے تو بدن کا جوڑ جوڑ کانپنے لگتا تھا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ میں اضداد صفات جمع تھیں۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

جُمِعَتْ فِی صِفَاتِكَ الْاَضْدَادُ فَلِهٰذَا عَزَّتْ لَكَ الْاَنْدَادُ
زَاهِدٌ حَاكِمٌ حَلِيْمٌ شُجَاعٌ
نَاسِكٌ فَاتِكٌ فَقِيْرٌ جَوَادٌ

دوسری علامت محبت کی رات کو جاگنا اور آتشِ محبت سے جلنا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جناب موسیٰؑ سے فرمایا جھوٹا ہے وہ شخص جو میری محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور تمام رات چین سے بھی سوتا ہے کیا ہر دوست اپنے دوست کے ساتھ خلوت کرنا پسند نہیں کرتا۔ اے موسیٰؑ کاش تم ان کو دیکھتے جو اندھیری راتوں میں

نماز پڑھتے ہیں اور میں ان کی آنکھوں میں سمایا رہتا ہوں ۔ اسے موسیٰ ھب لی من قلبك الخضوع ومن عینیك الدموع تجدنی قریباً مجیباً ۔ تم اپنی آنکھوں کے آنسو اور دل کی رجوع مجھے دے دو ۔ پھر مجھے پکارو گے تو ہر دعا قبول کر لوں گا ۔ اب اس علامت کو جناب امیر علیہ السلام میں دیکھئے کہ راتوں محراب عبادت میں کھڑے رہتے تھے اور بے قرار ہو کر روتے اور آہیں بھرتے اور فرمایا کرتے تھے

یَا دُنیا یَا دُنیَا اِلَیكِ عَنِّی اَبِی تَعَرَّضتِ اَم اِلَیَّ تَشَوَّقتِ هَیهَاتَ هَیهَاتَ حِینُكِ غُرِّی غَیرِی لَاحَاجَةَ لِی فِیكِ ۔

اے دنیا مجھ سے دور ہو کیا تو اپنے کو میرے سامنے پیش کرتی ہے یا تو میری شائق بنی ہے ۔ دور ہو دور ہو جا میرے غیر کو دھوکہ دے مجھے تیری ضرورت نہیں ۔

تیسری علامت محبت کی یہ ہے ۔ اور شوق کی آگ بھڑکنا ہے ۔ اسی وجہ سے دوستان خدا موت سے زیادہ مانوس ہوتے ہیں کیونکہ زندگی مانع وصل ہوتی ہے ۔ امیر المومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے واللّٰہ لابن ابی طالب اٰنس بالموت من الطفل بثدی امہ ۔

واللہ ابو طالب کا بیٹا موت سے اتنا ہی مانوس ہے جتنا ایک بچہ اپنی ماں کے پستان کا ہوتا ہے اور اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کرتے تھے یا بنی لا یبالی ابوك علی الموت ام وقع الموت علیہ او دفع علی الموت ۔

بیٹا ! تمہارے باپ کو اس کی پروا نہیں کہ وہ موت پر جا پڑے یا موت اس پر آ پڑے ۔ یہی تمنائے موت دوستان خدا کی پہچان ہے جیساکہ سورہ جمعہ میں ہے ۔

قُل یٰاَیُّهَا الَّذِینَ هَادُوٓا اِن زَعَمتُم اَنَّكُم اَولِیَآءُ لِلّٰهِ مِن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا المَوتَ اِن كُنتُم صٰدِقِینَ ﴿۶﴾

(الجمعہ : ۶۲)

اے رسول کہہ دو اے یہودیو، اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں تو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا تو کرو ۔

چوتھی علامت یہ ہے کہ اگر اس کا اثر اعضاء و جوارح سے ہونے لگے ۔ کیونکہ محبت ایک چھپی ہوئی آگ ہے ۔

جو خود بخود جسم کو جلاتی ہے۔ جب اہل جسموں میں یہ آگ لگتی ہے تو خوشبو دیتی ہے اور جب نا اہل جسموں میں لگتی ہے تو بدبو دیتی ہے۔ جو شخص زبان سے مدعی محبت ہو اور اس کے دل سے جلنے کی خوشبو نکلتی ہو۔ یعنی ظاہر میں کوئی اثر اعضاء پر محسوس نہ ہو تو وہ کاذب ہے کمال محبت یہ ہے کہ بے قصد ایسے افعال اعضا سے سرزد ہونے لگیں جو مرضئ محبوب کے مطابق ہوں یہ کیفیت پوری طرح جناب امیر علیہ السلام کے افعال سے ظاہر ہوتی تھی خیال کرو اس شخص کے اعمال کس حد تک مقبول ہوں گے جس کی نسبت رسول اللہ یہ فرماتے ہوں۔

ضَرْبَةُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَیْنِ

حقیقت یہ ہے کہ محبت کی تمام علامتوں میں بکا کا مرتبہ سب سے زیادہ ہے کیونکہ فراق کلیجے کے ٹکڑے کر دیتا ہے اور دل کو جلا دیتا ہے اور بکا سے زخمی دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اور آنسوؤں سے پوشیدہ آگ کے شعلے بجھ جاتے ہیں۔

انس سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا کہ حضرت شعیب اس قدر محبت خدا میں روئے کہ اندھے ہوگئے۔ خدا نے پھر ان کی آنکھیں روشن کر دیں۔ پھر اتنا روئے کہ اندھے ہوگئے خدا نے پھر بینا کر دیا تیسری بار اتنا روئے کہ بصارت زائل ہوگئی۔ خدا نے پھر بینائی عطا کی اور فرمایا اے شعیب ایسا کب تک کئے جاؤ گے۔ اگر خوف نار سے ایسا کرتے ہو تو میں نے اس سے پناہ دی اور اگر شوق جنت میں روتے ہو تو میں نے عطا کی۔ عرض کی خدایا نہ میں عذاب نار کے خوف سے روتا ہوں اور نہ شوق جنت میں بلکہ تیری محبت میرے دل پر اثر کر گئی ہے۔ میں جب تک تیری قربت حاصل نہ کر لوں چین نہیں پا سکتا۔ وحی ہوئی اے شعیب یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تم موت قبول کر لو۔ اے شعیب! اگر تمہاری کچھ حاجت ہو تو بیان کرو، عرض کی بس یہی ایک میری حاجت ہے کہ ایک بار مجھے اپنا حبیب کہہ کر پکار دے۔ آواز آئی یا شعیب انت حبیبی! اس آواز کے سنتے ہی فرطِ شادی سے جناب شعیب کی روح پرواز کر گئی۔

مقام غور ہے کہ ہمارے آقا مولا امیر المومنین علیہ السلام کا پیش خدا کتنا بڑا مرتبہ ہے کہ بغیر ان کی درخواست کے فرماتا ہے یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّونَهُ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ محبت کا اثر ہر بات سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور حضرت محمد مصطفٰے کو حبیب اور ایسا حبیب کہ جو محمدؐ کا حبیب ہے وہ حبیب اللہ ہے ایسے ہی موقعہ پر کہا گیا ہے ؎

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں

یہ ظاہر ہے کہ نبی اس سے محبت کر سکتا ہے۔ جس سے خدا محبت کرتا ہو اور وہ خدا سے محبت

کرتا ہو۔ صواعق محرقہ میں ابوالخیر حاکمی سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت علی علیہ السلام جناب رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کے چچا عباسؑ بھی حاضر خدمت تھے۔ جناب امیر علیہ السلام نے سلام کیا۔ حضرت نے جواب سلام دیا اور کھڑے ہو کر پہلے معانقہ کیا۔ پھر دونوں ابرو کے درمیان بوسہ دیا اور اپنی داہنی طرف بٹھالیا۔ عباسؑ نے عرض کی آپ کو علی سے بڑی محبّت معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا خدا کو اس کی محبّت مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور مواہب لدنیہ میں جناب عائشہ سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا کے نزدیک تمام عورتوں میں فاطمہ اور مردوں میں علیؑ زیادہ محبوب تھے۔

ترمذی اور حاکم نے بریدہ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا خدا نے مجھے چار شخصوں کی محبّت کا حکم دیا ہے اور یہ خبر دی ہے کہ وہ بھی ان سے محبّت رکھتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا وہ چار کون ہیں؟ فرمایا علیؑ و ابوذرؓ و سلمانؓ اور مقدادؓ۔

اسامہؓ بن زید سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے اپنے اہل میں سب سے زیادہ محبوب فاطمہ ہے اور طبرانی نے ترمذی سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔

هٰذَانِ ابْنَایَ وَ ابْنَا ابْنَتِی اَللّٰهُمَّ اِنِّی اُحِبُّهُمَا وَ اُحِبُّ مَنْ یُحِبُّهُمَا۔

یہ میرے بیٹے ہیں اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ اے خدا میں ان کو دوست رکھتا ہوں اور جو ان کو دوست رکھے اس کو بھی دوست رکھتا ہوں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ کو اپنے نواسوں سے کس درجہ محبّت تھی۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو حسین علیہ السلام کو دوست رکھتے ہیں کیونکہ موافق حدیث رسولؐ ان کا شمار محبانِ رسولِ خدا میں ہے اس وقت مجھے حسین علیہ السلام کے دوست یاد آگئے۔ وہ کون؟ حبیب ابن مظاہر۔

منقول ہے کہ ایک بار جناب حبیب کے والد علیؑ ابن مظاہر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے حبیب بھی ساتھ تھے اس وقت ان کا سن چھ سال کا تھا۔ علیؑ ابن مظاہر حضورؐ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ناگاہ حضورؐ کی نگاہ راستہ پر جا پڑی دیکھا کہ حسین جس طرف جاتے ہیں ایک لڑکا ان کے پیچھے پیچھے جاتا ہے اور ان کے پیروں تلے کی خاک اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرتؐ کو تعجب ہوا اور علیؑ ابن مظاہر سے پوچھا یہ لڑکا کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرا لڑکا ہے۔ پوچھا اس کا نام کیا ہے کہا حبیب یہ سن کر حضرتؐ بہت خوش ہوئے۔ اپنے مقام سے اٹھے اور حبیب کو اپنے پاس بٹھا کر دیر تک پیار کرتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حبیب نے کربلا میں حقِ دوستی ادا کر دیا۔ چنانچہ منقول ہے کہ روز حبیب ابنِ مظاہر

کوفہ میں ایک عطار کی دکان سے خضاب خرید رہے تھے کہ جناب مسلم بن عوسجہ کا اس طرف سے گزر ہوا۔ حبیب نے کہا بھائی مسلم میں دیکھتا ہوں کہ کوفہ میں فوجیں جمع ہو رہی ہیں۔ ہتھیار نکل ہو رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟

مسلم یہ سُن کر رونے لگے اور کہنے لگے۔ اے حبیب کیا بیان کروں۔ اہلِ کوفہ نے فرزند الثقلین حضرت امام حسینؑ کے قتل کا مکمل و مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ یہ سب اسی کی تیاریاں ہیں۔ یہ سننا تھا کہ حبیب نے خضاب ہاتھ سے پھینک دیا اور کہا خدا کی قسم! اب یہ میری ڈاڑھی نصرتِ حسینؑ میں سر کے خون سے خضاب ہوگی۔

اب تھوڑا سا حال جناب امام حسین علیہ السلام کا بھی سنئے۔ جب حضرتؑ کوفہ کی طرف تشریف لا رہے تھے تو ایک منزل پر پہنچ کر آپ کو حضرت مسلم کی شہادت اور اہلِ کوفہ کی غداری کا حال معلوم ہوا۔ آپ سمجھ گئے کہ اب دشمن مجھ تک بھی پہنچیں گے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو حکم بھی دیا کہ بارہ عَلم بناؤ اور چند لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک، ایک عَلم اٹھالے۔ جب گیارہ عَلم گیارہ لوگوں نے اُٹھا لئے اور ایک باقی رہ گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کس کو دیا جائے تو فرمایا اس کا اٹھانے والا عنقریب آنے والا ہے۔

منقول ہے کہ چند روز قبل امام حسین علیہ السلام ایک خط حبیب ابن مظاہر کے نام روانہ کر چکے تھے جس کا مضمون یہ تھا۔ یہ خط حسین بن علی علیہ السلام کی طرف سے مرد فقیہ حبیب ابن مظاہر کے نام ہے اے حبیب مجھ کو جو قرابت حضرت رسولِ خداؐ سے ہے۔ اس کو تم خوب جانتے ہو۔ اے حبیب بنی اُمیہ ہمارے ہمارے دَرپے آزار ہیں۔ مجھ سے بیعت یزید طلب کی جا رہی ہے۔ چونکہ تم صاحب غیرت و حمیّت ہو اس لئے لکھتا ہوں کہ اس موقعہ پر ہماری نصرت سے جان چُرانا زیبا نہیں روزِ قیامت خدا تم کو اس کی جزا دے گا۔

راوی کہتا ہے کہ حبیب ایک روز اپنی زوجہ کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ان کی زوجہ کے حلق میں یکایک لقمہ گلوگیر ہو کہنے لگیں اے حبیب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قاصد آنے والا ہے۔ ابھی یہی ذکر ہو رہا تھا کہ کسی نے دق الباب کیا۔ حبیب دروازے کے قریب آئے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں حسینؑ بن علیؑ کا قاصد ہوں۔ تمہارے نام ان کا خط لایا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے خط حبیب ابن مظاہر کے حوالے کیا۔ جناب حبیب ابن مظاہر نے تعظیماً آنکھوں سے لگایا۔ بوسہ دیا۔ جب مضمونِ خط سے آگاہی ہوئی تو آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ ان کی زوجہ نے پوچھا کس کا خط ہے جس کو پڑھ کر تم ایسے بے چین ہو گئے ہو۔ جناب حبیب نے کہا میرے آقا امام حسین علیہ السلام کا خط ہے اور مجھ سے طالبِ نصرت ہیں۔ بی بی نے پوچھا

اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ حبیب نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے۔ بہ مصلحت وقت کہہ دیا۔ کہ میں ان معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتا۔ یہ سننا تھا کہ وہ زن مومنہ بگڑ گئیں اور کہنے لگیں اے حبیب تمہاری جرأت و ہمت پر ولئے ہو۔ کیا غضب آگیا کہ نبیؐ کا نواسہ تم کو نصرت کے لئے بلاتا ہے اور تم ان کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اے حبیب اگر تمہیں جانے میں تامل ہے۔ تو یہ میری چادر تم لو اور اپنی تلوار مجھ کو دو میں خود اپنے آقا کی نصرت کے لئے جاتی ہوں۔

حبیب نے کہا کہ میں ضرور نصرت امام حسینؑ کے لئے جاؤں گا لیکن ابھی اس کا اظہار مناسب نہیں مبادا یہ خبر کوئی مخبر ابن زیاد تک پہنچا دے اور وہ مجھے قید کر دے اور میں اپنے ارادے سے باز رہوں اور دوسرے مجھے تمہارا خیال ہے کہ میرے بعد تمہارا کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔

اس زنِ مومنہ نے کہا:۔

"اے حبیب تم میرا خیال نہ کرو میں خاک چھانک کر اور فاقے کر کے زندگی بسر کر لوں گی خدا کے لئے تم میری وجہ سے نصرت حسینؑ مظلوم ترک نہ کرو۔ اے حبیب جب خدمت فرزندِ رسولؐ میں پہنچنا تو میری طرف سے تسلیم عرض کرنا اور حضرت کے دست و پائے مبارک کو بوسہ دے کر کہنا! مولا اگر عورت سے جہاد ساقط ہوتا تو میں خود آپ کی نصرت کے لئے حاضر ہوتی۔ اے حبیب! اب سفر کے لئے جلد تیار ہو جاؤ۔ اگر خدانخواستہ میرے مولا! کسی بلا میں گرفتار ہوگئے تو حشر میں حضرت رسول خدا کو کیا منہ دکھانے کی جگہ رہے گی۔"

الغرض حبیب نے اسی وقت سے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ گھوڑے پر زین کسی اور غلام سے فرمایا اسے لے جاؤ اور فلاں مقام پر میرا انتظار کرو میں بھی پیچھے پیچھے آتا ہوں۔ خبردار میرا ارادہ کسی پر ظاہر نہ کرنا غلام گھوڑا لے کر چلا گیا۔ جب حبیب کے پہنچنے میں دیر ہوئی تو غلام گھبرایا اور گھوڑے کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ اگر تیرا مالک نہ آیا تو میں تجھ پر سوار ہو کر نصرت حسینؑ کے لئے جاؤں گا۔" غلام گھوڑے سے کہہ ہی رہا تھا کہ حبیب بھی وہاں پہنچ گئے۔ غلام کا یہ کلام سن کر آب دیدہ ہوئے اور اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگے۔ اے فرزندِ رسولؐ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیسا وقت آپڑا ہے آپ پر کہ غلام تک آپ کی نصرت کی تمنا کر رہے ہیں۔ پھر حبیب نے غلام سے کہا۔ جا میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کیا۔ اس نے کہا اے حبیب خدا کی قسم میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ میں نصرتِ فرزندِ رسولؐ کے لئے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ حبیب نے اس کے لئے دعائے خیر کی اور وہاں سے روانہ ہوئے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ایک منزل پر پہنچ کر اپنی فوج کے بارہ علم تیار

کرلئے تھے گیارہ تو تقسیم کردیئے ہیں اور ایک باقی رہ گیا تھا۔ یکایک گرد سامنے سے نمودار ہوئی۔ حضرتؑ نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہوکر فرمایا' دیکھو اس نشان کا اٹھانے والا آ پہنچا۔ جب حبیب امام علیہ السلام کے قریب آئے تو گھوڑے سے اترے اور موافق رسم قدیم حضرتؑ کے پائے مبارک کو بوسہ دیا۔

منقول ہے کہ جناب زینب نے یہ سنا کہ حبیب ابن مظاہر بھائی کی نصرت کو آئے ہیں تو ایک کنیز سے فرمایا۔ حبیب سے جاکر میرا سلام کہو۔

حضرات! جب حبیب نے یہ سنا تو اپنے منہ پر طمانچے مارے اور رو رو کر کہنے لگے۔ اللہ اکبر! میرا یہ مرتبہ ہوگیا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کی بیٹی مجھے سلام کہلا بھیجتی ہے۔ الغرض اس وقت سے حبیب برابر امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہے اور باوجودیکہ بوڑھے تھے مگر جوانوں کا سا حوصلہ رکھتے تھے ان کو نصرت حسین علیہ السلام کا اتنا جوش تھا کہ شب عاشور تمام رات شہادت کے شوق میں ہتھیار باندھے بیٹھے رہے۔

لکھا ہے روزِ عاشور میدانِ جنگ میں کوئی ناصر حسینؑ مظلوم گھوڑے سے گرتا تھا۔ اور امام حسین علیہ السلام گھبرائے ہوئے اس کے پاس پہنچتے تھے تو حبیب ابن مظاہر ضرور آپ کے ساتھ جاتے تھے کیونکہ ایک دم کے لئے حضرتؑ سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب مسلم بن عوسجہ جنگ کرنے کے بعد گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی یا بن رسول اللہؐ ادرکنی۔ یہ سن کر حضرت میدانِ قتال کی طرف روانہ ہوئے۔ حبیب بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلے جب وہاں پہنچے تو مسلم کو جاں بلب پایا۔ حضرتؑ نے ان کا سر زانو پر رکھ کر فرمایا۔ اے مسلم خدا تم کو جزائے خیر دے کہ تم نے ہماری نصرت بڑے خلوص سے کی اے مسلم تمہارے خاک پر گرنے سے حسینؑ کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ جو مصیبت تم پر گزرنی تھی گزر گئی اب ہم باقی رہ گئے۔

اس کے بعد حبیب نے مسلم سے فرمایا اے مسلم اگر میں جانتا کہ میں تمہارے بعد زندہ رہنے والا ہوں تو باصرار تم سے کہتا کہ وصیت کرو لیکن میں تو تمہارے پیچھے آرہا ہوں کہ کوئی آرزو دل میں ہو تو بیان کرو۔ یہ سن کر مسلم نے آنکھ کھولی۔ اور اپنی انگلی سے امام علیہ السلام کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اوصیک بھذا۔ اے حبیب! میری وصیت بس یہی ہے کہ ان سے بے خبر نہ رہنا۔ اللہ اکبر! کیا وفادار تھے انصار امام مظلومؑ کہ ہونٹوں پر جان تھی مگر آپ کی نصرت کا خیال اس وقت بھی ان کے دلوں میں تھا۔ ایک دوسرے کو وصیت کرتا تھا کہ نصرتِ حق سے جان نہ چرانا۔ یہی لوگ مصداق ہیں اس آیت کے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ العصر ۱۰۳/۳

حضرات! اب سنیئے حبیب ابن مظاہر نے کس حوصلے کے ساتھ روزِ عاشورہ اپنی جان فرزندِ رسولؐ پر قربان کی۔ لکھا ہے کہ جب حبیب اجازتِ کارزار حاصل کر کے میدانِ جنگ میں تشریف لائے تو پہلے رجز پڑھا۔ پھر اس قوم بدشعار کو سخت ملامت کی اس کے بعد شمشیرِ آبدار نیام سے نکال کر وہ دلیرانہ جنگ کی کہ دشمن کے ہوش گم ہو گئے۔ آپ نے پے درپے حملوں میں باسٹھ نامرادوں کو داصلِ جہنم کیا۔

بروایت مناقب حبیب جوشِ شجاعت میں ایک بار اس طرح ان جفاکاروں پر جا پڑے جیسے شیر ہرنوں کے غول پر جا پڑتا ہے۔ حصین بن نمیر ملعون نے جو ان کی گھات میں تھا۔ موقع پاتے ہی ایک نیزہ الیاس ان کے سینے پر مارا کہ پھر گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ بدیل بن صریح ملعون نے فوراً سر تن سے جدا کیا۔

مقتل ابو مخنف میں ہے۔

حبیب کے قتل ہونے سے امام علیہ السلام کا دل ٹوٹ گیا اور بہت زیادہ مایوسی چھا گئی انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر فرمایا خدا حبیب پر رحم کرے کہ وہ ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔

لکھا ہے کہ

حبیب کے مرنے کی خبر جب خیمہ میں پہنچی تو مخدراتِ عصمت و طہارت نے حبیب کا ماتم کیا۔ اسی طرح جیسے اپنے عزیز خاص کا کرتے ہیں۔ بار بار جناب زینب فرماتی تھیں اے حبیب! خدا تمہیں جنت میں اعلےٰ درجہ کرامت فرمائے۔ تم نے میرے مظلوم بھائی کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اے حبیب! تمہارے دم سے ہم اہل بیت کو بڑی ڈھارس تھی!

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اہلِ حرم انصار کے لاشوں پر تو نوحہ و بکا کر سکے مگر جب ہمارے مولا و آقا امام مظلومؑ شہید ہوئے تو ان شکستہ دل اور ستم رسیدہ بی بیوں کو ان کی لاش پر رونا نصیب نہ ہوا۔ آہ کیونکر روئیں۔ وہ دکھیا بی بیاں جن پر بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دشمنوں نے فوراً خیموں میں آگ لگا دی اور اس طرح اہلِ حرم کو لوٹنا شروع کیا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ میت کے وارثوں اور پسماندگان کو تسکین دی جاتی ہے۔ ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن آہ!

کربلا میں کیسے مسلمان تھے کہ ذرا ان دکھیا عورتوں پر رحم نہ آیا جو ایک دو نہیں پورے بہتّر کی سوگوار تھیں۔ جن کی گودوں تک کے بچے شہید ہو گئے تھے۔ جن کے جوان تیغوں سے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے گئے تھے۔ اور جن کے سروں سے وارثوں کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔ ایک عزیز کا ماتم کس قدر سخت ہوتا ہے۔ اور یہاں تو بھرا گھر خالی ہو گیا تھا۔

أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِينَ ۝ ۱۱/۱۸ ھود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ۝

تیرھویں مجلس

تفسیر آیۂ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ

فضائل جناب امیرؑ و شہادت امام حسینؑ

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ

اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

۵/۵۵-۵۶ مائدہ

ترجمہ: اس کے سوا نہیں کہ تمہارے سرپرست و حاکم صرف اللہ اُس کے رسول اور وہ لوگ جو ایمان والے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں اور حالت رکوع میں زکواۃ دیتے ہیں۔ اور جس شخص نے اللہ رسولؐ اور ایمانداروں کو اپنا سرپرست بنایا تو خدا کے لشکر میں آگیا۔

یہ آیۂ وَانی ھدایہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ہے اس کی شان نزول کے متعلق جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک روز میں نے حضرت رسولؐ خدا کے ساتھ نماز پڑھی پس ایک سائل مسجد میں آیا اور کچھ سوال کیا۔ کسی نے اسے کچھ نہ دیا۔ سائل نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرکے کہا۔ خداوندا گواہ رہنا کہ میں نے تیرے نبیؐ کی مسجد میں سوال کیا مگر کسی نے کچھ نہ دیا۔ علیؑ اس وقت نماز میں مشغول تھے۔ رکوع کی حالت تھی انہوں نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے جس میں ایک انگوٹھی تھی اس سائل کی طرف اشارہ کیا سائل ان کے قریب گیا اور انگوٹھی کو انگلی سے اُتار لیا۔

یہ واقعہ حضرت رسولؐ خدا کے سامنے کا تھا۔ حضرتؐ نے اپنا روئے مبارک آسمان کی طرف کرکے فرمایا

خداوندا میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا تھا۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿٣١﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾

طہ ۲۰/۲۵تا۳۲

ترجمہ:۔ موسیٰ نے کہا اے میرے رب میرے سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور اس سے میری کمر کو مضبوط کر دے اور میرے امر نبوت میں اس کو شریک قرار دے۔

پس پالنے والے میں بھی یہی سوال کرتا ہوں۔ میرا سینہ کشادہ کر دے۔ اور میرا وزیر میرے اہل میرے بھائی علی کو قرار دے۔

ابوذرؓ فرماتے ہیں ابھی حضرتؐ کی یہ دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ جبریل امین آیہ انما ولیکم اللہ لے کر نازل ہوئے۔ جن لوگوں کو اہل بیت سے عداوت ہے انہوں نے لفظ "ولی" کے معنی میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے اور اس امر میں پوری کوشش کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی یہ مخصوص فضیلت خاک میں مل جائے۔ کسی نے کہا ولی کے معنی دوست کے ہیں، کسی نے کہا دوست و مددگار کے ہیں لیکن شیعوں کا دعویٰ یہ ہے کہ اس آیت میں ولی کے معنی حاکم اور اولیٰ بالتصرف کے ہیں۔ دوست اور ناصر کے معنی یہاں صحیح ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ دوست اور ناصر تو بہت ہوتے ہیں اور اس آیت میں کلمہ انما برائے حصر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حاکم سب سے زیادہ تمہارے جان و مال میں تصرف کرنے والے صرف تین ہیں۔ ایک اللہ دوسرے اس کا رسول اور تیسرے وہ ایمان لانے والے جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اگر ولی کے معنی یہاں دوست کے لئے جائیں تو کلمہ حصر بے کار ہو جائے گا۔ اولیٰ اور مولیٰ کے ایک ہی معنی ہیں۔ روز غدیر حضرت رسولؐ خدا صاف طور پر اس کو بیان کر چکے ہیں اور آپ نے ایک لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں فرمایا الست اولی بکم من انفسکم کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا۔ ہر طرف سے آواز آئی۔ بیشک! آپ نے فرمایا من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے یہاں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالتصرف

کے ہیں کیونکہ اولیٰ جیسے ہیں حضرت نے اولیٰ بکم سے اسی کا اقرار کرایا تھا پس جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نبی کی طرح علی بھی مولا اور اولی بالتصرف ہیں۔ تو پھر آیہ انما ولیکم اللّٰہ میں بھی ولی کے معنی اولیٰ بالتصرف ہی کے ہوں گے۔

اہل سنت کے مشہور و معروف عالم ابن اثیر نے اپنی کتاب نہایہ میں من کنت مولاہ فہذا علی مولا کے تحت میں لکھا ہے کہ حضرت کا مقصود یہ تھا ومن کنت نبیہ فعلی ولیہ یعنی جس کا میں نبی ہوں علی اس کا ولی ہے۔

امام شافعی نے بھی مولا کے معنی اولی بالتصرف ہی سمجھتے ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں یہ آیہ

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱

۱۱ / ۴۷ سورہ محمد

کیا ان لوگوں نے روئے زمین پر سیر نہیں کی تاکہ یہ دیکھتے کہ ان سے پہلے (کافروں) کا انجام کیا ہوا ہے۔ خدا نے ان پر تباہی ڈال دی اور کافروں کے لئے ایسی ہی تباہی ہوگی اس لیے ہے کہ ایمان والوں کا سرپرست اللہ ہے اور کافروں کا سرپرست کوئی نہیں۔

سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ روز غدیر حضرت عمرؓ نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو اس طرح مبارک باد دی۔ بَخٍ بَخٍ لَكَ يَا ابْنَ اَبِي طَالِب قَدْ اَصْبَحْتَ وَاَمْسَيْتَ مَوْلَايَ وَمَوْلَا كُلِّ مُؤْمِنٍ وَمُؤْمِنَةٍ یعنی مبارک ہو اے علیؑ ابن ابی طالبؑ کہ آج سے آپ میرے اور ہر مومن و مومنہ کے مولا ہو گئے۔ اگر اس قول میں مولا کے معنی اولیٰ بالتصرف نہ لیے جائیں بلکہ دوست لے جائیں گے۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس سے پہلے حضرت علی علیہ السلام نہ ان کے دوست تھے اور نہ کسی مومن و مومنہ کے یا یہ کہ حضرت عمرؓ مومن نہ تھے جو حضرت علیؑ کی دوستی کا نعادن ان کو حاصل ہونا۔

چونکہ آیہ انما ولیکم اللّٰہ واقعہ غدیر سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی اگر ولی کے معنی دوست

کے لئے گئے ہیں۔ لہذا حضرت عمرؓ کو اس آیت کے حکم کے بموجب حضرت علی علیہ السلام کا دوست ہونا چاہیے تھا۔ پس اگر وہ دوست تھے تو وہ واقعہ غدیر خم کے بعد یہ مبارک باد بالکل مہمل ہو جاتی ہے کیونکہ جو شرف پہلے سے حاصل تھا۔ اس کی مبارک باد اب کیسی؟ دوسرے آیہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

التوبہ: ۹

مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں۔ اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔ اور یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ مومن کا دوست مومن ہے۔ پس اگر حضرت عمرؓ مومن تھے تو حضرت علیؑ کے دوست بھی تھے اور جب دوست تھے تو پھر یہ کہنا کہ آج سے مرے اور ہر مومن و مومنہ کے دوست ہو گئے کیا معنی؟

چونکہ دوست کے معنی حضرت عمرؓ کے اس قول میں صحیح نہیں بیٹھتے لہذا معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اس قول میں حاکم اور اولیٰ بالتصرف ہی کے معنی مراد لیے تھے۔ جو لوگ ولی کے معنی دوست لیتے ہیں وہ گویا حضرت عمرؓ کو ایمان سے خارج کرنا چاہتے ہیں ؎

صد شکر کز رقیباں دامن کشاں گزشتی
گو مشت خاک با ہم بر باد رفتہ باشد

قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آیۂ انما ولیکم اللہ حضرت علی علیہ السلام ہی کی شان میں ہے کیونکہ دونوں میں لفظ ولی مولیٰ واقع ہوا ہے۔ اور تینوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں ورنہ کلام خدا اور رسول میں موافقت ثابت نہ ہوگی۔ اگر حدیث میں لفظ مولیٰ کے معنی ناصر ہوں تو کئی خرابیاں لازم آتی ہیں اول یہ کہ حدیث و قرآن میں موافقت نہیں رہتی۔ دوسرے حدیث و آیت میں مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پہلے آنحضرت نے بطور براعۃ الاستہلال یہ فرمایا تھا۔ الست اولیٰ بکم من انفسکم پھر فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ پس اگر دونوں جگہ ایک ہی

مراد نہ لئے جائیں تو ایک حکیم کا قول معمولی لوگوں کے کلام سے بھی از روئے فصاحت گر جائے گا۔ بتیرے پر کہ ایک غیر ضروری شئے کا روز غدیر اس خاص اہتمام سے بیان کرنا لازم آئے گا۔
لفظ مولیٰ بمعنی اولیٰ کلام عرب میں بہت زیادہ مستعمل ہے اور قرآن بھی یہی بتاتا ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾ ۵۷/۱۵ الحدید

ترجمہ:۔ آج نہ تو تم سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کافروں سے تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہی تمہارے لئے مناسب جگہ ہے اور برا ٹھکانہ ہے۔
لطف کی بات یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے پس جس طرح منافقین کی مولا آگ ہے اسی طرح جناب امیر علیہ السلام مومنین کے مولا ہیں۔ اگرچہ ولی بمعنی دوست و ناصر بھی قرآن میں موجود ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جگہ ولی بمعنی دوست ہی ہوں بہت سے الفاظ مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ لیکن محل اور مقام کے لحاظ سے ان کے معنی لئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ بمعنی دعا بھی آیا ہے اور بمعنی نماز بھی لیکن موقع کے لحاظ سے ہر جگہ معنی لئے جاتے ہیں۔
علاوہ بریں امامت اسی نیابت رسولؐ میں ریاست عامہ ہے جیسے نبوت خدا کی نیابت میں ریاست عامہ ہے یعنی ریاست عامہ مطلقہ خدا کے لئے ہے اس کے بعد نبی کے لئے اس کے بعد نائب نبی کے لئے یہ آیہ انما ولیکم اللہ میں تین ریاستیں بیان کی گئی ہیں۔ اور اسی ترتیب سے بیان کی گئی ہیں۔ اسی امر کو حضرت رسول خدا نے روز غدیر خم ملحوظ رکھ کر فرمایا تھا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَوْلَایَ وَاَنَا اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ وَمَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ (اللہ میرا مولا ہے اور میں تمہاری جانوں پر حاکم ہوں اور جس کا میں حاکم ہوں اس کا علی حاکم ہے)
اس حدیث کا بلحاظ منطق اگر صغرا اور کبریٰ درست کرکے نتیجہ نکالا جائے تب بھی یہی ہے۔ کُلُّ مومن اَنَا کُنْتُ مَوْلَاہُ (صغریٰ) وَ کُلُّ مُومِنٍ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ (کبریٰ) نتیجہ نکلا۔ کُلُّ مُومِنٍ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ)
اگر مولا بمعنی دوست ہوتا تو حضور کو اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی کہ ٹھیک دوپہر میں لوگوں کو

جمع کرتے، پالان شتر کا منبر بنواتے اور اس شد و مد سے خطبہ پڑھتے اور کلمات یہ کہتے۔ نہ حضرت عمرؓ کو یہ ضرورت پیش آتی کہ وہ اس شد و مد سے مبارک باد دیتے صرف دوست بن جانا کوئی ایسی فضیلت نہ تھی۔ جس کے لئے یہ اہتمام ہوتے۔

اس کے علاوہ ایک ثبوت اور بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کے معنی دوست کے نہ تھے ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں لکھا ہے کہ واقعہ غدیر کے بعد حرث بن نعمان فہری نے کہا اے محمدؐ! آپ نے توحید و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج وغیرہ کے احکام سنائے ہم نے قبول کئے تو آپ اس پر راضی نہیں ہوئے جو آج آپ نے اپنے ابن عم کو ہم پر فضیلت دی۔ اے محمدؐ! اگر آپ سچے ہیں اور میں جھوٹا ہوں تو آپ خدا سے دُعا کیجئے کہ خدا مجھ پر عذاب نازل کرے۔ چنانچہ آیہ سَاَلَ سَآئِلٌ م بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَہٗ دَافِعٌ اس واقعہ کی تصدیق ہے۔ حرث پر آسمان سے ایک پتھر گرا جو حلقہ ہو کر اس کے گلے میں پڑ گیا اور وہ مر گیا۔ یہ موقع کا گواہ ہے عرب ہے اپنے محاورات اور الفاظ کے معنی اور محل استعمال کا خوب جاننے والا ہے۔ اگر وہ مولا کے معنی ناصر اور دوست کے سمجھتا تو ہرگز عذاب الٰہی کا خواہاں نہ ہوتا ضرور اس نے مولا کے معنی اولیٰ بالتصرف اور حاکم کے سمجھے تھے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ عرب عجم میں یہ رسم ہے کہ والیان امراء اور ان کے احبا کے لئے دُعا کی جاتی ہے اور ان کے اعدا کے لئے بد دُعا عربی میں کہا جاتا ہے۔ ظِلُّکُمْ ظَلِیْلٌ دَعَدَ وَکُمْ ذَلِیْلٌ اور فارسی میں کہتے ہیں دوست شاخ دشمن پامال۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے تہنیت دی پس اگر وہ مومن تھے۔ تو ان کا یہ قول اس کا اقرار ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ان کے رئیس ہیں۔

آیۂ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ میں حضرت علی علیہ السلام کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اول الذین امنو اور دوسرے وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ اور تیسرے یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں الذین امنو آیا ہے۔ ان کے رئیس اور قائد علی علیہ السلام ہیں۔ سبحان اللہ ان کے ایمان کا کیا کہنا یہ تو مجسم ایمان تھے۔ چنانچہ جنگ خندق میں جب حضرت علی علیہ السلام عمرو بن عبدود کے مقابلے کو چلے تو حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ (آج پورا ایمان کل کفر کے مقابل جا رہا ہے) پس اگر عمرو کل کفر تھا تو علیؑ علیہ السلام کل ایمان تھے۔ اگر اس آیت میں الذین آمنو سے حضرت علی علیہ السلام مراد نہ لئے جائیں تو اس حکم میں ہر شخص داخل ہو جائے گا جو نماز پڑھتا اور زکوٰۃ دیتا ہو۔ ایسی حالت میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ نیز قرینہ روایت یہ ہے کہ اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام ہی ہیں

کیونکہ یہ انگوٹھی حضرت رسولؐ خدا کی موجودگی میں دی گئی تھی۔ اور حضور نبی اکرمؐ نے وزارت کے لئے دعا کی تھی۔ ابھی دعا تمام نہ ہوئی تھی کہ جبریلِ امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں جمع کے صیغے ہیں اور علی علیہ السلام اکیلے تھے اس کا جواب یہ ہے کہ کلامِ باری میں جمع کا اطلاق واحد پر کئی جگہ پایا جاتا ہے۔ مثلاً

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ (۱۵/۹ حجر)

ہم نے ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ (۳/۱۷۳ عمران)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے کہا گیا کہ دشمنوں نے تم سے لڑنے کے لئے بڑا لشکر جمع کیا ہے ان سے ڈرتے رہو تو بجائے خوف کے ان کا ایمان اور زیادہ ہوگیا اور کہنے لگے اللہ کی مدد ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ سب سے اچھا کارساز ہے۔

اس آیت میں ناس سے مراد نعیم ابن مسعود اور ناس سے مراد ابوسفیان ہے باوجودیکہ ایک شخص ہے لیکن جمعوا۔ جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

تیسرے موقع پر ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ (۳/۴۲-۴۳ عمران)

جب ملائکہ نے کہا اے مریم اللہ نے تمہیں برگزیدہ کیا اور تمہیں برگزیدہ کیا دنیا کی عورتوں پر اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

یہاں ملائکہ سے مراد جبرائیل امین ہیں۔

چوتھے مقام پر

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۗ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ① الطلاق : ٦٥

اے نبی (مسلمانوں سے کہہ دیجئے) کہ جب اپنی بیوں کو طلاق دو تو ان کی عدّت (پاکی) کے وقت طلاق دو اور عدہ کا شمار رکھو اور اپنے پروردگار خدا سے ڈرو اور عدہ کے اندر انہیں گھر سے نہ نکالو اور وہ خود بھی گھر سے نہ نکلیں مگر جب وہ صریحی بے حیائی کا کام کریں (تو نکال دینے میں مضائقہ نہیں) اور یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا کہ شاید خدا اس کے بعد کوئی بات پیدا کرے۔

لفظ النساء جمع ہے لیکن مراد حضرت حفصہؓ ہیں چنانچہ رازی نے انس سے یہی روایت کی ہے۔

پانچویں آیۂ مباہلہ میں ابناء و نساء نا و انفسا جمع ہے لیکن مصداق ان کے واحد ہیں۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام کے خضوع کی یہ حالت تھی کہ حالت نماز میں تیر پیر سے نکال لیا گیا اور خبر نہ ہوئی تو بحالت رکوع سائل کی آواز کیسے سن لی۔ اس کا جواب بمذاق عارفین یہ ہے کہ جس وقت سائل کی آواز درگاہ الہٰی میں پہنچی تو حضرت علیؑ نے اس کو سن لیا کیونکہ درگاہ احدیت کے مقربان خاص میں سے ہیں اور قربت کے انتہائی مدارج پر فائز ہیں اور بنا بر عقول متوسط جواب یہ ہے کہ انہوں نے مقصد سائل کو بالہام ربانی معلوم کر لیا اور یہ استغراق کے منافی نہ تھا بلکہ دلیل کمال قربت

ہے۔ جیساکہ وحی کا نزول جو الہام سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ اسی غشی کے منافی نہ تھا۔ جو خاتم الانبیاء پر طاری ہوتی تھی۔ بلکہ وہ غشی ہی سبب نزول وحی تھی۔

جناب امیر علیہ السلام حالت نماز میں سائل یا اس کے سوال کی طرف رجوع کرنا اس کا مقتضی نہیں کہ آپ کی توجہ غیر شے کی طرف ہو گئی۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے ایسا فعل کیا جس کی انتہا خدا کی طرف ہوتی ہے بلاتشبیہ اس کو یوں سمجھو کہ ایک شراب خورنشہ کی حالت میں اگر کوئی کام ہوشیاروں کا ساکر گزرے اور پھر بدستور پہلی حالت پر لوٹ جائے تو اس کو صحیح نہیں کہتے۔

اسی طرح جناب امیر علیہ السلام اگر ذرا دیر کے لئے حالت عبادت میں سائل کی طرف متوجہ ہو گئے تو عبادت سے خارج نہ ہوئے اور آپ کے استغراق میں فرق نہ آیا۔

جاننا چاہیے کہ وہ سائل فرشتہ تھا جو خدا کی طرف سے بصورت سائل بھیجا گیا تھا پس کیونکہ وہ عبادت گزار حالت خضوع و خشوع اس کو نہ جانتا جس کی طرف وہ فرشتہ بھیجا گیا تھا۔

بطریق اہل بیت علیہم السلام مروی ہے کہ وہ سائل فرشتہ تھا۔ اس نے آکر کہا تھا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا وَلِیَّ اللّٰهِ وَاَوْلٰی الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنْفُسِهِمْ تَصَدَّقْ عَلٰی مِسْکِیْنٍ (یعنی اے اللہ کے ولی اور مومنوں کی جان کے ان سے زیادہ مالک ایک مسکین کو صدقہ دو) پس اگرچہ حضرتؑ انتہائی خضوع و خشوع میں تھے لیکن اپنے خدا کے پیغام اور پیغام بروں سے تو غافل نہ تھے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اس کی آواز کو سن لیا اور اپنی عطا سے مشرف کیا یعنی سائل نے آپ کی انگلی سے انگوٹھی اُتار لی۔

سخت حیرت ہے کہ ایسے لوگ کیونکر یہ اعتراض کرتے ہیں جبکہ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں حالت نماز میں اپنے لشکر کو تعلیم دیتا ہوں اور اس کی درستی کرتا ہوں پس اگر تجہیز لشکر خضوع قلب کے لئے منافی نہیں تو حالت رکوع میں زکوٰۃ دینا کیوں منافی ہوگا۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ حضرت علیؑ سے بحالت نماز فعل کثیر سرزد ہوا اور یہ منافی نماز ہے۔ علامہ زمخشری نے اس اعتراض کی تردید یوں کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اُتارنے کا اشارہ کیا، سائل نے بڑھ کر اسے اُتار لیا۔ پس اس صورت میں کوئی عمل مفسد نماز واقع نہیں ہوا۔ یہ اعتراض بھی اہل سنت کو زیب نہیں دیتا۔ کیونکہ ان کے امام نے تفسیر کبیر میں یہ روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا بحالت نماز جوتا اُتار لیتے تھے اور ابن عباسؓ کے گیسو پکڑ کر داہنی جانب حرکت دیتے تھے اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ سودہ بنت زمعہ کو بحالت قیام نماز گود میں اُٹھائے رہتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو زمین پر بٹھا دیتے تھے۔ جامع الاصول میں بجائے سودہ کے امامہ لکھا ہے۔

بہرحال اس آیت سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے حاکم یا ولی تین ہیں۔ اوّل اللہ، دوسرے رسولؐ اور تیسرے وہ مومن جو بحالتِ رکوع زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اس صورت میں کسی مسلمان کو زیبا نہیں کہ ان کی مخالفت کرے ورنہ اس پر بغاوت کا الزام عائد ہوگا۔ بعد حضور نبی اکرمؐ یقیناً حضرت علی علیہ السلام کو تمام اُمت کی جان و مال پر حق تصرّف حاصل تھا۔ وہ جس سے جو کام چاہتے لیتے۔ یہی وہ خاص مرتبہ تھا جو دنیا پرست لوگوں کی آنکھ میں خار کی طرح کھٹکا اور انہوں نے چاہا کہ جس طرح ممکن ہو حضرتؑ کے اس شرف کو خاک میں ملا دیا جائے چنانچہ رسولؐ اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں نے اس حکمِ محکم کو پسِ پشت ڈال دیا۔

اگر مسلمان آیہ مذکورہ میں آخری جزو کا مصداق حضرت علی علیہ السلام کو نہیں جانتے تو ذرا بتائیں وہ دوسرا کون ہے جس نے نماز میں بحالت رکوع انگوٹھی دی اور ولایت مطلقہ کا درجہ حاصل کیا۔ انگوٹھی تو ایک کیا بحالت نماز چالیس دے سکتا ہے۔ لیکن ولایت مطلقہ کی سند پیش نہیں کر سکتا۔ ولایت مطلقہ کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کے ہر ذرّہ پر حق تصرف حاصل ہو اور تمام مخلوقات ارضی و سماوی اس کی بارگاہ میں جبینِ نیاز کو جھکائے۔

فرشتے اس کے بچّوں کی گہوارہ جنبانی کریں۔ حوریں اس کی بیوی کی خدمت میں حاضر ہو کر دایہ گری کا کام انجام دیں رضوان اس کے بچّوں کے لئے جنّت کے میوے اور جنّت کا لباس لائے۔ جنات اس سے اپنے مقدمات کا فیصلہ چاہیں۔ باز و کبوتر پرند اپنا مقدمہ اس کے سامنے پیش کریں۔ زمین اس سے کلام کرے اور اپنے سینے کو سمیٹ کر چشم زدن میں اس کو مدینہ سے مدائن پہنچا دے۔ تاکہ وہ سلمان رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہوں ستارے اس کے گھر میں اُتریں۔ آفتاب غروب ہونے کے بعد اس کے لئے پلٹ آئے بادل اس کی دُعا سے پانی برسائے۔ یہ سب امور اس پر دال ہیں کہ ولایت مطلقہ جناب امیر علیہ السلام کو حاصل تھی۔ یہ ایسی چیزیں نہیں کہ بطور خود حاصل کرے ؎

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ ولایت مطلقہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو اپنے اپنے زمانہ میں حاصل رہی۔ ان کو دُنیا کی ہر مخلوق پہچانتی تھی۔ انہی میں کی وہ فرد تھی جو بے جرم و تقصیر شہید کر دی گئی اس شہادت سے تمام کائنات نے متاثر ہو کر امام حسین علیہ السلام کی ولایت مطلقہ کا ثبوت دیا آفتاب کو گہن لگا۔ سیاہ آندھی چلی۔ آسمانی اُفق پر شفق کی سُرخی نے ظاہر ہو کر غضب الٰہی کا اظہار کیا زمینِ کربلا میں زلزلہ آیا۔ جو پتھر اس سرزمین سے اُٹھایا گیا

اس کے نیچے سے تازہ خون جوش مارتا ہوا نکلا۔ جنات کے نوحے سُنے گئے، حیوانوں میں ہل چل مچی۔

افسوس صد افسوس خدا کا یہ پیارا بندہ۔ ولی۔ عالم، نبیؐ کا پارہ جگر، جوانانِ جنت کا سردار، ایک ایسی سنگ دل، نفس پرست اور دشمنِ عقل و ایمان قوم کے ہجوم میں پھنس گیا تھا۔ جس کو نہ خدا سے واسطہ تھا نہ رسولؐ سے جس نے نماز ادا نہ کرنے دی۔ چنانچہ منقول ہے کہ بعد شہادت حبیب ابن مظاہر امام علیہ السلام نے نماز ظہر بطور نمازِ خوف ادا کی۔ اس حالت میں بھی دشمنانِ دین چاروں طرف سے تیر برسا رہے تھے اور لشکر گاہ حسینی میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی کہ حضرت امام مظلومؑ وہاں کھڑے ہو کر باطمینان نماز ادا کر سکتے۔

لکھا ہے جب حضرتؑ نے مع اپنے اعزہ و انصار نماز ظہر ادا کرنے کا قصد کیا تو سعید بن خالد، ہلال بن نافع اور حضرت عباسؑ علمدار وغیرہ صف باندھ کر اس رخ پر کھڑے ہو گئے جدھر دشمن تیر برسا رہے تھے۔ چنانچہ کوئی تیر اُدھر سے آتا تو یہ لوگ سینے تان تان کر بڑھتے تھے۔ اور تیروں کو سینے پر لینے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔ جب تک حضرتؑ نے نماز ادا فرمائی حضرت عباسؑ علمدار کے سینہ مبارک پر سترہ تیر پیوست ہوئے اور سعید بن خالد کے سینے پر تیرہ تیر لگے۔

منقول ہے جناب سعید کے سینے پر ایک تیر اس زور سے لگا کہ آپ زمین پر گر گئے۔ جناب عباسؑ نے چاہا کہ سعید کو وہاں سے ہٹا دیں۔ مگر انہوں نے وہاں سے ہٹنا گوارا نہ کیا اور کہنے لگے۔ اے ابو الفضل العباسؑ آپ میرا خیال چھوڑیئے ایسا نہ ہو کہ آپ میری طرف متوجہ رہیں اور کوئی تیر امام مظلوم علیہ السلام کے جسم پر آ لگے۔

صاحب بحر البکا تحریر فرماتے ہیں کہ جب امام علیہ السلام نماز ظہر ادا فرما چکے تو جناب جونؓ اذن کارزار حاصل کرنے کے لئے خدمت امام میں حاضر ہوئے۔ جناب جون جو پہلے حضرت ابو ذرؓ کے غلام تھے۔ ان کی وفات کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں رہنے لگے، بوڑھے آدمی تھے مگر نصرت حسین علیہ السلام کے جذبے میں سینہ تلنے امام کے سامنے عرض کر رہے ہیں۔ یا ابن رسولؐ اللہ شوقِ شہادت میں بے چین ہوں۔ جلد اذن کارزار مرحمت فرمایئے۔ حضرتؑ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

اَنْتَ فِی اِذْنٍ مِنِّیْ اِنَّکَ تَبِعْتَنَا طَالِبًا لِلْعَافِیَۃِ۔

تم مجھ سے اجازت مرنے کی طلب کرتے ہو حالانکہ تم طلب عافیت کے لئے ہمارے پاس آئے تھے۔

کَیْفَ اٰذَنُ لَکَ بِالْقَتْلِ (میں کس دل سے تمہیں مرنے کی اجازت دوں)

جونؓ نے عرض کی یا ابن رسول اللہ اَنَا فِی الرَّخَاءِ اَلْحَسُ قِصَاعَکُمْ وَفِی الشِّدَّۃِ اَخْذُلُکُمْ وَاللّٰہِ اِنَّ رِیْحِیْ مُنْتِنٌ وَاِنَّ حَسَبِیْ لَلَئِیْمٌ وَلَوْنِیْ الْاَسْوَدُ فَتَنَفَّسْ عَلَیَّ بِالْجَنَّۃِ فَتَطَیَّب

رِيحِي وَيُشَرِّفَ حَسَبِي وَتَبْيَضَّ وَجْهِي وَاللهِ لَا أُفَارِقُ كُعْبَهُ حَتَّى تَخْتَلِطَ هٰذَا الدَّمُ الْأَسْوَدُ مَعَ دِمَاءِ كُمْ ۔

اے فرزندِ رسولؐ میں عیش و راحت کے زمانہ میں تو آپ کی کاسہ لیسی کرتا رہا۔ اور اب کہ سختی کا وقت آیا ہے تو آپ کو چھوڑ دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم سے ضرور بدبو آتی ہے اور میرا حسب ضرور پست ہے اور میرا رنگ کالا ہے پس میں چاہتا ہوں کہ میں داخلِ جنت ہوں تاکہ میرے بدن کی بدبو خوشبو میں بدل جائے میرا حسب صاحبِ شرف ہو میرا چہرہ روشن ہو جائے۔ واللہ میں آپ سے اس وقت تک جدا نہ ہوں گا جب تک میرا کالا خون آپ کے خون میں نہ مل جائے۔

جون کا یہ کلام سن کر امامِ مظلوم رونے لگے اور اجازت کارزار مرحمت فرمائی۔ جنابِ جونؔ بدن پر ہتھیار سجا کر نہایت شجاعانہ انداز سے ہمہمہ کرتے میدانِ کارزار میں آئے۔

لکھا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب جونؔ لڑنے کے لئے نکلے ہیں تو کنیز سے فرمایا کہ درِ خیمہ کا پردہ باندھ دے تاکہ میں جونؔ کی جنگ دیکھوں۔ اس کے بعد آپ عصا کے سہارے درِ خیمہ پر آ کر بیٹھ گئے۔

جب جنابِ جونؔ حملہ کرتے تھے دشمن کٹ کٹ کر گرتے تھے تو حضرت زین العابدین علیہ السلام کے چہرے پر آثارِ بشاشت نمایاں ہوتے تھے۔

منقول ہے کہ جنابِ جونؔ نے سات دشمنوں کو قتل کیا۔ آخر زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے اور آواز دی يَا ابْنَ رَسُولِ اللهِ اَدْرِكْنِي یہ آواز سنتے ہی امام مظلوم علیہ السلام میدان کی طرف روانہ ہوئے جب جونؔ کے پاس پہنچے تو وہ حالتِ نزع میں تھے۔ آپ نے ان کا سر زانو پر رکھ لیا۔ جونؔ نے فوراً سر ہٹا کر زمین پر رکھ لیا۔ دوسری بار پھر امام علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ جونؔ نے پھر وہی کیا۔ تب امام علیہ السلام نے فرمایا۔

"اے جونؔ کیا سر زانو پر رکھنے سے تکلیف ہوتی ہے؟"

عرض کیا مولا! ایسا تو نہیں ہے مگر یہ سوءِ ادب ہے کہ غلام کا سر آقا کے زانو پر رکھا جائے۔ مولا آپ ازراہِ شفقت ایسا کر رہے ہیں مگر میرا ایمان اجازت نہیں دیتا کہ اس کو گوارا کروں۔ امام حسین علیہ السلام پر ان کے پُرخلوص کلمات کا بے حد اثر ہوا اور آپ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ بَيِّضْ وَجْهَهُ وَطَيِّبْ رِيحَهُ وَاحْشُرْ مَعَ الْاَبْرَارِ وَعَرِّفْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ

اے خدا اس کے چہرے کو روشن کر اور اس کے بدن کی بدبو کو خوشبو بنا اور ابرار کے ساتھ محشور کر اور اس کے اور محمد و آلِ محمد کے درمیان پوری معرفت ظاہر کر)

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب کربلا میں دفن شہداء کا انتظام کیا گیا تو جَون کے بدن سے مشک و عنبر کی خوشبو آرہی تھی۔

جَون کی شہادت کے بعد سعید ابن عمر ابن ابی مطاع اذن کارزار لے کر میدان میں آئے۔ یہ بڑے عابد و زاہد تھے اور شجاعان کوفہ میں سے تھے۔ بڑی دلیری سے لڑے اور بہت سے دشمنوں کو تہ تیغ کیا آخر زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ دشمن نے ان کو مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام انہوں نے اُٹھ کر کئی دشمنوں کو مار گرایا۔ آخر ان کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا۔

ان کے بعد ہلال بن نافع بجلی خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے اور اذن کارزار طلب کیا۔ جناب ہلال کے حال میں لکھا ہے کہ یہ نہایت ہی حسین اور خوش جمال تھے۔ ان کی زوجہ بھی ساتھ تھیں۔

حضرتؑ نے فرمایا اے ہلال تمہاری زوجہ پر جو تمہارے عقد میں چند روز قبل آئی ہے تمہاری جُدائی بہت شاق ہوگی۔ میں تم کو اختیار دیتا ہوں چاہے قتال کرو چاہے اپنی بیوی کو خوش رکھو۔ جب اس مومنہ کو یہ صورتِ حال معلوم ہوئی کہ ہلال میری وجہ سے روکے جا رہے ہیں تو خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہو کر کہنے لگی۔ مولا! میری وجہ سے نہ روکیئے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے میرا شوہر سعادتِ شہادت سے محروم رہے۔ میں بیوگی برداشت کر لوں گی۔

لیکن آپ پر دشمنوں کا نرغہ میں نہیں دیکھ سکتی۔

الغرض جناب ہلال اپنی زوجہ کو رخصت کر کے میدان میں تشریف لائے۔ اور رجز پڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہوئے تھوڑے ہی عرصہ میں تیرہ آدمیوں کو مار گرایا۔ آخر دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر کر حملے شروع کر دیئے اور دونوں ہاتھ قلم کر ڈالے۔ اب ہلال بیچارے لڑائی سے مجبور ہو گئے۔

اب بے دینوں نے گرفتار کر کے شمر کے سامنے پیش کیا اس نے طنزاً کہا اے ہلال نصرت حسینؑ کا مزہ چکھا؟"

یہ سنتے ہی جناب ہلال کو غصہ آگیا فرمانے لگے۔

او بے حیا کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں نصرت حسین علیہ السلام پر نادم ہوں او شقی آگاہ ہو اگر نصرتِ حسین علیہ السلام میں میرا بدن قینچیوں سے کاٹا جائے۔ میری ایک ایک رگ میں سوئیاں چبھوئی جائیں

تب بھی میں نصرت حسین علیہ السلام کا آرزومند رہوں گا۔ ایک جان نہیں میری ہزار جانیں فرزندِ رسول پر قربان ہوں۔"

یہ سُن کر شمر ملعون نے حکم دیا کہ "ہلال کا سر کاٹ لو۔" چنانچہ فوراً ان کا سر قلم کر دیا گیا۔

جب ہلال کے شہید ہونے کی خبر ان کی زوجہ نے سُنی تو سجدہ شکر ادا کیا۔ زنانِ اہل حرم نے اس زنِ مومنہ کے گرد جمع ہو کر پرسا دینا شروع کیا۔

اس نے کہا۔ "بی بیو! میرا شوہر خوش نصیب تھا کہ نصرت حسین مظلوم علیہ السلام میں اپنی جان دی اے بی بیو! بجائے ہلال کے پُرسے سے بہتر یہ ہے کہ سب بی بیاں اپنا اپنا سر کھول کر یہ دُعا کریں کہ خداوندا! فرزندِ رسولؐ کے سر سے یہ بَلا ٹال دے۔" آہ! ہمارے آقا پر کیسا وقت آگیا تھا کہ غیر عورتیں اس طرح سے بے چین تھیں۔

أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ ۱۸/۱۱ ھود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ۝ ۲۶/۲۲۷

چودھویں مجلس

تفسیر آیۂ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ
و
شہادت جناب قاسمؑ

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ
مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

(۱۱۵/۴ نساء)

جو جھگڑا کرے کے رسول کو اذیت پہنچائے گا اس کے بعد کہ ہدایت اس پر ظاہر ہو چکی اور مومنین کے خلاف راستہ چلے گا تو ہم اس کے لئے وہی پسند کریں گے۔ جس کو وہ دوست رکھے گا۔ اور ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ سرکارِ الٰہی سے ایک مجرم پر دو جرم عائد کئے گئے ہیں ایک بہت سنگین ہے اور دوسرا بہت ہلکا، مگر سزا دونوں کی ایک ہی ہے۔ یعنی رسولؐ کی مخالفت کرنے اور مومنین کے راستے کے خلاف چلنے کی سزا جہنم ہے۔ اگر یہ دونوں جرم ہموزن ہوتے تب تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ایسی صورت میں ایک کا پلہ زمین پر ہے اور دوسرے کا آسمان پر۔ کیا یہ امر ہمارے رسولؐ کی توہین کا باعث نہ تھا معصوم رسولؐ ہے اور مومنین غیر معصوم۔ پھر ان دونوں کا مخالف یکساں کیسے ہو سکتا ہے۔ صرف رسول ہی کی مخالفت میں جہنم کی سزا ہے تو پھر دوسرے جرم کے اضافہ کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس کی سزا کیا بتائی گئی۔

اگر ایک بادشاہ کا یہ قانون نافذ ہو کہ جو میرے گودخرسے لغاوت کرے گا اور جو چند بھلے مانسوں

کے خلاف کرے گا تو اسے حبس دوام یا بعبور دریائے شور کی سزا دوں گا۔ تو کیا یہ قانون مبنی برانصاف ہوگا۔ اور کیا اس گورنر کی پوزیشن پر حرف نہ آئے گا اگر اس اضافے کے بغیر یہ سواری جا سکتی تھی تو پھر اضافہ کی کیا ضرورت تھی اور اگر ضرورت تھی تو اس کے لحاظ سے کیا سزا ہوئی۔ گورنر بادشاہ کا نمائندہ ہے۔ اور چند بھلے مانس بہ حیثیت رعایا اس کے تابع فرمان پھر دونوں کی پوزیشن میں مساوات کیسی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ گورنر کی مخالفت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس کے پرائیویٹ معاملات میں پبلک کو اس کی مخالفت ہو۔ اس مخالفت سے گورنمنٹ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ دوسری مخالفت سیاسی امور میں ہے۔ یعنی جس قانون کو نافذ کرنا چاہتا ہے کچھ سرکش لوگ مانع آتے ہیں۔ اس صورت میں گورنمنٹ اپنے اختیارات عمل میں لائے گی کیونکہ وہ اس کا ممتاز نمائندہ ہے۔ اس کی مخالفت عین گورنمنٹ کی مخالفت ہے۔ اسی طرح چند بھلے مانسوں کی مخالفت کی بھی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ کچھ شریر لوگ ان کے ذاتی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں مخالفت کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کو قانون شکنی پر آمادہ کرتے ہیں اور ان کو راہِ راست سے ہٹا کر بغاوت اور غداری کی تعلیم دیتے ہیں یہاں بھی پہلی صورت میں از روئے قانون گورنر کو ان لوگوں کے مجرم بنانے کا حق نہیں لیکن دوسری صورت میں چونکہ قانون کا تعلق ہے۔ لہٰذا وہ ان سے ضرور تعرض کرے گا۔ اب یہ معلوم ہوا کہ دونوں جرم بظاہر جدا جدا ہیں۔ لیکن حقیقتاً بھلے آدمیوں اور گورنر کی مخالفت قانون سرکار کے پوائنٹ پر آکر دونوں ایک ہوگئی ہیں پس اسی طرح آیت میں رسولؐ کی مخالفت اور راہ مومنین کے خلاف راستہ اختیار کرنے کا جرم درحقیقت ایک ہی ہے اگر یہ راستہ مومنین نے خود ہی بنایا ہوتا تو جرم بھی جدا جدا ہوتے اور سزائیں بھی الگ الگ لیکن مومنین کا راستہ چونکہ وہی ہے جو رسول کا بنایا ہوا ہے لہٰذا ان کے راستہ کو چھوڑنا درحقیقت رسول کا راستہ چھوڑنا ہے۔ اس لئے دونوں کی سزا ایک ہی قرار دی گئی ہے۔ ہاں اگر مومنین اپنا راستہ الگ بنالیں تو تصویر کا رُخ بدل جائے گا۔ پھر ان کی مخالفت رسولؐ کی مخالفت نہ رہے گی بلکہ از روئے قانون ان کی ہی مخالفت رہے گی۔

پس اجماع پرستوں کا یہ خیال غلط ہے کہ مومنین جو راستہ بنالیں وہ صراطِ مستقیم ہے بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی بتائی ہوئی جو راہ مومنین کی ہے۔ اس کے خلاف نہیں چلنا چاہیے ورنہ جہنم اس کی سزا ہے مومنین کو خود اپنا راستہ تجویز کرلینے کا حق کیوں نہیں دیا گیا اس لئے کہ بھٹکنے کا ان سے امکان ہے اگر ایسا

نہ ہوتا تو ایک دین کے بہتّر فرقے کیسے ہو جاتے کیا کسی اسکول کے ٹیچر یا کالج کے پروفیسر کو آج تک لڑکوں پر یہ اعتماد ہوا ہے کہ وہ اپنا کورس آپ تجویز کر کے امتحان کی تیاری کر لیں۔ کیا کسی جماعت کے تیس تیس طلباء مل کر ایک تجربہ کار معلّم کی قائم مقامی کر سکتے ہیں۔ کیا اتنی بڑی جماعت سے کتاب کے غلط مطلب یا امتحان کی تیاری غلط طور پر کرنے کا امکان باقی نہ رہے گا۔ کیا ان کا تجویز کردہ مانیٹر استاد کی جگہ بیٹھ کر صحیح راستہ پر ان کو چلائے گا۔

پبلک روڈ جس پر رات دن پبلک چلتی ہے کیا پبلک کی بنائی ہوتی ہے۔ بناتی ہے سرکار مگر کہلاتی ہے پبلک روڈ، سرکار اپنی زمین میں پبلک کو سڑک بنانے کی اجازت ہی نہیں دیتی ہاں اپنے وفاداروں کے نام سے سڑکوں کو موسوم کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف راستہ بنا دینا ہی کافی نہیں بلکہ بنانے کے بعد مسافروں کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر دن دہاڑے کسی راستہ میں مسافر لٹ جاتے ہوں تو اس کا الزام پبلک پر عائد نہیں ہوتا بلکہ سرکار پر ہوتا ہے۔ اگر درندے حملہ کرتے ہوں یا مسافروں کو پانی کی تکلیف ہوتی ہو۔ یا جا بجا ندی نالے اُترتے پڑتے ہوں تو اس کا الزام بھی گورنمنٹ ہی کے سر آتا ہے لہٰذا ان تمام ذمہ داریوں کے ہوتے ہوئے سرکار سڑک خود بنواتی ہے پبلک مفاد کو پیش نظر رکھ کر ضرور بناتی ہے لیکن پبلک کی رائے سے کر نہیں بناتی اس کے بنانے وقت جہاں بے موقع مکان دیکھتی ہے گرا دیتی ہے تاکہ راستہ میں کجی نہ رہے۔ ڈاکوؤں کی گھات کی جگہیں اپنی نظر میں رکھتی ہے وہاں پولیس کا پہرہ بٹھاتی ہے۔

پبلک کی ڈالی پگ ڈنڈیاں جیسی ٹیڑھی اور ناہموار ہوتی ہیں کون نہیں جانتا کہ ان پر چل کر اکثر لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ ہر گاؤں کے لئے ایک جداگانہ پگ ڈنڈی بن جانے سے مسافر چکرا جاتا ہے کہ کدھر جاؤں۔ اکثر رات کو ان پر چل کر لٹ جاتے ہیں۔ یہ کھائی، خندق، جنگل، جھاڑی سب سے ہو کر نکل جاتی ہے۔

ان کے ہونے سے سرکاری سڑک کی قدر ہو جاتی ہے۔ پگ ڈنڈی پر چلنے والا مسافر جب کشادہ پختہ سڑک پر آجاتا ہے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سرکاری سڑکوں پر رات کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اور میل کے پتھر بھی ہدایت کے لئے نصب ہوتے ہیں۔ درخت بھی لگائے جاتے ہیں تاکہ دھوپ کے مارے اور لو سے جھلسے مسافروں کو راحت ملے۔ پس عقل مند آدمی ایسے راستے پر چلے گا یا پبلک کی بنائی ہوئی پگ ڈنڈی پر؟

سرکاری سڑکوں پر خطرے کے مقامات پر اشارات ہوتے ہیں کہ سنبھل کر چلو۔ چوراہوں پر پولیس

مین ہوتا ہے جو ہاتھ اُٹھا کر بتاتا ہے کہ اب چلو یا اب رُک جاؤ۔ یہ اس لئے کہ تصادم نہ ہو۔ یہ ہدائیتیں بھلا پگ ڈنڈیوں پر کہاں۔ اگر سرکاری سپاہی ہر وقت راستوں پر موجود نہ ہوں تو لوگ دن دہاڑے پھاند پھاند کر لوگوں کے گھروں میں گھس جائیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ راستہ مومنین کا بنایا ہوا نہیں تو لامحالہ خدا کا بنایا ہوا ہوگا اب واضح ہو جانا چاہیے کہ خدا کا بنایا ہوا راستہ کون سا ہے۔ سنیئے قرآن اس کو بتاتا ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ (۱۵۳/ ۶ انعام)

یہ میرا راستہ سیدھا ہے پس تم اسی پر چلو اور بہت سے راستے اختیار نہ کرو۔ ورنہ خدا کے راستے سے جُدا ہو جاؤ گے۔

اس آیت میں تین باتیں قابلِ غور ہیں۔ اوّل یہ کہ لفظ ھذا کا اشارہ کیا ہے کیونکہ جب تک کوئی راستہ پہلے سے معین نہ ہوئے اشارہ ہو کیونکر سکتا ہے۔ دوسرے اس کے علاوہ کچھ اور راستے بھی ہیں جن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چونکہ جمع کا اطلاق کم سے کم تین پر ہوتا ہے اس لئے تین ضروری ہی ہوں گے۔

تیسرے یہ کہ ان راستوں پر چلنے والا خدائی راستہ سے بھٹک جائے گا۔ لہٰذا اس خاص راستہ کا اور اس پر چلنے والوں کا اور ان بہت سے راستوں کا جو باعثِ تفرقہ ہیں تعین ہو جانا چاہیے تاکہ سبیل مومنین مخصوص ہو جائے۔

چوتھے خدا کا راستہ سیدھا ہے ٹیڑھا نہیں۔

جب کسی چوراہے پر پہنچ کر مسافر کو تردّد ہو کہ میں کس طرف کو جاؤں تو کیا کرنا چاہیے اس کا جواب یہی ہے کہ کسی واقف کار سے پوچھنا چاہیے۔ اگر کوئی سرکاری آدمی مل جائے اور گورنمنٹ ہاؤس سے نکلتا ہوا دکھائی دے تو اس سے بہتر بتانے والا کون ہو سکتا ہے۔ اگر جا رہا ہو تو ٹھہرا لو۔ اگر بھلا آدمی ہے تو خود تمہیں متردد دیکھ کر ٹھہر جائے گا اور اشارے سے بتا دے گا کہ اس طرف چلے جاؤ۔ یا کسی واقف منزل راہ رَو کی طرف اشارہ کر دے گا۔ کہ اس کے پیچھے ہو لو۔ یہ منزلِ مقصود تک تمہیں پہنچا دے گا اور بھٹکنے نہ دے گا دیکھو جس کی طرف وہ اشارہ کرے اسے خوب پہچان لینا۔ ایسا نہ ہو کہ دو قدم چل کر ساتھ چھوڑ دو۔ اور کسی اور کے پیچھے چل پڑو۔

خدا نے کہا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

(۵۱/۳ آل عمران)

دیکھو یہ کون ہے جس کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

"اے رسول لوگوں سے کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے (اے رسول) کہدو کہ تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم نے رُوگردانی کی تو اللہ انکار کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳۲/۳۱/۳ عمران)

اس سے معلوم ہوا کہ رسولؐ تمہارے لئے واجب الاطاعت حاکم و مولا ہیں۔ موقع ہو تو رسولؐ سے پوچھ لو۔ کہ جب آپ نہ ہوں تو ہم کس کا اتباع کریں۔ معاملہ نازک ہے خوب تحقیق کر لینا صورت دیکھنا انگلی سے اشارہ کرا لینا اور نام بھی پوچھ لینا تاکہ کل کوئی جھٹلا نہ دے سنو اس آواز کو من کنت مولاہ فہذا علیؑ مولاہ۔

اب لسان قدرت سے صراطِ مستقیم کا تعین ہو جانا چاہیے۔ شیطان کا قول قرآن مجید میں یوں نقل ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ﴿۴۱﴾

(۱۵/۳۹ حجر)

پالنے والے تو نے مجھے گمراہی میں چھوڑا ہی ہے۔ میں بھی دنیا کی چیزوں کو ان کی نظر میں زینت دوں گا اور سوائے تیرے مخلص بندوں کے سب کو بہکاؤں گا۔ خدا نے کہا یہی تو میری طرف

آنے کا سیدھا راستہ ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ عباد مخلصین کا راستہ سیدھا ہے کہ عباد مخلصین ان سے زیادہ کون ہوں گے جنہوں نے من المھد الی اللحد کسی بُت کے سامنے سر ہی نہ جھکایا ہو۔ جنہوں نے طرفۃ العین کے لئے توحید یا رسالت میں شک کیا ہی نہیں خود فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۴﴾

(۶۴/۴۳ زخرف)

بیشک اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا بھی۔ پس اسی کی عبادت کرو۔ یہی صراطِ مستقیم ہے)

اب اس راستے کے چلنے والوں کا تعین بھی ہو جانا چاہیئے۔ خدا فرماتا ہے۔

یٰسٓ ﴿۱﴾ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳﴾ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴﴾

(۴-۱/۳۶ یٰسٓ)

اے سید (سردار (رسولؐ) قسم ہے قرآن حکیم کی بے شک تو مرسلین میں سے ہے۔ اور راہِ راست پر ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول سیدھے راستے پر چلنے والا تھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ رسولؐ کے بعد اس راستے پر چلنے والا کون تھا۔ پس جو ایسا ہو ہر مسلمان کو اس کے پیچھے چلنا چاہیے۔ حدیث ثقلین سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول نے قرآن کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کر کے یہ بتا دیا کہ اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور سیدھا راستہ وہی ہے جس پر چلنے والا گمراہ نہ ہو۔

کس ندیدیم کہ گم شد از راہ راست

مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا۔ ان تومر دعلیًّا یاخذ بکم الصراط المستقیم

(اگر تم علیؑ کو اپنا امیر بنا لوگے تو وہ تم کو صراط مستقیم پر لے جائے گا)

اور بعض کتب اہل سنت میں یہ حدیث بھی مرقوم ہے۔ یا علیؑ انت الطریق الواضح

وصراط المستقیم۔
اے علی! تم طریقِ واضح اور صراطِ مستقیم ہو۔
قرآن مجید کی حکایت اس بارے میں یوں ہے

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

۵/۱۵ مائدہ

اللہ کی طرف سے نور آیا ہے۔ اور روشن کتاب اللہ اس نور سے ہدایت کرتا ہے اس شخص سے جو اس کی مرضی و سلامتی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اور وہ ہادی ان لوگوں کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے اور ان کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر زمانے میں کتاب خدا کے ساتھ ایک نور کا رہنا ضروری ہے۔ اس کی روشنی میں لوگ صراطِ مستقیم کی طرف چل سکتے ہیں۔ پس رسولؐ کے بعد اس سے زیادہ کون کتاب مبین کے ساتھ ہونے والا مل سکتا ہے جو شریکِ نورِ رسالت ہے۔ جیساکہ حدیثِ رسولؐ ہے۔ انا وعلی من نورٍ واحد
اب یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون راستے ہیں جن پر چلنے کو منع کیا گیا ہے اور جن پر چلنے سے خدائی راستہ چھوٹ جاتا ہے۔ قرآن نے صحیح اور غیر صحیح راستوں کو یوں بیان کیا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

۱-۷ / ۱ سورہ فاتحہ

حمد ہے اس خدا کی جو تمام کائنات کا پالنے والا ہے۔ رحمٰن و رحیم ہے قیامت کے دن کا مالک ہے۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ ہم کو اُس سیدھے راستے پر قائم رکھ جن پر تو نے اپنی رحمتیں نازل کی ہیں۔ نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے اور نہ اُن لوگوں کا راستہ جو گمراہ ہوگئے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾

(۷۰-۶۹/۴ نساء)

جو اللہ و رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کو اللہ نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔ یعنی انبیاء۔ صدیقین۔ شہدا اور صالحین اور یہ کیسے اچھے ساتھی ہوں گے یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ جاننے کے لئے کافی ہے۔

صراطِ مستقیم یا سبیل خدا والے بہی تھوڑے سے لوگ ہیں جو ان چار گروہوں کے ساتھ ہیں۔ باقی تمام جم غفیر مغضوبین اور ضالین کے ساتھ ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ دنیا میں کوئی ایسا گھر ڈھونڈے نہ ملے گا جس میں نعمت پانے والوں کے یہ چاروں گروہ موجود ہوں۔ اگر کسی گھر میں نبی ہوگا تو صدیق نہ ہوگا۔ صدیق ہوگا تو شہید نہ ہوگا۔ یہ خصوصیت صرف حضرت سرور کائناتؐ کے خانوادۂ گرامی کو حاصل ہے کہ چاروں قسمیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ اور بہترین صورت میں ان کا نبی سید الانبیاء ان کا صدیق سید الصدیقین۔

صواعق محرقہ میں ہے کہ صدیق تین ہیں مومن آل فرعون جس نے جناب موسیٰ کی تصدیق کی اور حبیب النجار جس نے حضرت عیسیٰ کی تصدیق کی اور علی بن ابی طالبؑ جنہوں نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تصدیق کی اور یہ سب سے برتر اور افضل ہیں۔ اور امیر المومنینؑ نے فرمایا۔ اَنَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ لَا يَقُوْلُهٗ بَعْدِيْ اِلَّا كَاذِبٌ مُفْتَرٍ (میں سب سے بڑا صدیق ہوں اور میرے بعد صدیق ہونے کا دعویٰ نہ کرے گا۔ مگر کاذب مفتری)

ان کا شہید سید الشہداء ان کا صالح صالح المومنین جیسا کہ خدا نبی کی دو بیبیوں سے فرماتا ہے۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾

(۴/۶۶ تحریم)

اگر تم توبہ بھی کر دو تو کیا ہوگا کیونکہ) تمہارے دل تو ٹیڑھے ہو گئے اور اب اگر تم نے نبیؐ کے خلاف شورہ پشتی کی تو اللہ اس کا مددگار رہے اور جبرئیل اور صالح المومنین (علیؑ) اور اس کے تمام ملائکہ اس کی پشت پناہ ہیں۔ جن راستوں کے ادھر ادھر گہرے غار اور کھڈ ہوتے ہیں۔ ان کے دونوں طرف جنگلے لگا دیئے جاتے ہیں۔ یا کم از کم رسّے باندھ دیئے جاتے ہیں کہ لوگ ان کو پکڑ کر چلیں اور گرنے سے محفوظ رہیں۔ رسولؐ نے بھی صراطِ مستقیم کے دونوں طرف دو مضبوط رسّے باندھ دیئے ہیں اور ان سے تمسک کا حکم دے دیا ہے ان میں سے ایک کا نام کتاب اور دوسرے کا اہل بیت ہے۔ یہ انتظام اس لئے تھا کہ علم کے پیر کو اگر لغزش ہو تو قرآن سنبھال لے اور اگر عمل کے پیر کو لغزش ہو تو اہل بیتؑ سنبھال لیں۔ یہ دونوں مضبوط رسیاں یہاں سے لے کر حوضِ کوثر تک چلی گئی ہیں۔ حدیث ثقلین یہ ہے۔

ایھا النّاس اِنّی تارِکٌ فیکُمُ الثّقلین کتاب اللہ وَعِترَتی اَھلَ بیتی مَا اِن تَمَسَّکتُم بِھِما لَن تَضِلّوا بَعدی وَلَن یَفتَرِقا حَتّیٰ یَرِدا عَلَیَّ الحَوضَ۔

لوگو! میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب دوسرے میری عترت میرے اہل بیت جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اور یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آجائیں۔" یہ حدیث اس آیت سے ماخوذ ہے

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ۝۱۱۲ ۳/۱۱۲ عمران

اور جہاں کہیں ہتّے چڑھے اُن پر رسوائی کی مار پڑی مگر خدا کے عہد یا اور لوگوں کے عہد کے ذریعہ سے جہاں کہیں ان کو پناہ مل گئی اور ہیر پھیر کے خدا کے غضب میں پڑ گئے اور ان پر محتاجی کی مار الگ پڑی یہ اس سبب سے کہ وہ خدا کے آیات سے انکار کرتے تھے اور پیغمبرؐ کو ناحق قتل کرتے تھے یہ سزا اس کی ہے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے گزر گئے تھے۔

اس آیت کے مفہوم پر ہم کو نظر ڈالنی چاہیے جو کوئی رسول کو تکلیف پہنچائے اس کے بعد کہ اس پر ہدایت ظاہر ہو چکی ہے اور مومنین کی راہ کے خلاف بھی چلے تو اس کی سزا جہنم ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ نے اپنی حجت تمام کردی اور وہ راستہ بتادیا جو بالخصوص مومنین کا راستہ ہے۔ مخصوص ہیں نے اس لئے کہا کہ الف لام تخصیص کا مومنین پر داخل ہے۔ یہ وہی راستہ ہے جس کو حضورؐ نے حدیث ثقلین میں بیان کیا ہے۔

رسول ایک راستے کے ہادی اور رہنما بن کر آئے تھے اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ ۱۳/۷ رعد اے رسولؐ تم لوگوں کو عذاب سے ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے۔ پس کیونکر ممکن ہے کہ رسولؐ ایک قوم کا ہادی ہو۔ اور وہ راستہ نہ تو مومنین کو معلوم ہوا اور نہ وہ اس پر چلے ہوں۔ ضرور یہ راستہ معین ہو چکا اور مومنین اس پر چل چکے پھر یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کہ مراد اس آیت میں وہ راستہ ہے جو مسلمانوں نے اجماع سے تجویز کیا ہے۔ اس صورت میں تو فرض رسالت پورا نہیں ہوتا یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مُراد اس سے دین اسلام ہے اور وہ رسول بتا گئے پس وہی مومنین کا راستہ قرار پایا لیکن اگر ایسا ہے تو پھر کوئی مسلمان مستحق نار قرار نہیں پاتا اور آنحضرتؐ کے اس قول کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ ان میں سے بہتر دوزخی ہوں گے اور ایک ناجی۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام میں تہتر راہیں ہیں اور ان میں سے ایک سیدھی ہے جس کی طرف هٰذا صراطی مستقیماً سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بھٹکنے کا خوف صرف ان راہوں میں ہوتا ہے جو کئی راہیں قریب قریب ملی جارہی ہوں ایسے راستوں میں اکثر اوقات مسافر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے الگ تھلگ راستوں میں بہت ہی کم لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔

دوسرے آیت میں

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝۱۱۵ ۴/۱۱۵ سورہ نساء

اس آیت میں غیر سبیل المومنین

کہا گیا ہے نہ کہ غیر سبیل المسلمین یعنی مراد اسلام کا عام راستہ نہیں جس میں تہتر، پگ ڈنڈیاں پڑی ہوئی ہیں۔ بلکہ وہ خاص ایمان کی شاہراہ مُراد ہے جو سیدھی اللہ تک پہنچانے والی

ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی راستہ کا رہبر کیسا ہونا چاہیے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو بہت سی بار اس راستہ پر آیا گیا ہو۔ بچپن سے یہ راستہ اس کے پیروں کو لگا ہو، راستے کے ایک ایک نشیب و فراز سے واقف ہو اور یہ راستہ اس کے پیروں کو اتنا لگ گیا ہو کہ اپنے گھر سے اُٹھ کر منزلِ مقصود تک پلک جھپکتے پہنچ جائے (معراج) اور واپس آجائے۔ جب یہ شفیق رہنما دُنیا سے اُٹھے تو اب اس سے پوچھو کس کے پیچھے چلیں۔ وہ یقیناً کسی ایسے کے ہاتھ میں ہاتھ دے گا جو اسی گھر سے آ رہا ہو جہاں آپ کو جانا مقصود ہے پس اس سے بہتر رہنمائی اور کیا ہو سکتی ہے۔

ایک سوال اس مقام پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بہت سی راہیں پیدا کیسے ہو گئیں۔ رسول اللہؐ تو صرف ایک ہی راستہ بنا کر گئے تھے۔ اس کا جواب ایک مثال کے ذریعے سے دیا جاتا ہے۔ لاہور سے کلکتہ تک ایک سیدھی سڑک چلی جا رہی ہے جس کے دائیں بائیں بے شمار پگ ڈنڈیاں پڑی ہوئی ہیں۔ آخر یہ کیسے بنیں۔ اگر سب کے سب لاہور سے کلکتہ ہی جانے والے ہوتے تو ہرگز یہ راستے پیدا نہ ہوتے اور کچّی سڑکیں پکّی کے ساتھ نہ چلتیں۔ لیکن لاہور سے جو کلکتہ کا قصد کر کے اُٹھے تھے وہ ایک ایسے اولوالعزم رہنما کے پیچھے چل رہے تھے جو برابر ان کی ہمتیں بڑھاتا اور منزلیں مارتا چلا ہی جاتا تھا۔ اور راستہ کے اِدھر اُدھر جو سرسبز شاداب اور میوہ دار درخت لگے تھے ان میں سیر و تفریح کی اجازت نہ دیتا تھا کیونکہ باغوں میں بڑے زہریلے ناگ جھاڑیوں کے اندر سر چھپائے بیٹھے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ فاقے کرتے اور مصیبتیں جھیلتے جس طرح ممکن ہو سکے منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔ وہاں ہر طرح کا دوامی آرام تمہیں نصیب ہو گا۔ اگر راہ کی دل بستگیوں میں اُلجھ گئے تو پھر یہیں کے ہو جاؤ گے اور سو خطروں میں گھر جاؤ گے۔ یہ لوگ رہنما کے ساتھ گرتے پڑتے چلے تو جاتے تھے مگر دل خوش نہ تھا آپس میں کہتے تھے کہ اس رہنما کی قیادت میں زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ یہ جس طرح خود سوکھی روٹی کے ٹکڑے کھاتا ہے ہم کو بھی کھانے پر مجبور کرتا ہے۔ مگر مخالفت کرتے بنتی نہ تھی۔ اتفاقاً اس رہنما کا انتقال ہو گیا اس نے مرتے وقت وصیّت کی کہ میرے بعد فلاں شخص کو اپنا رہنما بنا لینا وہ میری طرح تم کو صحیح راستہ پر لے جا کر منزل تک پہنچا دے گا۔ مگر انہوں نے اس پر شور و غل مچایا کہ اس رہنمائی ہمیں ضرورت ہی نہیں جو کچھ آپ نے ہدایت کر دی ہے۔ بس وہی ہمارے لئے کافی ہیں اور ہمیں حفظ یاد ہیں۔ بہت سے آدمی تو اس نئے رہبر کے ساتھ آگے بڑھے باقی کترا کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ اور جس کا منہ جس طرف اُٹھ گیا چل کھڑا ہوا۔ ان ہی کے قدموں کی برکت سے پگڈنڈیاں بنتی چلی گئیں اور ان سے بعض، بعض کے رہنما بن گئے۔

ٹھیک یہی حال اُمّتِ محمدیؐ کا ہوا کہ آنحضرتؐ کے بعد تہتّر فرقوں میں تقسیم ہو گئی اور اپنے ان

رہنماؤں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جن کو رسول نے کتاب خدا کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی ہدایت کے لئے کتاب خدا کو کافی سمجھا انکی یہی وہ اصولی غلطی تھی جس نے اسلام کے بہتر فرقوں کو گمراہ کیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن کا علم ان لوگوں سے نہ لیا گیا۔ جن کے سینوں میں علم کتاب تھا اور یہ آیہ

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

(۲۹ / ۴۸ - ۴۹ عنکبوت)

اے رسول قرآن نازل ہونے سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھا کرتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا ہی کرتے تھے۔ ایسا ہوتا تو ضرور یہ جھوٹے تمہاری نبوت میں شک کرنے لگتے مگر جن لوگوں کو خدا کی طرف سے علم عطا ہوا ہے اُن کے دلوں میں یہ (قرآن) واضح اور روشن آیتیں ہیں اور سرکشوں کے سوا ہماری آیتوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

کا مصداق تھے ان کی بجائے ایسے لوگوں سے لیا جو بجائے خدا و رسول سے تعلیم حاصل کرنے کے اپنی رائے اور قیاس سے کام لیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رسول کے مرتے ہی بدعات کا سیلاب اُبل پڑا۔ اور آیات قرآنی کی تاویلیں اپنی طرف سے کر کے جس حکم کو چاہا جیسا بنا لیا۔

کچھ عرصہ تک تو غلط تاویلوں ہی تک تصرف محدود رہا۔ لیکن جب یزید کی حکومت کا دور آیا تو تنزیل قرآن سے بھی انکار کیا جانے لگا۔ یزید کے عقیدہ کی ترجمانی اس کے شعر میں موجود ہے۔

لَعِبَتْ بَنُوْهَاشِمٍ بِالْمُلْكِ فَلَا ۔۔۔ مَلَكٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلْ

بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ ایک کھیل کھیلا تھا ۔۔۔ نہ ان کے پاس فرشتہ آیا نہ وحی نازل ہوئی تھی

خیال کیجئے اسلام کے لئے کیسا تباہ کن دور تھا جب قرآن منزل من اللہ ہی نہ رہا تو معاذ اللہ رسول کب سچے رہے۔ اور جب رسولؐ ہی سچے نہ رہے تو ان کا لایا ہوا دین کب سچا رہا۔ اگر اس خطرہ کی بر وقت روک تھام نہ کی جاتی تو گویا خدا کا برگزیدہ دین باقی رہ جاتا۔ اور اگر برائے نام رہ بھی جاتا تو اس کی صورت مسخ نہ ہو جاتی۔

صد آفرین کربلا والوں کی ہمت پر کہ انہوں نے اپنی جان و مال و آبرو ہر شئے کو قربان کر کے دین الٰہی کو

اس شدید خطرہ سے بچالیا۔ ان مجاہدین راہِ خدا نے جس حوصلہ مندی اور بے جگری سے کام لیا اور اپنے کمال ایمان اور صبر و شکر کے محیر العقول کارنامے دکھائے دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کسی شاعر نے ان کی عدیم المثال شجاعت کی کیا خوب تعریف کی ہے۔

لَبِسُوا القُلُوبَ عَلَی الدُّرُوعِ کَاَنَّمَا یَتَهَافَتُوْنَ عَلٰی ذِهَابِ الْاَنْفُسِ

انہوں نے زرہوں پر اپنے دل پہن لیے تھے اور وہ جانیں فدا کرنے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے

زن و مرد، جوان و پیر، آزاد و غلام سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ موت کا وہ تلخ جام جس کے تصور سے لوگوں کے بدن میں رعشہ پڑ جاتا ہے۔ وہ نصرتِ دین کے جوش میں اس ذوق و شوق سے پی رہے تھے۔ گویا دودھ اور شہد کے پیالے ان کے منہ سے لگا دیئے گئے ہیں۔

منقول ہے کہ جب امام مظلومؑ کے تمام انصار میدانِ جنگ میں کام آچکے اور عزیز بھی درجہ شہادت پانے لگے تو جناب قاسم حاضرِ خدمت ہو کر اذن کارزار طلب کرنے لگے۔ حضرتؑ یتیم بھتیجے کو چھاتی سے لگا کر رونے لگے۔ اور فرمایا اے میرے فرزند تو میرے مولے بھائی کی یادگار رہے تجھے دیکھ کر بھائی حسنؑ یاد آجاتے ہیں اے فرزند تو ابھی کم سن ہے میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ تجھ جیسے نازوں کے پالے خوش رُو اور خوش سیرت جوان کو ان خونخوار درندوں میں تیغ و نیزے کھانے کو بھیج دوں۔ بیٹا! تیری جُدائی تیری دُکھیا ماں سے برداشت نہ ہوگی۔ اس کا کلیجہ اس صدمے سے پھٹ جائے گا۔ آہ! ان کے دل میں بہت سے ارمان ہیں۔ ابھی تو ان بیچاری نے تیری جوانی کی بہار بھی نہیں دیکھی۔ یہ سُن کر جناب قاسم آبدیدہ ہوئے اور عرض کی چچا جان میں آپ کو اپنے پدر بزرگوار کی روح کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھ کو شرف شہادت سے محروم نہ رکھیے۔ یہ ضرور ہے کہ میرا سن ابھی کم ہے لیکن مجھے بھی بحمدللہ یہ فخر حاصل ہے کہ علیؑ جیسے شجاع کا پوتا ہوں اور عباسؑ جیسے غازی کا بھتیجا ہوں میدان میں جا کر ہاشمی شجاعت کے وہ جوہر دکھاؤں گا کہ یہ نابکار سکتے میں رہ جائیں گے۔ ابھی چچا بھتیجے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ درِ خیمہ سے کسی کے رونے کی آواز آئی۔

امام مظلومؑ اس طرف متوجہ ہوئے پوچھا یہ کون روتا ہے۔ کسی نے کہا حضور کی بھابی اُم فروہ ہیں حضرت یہ سنتے ہی خیمہ میں تشریف لائے اور پوچھا۔ بھابی جان آپ کے اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رونے کا سبب کیا ہے۔ کہنے لگیں۔ یابن رسول اللہؐ کیا بیوہ کی اولاد فدیہ راہِ خدا بننے کے قابل نہیں ہوتی۔

یابن رسول آپ نے قاسم کو اگر اجازت جنگ عطا نہ فرمائی تو مجھے روز حشر آپ کے پدر بزرگوار اور مادر عالی وقار اور برادر والا تبار سے سخت ندامت ہوگی۔ یابن رسول اللہؐ خدا کے لئے قاسم کو نہ روکئے ورنہ عرصہ

حیات میرے اُوپر تنگ ہو جائے گا۔ اور زنانِ اہلِ حرم کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوں گی۔
دُکھیا بھاوج کی تقریر سن کر امام مظلوم کے دل پر غم کا آرہ چل گیا۔ دیر تک سر جھکائے زار و نزار روتے رہے۔ اس کے بعد خیمہ سے برآمد ہوئے اور صبر کی سل کلیجہ پر رکھ کر اجازت کا دزار مرحمت فرمائی اس کے بعد آپ نے تبرکات امام حسن علیہ السلام خیمے سے طلب فرما کر جناب قاسم کو اپنے ہاتھ سے آراستہ کیا۔ عمامہ امام حسن علیہ السلام سر پر باندھا زرہ بدن پر پہنائی پٹکے سے کمر کسی چھوٹی سی تلوار حمائل کی۔ جب اچھی طرح آراستہ کر لیا تو بھتیجے کی صورت دیکھ دیکھ کر زار زار رونے لگے۔
امام حسن علیہ السلام کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی چھاتی سے لگا کر پیار کیا اور فرمانے لگے "قاسم موت کو کیسا پاتے ہو" عرض کی یا عمی اجلٰی من العسل اے چچا شہد سے زیادہ میٹھا۔ فرمایا بیٹا! اللہ تجھے جزائے خیر دے پھر گھوڑا طلب فرمایا اور قاسم کا بازو پکڑ کر سوار کیا اور نہایت غم ناک لہجہ میں فرمایا۔ اچھا بیٹا سدھارو خدا حافظ۔
منقول ہے کہ ابھی جناب قاسمؑ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ ایک مرتبہ امام مظلومؑ بے تاب ہو کر دوڑے اور پکار پکار کر کہنے لگے۔ اے جانِ عم ذرا دیر کے لیے ٹھہر جا کہ حسین ایک بار تجھے اور چھاتی سے لگا لے۔ جناب قاسم رُک گئے اور گھوڑے سے اُتر کر عرض کی چچا جان میں تو آپ کو رخصت کر آیا تھا۔ فرمایا بیٹا کیا کروں میرا دل کسی طور سے نہیں مانتا۔ بیٹا آ تجھے ایک بار مرحوم بھائی کی طرف سے پیار کر لوں۔ فرطِ محبت سے چھاتی سے لگایا۔ بوسے لئے اور بسم اللہ کہہ کر پھر گھوڑے پر سوار کر دیا۔
قاسم ہمہمہ کرتے ہوئے میدان میں آئے اور دلیرانہ انداز میں رجز پڑھا اور پھر دشمن سے مبارز طلب کیا ازرق شامی کا ایک بیٹا نکل کر آیا۔ جناب قاسم نے چند منٹ میں اسے داخلِ جہنم کیا اس کے بعد دوسرا بیٹا آیا آپ نے اسے بھی مار گرایا یہاں تک کہ اس کے چاروں بیٹوں کو آپ نے واصلِ جہنم کیا۔ اس کے بعد خود ازرق مارِ سیاہ کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہوا نکلا۔ جناب قاسم نے بہت جلد اس کا بھی کام تمام کیا۔ یہ حال دیکھ کر پسرِ سعد گھبرایا اور سرداران لشکر سے کہنے لگا۔ یہ بنی ہاشم کے شیر ہیں ان سے ایک ایک کر کے نہ لڑو بلکہ چاروں طرف سے گھیر کر ایک بار سب حملہ کر دو۔ چنانچہ سب نابکار سمٹ آئے۔ جناب قاسم کو جلال آگیا شیرِ غضب ناک کی طرح در آئے۔ اور وہ شجاعانہ جنگ کی کہ دشمن کے ہوش باختہ ہو گئے جناب عباسؑ حضرت علی اکبر اور امام مظلوم علیہ السلام ہر ہر وار پر نعرہ تحسین و آفرین بلند کر رہے تھے کتب مقاتل میں لکھا ہے کہ جناب قاسم نے بیالیس نابکاروں کو تہ تیغ کیا۔
آخر کہاں تک لڑتے دشمن کی فوج ہر طرف سے گھیرے ہوئے نیزہ و شمشیر خنجر و تیر کے وار پر وار کر رہی

تھی حضرت قاسم کا تمام بدن زخموں سے چور چور ہوگیا۔ جب گھوڑے پر نہ رُک سکے تو آواز دی۔ یا عم ادرکنی یہ صدا سنتے ہی امام مظلوم علیہ السلام کی نظر میں دنیا تیرہ و تار ہوگئی۔ حضرت عباسؑ و حضرت علی اکبر کو ہمراہ لے کر مقتل کی جانب روانہ ہوئے آہ! آہ!! حضرتؑ کے پہنچنے سے پہلے وہ جفا کار لاشہ قاسم کو پامال کر چکے تھے۔ حضرت نے اپنے اس پارہ جگر کو اس حال میں پایا فقطعوہ اربا اربا یعنی دشمنوں نے اس جسم نازک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ آہ یہ حال دیکھ کر امام مظلوم علیہ السلام پر کیا گزری ہوگی۔ بھتیجا بھی وہ بھتیجا جو شہید دجفا بھائی کی یادگار تھا۔ اس طرح کچلا ہوا اور خاک و خون میں بھرا ایسے دم پڑا تھا۔ بے اختیار حضرتؑ نے اس تن پاش پاش کو چھاتی سے لگا لیا اور رو رو کر فرمانے لگے۔

"بیٹا قاسم کاش اس سے پہلے تمہارے بیکس و ستم رسیدہ چچا کو موت آجاتی اور تم کو اس خراب حالت میں نہ دیکھتا۔ بیٹا! اس عالم غربت و یاس میں تم کو بھی جدا کرنا قسمت میں لکھا تھا۔ اے یادگار برادر اے میری گود کے پالے مظلوم حسینؑ کس منہ سے تیری دکھیا ماں کے پاس جائے اور کس زبان سے تیرے مرنے کی خبر اس غم کی ماری کو سنائے۔

آہ! آہ!! مومنین جب حضرتؑ نے چاہا کہ جناب قاسم کی لاش کو اٹھا کر خیمے میں لے جائیں تو وہ جسد اطہر کسی طرح اس قابل نہ تھا کہ خاک سے اٹھ سکے۔ ایک ایک عضو جدا ہو رہا تھا۔ جس طرح بنا امام مظلوم جناب عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ کی مدد سے اس جسم پاش پاش کو اٹھا کر خیمہ گاہ تک لے آئے۔

آہ! آہ! جب کچلی ہوئی لاش خیمہ میں آئی تو سیدانیوں کا غم سے برا حال ہوگیا۔ خدا کسی ماں کو بیٹے کی یہ حالت نہ دکھائے۔ خیام حسینی میں اس وقت عجب کہرام بپا تھا ہر طرف سے واقاسماہ! واقاسماہ کی صدائیں آرہی تھیں۔ اہل حرم کے نوحہ و شیون اور مادر قاسم کے دل خراش بین سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔ فلک ستائی ماں بار بار اس تن پاش پاش کو چھاتی سے لگاتی اور اپنے شہید پسر کا شانہ ہلا کر کہتی۔ بیٹا قاسم کیسی گہری نیند سو رہے ہو کہ دکھیا ماں پکارتی ہے اور نہیں چونکتے۔ آہ! میں کربلا میں لٹ گئی میرے ارمان خاک میں مل گئے آہ! میرے چاند تجھے کس کی نظر کھا گئی۔ کاش یہ دکھیا ماں تجھ سے پہلے مرجاتی۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ ھود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ

مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

پندرہویں مجلس

تفسیر آیۂ کُونُوا مَعَ الصّادِقین

اور

شہادت عون و محمد پسرانِ جنابِ زینبؑ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (۹/۱۱۹ توبہ)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

دنیا میں ہر شے ایک خاص شرف سے پہچانی جاتی ہے اگر کسی وجہ سے وہ خصوصیت جاتی رہے تو اس کے فضل و شرف میں بھی نقصان واقع ہو جاتا ہے۔ موتی اگر اپنی آب کھو بیٹھے تو دو کوڑی کا ہے۔ جواہرات سے آب جاتی رہے تو آبگینہ سے بدتر۔ پھولوں سے مہک اُڑ جائے تو پیروں سے مسل دینے کے قابل ہے اور اس کی تمام فضیلتیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ صداقت، اخلاقِ انسانی کی رُوح ہے جان نکلنے کے بعد جس طرح عزیز سے عزیز وجود خاک میں ملا دینے کے قابل بن جاتا ہے اسی طرح صداقت نکلنے کے بعد تمام اخلاق ایک جسمِ بے جان بن جاتے ہیں اور انسان کی وقعت نظر سے گر جاتی ہے۔

کتنا ہی بڑا حاکم کیوں نہ ہو اگر سچا نہ ہو تو اس کا وقار قائم نہیں رہ سکتا۔ کتنا ہی حاذق طبیب ہو اگر اس میں جوہرِ صداقت مفقود ہے تو اس کے سارے کمالات خاک ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ فطرتِ انسانی صداقت پسند ہے۔ اس لئے کہ انسانی ضمیر میں عنصرِ صداقت کا نمایاں حصہ ہے انسان تمام انسانی اپنی ظاہری اور باطنی قوتوں سے محروم ہو سکتا ہے۔ لیکن دل کی سچی آواز مرتے دم تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ زبان چاہے دن میں دو ہزار جھوٹ بولے مگر ضمیر کی آواز کبھی ایک بار بھی اس کی ہمنوا نہیں بنتی، ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ہم اس جسم میں جو عالمِ اصغر ہے دل خدا کا رسول اور اس کا پیغام بر ہے

اگر یہ جھوٹ بولے تو غضب آجائے ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

پھر اس کی پیغام رسانی پر دیگر اعضاء و جوارح کو کیوں کر اطمینان ہو سکتا ہے۔ دل اسرارِ الٰہیہ کا گھر ہے اور زبان اس کا دروازہ جو راز وہاں سے نکلتا ہے اسی زبان کے ذریعے نکلتا ہے۔ لیکن اگر زبان لسان صدق نہیں تو دل اپنی اور اپنی بات کی وقعت بھی کھو بیٹھتا ہے۔ کسی شہر کا دروازہ اگر ٹوٹا پھوٹا اور میلا کچیلا ہو تو دیکھنے والا شہر کی حالت کا قیاس اسی سے کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حق شناس دل اپنی زبان صداقت ترجمان دکھانے ہیں بلکہ خدا سے یہ دعا مانگا کرتے ہیں۔ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۸۴/۲۶ شعراء) اگر یہ آواز سچے دل سے نکلتی ہے۔ تو باب اجابت سے ٹکرا کر پردۂ غیب سے یہ آواز کھینچ لاتی ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ (۱۹/۵۰ مریم)

(ہم نے ان کے لئے سچی زبان علیؑ کو قرار دیا)

اسرار الٰہیہ بیان کرنے میں دل کی قائم مقام صحیح معنی میں زبان ہے بشرطیکہ وہ لسان صدق ہو لیکن کبھی کبھی دیگر اعضاء بھی اس خدمت کو انجام دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کا منصب نہیں ہوتا مثلاً ہاتھ اور انگلی سے اور چشم و ابرو سے اشارہ کر کے ترجمانی کر دیتے ہیں لیکن اشارہ فہم حضرات جانتے ہیں کہ یہ اشارے کافی نہیں ہوتے۔ پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔ صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا اسی لئے کبھی غلط مفہوم بھی دوسروں کے ذہن نشین ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کا کچھ سمجھ لیتا ہے۔ ہاں کچھ کہہ کر اشارہ کیا جائے تو بات میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہے۔ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ

آیت مذکورہ میں صادقین کے ساتھ ہونے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی تقویٰ اختیار کرنے کے بعد کیونکہ بغیر تقویٰ صادقین کی معیت ممکن نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک گروہ وہ ہے کہ جس کو صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جن کے ساتھ رہنے کا حکم ہے۔ نیز یہ کہ ہر زمانہ میں صادقین کا وجود ہونا چاہیے کیونکہ یہ حکم ہر زمانے کے مسلمانوں کے لئے ہے نہ کہ صرف عہد رسالت کے مسلمانوں کے لئے ہے لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صادق کو پہچانے ورنہ حکم الٰہی کی مخالفت ہوگی۔

تیسرے یہ کہ صادقین معصوم ہونے چاہئیں ورنہ ان کی معیت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

امام رازی نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ صادقین معصوم ہونے چاہئیں۔ لیکن وہ وجود صادقین کو علیحدہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ معصوم کا وجود ہر زمانے میں نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اس سے مُراد اجماع اُمت ہے۔ وہ جو کچھ کہے عام اُمّت کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کہنا غلط ہے اُمّت کا اجماع لازم عصمت نہیں، کیونکہ غیر معصوموں کا اجماع معصوم نہیں بن سکتا۔ کیسے ممکن ہے کہ جس گروہ کا ایک ایک فرد جاہل ہو وہ جمع ہونے کے بعد عالم ہو جائے اور دس اندھے مل کر سیانے ہو جائیں۔ رسولؐ نے تو ہر زمانے کے صادق کا نام تک بتا دیا ہے۔ کوئی نہ مانے یہ دوسری بات ہے۔ قرآن کے ساتھ اپنے اہل بیت کو اسی لئے چھوڑا گیا تھا کہ ہر زمانے میں ایک صادق موجود رہے۔ اور لوگ اس کے ساتھ رہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ صادقین سے مُراد وہ سچے ہیں جن کو ہم سچا کہتے ہیں یا وہ جن کو خدا سچا کہتا ہے اگر ہمارے کہے ہوئے سچے مُراد ہوں تو پھر ایک کیا ہزاروں صادق حسین، صادق علی اور صادقہ خاتون مل جائیں گے۔ بلکہ صدیق خان۔ صدیق محمد اور صدیقہ خاتون کی معیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب نام کے صادق، صدیق، صدیقہ، صادقہ ہوں گے۔ (آیت ترجمہ) اپنے منہ سے وہ باتیں کہہ دیتے ہیں جو اُن کے دل میں تک نہیں۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ (۱۶۷/۳ عمران)

کے مصداق ہوں گے۔ صداقت حقیقی ضمیر کی سچی آواز ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے۔

قرآن میں اہل صدق کو دو لفظوں سے یاد کیا گیا ہے۔ ایک صادق دوسرے صدیق۔ صادق وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾

(۲۳/۳۳ احزاب)

(بعض مومنین ایسے ہیں کہ انہوں نے خدا سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ پس ان میں سے بعض کی مدتِ حیات تو ختم ہو چکی اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تاکہ اللہ ان سچوں کو ان کی سچائی کا بدلہ دے)

اس سے معلوم ہوا کہ سچے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدائی عہد کو پورا کیا۔ پس خدائی عہد کیا ہے اس کا

شریک کسی کو قرار نہ دینا جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ ۳۶/۶۰ یٰسین

(اے بنی آدم کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔)

یہ تو ظاہر ہے کہ سب سے بہتر اس عہد کو پورا کرنے والے اہل بیت رسول ہیں۔ جنہوں نے آن واحد کے لئے بھی کسی بت کے سامنے اپنا سر نہیں جھکایا۔ اور شرک کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ پس ان سے بہتر سچا کون ہوسکتا ہے۔ ان میں سب تو مر چکے ایک آخری امام باقی رہے جس کو موت کا انتظار رہے اور لوگوں کو اس کا انتظار ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ فرماتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞ (۱۵) (۱۵/۴۹ الحجرات)

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور پھر انہوں نے شک نہیں کیا۔ اور انہوں نے راہِ خدا میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ پس یہی لوگ سچے ہیں۔

یہ تمام صفات چونکہ بدرجہ اولیٰ اہل بیت رسول میں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا تمام صادقوں کے وہ پیشوا ہوئے۔ پس بموجب حکم آیت مسلمانوں کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایک صادق میں عنداللہ جن صفات کو ہونا چاہیے وہ یہ ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى

الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ()

نیکی کچھ یہی تو نہیں کہ نماز میں اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ نیکی تو اس کے لئے ہے جو خدا اور روز قیامت اور فرشتوں اور خدا کی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور پردیسیوں اور مانگنے والوں اور لونڈی غلام کے آزاد کرانے میں صرف کرے اور پابندی سے نماز پڑھے اور زکوٰۃ دیتا رہے اور جب کوئی عہد کریں تو اپنے قول میں پورے ہوں اور فقر و فاقہ رنج و سختی اور گھٹن دقت میں ثابت قدم رہیں یہی وہ لوگ ہیں جو دعویٰ ایمان میں سچے ثابت ہوئے اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

۲/۱۷۷ بقرہ

سوائے اہلبیت رسول اصحاب رسول میں ایسا کون تھا جو اس لمبی چوڑی فہرست پر پوری طرح عمل کرنے والا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں مذکورہ بالا صفات رکھنے والے کو صادق کہتے ہیں۔

صدق انسانوں میں دو طرح سے پایا جاتا ہے۔ کلّی اور جزوی اگر وہ مذکورہ بالا آیت میں جزوی مراد ہو تو اس سے کوئی مسلمان خالی نہیں ہو سکتا۔ اگر بالفرض اس نے مدت العمر کوئی بھی سچ نہ بولا ہو گا تو کم از کم لا الٰہ الا اللّٰہ کا سچا کلمہ تو اپنی زبان پر جاری کیا ہی ہو گا۔ پس جب اس قسم کا سچ ہر شخص میں پایا جاتا ہے تو پھر یہ کہنا فضول ہو گا کہ سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ چونکہ یہ صورت باطل ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ صادقین سے مراد ایسے لوگ ہیں جنہوں نے من المہد الی اللحد کبھی جھوٹ بولا ہی نہ ہو۔ اور ایسے لوگ امّت محمدیہ میں سوائے ہمارے آئمہ معصومین علیہم السلام کے جن میں سے کسی نہ کسی کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے اور کوئی اس قابل ہو نہیں سکتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ از روئے قرآن صادق اور صدیق کون کون ہے ؟

۱۔ نوح علیہ السلام ۔ ۲۔ ابراہیم علیہ السلام ۔ ۳۔ موسیٰ علیہ السلام ۔ ۴۔ عیسیٰ علیہ السلام اور پانچویں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا ⑦ لِّیَسْـَٔلَ الصّٰدِقِیْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا ⑧ (۸/۳۳ احزاب)

(وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے پیغمبروں سے اور تم سے اور نوح و ابراہیم و موسیٰ اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے عہد و پیمان لیا اور ان لوگوں سے ہم نے سخت عہد لیا تھا تاکہ (قیامت کے دن) سچوں (پیغمبروں) سے ان کی سچائی (تبلیغ رسالت) کا حال دریافت کریں اور کافروں کے لئے تو عذاب علیم ہے ۔

جب ہم نے انبیاء سے میثاق لیا اور اے رسولؐ تم سے اور نوحؑ و ابراہیمؑ و موسیٰ و عیسیٰ سے عہد لیا اور ہم نے ان سے سخت پکا عہد لیا تاکہ صادقین سے ان کے صدق کے متعلق پوچھا جائے ۔

۲۔ حضرت اسماعیل

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۚ ۵۴ ‏ ۱۹/۵۴ مریم

(وہ سچا تھا)

۳۔ صدیق کا لفظ قرآن میں خاص خاص انبیاء کے لئے ہے ۔

۱۔ حضرت ادریس

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ ۟ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ۟ۙ ۵۶ (۱۹/۵۴ مریم)

(وہ سچا تھا)

۲۔ حضرت ابراہیم وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

(۱۹/۴۱ مریم)

۳۔ حضرت یوسف کے بارے میں يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ

۴۔ حضرت مریم کے لیے ہے۔ مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ

(۵/۷۵ المائدہ)

آیۂ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ

(۵۷/۱۹ الحدید)

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور صدیق و شہداء ہیں خدا کے نزدیک ان کے لئے اجر و نور ہے)

سیوطی نے اس آیت کے متعلق درمنثور میں یہ اقرار کیا ہے کہ اس آیت میں صدیقوں سے مراد حضرت علیؑ ہیں آیۂ مباہلہ نے اس کی توضیح کر دی ہے کہ صادقین کون ہیں محمد و آل محمد علیہم السلام کی صداقت ایک ممتاز صداقت ہے ان کی صداقت پر قرآن نے جا بجا گواہی دی ہے۔

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿٣٣﴾

(۳۹/۳۳ الزمر)

(جو صدق کو لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی ہے)

جس کے بعد کہ رسولؐ نے دعوائے نبوت کو پیش کیا سب سے پہلے جس نے اس سچے دعوے کی تصدیق کی وہ علیؑ ہیں یہی وہ لوگ ہیں کہ جو کام کرتے گئے۔ اس کی تعریف میں قرآن نازل ہوتا گیا تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کا عمل پہلے اور قرآن بعد میں۔

قرآن کو ان کی تصدیق کی اس درجہ احتیاج تھی کہ جب تک مولود کعبہ گواہ بن کر نہ آگیا وہ سینۂ رسولؐ سے اُبھر کر زبان پر آیا۔ صدیق کا مرتبہ نبی سے دوسرے درجہ پر ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۞ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۞ (۶۹/۴ نساء)

جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کو اللہ نے اپنی نعمتیں دی ہیں۔ یعنی انبیاء۔ صدیقین۔ شہدا اور صالحین اور یہ کیسے اچھے ساتھی ہوں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کے لئے کافی ہے۔

رازی نے لکھا ہے کہ نبی اگر ایک زینہ اُتر آئے تو صدیق بن جائے۔ اور صدیق اگر ایک زینہ اُبھر جائے تو نبی ہو جائے۔ خم غدیر میں رسول نے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچ دیا۔ خود ایک زینہ اُوپر تھے۔ اور علی علیہ السلام ایک زینہ نیچے۔

صدیق یعنی تصدیق کرنے والے کے لئے صادق ہونا ضروری ہے۔ لیکن صادق کے لیے صدیق ہونا ضروری نہیں۔ اگر تصدیق کاذب کی زبان سے ہو تو اس کی وقعت نہیں۔

کونوا مع الصادقین میں چودہ حروف ہیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ چودہ صادقین ہیں ہر زمانہ میں ان ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔

مقام صدیق معمولی مقام نہیں بلکہ اس کو مقام محمود سے تعبیر کیا گیا ہے یا یوں کہو کہ یہ مقام صدق سے حاصل ہوتا ہے۔

لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۞ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۞ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ

(۸۰-۷۹/۱۷ اسرائیل)

عنقریب تمہارا رب تم کو مقام محمود تک پہنچا دے گا اے رسول کہو پروردگار! مجھے صدق کے داخل ہونے کی جگہ میں داخل کر اور صدق کے نکلنے کی جگہ سے نکال اور اپنی طرف سے میرے لیے ایک سلطان نصیر قرار دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ۲۶/۸۴ (میرے لئے ایک سچی زبان آخر لوگوں میں قرار دے) اور حضرت رسول خدا نے سلطان نصیر مانگا۔ جناب ابراہیم کی دعا بھی قبول ہوئی اور حضرت رسول خدا کی بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جواب یوں ملا۔ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا (ہم نے علی کو ان کے لئے سچی زبان قرار دیا) اور رسول کی دعا کے پہلے حصے کا جواب یوں ملا۔ ۱۹/۵۰ مریم

الٓرٰ قف تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ قَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيۡنٌ ﴿۲﴾ (۱۰/۱-۲ یونس)

آلرا۔ یہ حروف مقطعات ہیں جن کا مفہوم رسولؐ اور آئمہ طاہرینؑ کے سوا دوسرا نہیں جانتا۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔ کیا لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ہم نے انہی میں سے ایک مرد پر اپنی وحی کی تاکہ وہ لوگوں کو ڈرائے اور جو ایمان لائے ہیں ان کو بشارت دے کہ ان کے لیے ان کے رب کی بارگاہ میں بلند مرتبہ ہے (اور) انہوں کو ٹن کی کافر لوگ کہنے لگے۔ یہ تو کھلا جادو ہے۔

یہ دعا ہمارے رسول کی انہا اپنے لیے نہ تھی بلکہ اور بھی شامل تھے۔ اگرچہ زبان پر نہ تھے مگر دل میں تھے (جواب میں لَهُمۡ (ان کے لئے) کہہ کر ثابت کر دیا گیا۔ عام مومنین اس سے مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ رسولؐ کے درجہ میں کہاں ہیں دوسرا حصہ دعا کا سلطاناً نصیراً مانگنا تھا اس کا جواب یوں آیا۔

وَمَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا فَقَدۡ جَعَلۡنَا لِوَلِيِّهٖ سُلۡطٰنًا فَلَا يُسۡرِفۡ فِّى الۡقَتۡلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنۡصُوۡرًا ﴿۳۳﴾

(۱۷/۳۳ بنی اسرائیل)

جو کوئی مظلوم قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کے لئے ایک سلطان نصیر کو قرار دیا)
تمام مفسرین شیعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مظلوم سے مراد حسین علیہ السلام اور سلطان نصیر سے مراد بارہویں امام علیہ السلام ہیں۔ انشاء اللہ ظہور کے بعد وہی خونِ ناحق حسین علیہ السلام کا بدلہ لیں گے۔
رسول کو دو باتوں کی تصدیق کی ضرورت تھی۔ ایک رسالت دوسرے کتاب اللہ۔ کسی امر کی تصدیق کے لیے چند باتوں کی ضرورت ہے۔ اوّل چیز کی تصدیق کر رہا ہو۔ اس سے کما حقہ واقف ہو۔
دوسرے اس کی تصدیق موثر ہو۔
تیسرے جس واقعہ کی تصدیق کر رہا ہو۔ اس کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو نہ کہ صرف کانوں سے سُنا ہو اگر کوئی شخص نبوت کا مصدق بن کر نکلے اور اس سے پوچھا جائے کہ جب آنحضرتؐ کو نبوت ملی تھی کیا تم اس وقت موجود تھے اور وہ کہے موجود تو نہ تھا صرف رسولؐ سے سُن کر گواہی دے رہا ہوں تو یہ شہادت سماعی ہوگی نہ کہ عینی۔ اور اس کا مرتبہ عینی شہادت سے کم ہوگا۔ علیؑ کے سوا آنحضرتؐ کی رسالت کا گواہ عینی صحابہ کی صف میں اور کون تھا چونکہ بمصداق حدیث انا و علی من نور واحد آپ عالم نور میں بھی نبیؐ کے ساتھ تھے۔ لہٰذا جب تاج نبوت آپ کے سر پر رکھا گیا تھا تو آپ دیکھ رہے تھے۔ پس جب عینی گواہ تھے تو آپ کی تصدیق سب سے زیادہ معتبر کیوں نہ ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک ایسا مصدق نہ آگیا رسولؐ نے نہ تو اعلانِ رسالت کیا اور نہ کتاب کو پیش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مباہلہ میں حضورؐ نے اپنے ساتھ صرف ان ہی کو لیا جو نبوت اور رسالت کے عینی گواہ تھے۔ اگر مسلمان آیہ کونوا مع الصادقین پر عمل کرتے اور صادقین کو چھوڑ کر کاذبین کے پیچھے نہ ہو جاتے تو ایک دین کے تہتر فرقے نہ ہو جاتے۔
سب سے بڑا صادق وہ ہے جس نے نہ کبھی کلمہ کفر زبان پر جاری کیا ہو نہ شرک کا قائل رہا ہو اور سب سے بڑا کذب یہ ہے کہ کفر و شرک میں رہ کر خدا کے علاوہ کسی اور کی الوہیت کا بھی اقرار کرتا رہا ہو۔ یا رسولؐ جو احکام خدا کی طرف سے لائے ہوں ان کا منکر ہو۔ کیونکہ رسولؐ جو کچھ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ سراسر صدق تھا پس جو اس کے خلاف کہے گا وہ یقیناً جھوٹ ہوگا۔ کیونکہ وہ خلاف واقعہ ہوگا۔
کربلا میں جو جنگ تھی وہ حق و باطل یا صدق و کذب ہی کی جنگ تو تھی۔ یزید نے کھلے لفظوں میں قرآن اور رسولؐ دونوں کی تکذیب کی اس کا یہ مشہور شعر ہے ؎

لَعِبَتْ بَنُوْ ھَاشِمٍ بِالْمُلْکِ فَلَا … مُلْکٌ جَاءَ وَلَا وَحْیٌ نَزَلَ

بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا تھا   نہ ان کے پاس کوئی فرشتہ آیا تھا نہ وحی

اس انکار کے مقابلے کے لیے رسالت کا عینی گواہ جو صادقین کا ایک فرد تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کو ثابت کرنا تھا کہ میرا مقابل وہ ہے جو بظاہر اپنے کو مسلمان کہتا ہے لیکن بباطن وہ حامی کفر و شرک ہے حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے ایک ایک عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ صادق ہیں اور ان کا دشمن دعوے اسلام میں جھوٹا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان صادقین کے ہمراہ جو صداقت کا بھولا ہوا سبق مسلمانوں کو یاد دلانے کے لئے اٹھے تھے انکا ساتھ دینے والے کتنے تھے۔ لاکھ دو لاکھ نہیں۔ ہزار دو ہزار نہیں۔ صرف بہتّر وعدے کے پکے ارادے کے پہاڑ۔ بات کے سچّے۔ ایمان کے پتلے۔ متقی۔ پرہیزگار، زاہد و ابرار، قائم اللیل۔ صائم النہار، قاری قرآن تقویٰ کی جان۔ صداقت کے قدردان۔ سعادت شعار۔ وفا کردار ان کو خدا کی وحدانیت۔ رسولؐ کی رسالت اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی امامت پر اس درجہ یقین کامل تھا کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کے ایمان و یقین کے قدم کو ذرہ برابر لغزش نہ ہوئی۔ ان کو پورا یقین تھا کہ ہم حق پر ہیں اور ہماری خدمات سرکار الٰہی میں مقبول ہوں گی۔ اس یقین میں بچّے، جوان اور بوڑھے برابر کے شریک تھے اور آیہ کونوا مع الصادقین کی تفسیر بنے ہوئے تھے۔

فطری قاعدہ یہ ہے کہ بچّے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ جوانوں میں تہوّر ہوتا ہے۔ جذبات میں ڈوب کر بے سوچے سمجھے سخت سے سخت مہلکوں میں اپنے آپ کو ڈال دیتے ہیں۔

عورتیں عموماً رقیق القلب ہوتی ہیں ذرا سی مصیبت میں گھبرا جاتی ہیں۔ غلام کی ذہنیت بہ نسبت آزاد کے پست ہوتی ہے۔ یگانے بیگانوں سے زیادہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ لیکن حسینؑ کی معیت نے ان کی ذہنی سطح کو ایسا ہموار بنایا کہ دنیا حیرت میں آ گئی۔ بوڑھوں میں جوانوں کا جوش تھا، جوانوں میں بوڑھوں کا سا تدبر، بچوں میں جوانوں کی سی ہمت، عورتوں میں مردوں جیسی شجاعت، غلاموں میں آزادوں کی سی اولوالعزمی۔

آج کی مجلس میں ان دو کم سن بچّوں کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ جن کی رگوں میں شجاعت اور علوی صولت اور ہیبت کا خون موجیں مار رہا تھا۔ جو باوجود کم سنی دشمن کے ٹڈی دَل فوج کو کچل دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ بیشہ شجاعت کے غضنفر جناب زینب سلام اللہ علیہا کے پارۂ جگر، علی مرتضیٰؑ شیر خدا کے نواسے، جناب جعفر طیارؓ کے پوتے اور امام حسین علیہ السلام کے پیارے بھانجے عون و محمد تھے۔

شرف شہادت حاصل کرنے کا وہ بے پناہ شوق۔ خاندانی شجاعت دکھلانے کا وہ طوفان خیز ولولہ، دشمن کے خون سے مقتل کی زمین کو لالہ زار بنانے کی وہ دلیرانہ امنگیں کہ صبح سے ہتھیار بدن پر سجے، مرنے پر کمر کسے ایسے

شاد شاد پھر رہے تھے گویا روز عید ہے۔ بار بار چھوٹا بھائی بڑے سے کہتا اب تو زندگی کا ایک ایک لحظہ ایک ایک برس معلوم ہو رہا ہے۔ جلد چل کے ماموں جان سے اجازت کارزار حاصل کیجئے۔ اور ان شقاوت کرداروں کو ان کی بے ادبی اور گستاخی کا مزہ چکھلیئے۔ جی میں آتا ہے کہ ابھی گھوڑا بڑھا کر ان بدبختوں پر جا پڑوں اور کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگا دوں۔ بڑا بھائی کہتا تھا میرا دل بھی یہی چاہتا ہے۔ لیکن ماموں جان ہم کو اجازت کارزار مرحمت فرمائیں گے نہیں۔ چونکہ ہم کم سن ہیں۔ ممکن ہے بڑوں کے مقابل ہماری یہ جرأت بے محل ثابت ہو اور ماموں جان ناراض ہو جائیں۔ ادھر جوں جوں تاخیر ہو رہی ہے اماں جان کی ناراضگی کا خوف بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ سن کر چھوٹے بھائی نے کہا۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے ماموں جان کی خدمت میں چل کر اپنا ارادہ ظاہر کریں کہ بڑے ماموں جان سے سفارش کر کے ہمیں اجازت کارزار دلوا دیں۔

چنانچہ دونوں بچے جناب عباسؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دست بستہ درخواست پیش کی جناب عباسؑ بچوں کے یہ حوصلے دیکھ کر رونے لگے اور چھاتی سے لگا کر فرمایا۔

اے میرے شیرو، اے بیشۂ شجاعت کے غضنفرو! شاباش صد آفرین تمہاری جرأت و ہمت پر بیشک جعفر طیار کے پوتوں اور حیدر کرار کے نواسوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میرے پیارو جلدی نہ کرو جب وقت آئے گا خود تم کو مولا کی خدمت میں پیش کر کے اجازت کارزار دلوا دوں گا۔

ابو جعفر و ہندی اپنے مقتل میں لکھتے ہیں کہ جناب زینبؑ کو بڑی کد اس کی تھی کہ جلد از جلد ان کے بیٹے درجۂ شہادت پر فائز ہو چکیں۔ جوں جوں تاخیر ہوتی جاتی جناب زینبؑ کے چہرے کا رنگ اڑتا جاتا تھا ظہر کے بعد ان کو تاب ضبط نہ رہی اور دونوں صاحبزادوں کو بلا کر ملال انگیز لہجے میں فرمانے لگیں۔ کیوں عون محمدؑ! میرے رات کے سمجھانے کا تم پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ہے ہے غیر تو ماموں پر سے جانیں قربان کر رہے ہیں اور تم بھانجے ہو کر ابھی تک بچے بچے پھرتے ہو آخر وہ وقت کب آئے گا کہ تم مرنے کے لئے نکلو گیا اس کا انتظار ہے کہ ماموں اپنا گلا زیر تیغ رکھ دیں تب نکلو گے ہے تم نے اپنے اور غیروں کے سامنے میری آنکھ نیچی کرادی۔

بچوں نے جوں ہی ماں کی یہ غضب انگیز تقریر سنی تو لرز گئے۔ ہاتھ جوڑ کر کپکپاتی آواز میں کہا اے مادر گرامی بخدا اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہمیں تو خود ایک ایک گھڑی شاق ہو رہی ہے۔ آپ چھوٹے ماموں جان سے دریافت کر لیں کہ ہم نے ان کی خدمت میں یہ تمنا ظاہر کی تھی یا نہیں ہم کو اپنی جان ماموں جان سے زیادہ عزیز نہیں لیکن اجازت نہ ملنے سے مجبور ہیں۔

یہ سن کر جناب زینبؑ کے چہرے پر آثار بشاشت نمایاں ہوئے۔ شفقت سے سروں پر ہاتھ پھیر کر فرمانے لگیں۔ شاباش! تم نے اس وقت میرے رنجیدہ دل کو شاد کر دیا۔ لیکن میرے پیارو تم اس خیال میں نہ رہو کہ ماموں تم کو خود بلا کر جنگ کی اجازت دیں گے ہے ہے کون ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں اور آنکھوں کے تاروں کو بخوشی تلواروں کے تلے رکھ دے۔ اگر سچے دل سے تم اپنے ماموں کے عاشق ہو تو ان کی خدمت میں حاضر ہو کر جس طرح بنے اجازت حاصل کرو۔

الغرض دونوں صاحبزادے ماں سے رخصت ہو کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگنے لگے۔ حضرتؑ کا دل بھر آیا اور دونوں کو چھاتی سے لگا کر فرمایا آہ! تمہارے یہ سن اس قابل نہیں کہ ان لاکھوں دشمنوں سے لڑنے کی اجازت دوں۔ آہ! تین دن کی بھوک پیاس سے تمہاری جانوں پر یونہی بنی ہوئی ہے۔ پھول سے چہرے کملائے ہوئے ہیں لاکھوں دشمنوں کا نرغہ ہے جو مجاہد جاتا ہے زندہ واپس نہیں آتا۔ ایسی حالت میں تمہیں کس دل سے دشمنوں سے لڑنے کے لئے اجازت کا رزار دوں۔

بچوں نے سر جھکا کر عرض کی کہ ہم موت سے نہیں ڈرتے۔ دین خدا کی حمایت میں لڑنا اور راہ خدا میں جان دینا ہمارے دادا اور نانا کے گھر کا آئین ہے۔ غلام عرض نہیں کر سکتے کہ صبح سے اب تک کا وقت کس بے چینی میں گزرا ہے۔ جس قدر جنگ کرنے میں تاخیر ہو رہی ہے اسی قدر ہماری والدہ گرامی کی پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔

بچوں کی یہ باتیں سن کر تاب ضبط نہ رہی امام مظلوم علیہ السلام دونوں کو ساتھ لئے جناب زینبؑ کے خیمے میں تشریف لائے اور رو کر فرمانے لگے۔ بہن! اب عون و محمد بھی ہم سے مرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ آہ! حسینؑ پر کیسا وقت آ پڑا ہے کہ اپنے اعزا و انصار کو نہ مرنے سے روک سکتا ہے نہ اجازت دیتے ان مصائب کو برداشت کرنے کے لئے کہاں سے دل لاؤں۔ صبح سے یہ وقت لاشے اٹھاتے اٹھاتے گزرا۔ اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو خاک پر ایڑیاں رگڑتے دیکھا۔ گردش چرخ سے اب وہ وقت بھی آ گیا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی مرنے کی اجازت مانگنے لگے اے بہن ایسی حالت میں زندگی کا کیا خاک مزہ ہے۔ اے بہن اجازت دو کہ اب میں میدان میں جا کر شمر کے خنجر سے اپنا گلا کٹوا دوں تاکہ میرے دشمنوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور پھر ان کو کسی کے قتل کی آرزو باقی نہ رہے۔

یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ تڑپ گئیں اور بھائی کے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگیں اور کہنے لگیں ماں جائے زینبؑ آپ پر سے قربان آپ غلاموں کے لئے اتنا کیوں آزردہ ہیں دو کیا اگر ہزار فرزند ایسے ہوں تو زینبؑ آپ پر قربان کر دے۔ بھیا میری دلی تمنا ہے کہ راہ خدا میں ان دونوں کو شہید دیکھوں ہائے کس ماں جائے تیری غربت

اور بے کسی پر بہن نثار۔ یہ وقت اولاد کو عزیز رکھنے کا نہیں۔ پنجتن پاک میں بس ایک دم آپ کا باقی ہے اگر خدانخواستہ آپ نہ ہوئے تو پھر فلک کی ستائی بہن کس کے سہارے جئے گی۔ بھیا میں آپ کو اپنے حقوق کی قسم دیتی ہوں کہ ان کو نہ روکئے۔ خدا علی اکبر کو سلامت رکھے۔ زینب کا کلیجہ ان کو دیکھ کر ٹھنڈا ہو گا۔

بہن کی یہ گفتگو سن کر امام مظلوم علیہ السلام خیمے سے باہر تشریف لائے اور عون و محمد کو اجازت کارزار عطا فرمائی دونوں صاحبزادے باغ باغ ہو گئے۔ بدن پر ہتھیار سجا کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور سلام آخر کر کے میدانِ جنگ کو روانہ ہو گئے۔ اگرچہ سن دونوں کے کم تھے۔ مگر جعفر کے پوتے اور علیؑ کے نواسے تھے اپنے شیرانہ رجز سے میدانِ کارزار کو ہلا دیا۔ چھوٹے چھوٹے نیچے لے کر دونوں اس طرح دشمن پر جا پڑے جس طرح بھوکا شیر ہرنوں کے غول پر جھپٹتا ہے دشمن سامنے سے بھاگتے جاتے تھے یہ ان کے غول میں گھستے جاتے تھے یہاں تک کہ پسر سعد کے خیمے تک جا پہنچے وہ خوفزدہ ہو کر پشتِ خیمہ سے نکل کر بھاگا اگر ذرا دیر اور رک جاتا تو ان بہادروں نے اس کا کام ہی تمام کر دیا ہوتا۔ اس نے خیمہ سے نکل کر اپنی فوج کو ڈانٹا کہ کیسے نامرد ہو کہ دو بچوں کو نہیں گھیر سکتے۔ ابو خالد ازدی پہلو میں کھڑا تھا اس نے کہا اے پسر سعد انہیں بچہ نہ سمجھنا۔ یہ جعفر کے پوتے اور علیؑ کے نواسے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ ذرا آگے بڑھ کر تو دیکھ کس طرح دونوں نے زمین خون سے لال کر دی اور میدانِ کربلا لاشوں سے پاٹ دی ہے۔

حضرت جعفر کے دونوں شیر دشمنوں کو خاک پر گراتے اور زورِ یداللہی دکھلاتے نہر کے کنارے پر جا پہنچے آہ! جب پیاسوں نے نہر کے پانی کو موجیں مارتے دیکھا تو بدن میں سنسنی پڑ گئی۔ چاہتے تو نہر میں داخل ہو کر پیاس بجھا سکتے تھے۔ لیکن سبحان اللہ کیسے وفادار اور حق شناس تھے کہ یہ کہہ کر ادھر سے منہ پھیر لیا۔ آہ خیموں میں چھوٹے چھوٹے بچے تو پیاس سے دم توڑ رہے ہیں اور ہم اپنی پیاس بجھانے لگیں ہرگز نہ ہو گا۔

لکھا ہے جب دونوں شیر فرات کی طرف سے لوٹ رہے تھے تو دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر کر وار پر وار شروع کر دیئے۔ زخمی تو تھے کہاں تک اس ٹڈی دل کا مقابلہ کرتے آخر جب زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑے سے گرنے لگے تو آواز دی۔

یا ابن رسولؐ اللہ ادرکنی یہ صدا سنتے ہی حضرتؑ مقتل کی طرف روانہ ہوئے آہ! آہ!! جب وہاں پہنچے تو دونوں کو خاک پر مردہ پایا۔ غم کی چھری کلیجہ پر چل گئی۔ دل سینے میں تڑپ گیا۔ دونوں کو خاک پر سے اٹھایا اور خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

جناب فضہ خیمہ کے دروازے سے یہ دیکھ رہی تھیں جوں ہی لاشوں کو آتے دیکھا سینہ کوٹتی زار زار روتی پیٹتی خیمہ میں آئیں اور جناب زینبؑ سے کہنے لگیں۔ بی بی! تم لٹ گئیں۔ تمہارے بچے کام آئے۔ فرزند رسولؐ دونوں

کی لاشیں لا رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ نے سجدۂ شکر ادا کیا۔

منقول ہے کہ جب خیمے میں لاشے لائے گئے تو ایک کہرام بپا ہو گیا۔ ہر طرف سینہ زنی اور نوحہ خوانی تھی۔ امام حسین علیہ السلام دکھیا بہن کو سینہ سے لگائے پُرسہ دے رہے تھے آہ! اس ماں کا دل کیا کہتا ہوگا جس کے دونوں بیٹوں کی لاشیں خاک و خون میں بھری سامنے رکھی ہوں گی۔ خدا کسی ماں کو یہ وقت نہ دکھائے۔

مقتل ابواسحٰق میں ہے کہ جب عون و محمد کے لاشے خیمے میں آئے تو جناب زینبؑ بے اختیار ان پر گر پڑیں اور پیار کر کے کہنے لگیں۔

زینبؑ! تمہاری ان خون بھری صورتوں پر نثار۔ تم نے میری لاج رکھ لی اور اماں کی روح سے شرمندہ نہ کیا بچو! اب میں تم سے خوش ہوں۔ آہ میرے پیارو! تم نے دنیا کی کچھ بہار نہ دیکھی ناشاد و نامراد چل بسے۔ اس کوکھ جلی ماں کے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ آہ! وہ آج سب خاک میں مل گئے۔ آہ! میں کربلا میں لٹ گئی۔

اے میرے شیرو! اے میرے بہادرو! اے میرے نازوں کے پالو! اٹھو۔ دکھیا ماں کے دل کو ڈھارس دو آہ! پھر ہاتھ جوڑ کر لرزتی آواز میں کہو۔ "اماں! ہم موت سے نہیں ڈرتے" آہ! میرا باغ اجڑ گیا۔ میرے ارمان خاک میں مل گئے ہیں تمہارے چاند سے چہروں پر سہرہ کی بہار نہ دیکھی۔ اللہ مجھے تمہارے غم میں صبر دے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

۲۲۷/۷۶

سولھویں مجلس

تفسیر آیۂ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ الخ

بیان اسلام و فطرت و شہادت حضرت عباس علیہ السلام

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

۹/۳۳ سورہ توبہ

یہ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ پھونکیں مار مار کر خدا کے نور کو بجھا دیں۔ لیکن خدا اس کے سوا کچھ مانتا ہی نہیں کہ اپنے نور کو پورا کر ہی دے۔ چاہے کفار کتنا ہی برا مانیں۔ اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ تمام ادیان پر اسے غالب کر دے چاہے مشرک کتنا ہی برا مانیں۔

دنیا کے ہر شخص کو اس پر غور کرنا ہے کہ انسان کو کسی دین کا پابند ہونا چاہیے یا نہیں۔ آج کل لوگ دین کے نام سے متنفر ہیں وہ کہتے ہیں۔ جتنا جھگڑا ہے وہ اسی مذہب کا ہے جب تک انسان کی گردن میں مذہب پرستی کا طوق پڑا ہوا ہے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ خیال سرعت کے ساتھ انسانی دل و دماغ میں جگہ پکڑتا جا رہا ہے اور اس بناء پر دین کا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے۔ جو لوگ دین کے دائرے سے باہر ہو گئے ہیں وہ بڑی قوت کے ساتھ اوروں کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں چونکہ ان کی قوت زیادہ ہے لہٰذا حامیان دین کو بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ خاص کر اس وجہ سے

کہ جو لوگ دین کے دائرہ میں بظاہر نظر آتے ہیں۔ ان کے دل بھی مخالفوں کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم مذہب کو عقل کی روشنی میں دیکھیں۔

انسانی فطرت کے کچھ مقتضیات ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے زندگی امن و امان سے گزر جاتی ہے ورنہ قسم قسم کے مفاسد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً انسانی فطرت ہے کہ اپنے محسن سے محبت رکھے۔ دشمن سے نفرت کرے۔ دغابازوں سے دُور رہے اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرے۔ ایک دوسرے سے مل جُل کر رہے اس لئے ضروری ہے کہ باہمی تعاون سے معاشرت اور تمدن کے کچھ قوانین ہوں۔ تاکہ ان ضرورتوں کو پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور طبائع کے اختلاف اور خواہشات نفسانی کے اغوا سے فتنہ و فساد کی صورت پیدا نہ ہو۔

یہی قوانین اگر بندے بنا دیں تو ملکی قوانین یا سماجی آئین کہلاتے ہیں اگر خدا بنا دے تو اس کو دین یا شریعت کہتے ہیں۔ پس جو لوگ دین سے جُدا رہنا چاہتے ہیں وہ دراصل کسی قانون کا پابند رہنا ہی نہیں چاہتے اور وہ اس کے حامی نہیں کہ بنی نوع انسان امن اور سلامتی سے زندگی بسر کرے۔ قانون سے آزاد تو صرف حیوان ہی ہو سکتا ہے۔ انسان تو کسی طرح آزاد ہو ہی نہیں سکتا۔

جھگڑے کا باعث دین نہیں کیونکہ اس کا کوئی قانون مبنی بر فساد نہیں بلکہ اہل دُنیا کی اندرونی خباثتیں اور شیطانی افعال ہیں جو دین کے پردے میں نمایاں ہوتے ہیں۔ افراد کی فتنہ پرور حرکات کا الزام مذہب کے سر تھوپنا قرینِ عقل نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب دین ان قواعد کا نام ہے جس سے انسان نیکوکاروں کی سی زندگی بسر کر سکے تو ان قواعد کا بنانے والا کون ہونا چاہیے۔ آیا یہ بہتر ہے کہ ہم بنالیں یا یہ کہ خدا بنائے۔ انسان چونکہ بالطبع خود غرض ہے۔ لہٰذا وہ کبھی بے لاگ قانون نہیں بنا سکتا۔ ہر بادشاہ جب کوئی قانون سلطنت بناتا ہے تو اپنے حقوق کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے اس صورت میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ آج تک دُنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں بنا جس میں تمام بنی نوع کے حقوق کا یکساں لحاظ رکھا گیا ایسا قانون تو وہی بنا سکتا ہے جو انسانی دائرے سے بالکل الگ سب سے بے نیاز اور قطعاً بے غرض ہو اور جو خود خالقِ کائنات ہونے کی وجہ سے تمام مقتضیات فطرت سے واقف ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا میں بے شمار ادیان پائے جاتے ہیں اور ہر دین والے اس کے دعوے دار ہیں کہ خدا کا دین پسندیدہ ہمارا دین ہے اور نجات اسی کے سایہ میں ہے اور دوسرے تمام ادیان باطل ہیں کل حزب بما لدیھم فرحون ایسی صورت میں یہ فیصلہ کیوں کر ہو کہ سچا دین کون ہے؟

ایک شخص اگر ایسے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے۔ جہاں سے ہر طرف کو بے شمار راستے جا رہے ہوں تو اس کے لئے بغیر بتائے ایک راستہ کا معین کرنا دشوار ہو گا۔ وہ کیونکر سمجھ سکتا ہے کہ کون سا راستہ سیدھا اور مختصر ہے اور کون سا ٹیڑھا اور طولانی یہ دشواری اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب ہر دین میں مختلف فرقوں کو دیکھا جاتا ہے۔ یہودیوں میں اکہتر۔ عیسائیوں میں بہتر اور مسلمانوں میں تہتر۔

کیا یہ سب صحیح راستہ پر ہیں ؟ کیا یہ سب منزل مقصود تک پہنچانے والے ہیں۔ ان کے درمیان اصول و فروع کا اختلاف ہرگز یہ نہیں بتاتا کہ یہ سب صحیح ہیں۔ تھیوسوفسٹ کہتے ہیں کہ ہر دین کو حق مانو ایک ہی منزل تک پہنچنے کے یہ مختلف راستے ہیں۔ لیکن کیا یہ خیال درست ہے اگر سب راستے منزل مقصود تک ہی پہنچا دیا کرتے تو مسافر گمراہ ہی نہ ہوتا۔ اگر بالفرض یہ سب راستے منزل تک پہنچا بھی دیں تو صرف ایک ہی ہوتا ہے کیونکہ دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط تو صرف ایک ہی نکل سکتا ہے اور وہی سب چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے آس پاس تمام خطوط ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ لمبے بھی کیا ایک عقل مند کا یہ فرض نہیں کہ وہ سب سے سیدھے اور مختصر راستے کو اختیار کرے۔ اگر ادیان میں اصولاً کوئی فرق نہ ہوتا تو وہ مختلف نہ ہوتے۔ اور اگر فرق ہے تو سب صحیح کیسے ہوئے۔

کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک دین والے کہیں خدا ایک ہے دوسرے کہیں خدا دو ہیں۔ تیسرے کہیں تین ہیں۔ بلکہ بعض ادیان والے کہیں تین سو ساٹھ ہیں۔ پھر عقلاً یہ سب صحیح راستہ پر کیونکر ہوں گے۔ مقصود کسی دین سے یہ ہے کہ عبد و معبود کے درمیان رشتہ قائم ہو اور بندے اپنے معبود کی معرفت حاصل کریں لیکن اس صورت میں معرفت کیسے ہو گی۔ جب کہ معبودوں کی تعداد میں اتنا اختلاف ہے۔

پس اس اختلافی صورت میں ایسے دین کا تعین ہونا چاہیے جو حق ہو اور جس کی راہ کو صراطِ مستقیم کہہ سکیں اور اس پر چل کر نجات حاصل ہو سکے۔ کھری اور کھوٹی چیزیں جہاں ملی ہوئی ہوں۔ وہاں پرکھنے کے لئے ایک معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا کھرا کھوٹا دین جانچنے کے لئے بھی ایک معیار ہونا چاہیے۔ اگر یہ معیار آسمانی کتابوں کو بنایا جائے تو کسی ایک کتاب کو تمام ادیان کیوں ماننے لگے۔ دوسرے اگر آسمانی کتابوں سے فیصلہ ممکن ہوتا تو اہل ادیان اور ان کے فرقوں میں اختلاف ہی کیوں ہوتا۔ کیونکہ آسمانی کتابوں کے الفاظ میں تاویلوں کی گنجائش ہوتی ہے لہذا ہر شخص اپنے خیال کے مطابق ایک مطلب نکال لیتا ہے۔

پھر کیا علماء کے اقوال کو معیار بنایا جائے۔ یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ علماء میں خود اختلاف ہے حقیقت یہ ہے کہ لوگ مذہب کے بارے میں بجائے عقل فطری کے عقل عادی سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۲۲ پ ۲۵ع ۱۴ زخرف ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی مذہب پر پایا ہے

پس ہم ان ہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں) اگر عقل سلیم سے کام لیں تو فطرت سے زیادہ صحیح کوئی دوسرا معیار نہیں فطرت ہر انسان میں مشترک ہے اور ایک ہی صورت سے ہے۔ پس اس معیار کے قبول کرنے میں کسی کو تامل نہ ہوگا۔ لہذا سچا دین وہ ہے جس کے احکام فطرت کے مطابق ہوں کیونکہ خدا کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اس کے تمام کام فطرت کے مطابق ہیں۔ پس جس دین کے اصول وفروع فطرت کی کسوٹی پر کھرے اُتر جائیں اور اصولِ فطرت کے مطابق ثابت ہوں۔ وہ سچا دین ہے باقی سب جھوٹے۔

اس وقت تک دُنیا میں جتنے ادیان ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی اپنے فطری ہونے کا دعویٰ نہیں کیا سوائے اسلام کے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ۳۰/۳۰ روم ــــــــ فطرت الہیہ وہ ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے خلق الہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوا کرتی بس یہی سچا دین ہے)

اس مضمون کو حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَلٰکِنْ اَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ وَیُنَصِّرَانِهٖ وَیُمَجِّسَانِهٖ۔

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی فطرت اس قابل ہوتی ہے کہ احکام اسلام کو برداشت کرے۔ لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں۔

یہودی ایک خاص مدت گزرنے کے بعد ایک خاص رسم کے تحت یہودیت میں داخل کرتے ہیں نصاریٰ بپتیسمہ دے کر نصرانی بناتے ہیں۔ ہندو جنیو پہنا کر، مجوسی ہنسلی اور سکھ کڑا پہنا کر اپنے دین میں داخل کرتے ہیں لیکن اسلام میں کوئی ایسا عمل نہیں ہوتا۔ اس کا بچہ پیدا ہی مسلمان ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہی جاتی ہے۔

حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ بچہ مسلمان ہی پیدا ہوتا ہے خواہ کسی کے گھر میں پیدا ہو کیونکہ فطرت اور اسلام کے آئین ایک ہی ہیں لہذا اسلام اپنے بچے کو مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کرتا البتہ جو لوگ اپنے دین سے خارج جانتے ہیں۔ وہ داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے بچے کو فطری اصول سے ہٹا کر غیر فطری احکام کا معتقد بناتے ہیں۔ دینِ اسلام کے فطری اور عقلی ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی شریعت کا تعلق انسان سے اس وقت سے ہوتا ہے جب اس کی عقل کامل ہو جائے۔ اور فطرت اپنے حدِ کمال کو پہنچ جائے اور وہ تقلیداً نہیں بلکہ عقلاً احکام الہیٰ کی علم سمجھنے کے قابل بن جائے اطفال اور مجانین کو اسی لئے مرفوع القلم سمجھا جاتا ہے کہ عقل کا سایہ ان پر نہیں ہوتا پس جہاں شریعت اسلام

ہے وہاں عقل ہے اور جہاں عقل ہے وہاں شریعت اس مضمون کو زبان معصوم نے یوں ادا کیا۔ کلما حکم به العقل حکم له الشرع وکلما حکم به الشرع حکم به العقل لیکن عقل سے مراد عقل عادی نہیں جو خارجی اثرات سے زنگ آلود ہو جاتی ہے بلکہ وہ عقل مراد ہے جس پر ماحول کا اثر نہ ہو۔ اور ہر بات کا بے لاگ فیصلہ کرے۔ صحیح عقل کی تعریف حدیث میں یہ کی گئی ہے العقل ما عبد به الرحمن واکتسب به الجنان۔ یعنی جس کے ذریعے سے عبادت خدا کی جائے اور جنت کو حاصل کیا جائے یعنی حکم خدا کی فرماں برداری ہو اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اس حدیث میں کہ جب خدا نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا اقبل فاقبل ثم قال له ادبر فادبر۔ (آگے آ۔ پس وہ آگے آگئی اور جب کہا پیچھے ہٹ تو پیچھے ہٹ گئی) چونکہ اسلام کے معنی بھی گردن بطاعت نہادن ہیں لہٰذا عقل اور اسلام ایک ہی چیز ہے۔ لہٰذا ہم مفہوم ہونے کی بناء پر ازل سے ان کا ساتھ ہے۔ پس جس نے اسلام قبول کر لیا اور عقل کو چھوڑا اس کا ایمان ضعیف اور جس نے عقل کو لیا اور اسلام کو چھوڑا وہ کافر اور ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ان میں سے ایک کسی حالت میں کافی نہیں جو نسبت قرآن اور اہل بیت علیہم السلام میں ہے وہی اسلام اور عقل میں ہے جس طرح اسلام کے محاسن بغیر عقل کے سمجھ میں نہیں آتے۔ اسی طرح مطالب قرآن بغیر اہل بیت علیہم السلام سمجھ میں نہیں آتے۔

ایک لطیف نکتہ قابلِ غور یہ ہے کہ اگرچہ بچہ کا تعلق اسلام سے روزِ ولادت ہی سے ہو جاتا ہے لیکن جب تک عقل عملی پیدا نہیں ہوتی شریعت جس کا تعلق عقل سے ہے بہ حیثیت وجوب اس سے متعلق نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں بلوغ تک اسلام پوشیدہ رہتا ہے لیکن بلوغ پر اعلان کا حکم بصورت وجوب ہو جاتا ہے کیونکہ عملی جدوجہد کا وقت آ جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ جب تک رسولؐ کو قوتِ عملی حاصل نہ ہوئی اعلان رسالت کا حکم نہ ہوا۔ علیؑ کے پیدا ہونے کے بعد چونکہ رسولؐ کا بازوئے عملاً قوی ہو گیا لہٰذا تبلیغ کا کام بھی شروع کر دیا گیا۔ جس طرح انسان کی عقل چودہ برس سے قبل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی اسی طرح جب تک اسلام کے رہنماؤں کی تعداد چودہ تک نہ پہنچ جائے شریعت کی تبلیغ مکمل نہیں ہوتی۔

عام بچوں میں چونکہ چودہ برس بعد عقل کامل ہوتی ہے اس لئے شریعت کا تعلق ان سے بعد بلوغ ہوتا ہے لیکن جو مجسّم عقل ہوں یا عالم امری کے بچے ہوں ان سے شریعت کا تعلق روزِ ولادت سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قول حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس پر شاہد ہے قال اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا (پ ۱۶) میں اللہ کا بندہ ہوں اس لئے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ ایسے لوگوں کی شہادت بچپن میں اس پایہ کی ہوتی ہے کہ بڈھوں کی گواہی بھی اس کے سامنے ہیچ ہو جاتی ہے یہ قانونِ شریعت

پڑھنے نہیں آتے بلکہ پڑھانے آتے ہیں۔

رسولؐ نے علیؑ کی طرح بعد ولادت قرآن کیوں نہ سنایا اگر رسولؐ سنا دیتے تو ایک بڑا شرف خاک میں مل جاتا قبل اعلان رسالت جو کچھ کرتے یا کہتے وہ اس بناء پر ہوتا کہ قرآن کی تعلیم تھی۔ اس صورت میں قرآن کا مرتبہ افضل ہو جاتا اور رسولؐ کا عمل قرآن کے پیچھے ہوتا اور اب رسولؐ کا عمل مقدم رہا اور قرآن اس کی تصدیق بعد میں کرتا ہوا آیا۔ یعنی رسولؐ کی انسانیت اس درجہ کمال پر تھی کہ قبل نزول وحی جو کچھ انہوں نے کیا اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ وحی اس پر ٹوکتی اور اس کے خلاف کرنے کا حکم دیتی بلکہ اس نے رسولؐ کے ہر ہر عمل کی تصدیق کی یہ آپ کے انسان کامل ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر رسولؐ بعد وقت ولادت قرآن سناتے تو کوئی تصدیق کرنے والا نہ ہوتا۔ برخلاف اس کے جب علیؑ نے قرآن سنایا تو آنحضرتؐ نے اس کی تصدیق کی۔ تیسرے اگر اس وقت قرآن سناتے تو شریعت ہوتی۔ مگر اس پر عمل نہ ہوتا اور قانونِ الٰہی کا معطل رہنا باعث توہین تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ چالیس برس رسولؐ نے جو عمل کیا اور اس کے بعد قرآن نے نازل ہو کر ہو بہو اس کی تصدیق کی تو یہ اس کی دلیل تھی کہ انسان کی صحیح فطرت اور قانونِ الٰہی دو جداگانہ چیزیں نہیں فطرت صحیح وہی کرتی ہے جو قانون الٰہی کہتا ہے محمد و آل محمد علیہم السلام نے یہ ثابت کر دیا کہ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اگر کوئی بچہ خارجی واقعات سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے تو قانون اسلام کے ہر ہر قدم پر اس کی فطرت ساتھ ہوگی اور اس بات کے ثبوت ہیں کہ فطرت صحیحہ کی زبان قانونِ اسلام ہے علیؑ کا بعد ولادت قرآن سُنا دینا تھا اب دیکھئے کہ نبیؐ و علیؑ نے کیا کام کیا۔ ایک نے عمل سے دکھایا۔ دوسرے نے زبان سے بتایا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ فطرت اللہ میں سیاست الٰہیہ کا علم بھی ہے اور عمل بھی انا و علی من نور واحد کی حدیث نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ قدرت نے ایک نور کے دو حصے کر کے ایک حصہ سے ایک بات کا ثبوت دیا اور دوسرے سے دوسری بات کا۔ ان میں سے ہر حصے میں علم و عمل بننے کی قوت ہے۔ کبھی ان سے قوت علمی کا مظاہرہ ہے اور کبھی قوت عملی کا۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ دینِ اسلام کیونکر فطری اصول پر قائم ہے اور اس کے مقابل دیگر ادیان کہاں تک اس معیار پر کھرے اُترتے ہیں اسلام میں اصول دین تین ہیں اور ہمارے مذہب میں پانچ ہیں پہلے ان ہی کو جانچئے۔ انسان چونکہ تمام مخلوقات میں اشرف و افضل ہے۔ لہٰذا ہم اسی کی فطرت کو معیار قرار دیتے ہیں۔

انسان نام ہے چند اعضاء و جوارح کا جو ایک روح کے ماتحت اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے

ہیں۔ صفات کے اعتبار سے چاہے کتنے ہی نام ہوں لیکن حقیقتاً روح ایک ہی ہے جو تمام بدن کی مدبر ہے ہمیں نام سے بحث نہیں چاہے اطبا حرارت غریزی کہیں یا حکما و فلاسفہ نفس ناطقہ بولیں یا ڈاکٹر ہیٹ سے تعبیر کریں۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس جسم کی منتظم ایک ایسی لطیف اور غیر محسوس شے ہے جو بدن سے اپنی خصوصیات میں بالکل جُداگانہ ہے۔ اطبا کہتے ہیں جب خارجی حرارت، حرارت غریزی سے مل کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر کہتے ہیں اندرونی الیکٹریسٹی پر جب بیرونی الیکٹریسٹی کا زور پڑتا ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منتظم بدن اگر ایک سے دو ہو جائیں تو تنازع و فساد جسم یقینی ہے۔ یہیں سے اسلام کا مسلمہ مسئلہ نکلا کہ تمام عالم کا خالق ایک ہے اگر دو ہوں تو عمل میں فساد واقع ہو جائے۔ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (پ۱۷، انبیاء) اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو یہ دونوں نسٹ کر رہ جاتے۔ پس جو ادیان کئی کئی خداؤں کے قائل ہیں وہ یقیناً فطرت کے خلاف ہیں اسی لیے وہ عقلاً باطل پر ہیں خواہ وہ دو کہنے والے مجوسی ہوں یا تین کہنے والے نصاریٰ یا بہ کثرت ماننے والے ہندو و ستارہ پرست ہوں۔

توحید کا مسئلہ ایسا فطری مسئلہ تھا کہ اسلام کے اعلان کے بعد دیگر ادیان کو اپنی کثرت پرستی پر شرم آنے لگی اور ان کو مجبور ہونا پڑا کہ تاویلات رکیکہ سے اس مسئلے کو اپنے اصول میں شامل کر لیں۔ چنانچہ نصاریٰ نے توحید فی التثلیث و تثلیث فی التوحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ ہندوؤں نے نرنکار کہہ کر اپنی جان بچائی۔ اسی طرح دیگر ادیان نے کھینچ تان کر توحید پرستی کا اعلان شروع کیا۔ لیکن اسلام جیسی کھری اور چوکھی توحید کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ بظاہر توحید پرست بن گئے مگر صفاتِ الٰہی وہی باقی رہیں جو توحید سے کوسوں دُور تھیں۔

ہم نے رُوح کے متعلق بیان کیا کہ وہ موجود ہے مگر دکھائی نہیں دیتی نہ اب نہ کسی اور وقت وہ موجود ہے مگر جسم میں حلول کئے ہوئے نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور کہیں بھی نہیں، رگ گردن سے قریب اور کوسوں دُور، وہ جسم کی طرح فانی نہیں بلکہ باقی ہے اسی فطری اصول پر اسلام نے خُدا کی یہ صفات بیان کیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور کسی شے میں حلول کیے ہوئے نہیں پس جو ادیان حلول کے قائل ہیں جسم کو مانتے ہیں خدا کو قابل رویت جانتے ہیں وہ کہاں فطری اصول پر باقی ہیں۔ یہود کہتے ہیں کہ خدا عزیرؑ کے اندر تھا نصاریٰ کہتے ہیں عیسیٰؑ میں حلول کئے ہوئے تھا۔ ہنود کہتے ہیں کرشن میں جلوہ نما تھا اب فرمائیے یہ کیوں کر فطری اصول پر قائم ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ ایسی ذات کو کیوں خدا مانتے ہیں جس کو آنکھوں سے

دیکھا ہی نہیں فرمایا اسی لئے تو اسے خدا مانتا ہوں کہ وہ دکھائی نہیں دیتا اگر وہ دکھائی دے جاتا تو پھر خدا کہنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔

اب اصول دین کی دوسری اصل عدل کو لیجئے روح بدن انسان کا ایک ایسا عادل حکمران ہے کہ سر سے پیر تک ایک ایک عضو کی یکساں خبر رکھتا ہے اور ہر عضو کی ضرورت کو اپنے قائم مقام قلب کے ذریعے سے مہیا کرتا ہے۔ آنکھوں کی روشنی۔ ناک کو رطوبت زبان کو لعاب، رگوں کو خون اور ہڈیوں کو مغز جگر کو گرمی اور پھیپھڑوں کو ہوا دیتا ہے۔ اس کی نظر میں سر سے لے کر ناخن پا تک سب اعضا برابر ہیں سب کی روشنی رسانی اس نے اپنے ذمّے لی ہے۔ سوتے جاگتے وہ سب کی حفاظت کرتا ہے۔ سونے میں ذرا بدن پر مچھر بیٹھا اور ہاتھ وہیں پہنچا اس پر نظر رکھتے ہوئے اسلام نے عدلِ باری کو اصول دین میں دوسرے نمبر پر رکھا۔ پس جن مذاہب میں عدل الٰہی کو داخلِ اصول نہیں سمجھا گیا وہ قانونِ فطرت سے ہٹے ہوئے ہیں۔

رہی تیسری اصل نبوت تو وہ بھی فطری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ روح کے احکام براہِ راست اعضا تک نہیں آتے بلکہ پہلے دل پر نازل ہوتے ہیں۔ پھر دل سے دماغ کی طرف پہنچتے ہیں۔ اور دماغ دیگر اعضاء تک طرف بھیجتا ہے پس دل بدن میں بمنزل بادشاہ ہے اور دماغ بمنزل وزیر دل کا کام روح کے احکام لینا ہے۔ اور دماغ کا کام سلطنت میں عمل کرانا۔ عمل صحیح کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے اگر دماغ کا کام صحیح نہ رہے تو افعال انسانی مجنونانہ حرکات بن کر رہ جاتے ہیں۔ کمال بدن اسی وزیر کی قابلیت پر منحصر ہے وزیر جس قدر زیورِ علم وفہم سے آراستہ ہوگا اتنے ہی فضائل زیادہ حاصل ہوں گے جس طرح دل کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا بغیر دماغ کے بھی نہیں رہ سکتا۔ اعضاء اور حواس کا تعلق دماغ ہی سے ہے اگر یہ ٹھیک نہیں تو کچھ بھی نہیں دماغ نام ہے بارہ قوتوں کا (۱) باصرہ (۲) سامعہ (۳) ذائقہ (۴) شامہ (۵) لامسہ (۶) حس مشترک (۷) حافظہ (۸) عنبرہ (۹) متخیلہ (۱۰) مفکرہ (۱۱) عاقلہ (۱۲) ممثلہ اگر ان سے ایک بھی کم ہو تو دماغ اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔

دماغ اور دل کا اتنی قریبی تعلق ہے کہ یہ تمیز کرنی دشوار ہو جاتی ہے کہ یہ بات دل سے نکل کر آئی ہے یا دماغ سے پس جو ادیان و مذاہب رسالت و امامت کو نہیں مانتے وہ یقیناً عمل نطرت سے ہٹے ہوئے ہیں اسلام نے اسی فطری قاعدے پر عمل کرتے ہوئے رسالت و امامت کو اصول دین میں داخل کیا ہے کیونکہ بغیر ان کے خدائی احکام بندوں تک نہیں پہنچ سکتے۔

اب رہا قیامت کا فطری ہونا تو ہر شخص فطرتاً یہ چاہتا ہے کہ ظالم کو اس کے ظلم کا اور نکوکار کو اس کی نیکی کا بدلہ ملے۔ اگر کسی مظلوم کی داد رسی نہیں ہوتی تو اس کا دل کیسا تڑپتا ہے۔ خدا اگر عمل بد کی سزا اور نیکوں کو

عمل خیر کی جزا نہ دے۔ تو یقیناً ظلم ہوگا۔ دنیا جزاء سزا کا گھر نہیں بلکہ دار امتحان اور دار عمل ہے پس ضروری ہے کہ ایک دن جزا وسزا کا ایسا ہو کہ ہر دفعے کے تمام گواہ حاضر ہو جائیں۔

اصول دین کی طرح اسلام کے تمام فروع دین بھی فطری ہیں۔ اگر مجلس کے طوفانی ہونے کا خوف نہ ہوتا تو ایک ایک فروع کا بھی اسی طرح فطری ہونا بیان کیا جاتا۔

رسول کے بعد ہر زمانہ میں ایک امام معصوم منصوص من اللہ کا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو خدا اور رسول کے احکام کا صحیح مطلب سمجھائے۔ اور ہر ایک عمل کی صحیح تعلیم دے۔ نیز یہ کہ اگر امت نے اپنی طرف سے کچھ باتیں داخل دین کرلی ہوں یا کوئی عمل اصولِ فطرت سے ہٹا ہوا اختیار کر لیا ہو تو وہ بلا خوف لومۃ لائم اس کو ظاہر کردے اور اس کے درست کرنے میں انتہائی جدوجہد کرے۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اسلام پر سب سے بڑی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس کے مروج و محافظ ایسے لوگ بن بیٹھے جن کو خدا اور رسولؐ نے ہدایت کا ذمہ دار نہیں بنایا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریعت محمدیہ کے احکام تبدیل بھی ہوئے اور ان باتوں کا اضافہ بھی ہوا جو عقل و فطرت دونوں کے خلاف تھیں یہی وجہ تھی کہ بہت سی حلال چیزیں حرام ہوگئیں اور بہت سے حرام حلال بہت سے اوامر نواہی میں داخل ہوگئے اور بہت سے نواہی اوامر میں۔ ہمارے آئمہؑ نے اپنے اپنے زمانے میں ان فتنوں کی روک تھام اور اسلام کی اصلی صورت باقی رکھنے میں انتہائی جدوجہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ جان و مال و آبرو ہر شے کو اس کی راہ میں قربان کردیا ان کی زندگی کا مقصد یہی یہ تھا کہ خدا و رسولؐ کی حقیقی تعلیم کو بندگانِ خدا کے سامنے پیش کردیں اور ان کو گمراہی سے بچالیں۔

یہی ضرورت تھی جس نے کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین علیہ السلام کو وہ عظیم الشان قربانی پیش کرنے پر مجبور کیا جس کی نظیر تاریخ عالم میں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ بنی امیہ جن کا راس و رئیس یزید بن معاویہ تھا۔ اسلامی نقاب منہ پر ڈالے در پردہ احکام شرعیہ کو تباہ و برباد کر رہا تھا۔ بنی امیہ اسلام کے دوست نما دشمن تھے۔ حالتِ کفر میں بنی ہاشم کے ہاتھوں جو ذلتیں ان کو اٹھانا پڑی تھیں ان کی وجہ سے آتشِ انتقام ان کے سینوں میں بھڑک رہی تھی۔ وہ مسلمان ہی اس وجہ سے ہوئے تھے کہ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلیں گے۔

امام حسین علیہ السلام کی گراں قدر قربانی کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس نقاب کو الٹ کر ان کی بد اعمالیوں کے بدنما چہرے دنیا کو دکھا دیں اور مظلومیت کی مختلف صورتیں اختیار کر کے ابنائے روزگار کو یہ بتادیں کہ ان کو اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ امام مظلوم علیہ السلام نے طاقت کا مقابلہ طاقت سے نہیں کیا بلکہ مظلومیت

سے کیا۔ کیونکہ طاقت کا مقابلہ کرنے میں صرف افراد کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا نہ کہ اس باطل مذہب کا جو اسلام کو تباہ برباد کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ دوسرے اگر طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جاتا تو دنیا کی فراموش شدہ داستانوں میں ایک داستان بن کر یہ بھی رہ جاتی۔ دنیا میں ہمیشہ بادشاہوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کون پوچھتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے۔ کون تحقیق کرتا ہے کہ حق پر کون تھا لیکن مظلومیت ایک ایسی چیز ہے کہ انسانی ہمدردی خود اس کی طرف کھینچتی اور لوگوں کو واقعات کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ حق و باطل کے معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ پس امام علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو مجھ سے ہمدردی اور میرے واقعات سے دلچسپی پیدا ہو تاکہ وہ واقعات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حسین علیہ السلام کی مظلومیت کے ہاتھوں یزید نہ صرف اہل روزگار کی نظروں میں ذلیل ہوا بلکہ ہمیشہ کے لیے اس کے ناپاک مشن کا خاتمہ ہو گیا اور اسلام اس کی زد سے قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گیا۔ یزید کے مقابل حسین علیہ السلام کو وہ شاندار کامیابی ہوئی جس کی نظیر نہیں ملتی۔

اسی لئے یہ اقوام کا حتمی فیصلہ ہے کہ یزید کو معرکہ کربلا میں شکست فاش ہوئی اور اس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ اس کو اپنے اس فعل شنیع پر ندامت ہوئی۔ اور اس نے اپنا گناہ ابن زیاد کے سر دھرا۔

حسین علیہ السلام کے طرف داروں اور خاندان والوں میں سے کسی نے بھی آن واحد کے لیے ندامت کا اظہار نہیں کیا۔ شکست کے بعد خود انسان کی نظر نیچی ہو جاتی ہے اور وہ ان واقعات کے ذکر سے گھبرانے لگتا ہے۔ یہ علامت بھی یزیدیوں میں پائی گئی۔ جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام یزید نہیں رکھتے بحمد للہ حسین علیہ السلام کا ذکر آج تک فخر و مباہات کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان کے مقدس نام پر لوگ جان دیتے ہیں۔

حسین علیہ السلام کی حق پرستی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ عین جنگ کے موقعہ پر جب لوگوں میں غیر ضروری تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور ننگ و نام کا خبط دشمن کی اچھی سے اچھی بات کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ فوج یزید سے ایک شخص ٹوٹ کر حسین علیہ السلام کی طرف آ جاتا ہے اور اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ لیکن حسین مظلوم کے بھوکے پیاسے وطن آوارہ ساتھیوں میں سے کسی ایک نے بھی یہ ناپاک ارادہ اپنے دل میں نہ کیا کہ مجھے یزید کی طرف جانا ہے۔

حسین علیہ السلام کی حق پرستی کا ایک بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ کی فوج میں اس زمانے کے بہتر بن فضلا، علماء عباد و زہاد و حفاظ قراء اصحاب و تابعین اور پاکیزہ فضائل دین دار موجود تھے۔ یہی نہیں کہ فوج کوفہ و شام میں گھر جانے کی وجہ سے مجبوراً لڑ رہے تھے نہیں بلکہ انتہائی جوش اور شوق کے ساتھ انہوں نے

جنگ میں حصہ لیا۔

زہیر بن القین کے حالات میں ہے کہ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ شمر نے جناب عباس علیہ السلام سے شب عاشور تنہائی میں گفتگو کی ہے تو ان کو خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جناب عباسؑ اس شقی کے اغوا سے اس طرف کھینچ جائیں پس شب عاشور نصف شب گزرنے کے بعد جناب زہیر اپنے خیمہ سے نکلے اور گھوڑے پر سوار ہو کر جناب عباسؑ کے خیمے کے سامنے آئے اور آواز دی۔

اے ابوالفضل العباسؑ ذرا خیمہ سے باہر تشریف لائیے اور وہ باہر تشریف لائے اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جناب زہیر کے ساتھ چلے۔ جب خیمہ گاہ سے کچھ دور نکل گئے تو جناب زہیر نے گھوڑے کو روک کر کہا۔

اے ابوالفضل العباسؑ میں آپ کو ایک واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جب شہزادی عالم جناب فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا کا انتقال ہوا تو جناب امیر علیہ السلام کسی طرح دوسری شادی پر آمادہ نہ تھے جب لوگوں نے زور دیا تو آپ نے فرمایا۔ اچھا کسی بہادر، شریف اور غیرت دار قبیلے کی عورت تلاش کرو۔ تاکہ اس سے جو لڑکا پیدا ہو وہ روزِ عاشور میرے حسینؑ پر جان قربان کرے۔

مومنین یہ سننا تھا کہ جناب عباس علیہ السلام نے جوشِ شجاعت میں ایک ایسی انگڑائی لی کہ رکابوں کے تسمے ٹوٹ گئے اور فرمانے لگے سبحان اللہ! اے زہیر! تم مجھے جوشِ شجاعت دلانے آئے ہو اے زہیر یہ کیسے ممکن ہے کہ تم تو فرزندِ رسول کے ساتھ اتنی محبت و ہمدردی رکھو اور میں ان کا بھائی ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دوں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اے زہیر لعنت ہے ایسی زندگی پر جو حسینؑ سے جدا ہو کر دنیا میں بسر کی جائے۔ جناب زہیر یہ سن کر پشیمان ہو گئے۔ اور فرمانے لگے اور اے ابوالفضل العباسؑ میری اس گستاخی کو معاف فرمائیے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے محبتِ حسین علیہ السلام میں کہا ہے۔ مرحبا آپ کی وفاداری اور جاں نثاری پر۔

مومنین جناب عباس علیہ السلام سے وفادار بھائی دنیا میں کہاں ملتے ہیں۔ آپ کے دم سے امام مظلوم اور مخدراتِ عصمت و طہارت کو بڑی ڈھارس تھی۔ جب کوئی اہم معاملہ آپڑتا تو جناب عباس علیہ السلام کے سپرد کر دیا جاتا۔

جناب عباس علیہ السلام جن کا سنِ مبارک بتیس یا تینتیس سال کا تھا۔ نہایت وجیہہ اور خوبصورت جوان تھے۔ اسی وجہ سے قمر بنی ہاشم کہلاتے تھے۔ فنِ حرب و ضرب میں کوئی آپ کا مثل و نظیر نہیں تھا۔ آپ نے یہ سب کمالات اپنے پدرِ بزرگوار جناب امیر علیہ السلام سے حاصل کیے تھے۔ کربلا میں لشکرِ حسینی کے تمام

ہاشمی جوان فنِ سپہ گری میں آپ کے شاگرد تھے۔

آپ کی غیر معمولی شجاعت اور خدا داد زور و طاقت پر اتنا بھروسہ تھا کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ جب میں اپنے گھر میں مقتلِ حسین کا تذکرہ سنتی تھی تو دل میں کہا کرتی تھی کہ جس حسینؑ کا بھیا عباسؑ جیسا شیر ہو کس کی طاقت ہے کہ اس کو قتل کر ڈالے۔ جس بہن کا عباسؑ جیسا بھائی ہو کس کی ہمت ہوگی کہ اس کے سر سے چادر چھین لے۔ لیکن آہ! آہ!! روزِ عاشورہ جب میرا شیر سا بھائی نہر فرات کے کنارے شہید کر ڈالا گیا تو اس وقت مجھے ان سب باتوں کا یقین ہو گیا۔

جناب عباسؑ امام مظلوم علیہ السلام کی مختصر فوج کے علم بردار بھی تھے اور اہلِ حرم کے سقّہ بھی۔

منقول ہے کہ ساتویں محرم کو جب پسرِ سعد کے حکم سے نہر فرات پر فوج کے پہرے بیٹھ گئے اور لشکر حسین مظلوم میں پانی جانے کی سخت ممانعت ہوگئی تو چھوٹے چھوٹے بچے پیاس سے تڑپنے لگے۔ جناب سکینہ سے جناب عباس علیہ السلام کو بہت اُنس تھا وہ نڈھال پڑی تھیں۔ جناب عباسؑ سے بچوں کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ چند بہادروں کے ساتھ نہر کی طرف چلے۔ جناب سکینہ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت عباسؑ پانی لینے جا رہے ہیں تو اپنا چھوٹا سا سوکھا ہوا مشکیزہ لے کر دوڑیں۔

کربلا میں خیمہ گاہ سے کچھ دور وہ مقام اب تک موجود ہے جہاں اس پیاسی بچی نے اپنا مشکیزہ جناب عباس علیہ السلام کے سپرد کیا تھا۔ اور رو رو کر کہا تھا: چچا جان شدّتِ تشنگی سے میرا کلیجہ کباب ہو رہا ہے جس طرح ممکن ہو میری پیاس بجھائیے۔

جناب عباس علیہ السلام نے فرمایا! بیٹی سکینہ تم خیمے میں جاؤ میں پانی لاتا ہوں۔ چنانچہ آپ گئے اور جس طرح بنا پانی لاکر بچوں کو سیراب کیا۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب سقائے سکینہ یا سقائے اہلِ حرم ہوا۔ یہ واقعہ ساتویں محرّم کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب عباس نے اس بارے میں بڑی کد کی کہ کسی طرح پیاسوں تک پانی پہنچ جائے معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ اور نو محرّم کو جو متعدد کنوئیں لشکر گاہ حسین علیہ السلام میں کھودے گئے اس کے محرک جناب عباس ہی تھے۔ آپ نے سب سے زیادہ کھدائی میں حصہ لیا۔ آج تک کربلا میں خیمہ گاہ حسینی کے اندر اس کنوئیں کا نشان موجود ہے جو وہاں کھودا گیا تھا۔

مگر آہ پیاسوں کی قسمت میں جو پانی پینا نہ تھا تو کسی جگہ سے پانی نہ نکلا۔

روزِ عاشورہ بھی جناب عباس علیہ السلام نے بہت سی خدمات انجام دیں۔ ان میں ایک خدمت یہ بھی تھی کہ جب میدانِ جنگ میں کوئی ناصر کام آتا تھا اور امام حسین علیہ السلام اس کی لاش پر جاتے تھے تو

جناب عباسؑ آپ کے ساتھ جاتے تھے۔ اور لاش شہداء کے اٹھانے میں مدد دیتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وفاداری جناب عباس علیہ السلام پر ختم ہوگئی۔ شب عاشور دو واقعات سے آپ کی وفاداری کا حال معلوم ہوگا۔ آپ کا ننھیال اسی قبیلہ میں تھا جس کا ایک فرد شمر تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کربلا میں حسین علیہ السلام کے ساتھ جناب عباسؑ اور ان کے بھائی بھی آئے ہیں تو اس نے پسر سعد سے کہا کہ لشکر حسینیؑ میں میرے بھانجے عباس وغیرہ بھی شامل ہیں اگر تو پناہ دینے کا وعدہ کرے تو میں سمجھا بجھا کر لے آؤں۔ وہ شقی راضی ہوگیا۔ چنانچہ شمر چند اشقیا کے ہمراہ خیمہ گاہ حسینی کی طرف آیا اور پکار کر کہنے لگا۔

"کہاں ہیں میرے بھانجے عباسؑ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں" جناب بریر ہمدانی پہرے پر تھے انہوں نے کسی کو بھیج کر اطلاع کرائی۔ جناب عباس علیہ السلام نے جواباً فرمایا۔ میرا اس شقی سے کیا تعلق ہے۔ میں نہیں ملنا چاہتا۔ جب امام حسین علیہ السلام کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بھیا عباس جاکر معلوم تو کرو شقی کہتا کیا ہے۔ چنانچہ حضرت امامؑ کے حکم کے بموجب آپ شمر کے پاس تشریف لائے اور فرمایا بتا کیا کہنا چاہتا ہے۔؟

اس نے کہا اے عباسؑ اپنی جوانی پر رحم کرو اور جلد از جلد لشکر حسینی سے باہر نکل آؤ۔ میں نے تمہارے اور تمہارے بھائیوں کے لئے ابن زیاد اور پسر سعد سے پروانۂ امان حاصل کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی جناب عباسؑ غصے سے تھر تھر کانپنے لگے اور ڈانٹ کر فرمایا۔

تَبَّتْ يَدَاكَ وَلُعِنَ مَا جِئْتَ بِهِ مِنْ أَمَانِكَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ أَتَأْمُرُنَا أَنْ نَتْرُكَ أَخَانَا وَسَيِّدَنَا الْحُسَيْنَ بْنَ فَاطِمَةَ وَنَدْخُلَ فِي طَاعَةِ اللُّعَنَاءِ وَأَوْلَادِ اللُّعَنَاءِ أَتُؤْمِنُنَا وَابْنُ مُحَمَّدٍ الْمُصْطَفٰى لَا أَمَانَ لَهُ۔

او شقی تیرے ہاتھ قلم ہوں اور لعنت ہو اس تیری امان پر اور دشمن خدا کیا تو ہم کو اس کا حکم دیتا ہے۔ اور ہم اپنے بھائی اور سید و سردار حسینؑ بن فاطمہ کو چھوڑ دیں اور ایک بدکار اور زناکار و زنا زادہ کی اطاعت میں داخل ہو جائیں اور ظالم تو ہم کو تو امان دیتا ہے اور فرزند رسولؐ کے لئے امان نہیں۔

وفاداری کا دوسرا واقعہ بھی سن لیجئے شب عاشور انصار حسینی کو حبیب ابن مظاہر نے اپنے خیمے میں جمع کرکے فرمایا۔

دوستو! صلح کی بات چیت ختم ہوئی۔ کل لڑائی ہونی ہے بتاؤ کیا ارادے ہیں۔ آیا خاندان رسولؐ سے پہلے

جان دینی ہے یا بعد ہیں۔ یہ یاد رہے کہ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے بنی ہاشم میں سے ایک شخص بھی مارا گیا تو روزِ حشر رسولِؐ خدا کو منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔

سب نے بالاتفاق کہا! اے حبیب یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم ان سے پہلے اپنی جانیں قربان کریں گے۔

حضرات! جب یہ خبر جناب عباس علیہ السلام کو پہنچی تو آپ بے چین ہو گئے اور جوانانِ بنی ہاشم کو اپنے خیمے میں جمع کر کے فرمایا۔

اے بیشہ شجاعت کے شیرو! اے میری گود کے پالو!! انصار نے ارادہ کیا ہے کہ ہم سے پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا کہے گی کہ حسینؑ نے غیروں کو کٹوا دیا اور اپنوں کو بچالیا۔ بولو میرے غیرت دار جوانو کیا ارادے ہیں۔

ہر طرف سے آواز آئی کہ ہم پہلے مریں گے یہ کس طرح ممکن ہے کہ غیر تو لڑ کر مر جائیں اور ہم کھڑے ہو کر تماشا دیکھیں۔

جناب عباسؑ یہ سن کر خوش ہو گئے اور فرمایا "شاباش تمہاری ہمت و جرأت پر۔

منقول ہے کہ جب جناب عباس علیہ السلام اجازت کارزار لینے کے لیے خدمت امام میں حاضر ہوئے تو امام علیہ السلام نے اپنی چھاتی سے لگا کر فرمایا۔

بھیا عباسؑ! تم ہی اس وقت بے کسی میں حسین کی زندگی کا سہارا ہو۔ آہ! تمہارے بعد میں کیونکر زندہ رہوں گا۔ تم میری فوج کے علم بردار ہو۔ تم میرے ٹوٹے ہوئے دل کی ڈھارس ہو۔ تمہاری وجہ سے اہلحرم کے دل قوی اور بچوں کے بے چین دلوں کی تسلی ہے۔ بھیا عباسؑ یہ وقت ایسا نہیں کہ تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔

جناب عباس علیہ السلام نے عرض کیا کہ

یا ابن رسول اللہؐ! آپ کی فوج میں اب اس غلام اور علی اکبرؑ کے سوا اور کوئی باقی نہیں۔ اب بغیر غلام کو بھیجے چارہ کار کیا ہے۔

حضرتؑ نے رو کر فرمایا۔

اچھا بھیا رِضًا بِقَضَائِہٖ وَتَسلِیماً لِاَمرِہٖ

اچھا خدا حافظ سدھارو۔

حضرت عباس علیہ السلام اذن کارزار لے کر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ جب آپ کو میدان کی طرف آتا دیکھا تو فوج یزید گھبرا گئی۔ عمر بن سعد گھبرایا ہوا ہر طرف پھر رہا تھا اور اپنی فوج سے بتاکید کہہ رہا تھا۔

"ہوشیار! خبردار!! عباسؑ! بنی ہاشم کا شیر ہے۔ اگر تم نے اس پر قابو پا لیا تو سمجھو

کربلا حسین پر فتح حاصل کرلی۔
الغرض! جناب عباسؑ علم بردار شیرانہ ہمہمہ کے ساتھ میدان کارزار میں تشریف لائے اور ایک شجاعانہ انداز میں رجز پڑھ کر اس قوم بدشعار پر حملہ آور ہوئے۔ دشمن ہر طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ پہلے ہی حملہ میں آپ نے ایک سو بیس ناریوں کو واصل جہنم کیا۔ یہاں تک کہ آپ کشتوں کے پشتے اور لاشوں کے انبار لگاتے ہوئے نہر فرات میں داخل ہوگئے۔
شدت پیاس سے آپ کا غیر حال تھا۔ ایک چلو میں پانی بھرا۔ دیکھا اور ننھے ننھے بچوں کی پیاس یاد کرکے رونے لگے۔ اپنے نفس سے خطاب کرکے فرمانے لگے۔
"کیا تو یہ پانی پینا چاہتا ہے کیا یہی شرط وفاداری و جاں نثاری ہے۔"
یہ کہہ کر چلو سے پانی پھینک دیا اور سوکھی ہوئی مشک سکینہ بھر کر نہر فرات سے نکل آئے۔
جب پسر سعد نے یہ دیکھا کہ عباسؑ غازی مشک بھر کر خیام حسینؑ کی طرف لے جانے والے ہیں۔ تو ایک بار لشکر کو ڈانٹ کر کہنے لگا۔
"خبردار خیمہ حسینؑ تک پانی نہ جانے پائے۔ چاروں طرف سے اس شیر کو گھیر لو۔"
یہ سنتے ہی تمام منتشر فوج ایک جگہ جمع ہوگئی۔ اور ہر طرف سے حملے ہونے لگے۔ جناب عباسؑ شیر غضبناک کی طرح ان کی صفوں کو چیرتے پھاڑتے چلے جاتے تھے۔ آخر تن تنہا کہاں تک لڑتے۔ بدن زخموں سے چور چور ہوگیا۔ خون سے تمام کپڑے تر بہ تر ہوگئے اسی حالت میں ایک ظالم نے موقعہ پاکر آپ کا داہنا ہاتھ قلم کردیا آہ! آہ! کس زبان سے کہوں کہ اس ہاتھ کے کٹتے ہی علم فوج حسینی خاک پر گر کر ٹھنڈا ہوگیا۔
مومنین! جناب عباس علیہ السلام کو اس حالت میں بھی یہی فکر تھی کہ کسی طرح پانی بچوں تک پہنچ جائے چنانچہ مشک کا تسمہ دانتوں میں دبائے اپنے گھوڑے کو بڑھاتے چلے جارہے تھے۔ کہ ظالم حرملہ نے ایک تیر ایسا مشک پر مارا کہ سارا پانی بہہ گیا۔ پانی کے بہتے ہی جناب عباس علیہ السلام نے ایک آہ سرد کھینچی اور خیمہ گاہ تک پہنچنے کا جوش جاتا رہا آہ ایک ظالم نے پیچھے سے آکر ایک گرز آپ کے سر پر مارا کہ آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے۔ اور آواز دی۔
یَابْنَ رَسُوْلِ اللہِ اَدْرِکْنِی۔ اس آواز کے سنتے ہی امام مظلوم علیہ السلام نے فرمایا۔ میری کمر ٹوٹ گئی اور راہ چارہ مسدود ہوگئی۔ اس کے بعد باحال تباہ حضرت علی اکبر کو ساتھ لے کر واعلیا واعباسا، واعباساہ کے نعرے مارتے ہوئے نہر فرات کی طرف روانہ ہوئے راہ میں دو مقام پر جھک کر امام مظلومؑ نے کوئی ایسی چیز اٹھائی کہ چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگے۔

حضرات! آپ سمجھے یہ کیا چیز تھی۔ یہ امام مظلوم علیہ السلام کے قوّت بازو حضرت عباس علیہ السلام کے کٹے ہوئے بازو تھے۔

امام علیہ السلام آہ کا نعرہ مار کر فرما رہے تھے۔

میرے مظلوم برادر میں تیری وفاداری اور جاں نثاری کے قربان آہ! بھیّا عباسؑ! تمہارے یہ ہاتھ میری نصرت میں قلم ہوئے۔

الغرض امام مظلومؑ روتے پیٹتے با حال پریشان نہر کے کنارے پہنچے دیکھا کہ ایک طرف تو فوج خدا کا علم سرنگوں پڑا ہے اور دوسری طرف مشک سکینہ تیروں سے چھدی ہوئی خاک پر پڑی ہے آہ! خدا کسی بھائی کو بھائی کی یہ حالت نہ دکھلائے۔ جو امام علیہ السلام نے اپنے بھائی کی دیکھی۔ ہائے بتیس برس کا شیر سا بھائی دونوں ہاتھ کٹائے خون میں نہائے خاک پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا ہے آپ زار زار روتے ہوئے بھائی کے سرہانے بیٹھ گئے۔

جناب عباسؑ کا سر خاک سے اُٹھا کر زانو پر رکھ لیا اور فرمانے لگے۔

عباسؑ حسینؑ تمہاری اس مظلومیت کے صدقے۔ مظلوم۔ اور بیکس حسین جیسے تم نے پکارا تھا۔ تمہاری یہ حالت تباہ دیکھنے کو آیا ہے۔ وفادار برادر۔ جاں نثار برادر۔ میرے پیارے عباسؑ آنکھ کھولو اور مجھ سے بات کرو۔

"بھیّا عباسؑ! مجھے بتاؤ تمہارا کیا حال ہے۔؟"

عرض کی مولا خدا کا شکر ہے کاش میں آپ کے چہرۂ اقدس پر نظر کر کے اس دُنیا سے رخصت ہوتا۔ حضرتؑ نے پوچھا کیا امر مانع ہے۔ عرض کی مولا کیونکر دیکھوں ایک آنکھ میں تیر پیوست ہے اور دوسری آنکھ میں سر کا لہو بھر گیا ہے یہ سُن کر امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباسؑ کی آنکھ سے لہو صاف کیا۔ آہ! حضرت عباسؑ نے ایک حسرت بھری نگاہ سے حضرتؑ کی طرف دیکھا اور عرض کی مولا! اگر غلام سے کوئی تقصیر ہو گئی ہو تو اس کو معاف فرمائیے۔ یہ سُن کر امام علیہ السلام تڑپ گئے اور بھائی سے لپٹ کر فرمانے لگے۔

"جانِ برادر! ایسے کلمات کہہ کر مظلوم حسینؑ کا دل نہ دُکھاؤ۔ عباسؑ! تم جیسے وفادار بھائی دُنیا میں کہاں ملتے ہیں۔"

پھر فرمایا!

اے بھائی یہ وقتِ آخر ہے حسینؑ مظلوم سے کوئی وصیت کرو۔ اگرچہ تھوڑی دیر ہے کہ میں بھی اسی منزل

کا مسافر بننے والا ہوں جو تم کو اس وقت درپیش ہے تاہم میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری آخری خواہش سنوں۔"

جناب عباسؑ نے عرض کی۔

"مولا میری یہ وصیت ہے کہ آپ میری لاش خیمہ میں نہ لے جایئے۔"

حضرتؑ نے پوچھا۔ "کیوں؟"

عرض کی مجھے سکینہ سے شرم آتی ہے۔ آہ! پیاسی بچی سے یہ وعدہ کر کے آیا تھا۔ کہ تیرے لیے پانی لاؤں گا آہ! میں اس کی یہ مراد پوری نہ کر سکا اور اب میں اُن سے شرمندہ ہو کر دنیا سے جا رہا ہوں۔

مومنین! ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جناب عباسؑ جانتے تھے کہ میرے مرنے سے حسینؑ کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ اور ان میں اتنی طاقت کہاں ہوگی کہ میری لاش کو اُٹھا کر خیمے تک لے جائیں۔

بعض روایت میں یہ ہے کہ جب حضرت عباسؑ اپنی آرزو بیان کر چکے تو امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔

"بھتیا عباسؑ ایک آرزو حسینؑ کی بھی ہے اس کو پورا کرو۔ آج تک تم نے اپنے آپ کو غلام اور مجھے آقا کہتے رہے۔ چاہتا ہوں کہ آج ایک بار مجھے بھائیؑ کہہ کر پکار لو۔"

آہ! مومنین جب جناب عباسؑ نے امام مظلوم علیہ السلام کی اس آرزو کو پورا کیا تو بھائی کہتے ہی دم نکل گیا۔

بھائی کا دم نکل گیا بھائی کے سامنے
اکبر

آہ! آہ!! امام مظلوم علیہ السلام حضرت عباسؑ کی لاش کو وہیں چھوڑ کر باحال پریشان مع حضرت علی علیہ السلام مشک و علم لے کر خیمہ گاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ جناب سکینہ نے جو علم آتا دیکھا تو خیمے کے اندر گئیں اور پکار پکار کر بچوں سے کہنے لگیں۔

اے بچو! جلد کوزے لے کر آؤ۔ میرے چچا عباسؑ پانی لئے آ رہے ہیں۔ دیکھو وہ علم آتا دکھائی دے رہا ہے۔

یہ سنتے ہی بچوں کے بے جان بدن میں جان آ گئی اور اپنے خالی کوزے لے کر در خیمہ پر

آ گئے ہوئے آہ! مومنین! اس وقت ان بچوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ جب یہ سُنا ہوگا کہ سقائے حرم نہر کے کنارے شہید ہوگیا۔

جوں ہی علم خیمہ میں آیا۔ سیدانیوں نے واعباساہ واعباساہ کہہ کر سینہ زنی شروع کی۔ جناب عباسؑ علمدار کی شہادت معمولی نہ تھی۔ اس شہادت سے اہل حرم کے دل ٹوٹ گئے اور ہر بی بی کو امام علیہ السلام کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ سب بی بیاں علم کے گرد جمع ہوکر ماتم کرنے لگیں۔ بالی سکینہ کے بین سننے والوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

سترہویں مجلس

تفسیر آیۂ اللہ الذی رفع السموٰت بغیر عمدٍ

اور

شہادت شبیہ پیغمبر علی اکبر علیہ السلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ﴿۲﴾ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

۱۳/۱-۳ سورہ رعد

الف لام میم را۔ یہ کتاب (قرآن) کی آیتیں ہیں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے جو تم پر

نازل کیا گیا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن بہت سے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لائے۔ اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جنہیں تم دیکھتے ہو۔ پھر عرش کو بنانے پر آمادہ ہوا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک وقت مقررہ سے چلا کرتا ہے وہی (دنیا کے) ہر کام کا انتظام کرتا ہے اور اپنی آیات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے تاکہ تم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے کا یقین کرو۔ وہ وہی ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے میووں کی دو دو قسمیں پیدا کیں (جیسے میٹھے کھٹے) وہی رات کے پردہ سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے۔ بے شک غور کرنے والوں کے لیے اس میں قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

خداوند عالم نے جتنی چیزیں خلق فرمائی ہیں انسان نے ان کی نقل ضرور بنائی ہے۔ مثلاً چاند بنائے درخت بنائے۔ انسان و حیوان جنگل اور پہاڑ سب کچھ بنا ڈالا ہے۔ لیکن اب تک کوئی ایسی چھت نہ بنائی جو بغیر ستون کے قائم ہو۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ سماوات کے متعلق بطلیموس وغیرہ فلاسفہ یونان کا یہ خیال تھا کہ یہ طبق در طبق ہیں اور ستارے ان میں جڑے ہوئے ہیں۔ بطلیموس کے اس نظریہ کو سب سے پہلے کوپرنیکس نے توڑا۔ اور یہ ثابت کیا کہ جس کو آسمان کہتے ہیں وہ کوئی چھت جیسی چیز نہیں بلکہ قدرت نے فضا میں ایک لطیف مادہ خلق فرمایا ہے۔ جس کو ایتھر کہتے ہیں۔ وہ ہوا سے زیادہ لطیف و شفاف ہے۔ اسی میں تمام سیارے اس طرح دوڑتے پھرتے ہیں جیسے پانی میں مچھلیاں یہ باہمی کشش سے قائم ہیں۔ اور ان کی گردش کے دائرے تلے اوپر بنتے گئے ہیں۔ یہ نیلا رنگ جو ہم کو نظر آتا ہے۔ یہ ہوا کا ابھار ایک بے رنگ چیز ہے۔ اگر ایتھر نہ ہو تو کسی سیارے کی روشنی آسکتی ہے نہ جا سکتی ہے۔ نہ کوئی آواز کسی کے کان میں پہنچ سکتی ہے۔ روشنی اس ایتھر کے ذریعے سے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے۔

جب یہ نظریہ قائم ہوا تو خرق والتیام کا جھگڑا ہی ختم ہوا۔ اب معراج ثابت کرنے میں کوئی دقت ہی نہ رہی۔ قرآن میں سماوات و افلاک دو لفظ ہیں۔ سماء کے معنی بلندی کے ہیں۔ اور اس سے مراد ستاروں کا محور ہے اور فلک مشتق ہے۔ فلکہ سے (چرخے کا دمرکا) اس سے مراد ستاروں کے دائرے ہیں۔

ثم استوی علی العرش (پھر عرش پر غلبہ حاصل کیا) عرش کے معنی تخت کے ہیں لیکن اصلاح میں اس سے مراد فلک الافلاک یا فلک نہم ہے۔ آٹھویں آسمان کو اصطلاح قرآن میں کرسی کہتے ہیں۔ جدید ہیئت دانوں کی تحقیق میں سیارے نو ہیں۔ سات تو پہلے سے تھے دو بعد میں دریافت ہوئے۔ اُرینیس اور نیپ چون۔ نیپ چون سب سے زیادہ فاصلہ پر ہے جس کی روشنی سطح زمین پر تین سو سال میں پہنچتی ہے جبکہ روشنی کی رفتار

ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سے کتنی دور ہے۔ نظام سماوی میں سب سے بڑا سیارہ بھی ہے۔ پس استوائے علی العرش کے یہ معنی نہیں کہ خدا عرش پر بیٹھ گیا بلکہ یہ معنی ہیں کہ اس نے اتنے بڑے سیارے پر اپنی قدرت سے غلبہ حاصل کیا یعنی اس کو بھی ایک مخصوص نظام پر قائم کر دیا اور دیگر سیاروں کی طرح وہ بھی مخصوص دائرہ میں چکر کھاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا اگلا حصہ ہے۔ وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمیٰ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تخلیق ادیات ہوئی پھر نظام عرش قائم کیا گیا پھر شمسی اور قمری نظام قائم ہوا حکمائے حال کی تحقیق یہ ہے کہ نظام شمسی میں سورج سب سے بڑا سیارہ ہے اور سب سے پہلے اسی کا وجود ہوا۔ نظام شمسی کے جتنے کرے ہیں وہ سب کا جزو ہیں۔ نیز یہ کہ سورج میں بیاسی عناصر ہیں جن میں ہیلیم اور ہائیڈروجن خاص ہیں جتنے عناصر ان کے علاوہ ہیں وہ ان ہی سے مرکب ہیں۔ بسیط اجزا سورج میں صرف یہی دو ہیں دنیا کی تخلیق میں ان ہی کو بڑا دخل ہیں۔

عالم نورانی میں بھی ایسا ہی ہے۔ انا و علیؑ من نور واحد سے معلوم ہوا کہ وہاں بھی وہ بنیادی جزو باعث تخلیق عالم ہیں۔ نظام شمسی میں بارہ برج ہیں جن میں سیارے گردش کرتے ہیں نظام روحانی میں بھی بارہ امام ہیں جن میں علوم الٰہیہ گردش کرتے ہیں۔ جس طرح آفتاب کی شعاعوں سے مخلوقات ارضی بلحاظ اپنے ظرف قابلیت کے فیض حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح آفتاب رسالت سے بھی لوگ اپنی اپنی حالت کے مطابق فیض پاتے تھے اور سب سے بڑا فیض حاصل کرنے والے علی و فاطمہ اور حسن و حسین علیہم السلام تھے۔ جن کو ہر وقت سرکار دو عالم کی معیت کا شرف حاصل تھا۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۹۱/۱/۲ سورہ شمس سے معلوم ہوا کہ سورج مقدم ہے اور چاند تابع ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ یعنی چاند سورج کا بلافصل جانشین ہے۔ اُدھر سورج غروب ہوا ادھر چاند نکلا۔ راستہ بھی دونوں کا ایک ہی ہے۔ ایک آفتاب کے قائم مقام بارہ چاند ہیں۔ اگرچہ مہینوں کے لحاظ سے ان کے نام جُداگانہ ہیں۔ مگر بلحاظ صورت و سیرت بارہ کے بارہ ایک سے ہیں۔ سب کا ایک ہی مطلع ہے اور ایک ہی مقطع ہر نیا چاند تین دن تک تحت الشعاع میں رہتا ہے۔ البتہ چوتھی منزل پر اس کی روشنی بڑھ جاتی ہے اور چودھویں منزل پر جا کر پورا روشن ہو جاتا ہے۔ آخر میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور شروع ماہ میں پھر رجعت ہو جاتی ہے۔ یہ سارے بارہ چاند خواہ کسی مہینے کے ہوں اپنی ہر حالت میں یکساں ہیں۔ یہی صورت بعینہ انسار امامت کی ہے جیسا کہ رسولؐ نے فرمایا۔ اولنا محمد واوسطنا محمد وآخرنا محمدؐ۔

پھر یہ بھی دیکھئے جب تک سورج رہتا ہے۔ ستارے سب غائب رہتے ہیں۔ لیکن چاند کے دور میں سب چمک اٹھتے ہیں گویا چاند کی روشنی کے سامنے ان کی چمک بالکل ماند ہے مگر پھر بھی ٹمٹمائے ضرور جاتے ہیں۔ ان ستاروں میں کچھ سعد بھی ہیں کچھ نحس بھی۔ آفتاب رسالت کی ضیا باری کے وقت سب اصحاب خاموش اور بے نور تھے۔ لیکن جب قمر امامت کا دور ہوا۔ تو سب چمک اٹھے۔ ان میں سعد و نحس۔ مومن اور منافق دونوں طرح کے لوگ تھے۔

اصحابی کالنجوم والی حدیث کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے کیونکہ ہر ستارے سے سمت کا تعین دشوار ہے۔ عام لوگوں کا تو کیا ذکر جہاز رانوں کو بھی ہر ستارے سے سمت کا پتہ نہیں چلتا البتہ وہی مخصوص ستارے جو کنسیلیشن کی صورت میں ہیں جن کو ہماری زبان میں بروج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ضرور سمتوں کے تعین میں رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر حدیث اصحابی کالنجوم بہم اقتدیتم اہتدیتم صحیح ثابت ہو جائے تو از روئے روایت اصحاب سے مراد اہل بیت علیہم السلام ہوں گے نہ عام صحابہ۔

خداوند عالم نے قرآن میں جا بجا سورج کے ذکر کے ساتھ چاند کا بھی ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق بہت ہی قریب کا ہے۔ غروب ہونے کے بعد سورج کا تعلق چاند سے قطع نہیں ہوتا۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ جدا ہے۔ حالانکہ وہ غیب کے پردہ میں سے برابر اپنی روشنی ڈالتا رہتا ہے۔ اسی طرح آفتاب رسالت کا تعلق بھی ماہتاب امامت سے قطع نہیں۔ اگرچہ پس پردہ ستارے بھی روشنی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں سب سے زیادہ نورانی وجود چاند ہی کا ہے۔

آفتاب مخزن نور ہے مگر کامل نہیں۔ اگر ایک سینک کو سیدھا کھڑا کر دیا جائے تو وہ اس کو چاروں طرف سے روشن نہیں کر سکتا۔ لیکن آفتاب رسالت کا نور کامل تھا۔ اسی لیے جسم رسولؐ کا سایہ نہ تھا۔

جو آیت عنوان کی گئی ہے اس میں یہ بھی فرمایا گیا ہے۔ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اس میں لکم کی ضمیر کا تعلق عام لوگوں میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عام انسانوں کی تسخیر میں نہ آفتاب ہے نہ مہتاب۔ بلکہ اس آیت میں جن سے خطاب کیا گیا ہے وہ محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام ہیں۔ یہ باذن الٰہی سورج کو پلٹا سکتے ہیں اور چاند کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔

سورج اور چاند ہوں یا ملاء اعلیٰ کے ساکن، زمین کے بسنے والے ہوں یا دریاؤں میں رہنے والے جس کو دیکھو محمد و آل محمد علیہم السلام کا تابع فرمان ہے۔ ہر شئے دنیا کی ان کو پہنچاتی ہے اور ان کے حکم کو بجا لانا اپنا فرض جانتی ہے۔ آفتاب و ماہتاب مادّی دنیا کو روشن کرنے کی سقف آسمان میں دو قندیلیں ہیں اور محمدؐ و آل محمدؐ علیہم السلام عرش الٰہی کو اپنے نور سے منوّر کرنے والے۔ دنیا میں جتنی روشن چیزیں ہیں ان ہی کے

نور کا پرتو ہیں۔

جس طرح تمام سیارے آفتاب عالم تاب کا ایک جزو ہیں اور سب اسی سے کسب ضیا کرتے ہیں اسی طرح آل محمد علیہم السلام نور محمدیؐ کا جزو ہیں اور ان ہی کے وجود ذی جود سے فیض حاصل کرنے والے ہیں۔ قرآن میں سورج اور چاند کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۲-۱-۹۱/۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چاند جو سورج کے پیچھے آتا ہے وہ اس امر کا گواہ ہے کہ آفتاب ایک وجودِ نورانی ہے وہ غائب ہونے کے بعد بھی اپنی فیض رسانی جاری رکھتا ہے۔ اسی طرح خدا نے رسول کا تابی علی کو فرمایا ہے۔ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ یہاں یتلوہ شاہد منہ سے مراد علی علیہ السلام مراد ہیں جو رسولؐ کی رسالت کے گواہ بھی ہیں۔ اور منہ یعنی ان کے بدن کا جزو بھی۔ ۱۱/۱۷ ھود

یوں حضرتؐ سردار انبیاءؑ کے پیچھے چلنے والے تو بہت سے تھے مگر جو خصوصیت حضرت علی علیہ السلام کو حاصل تھی وہ کسی اور کو کہاں نصیب۔ یہ عالمِ نور سے عالمِ ظہور تک حضرتؐ کے ساتھ ساتھ رہے اور کیسا ساتھ رہا کہ خلوت و جلوت۔ سفر و حضر۔ بزم و رزم میں کہیں ساتھ چھوڑا ہی نہیں۔ یہ کمال اتحاد اور حقیقت کے ہونے کی دلیل شعب ابو طالبؑ میں جب بنی ہاشمؑ محصور تھے۔ وہ کیسا سخت وقت تھا۔ مکہ کا ذرّہ ذرّہ سرکار دو عالمؐ کے خون کا پیاسا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی جب حضورؐ نکلتے تھے تو علیؑ ساتھ ہوتے تھے جس طرح سورج جہاں غروب ہوتا ہے۔ اس کا بلا فصل جانشین وہیں سے نکلتا ہے اور کچھ دن جو سورج کا مطلع ہوتا ہے وہی چاند کا مطلع بن جاتا ہے پس اسی طرح شعب ابو طالبؑ میں جہاں سے رسولؐ اُٹھے وہیں علی علیہ السلام سوئے۔ شبِ ہجرت جہاں سے رسولؐ گئے وہیں علیؑ سوئے۔ شبِ معراج جہاں سے رسولؐ اُٹھے علیؑ وہیں لیٹے۔

رسولؐ آفتاب ہیں اور علی علیہ السلام ماہتاب۔ سورج کی روشنی چونکہ بہت تیز ہوتی ہے اور ہر شے کی صورت آسانی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ لہٰذا تمام موذی جانور منہ چھپائے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن چاند کی حکومت آتے ہی بہت سی سرکش قوتیں زور مارنے لگتی ہیں۔ چور دیواریں پھاند کر گھروں میں کودنے لگتے ہیں۔ موذی جانور سوراخوں سے نکل پڑتے ہیں۔ درندے حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ کتے چاندنی سے بغض للّٰہی رکھنے کی بناء پر بھونکنے لگتے ہیں۔ رہزن اور بٹ مار کسی شریف آدمی کا گھر لوٹنے کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں سورج کی روشنی میں پردہ فاش ہونے کی وجہ سے ایسا کرنے کا چونکہ موقعہ نہیں ملتا۔ لہٰذا اپنی خواہشوں کو دبائے رہتے ہیں اور کھلے میدان میں نہیں آتے اور اگر کسی مجبوری سے آجاتے ہیں تو ذرا کھٹکا ہوتے ہی بھاگ

کھڑے ہوتے ہیں۔ چاند کی دھیمی روشنی میں چونکہ موذیوں کی صاف صورت نظر نہیں آتی لہذا ہاتھ صاف کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ عہدِ امامت میں اس تاریکی کو نفاق سمجھ لو۔ یہ بھی کیسا لطیف نکتہ ہے کہ چاند تین دن دشمنوں کے زیرِ اثر رہتا ہے جس کو قمر در عقرب کہتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ کم لطیف بات نہیں کہ چاند ہی تمام نظامِ شمسی میں ایک ایسا ستارہ ہے جو درد دکھ میں سورج کا شریکِ حال ہے۔ یعنی جب سورج کو گرہن لگتا ہے تو چاند گرہن بھی ضرور ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عبادت کا تعلق بھی تمام تر چاند ہی سے ہے نہ کہ ستاروں سے، بارہ مہینوں کا شمار اسی سے کیا جاتا ہے۔ عبادتوں کا حساب ہوتا ہے۔ یہ محرم کا مہینہ ہے، یہ صفر کا، یہ شعبان کا، یہ رمضان کا۔ یہ شوال کا، یہ ذی الحجہ کا۔ فلاں تاریخ کو شبِ قدر ہے، فلاں تاریخ کو شب برات ہے۔ فلاں تاریخ کو عیدالفطر ہے۔ فلاں تاریخ کو عیدالبقر ہے۔ اب گیارہ مہینے ختم ہوئے اور زکوٰۃ واجب ہوئی۔ اب حج کا زمانہ آگیا۔ اگر چاند کی رویت معلوم نہ ہو اور ان تاریخوں کا حساب ٹھیک نہ بیٹھے تو غیر وقتی عبادت حرام۔ اسی کا نام دین کے دائرہ محبت میں محبت اہلِ بیت علیہم السلام ہے۔ ع

بے حُبِّ اہلِ بیت عبادت حرام ہے

اسی لیے رسولؐ نے فرمادیا ہے۔ مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ مَاتَ مِیْتَۃً جَاہِلِیَّۃً جو مر گیا اور اس نے اپنے امام زمانہ کو نہ پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

پس یاد رکھیئے کہ آپ کا حساب کتاب دامنِ قمر سے وابستہ ہے۔ اگر ہاتھ سے چھوٹ گیا تو خسر الدنیا والاخرہ کا مصداق ہو جائے گا۔ یاد رکھیئے کہ دورِ قمری عبادت مقبول ہے اور مؤثر بھی رات کی عبادت بہترین عبادت ہے۔ خاصانِ خدا رات ہی کو عبادت کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ چاند کا دور دورِ عبادت ہے

وَمِنَ اللَّیْلِ فَاسْجُدْ لَہٗ وَسَبِّحْہُ لَیْلًا طَوِیْلًا ۝ ۷۶/۲۶ الدھر

رات کے وقت خدا کو سجدہ کرو اور اس کی تسبیح رات کے وقت دیر تک کرو۔

پس یہ معلوم ہوگیا کہ قمرِ امامت ہی سے آفتابِ رسالتؐ نے تمام عبادات کا تعلق کر دیا ہے۔ تو اب رسولؐ کی یہ حدیث بھی سن لیجئے جس کو مولوی عبید اللہ امرتسری نے اپنی کتاب ارجح المطالب میں نقل کیا ہے۔ صفحہ ۷۴۶

قَالَ عَلِیٌّ علیہ السلام قَالَ رسول اللہ علیہ والہ وسلم لَوْ اَنَّ عَبْدًا عَبَدَ اللہَ عَزَّوَجَلَّ مِثْلَ مَا قَامَ نُوْحٌ فِیْ قَوْمِہٖ وَکَانَ

لَهُ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فَانْفَقَهُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمُدَّ فِي عُمُرِهٖ حَتّٰى يَحُجَّ عَلٰى قَدَمَيْهِ اَلْفَ حَجٍّ ثُمَّ قُتِلَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ مَظْلُوْمًا ثُمَّ لَمْ يُوَالِكَ يَا عَلِيُّ لَمْ يَشُمَّ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَلَمْ يَدْخُلْهَا۔ (اخرجه الديلمی)

امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا کہ اگر کوئی بندہ خدا کی عبادت اتنے عرصے تک کرے جتنی مدت نوح زندہ رہے (ڈھائی ہزار برس) اور کوہ اُحد کے برابر سونے کا مالک ہو اور اس کو راہِ خدا میں صرف کرے اور اتنی طویل عمر پائے کہ ایک ہزار حج پاپیادہ کرے اور پھر صفا و مروہ کے درمیان مظلوم قتل کیا جائے پس اگر وہ اے علی اِمّ سے محبت نہ رکھتا ہوگا تو جنت کی بُو نہ سونگھے گا۔)

جس آیت کو میں نے اس مجلس کا عنوان قرار دیا ہے۔ اس کا ایک جز یہ بھی ہے "هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ط" (اللہ وہ ہے جس نے زمین کو بچھایا اور اس پر پہاڑ اٹھائے۔ اور چشمے بہائے فضائے عالم میں جہاں اور ستاروں کی گردش ہے اس میں ہماری زمین بھی ایک مٹرے دانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بھی سورج کا ایک حصہ ہے جس کو خدا نے بے شمار خصوصیات عطا فرمائی ہیں اور ان کی بناء پر اس کو تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے اوّل وہ خلافت الہیہ کا محل نزول ہے دوسرے اشرف المخلوقات حضرت انسان کا مسکن ہے تیسرے سب سے زیادہ تسبیح الٰہی اسی پر ہوتی ہے۔ چوتھے تمام مخلوقات ارضی کی غذا اسی سے ہے۔ اور پانچویں وہ امین ہے جو شے اس میں رکھ دو وہ اس کو واپس دے دیتی ہے۔ بلکہ سوگنا دیتی ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۶۱) البقر ۲/۲۶۱

جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثل اس دانہ کی سی ہے جس سے (زمین میں بونے کے بعد) سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہتا ہے دُونا کر دیتا ہے اور اللہ بڑی گنجائش والا ہر چیز سے واقف ہے۔

تراب میں اگر ایک سے کر سو دینے کی طاقت ہے، تو ابو تراب کو ایک ہزار دکھانے کی جس کا شاہد خیابر

امیر علیہ السلام ہیں۔ یہ قول ہے۔ رسول اللہؐ نے مجھے ایک ہزار باب علم کے تعلیم کئے ہیں اور ہر باب سے ہزار ہزار باب میرے اوپر منکشف ہوگئے۔

زمین کی یہ صفت امانت ہی تو ہے کہ خدا نے اس کو بے شمار خزانوں کا امین بنا رکھا ہے۔ امانت اخلاق انسانی میں بڑی ممتاز صفت ہے۔ حضرت رسولؐ خدا کی جاہے اور صفتوں کو کفار نے نہ مانا مگر الامین کہہ کر پکارا۔ کیسا امین تھا وہ رسولؐ شہر ملا بلدالامین دمکہ اور خادم ملا روح الامین اور وصی ملا ید الامین

چھٹی صفت زمین کی یہ ہے کہ وہ حد درجہ حلیم ہے۔ جہاں سے چاہو کھود ڈالو وہ روکتی نہیں پھر خاکسار ایسی کہ لوگ پیروں سے کچلتے ہیں اور کچھ نہیں کہتی۔ غالباً اپنی صفات کی بنا پر وہ سجدہ گاہ بشر بنی اور غالباً اسی پر نظر رکھتے ہوئے علی علیہ السلام نے اپنے آپ کو ابو تراب کہا ہو اور کیا بعید ہے اسی بنا پر قبلہ گاہ خلق بنے ہوں۔

اگرچہ زمین نعمات الہیہ کا خزانہ ہے مگر خلاق عالم نے دو چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے اول پہاڑ دوسرے نہریں کیونکہ تربیت عالم کو ان دونوں سے بڑا تعلق ہے۔ بارش کا ہونا، دریاؤں کا بہنا۔ ان سے نہروں کا نکلنا۔ چشموں کا پھوٹنا۔ ان سے خلق اللہ کا سیراب ہونا۔ کھیتوں کی آبپاشی ان ہی چیزوں سے ہے پہاڑ عجائبات قدرت کی کان ہیں۔ ان میں بے شمار جواہرات پائے جاتے ہیں۔ عمارتوں کے لیے قسم قسم کے پتھر موجود رہیں۔ ہر قسم کے معدنیات کا خزانہ ہے۔ قسم قسم کی جڑی بوٹیاں، انواع و اقسام کے درخت اور طرح طرح کے پھل اور پھلواری ہے۔ ان ہی سے ٹکرا کر ہوا مینہ برساتی ہے نہ یہی گرم ہواؤں کو ٹھنڈا بناتے ہیں۔ یہیں سے پانی کے زور میں جو پتھر چلتے ہیں وہ سنگریزے اور پھر ریت اور مٹی بنتے ہوئے دریاؤں اور دریاؤں سے سمندروں میں پہنچتے ہیں اور وہاں نئی چٹانوں کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین یکساں حالت میں رہے جہاں نشیب ہو وہاں نشیب اور جہاں بلندی ہو وہاں بلندی اور جہاں شورہ زار ہو وہاں شورہ زار اور جہاں زرخیز زمین ہو وہاں زرخیز زمین بنی رہے۔ اس کے علاوہ بھی قسم قسم کی خرابیاں پیدا ہوں۔

اس کے بعد اس آیت میں پھلوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر پھل میں اس نے قدرت کا کمال دکھایا ہے۔ دو طرح کے پھل ہیں میٹھے اور کھٹے انگور میٹھے بھی ہوتے ہیں اور کھٹے بھی۔ آم میٹھے بھی اور کھٹے بھی۔ ایک ہی زمین میں دو طرح کے درخت ہوتے ہیں ایک کے پھل میٹھے۔ دوسرے کے کھٹے حالانکہ زمین۔ پانی۔ ہوا اور فضا سب ایک ہے بلکہ ایک ہی درخت میں کہیں پھل کچا ہے اور کہیں پکا۔ کوئی ہلکا ہے اور کوئی بھاری۔ کوئی خوش رنگ کوئی بدرنگ۔ آخر یہ تغیر کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خلاقِ عالم خود مختار ہے۔ حکیم مطلق ہے۔ اپنی مصلحت

کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
جب ایک شاخ کے دو پھل ایک گود کے دو بچے اور ایک صدف کے دو موتی یکساں نہیں تو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ایک رسولؐ کی صحبت کے بہت سے بیٹھنے والے ایک جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں کہ جس کی پیروی کرو ہدایت پا جاؤ گے۔ پس یہ حدیث کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے۔ اصحابی کالنجوم انت لدیتم اھتدیتم۔
حقیقت یہ ہے کہ درختوں کے رنگ و روپ اور پھلوں کے ذائقے کا تمام دار و مدار تخم پر ہے جیسا تخم ہو گا اس کا درخت آخر حصہ تک ویسا ہی رہے گا۔ اگر نیم کا بیج آم کے پہلو میں دبا دیا جائے تو یہ مقاربت اور مصاحبت کوئی فائدہ نہ دے گی۔ آم کا قرب نبولی کو میٹھا نہیں بنا سکتا۔ ہاں ایک قسم ایک نسل کے پودے چاہے پاس پاس ہوں یا الگ الگ ان کی خصوصیت میں کوئی فرق نہ پڑے گا۔ ہر تخم زمین سے وہی چیز کھینچے گا جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔ زمین کی یہ کرامت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ اچھے برے اور میٹھے کھٹے کو خوب پہچانتی ہے۔ وہ اپنا خزانہ ناسمجھی سے نہیں لٹاتی۔ وہ میٹھے پھل کے درخت کو میٹھا رس دیتی ہے اور کڑوے کو کڑوا۔ قاعدہ ہے جیسا تخم۔ ویسا ہی پھل۔
اسی لیے تو ذمہ داری کے کاموں کے لیے شریف حسب و نسب کو تلاش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انبیاء اور اوصیائے انبیاء کو اصلاب و ارحام طاہرہ عطا فرمائے تاکہ تخم شریف کو اچھی جگہ ملتی ہے جس طرح درختوں پر تخم کا اثر پایا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جوہر ذاتی بے رنگ لائے نہیں رہتا کسی اچھے خاندان کی نسبت بدگوہر انسان کو لائق عظمت نہیں بنا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک خاندان میں پرورش پانے والے سب یکساں نہیں ہوتے۔ اس قریشی خاندان سے محمدؐ جیسا ہادی پیدا ہوتا ہے اور اسی سے ابولہب جیسا کافر۔
پس جب خاندانی اثر مساوات پیدا نہیں کرتا۔ اور فیض رسانی کے مفید ثابت نہیں ہوتا تو بھلا صرف صحبت کیا موثر ہو گی اور جب زندہ کی صحبت مفید نہ ہو گی تو مرنے کے بعد ہم پہلو بن جانے سے کیا فائدہ ہو گا۔ ہاں اگر طینت میں اشتراک جوہر ذاتی میں مشابہت ہے۔ کمال نفسی میں مطابقت ہے تو ضرور فائدہ پہنچ جائے گا۔ پانی دودھ میں مل کر ہم رنگ ہو سکتا ہے تیل میل نہیں کھاتا۔ وہ الگ ہی رہتا ہے۔ آم کی قلم آم میں لگ کر ایک جان ہو سکتی ہے۔ نیم اور آم کا تعلق نہیں ہو سکتا۔
ہر تخم کے لیے یکساں زمین کام نہیں دیتی۔ بعض کے لیے زیادہ کمائی ہوئی زمین کی ضرورت ہے بعض کے لیے معمولی اور بعض کے لیے بہت کم۔ جتنی بیش قیمت جنس ہو گی اتنی ہی اس کے لئے ریاضت کی

ضرورت ہوگی۔ چنا موٹے موٹے ڈلوں میں ہو جاتا ہے۔ گیہوں کے لیے کاشتکار کو زیادہ ریاض کرنا پڑتا ہے جب مادی چیزوں میں یہ حال ہے تو بھلا امامت و ہدایت معمولی سینوں میں کیونکر نشوونما پا سکتی ہے اس کے لئے دو ایسے قلوب کی ضرورت ہے، جو خلقت آدم سے ہزار ہا سال پہلے عالم نور میں نشوونما پا چکے ہوں۔

سرکار دو عالمؐ کی زندگی کے وہ کارنامے تو بڑے شد و مد سے بیان کیے جاتے ہیں جو بعثت کے بعد سے آنحضرتؐ نے انجام دیے یعنی کل ۲۳ سال کی جد و جہد لیکن اس سے پہلے جو آپ کی مقدس زندگی کے چالیس سال گزرے اس کا کوئی عظیم الشان کارنامہ بیان میں نہیں کیا جاتا گویا وہ تعطل کا زمانہ تھا جو ہستی خلقت حضرت آدمؑ سے پہلے نبوت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکی ہو۔ وہ چالیس سال تک کار تبلیغ سے غافل ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ عقل میں آنے والی بات نہیں۔

ہم نے تو یہ سمجھا ہے کہ جو عظیم الشان دینی خدمت ابتدائی چالیس سال میں ہوئی۔ وہ آخری ۲۳ سالہ خدمت سے زیادہ اہم تھی کیونکہ آخری خدمت کی کامیابی کا دار و مدار اسی ابتدائی خدمت پر تھا۔ آپ کو اپنے بعد کچھ ایسی ہستیاں چھوڑ کر جانا چاہیے تھا جو آپ کے مشن کو آپ ہی کی طرح انتہائی جوش اور انتہائی خلوص اور دیانت سے چلاتی رہیں۔ لہذا یہ زمانہ آپ نے اس اہم کام میں گزارا۔ انسان کے حیاتی کارناموں میں سب سے زیادہ جانکاہ اور روح فرسا کام تولید مثل ہے۔ یہ ایسا معمولی کام نہیں کہ ہر شخص اسے انجام دے سکے ارسطو نے اپنے استاد افلاطون سے پوچھا کہ انسان کامل کون ہے؟

اس نے کہا جو تولید مثل کرے۔ پس آنحضرتؐ نے سب سے پہلے یہی کام کیا کہ حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جیسا بنایا۔ اپنی تمام صفات کمالیہ سے اس طرح آراستہ کیا کہ کوئی کسر نہ رہی۔ مباہلہ کے وقت بتا دیا کہ میرا نفس علی بن ابی طالب ہیں آپ نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کو تولید مثل کا وہ طریقہ بتایا کہ تمام آئمہ اہل بیت علیہم السلام یکے بعد دیگرے تولید مثل کرتے چلے گئے۔

یہی وہ نبی کا نفس علی علیہ السلام تھے۔ جن کو رسولؐ نے ہر ممکن طریقے سے تعلیم دی۔ (۱) لعاب دہن چُسا کر (۲) طائر کی طرح بھرّا کر (۳) زبان منہ میں دے کر (۴) سینے سے سینہ لگا کر (۵) جب علی نے پوچھا تو بتایا (۶) نہ پوچھا تو اپنی طرف سے بتا کر۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ریاض کی دی ہوئی زمین ہے تخم ہدایت اس سے زیادہ کہاں پھل سکتا ہے۔ چنانچہ پھلا اور ایسا پھلا کہ ایک ایک دانہ سے ہزار ہزار دانے پیدا ہوئے مرنے سے چند روز پہلے سرکار دو عالمؐ تمام امت کو بتا گئے کہ میں نے اپنی مثل جس کو بنایا ہے۔ وہ ہے من کنت مولاہ فہذا علی مولاہ اس سے پہلے بار بار لوگوں کو یہ بھی سنا چکے تھے۔ انا و علی من نور

واحد اور یہ بھی فرمایا یا علی نفسک نفسی و دمک دمی
ایک طرف تو رسولؐ تولید مثل فرما رہے تھے اور دوسری ہدایت اُمت پر توجہ تھی لیکن حضورؐ کی اس ہدایت سے جس کا جتنا ظرف تھا اتنا ہی فیض حاصل کر رہا تھا۔ کوئی مومن بنا کوئی منافق کوئی ضعیف الایمان کوئی کُل ایمان۔ گمراہ کرنے والا نہ قرآن ہے نہ رسول بلکہ بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طبیعت کے مطابق اثر لیتا ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

باغبان ہمیشہ قطعات زمین کی حالت دیکھ کر بیج ڈالتا ہے اور جیسی مٹی کسی کھیت کی ہوتی ہے اسی کے لحاظ سے تخم ریزی کرتا ہے یہ قصور باغبان کا نہیں بلکہ زمین کا ہے ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

شورہ زار قطعات پر چاہے کتنی ہی محنت کی جائے گھاس اور کانس کے سوا کچھ پیدا نہ ہوگا۔ بعض کھیتوں میں پودوں کے ساتھ گھاس بھی اُگ آتی ہے جو اس کا ثبوت ہوتی ہے کہ باغبان نے محنت تو بہت کی مگر زمین کے اندر جو پرانی آل رہ گئی ہے وہ اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہی یہی چیز تھی کہ اسلام کے لانے کے بعد بھی بعض لوگوں کے دلوں میں شرک چیونٹی کی طرح رینگتا ہی رہا

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض درختوں کی جڑ سے دو شاخیں پیدا ہوتی ہیں اور بعض کا ایک ہی تنا ہوتا ہے۔ دو شاخوں والا بھی اسی پانی سے پرورش پاتا ہے اور ایک شاخ والا بھی اسی سے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دو شاخیں جدا ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی ہوتی ہیں۔ پانی ایک زمین ایک تخم ایک پھل ایک۔ پھول ایک مزہ ایک۔ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا۔ الناس من اشجار شتی وانا و علی من شجرۃ واحد۔ (لوگ مختلف درختوں سے ہیں اور میں اور علی ایک درخت سے) اسی کی تصدیق حدیث نور سے ہوتی ہے۔

انا و علی من نور واحد۔

شجرۃ الانبیا حضرت ابراہیمؑ سے دو شاخیں چلیں۔ ایک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے دوسری حضرت اسحاق علیہ السلام سے لیکن یہ دونوں شاخیں یکساں نہ رہ سکیں۔ نسل جناب اسحٰق علیہ السلام میں یہود و نصاریٰ و صابئین بھی ہوئے۔ اور مومنین و مسلمین بھی۔ لیکن سبحان اللہ کیا کہنا نسل جناب اسمٰعیلؑ کا کہ اس شاخ نبوت میں جو حضرت محمد مصطفیٰؐ سے چلی۔ سب کے سب ہی مسلمان ہوئے۔ یہ اس دعا کا اثر تھا جو

جناب ابراہیم علیہ السلام و جناب اسمٰعیل علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کے بناتے وقت کی تھی۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ؕ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

(البقر ۲/۱۲۹)

جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی دیواریں بلند کر رہے تھے تو خدا سے یہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر لینا تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم دونوں کو اسلام کے راستے پر ثابت قدم رکھنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ لوگوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کرے۔ بلاشک تو بڑا توبہ کا قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے اس اُمّتِ مسلمہ میں سے ایک رسولؐ کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، ان کے نفسوں کو پاک و پاکیزہ کر دے۔ بے شک تو غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جو شاخ چلی اگرچہ اس میں ایک نبی ہوا مگر ہوا خاتم الانبیا جس کی نبوت کا سلسلہ قیامت تک چلنے والا ہے۔

نسلِ اسماعیل میں قریشی شاخ کچھ دور چل کر پھر دو ہو گئی۔ لیکن قدرت کو یہ جدائی منظور نہ ہوئی اس نے علیؑ و فاطمہ کو پھر ایک کر دیا تاکہ ظاہر میں بھی دو ہوتا باقی نہ رہے۔ جب یہ دونوں شاخیں ایک ہو گئیں تو پھر اس شجرۂ طیبہ نے ایسا زور باندھا کہ قیامت تک کے لیے اس کی جڑ جم گئی۔

نسلِ اسحٰقؑ کی شاخ کچھ دن پھل پھول لا کر خزاں رسیدہ ہو گئی۔ لیکن حضرت اسمٰعیل سے ایسے سدا بہار پھول کھلائے جو قیامت تک مرجھانے والے نہیں۔ اگرچہ ایک روح افزا پھل پتّوں میں چھپا ہوا ہے مگر اس کی خوشبو سے عالم دہک رہا ہے۔

آہ آہ! نسلِ اسمٰعیل کا ہرا بھرا درخت کربلا میں اس بے دردی سے کاٹا گیا کہ کوئی پھل اور کوئی پھول

ایسا باقی نہ رہا جس پر ظلم و ستم کا تیر نہ چلا ہو۔ آہ! اس شجر نبوت کا وہ خوش نما پھول جو شباب کی ہوا میں دل فریبی سے مہک رہا تھا۔ ظلم و ستم کے بیرون نظے کچلا گیا کہ دیکھنے والے کلیجہ پکڑ کر رہ گئے۔ آہ حسینؑ کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر کیا اس قابل تھا کہ اس کے چاند سے سینہ کو بھالے مار مار کر چھلنی کر دیں۔

واللہ یہ حسینؑ کا کلیجہ تھا۔ یہ اُم لیلےٰ کا دل تھا کہ نصرتِ دین کے سچے جوش میں ایسے جوان بیٹے کی موت خوشی سے گوارا کرلی دُنیا میں جس کا مثل و نظیر نہ تھا۔

کتب تواریخ میں منقول ہے کہ جب جناب ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ اپنے فرزند جناب اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے ہیں تو صبح کو ان سے فرمایا کہ بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا بابا جان! جس امر کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کو ضرور بجالائیے۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے۔ جب بیٹے کی مرضی معلوم کرلی۔ تو پھر جناب ہاجرہ اور جناب اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور فرمایا اسمٰعیل کو آج ایک دوست کے یہاں دعوت میں لے جانا چاہتا ہوں۔ تم ان کو نہلا دھلا کر آراستہ کر دو۔ یہ سن کر جناب ہاجرہ خوش خوش اٹھیں اور بیٹے کو نہلا کر نئے کپڑے پہنائے گیسوؤں میں شانہ کیا، خوشبو سے بدن معطر کیا اور جناب ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں لائیں۔ آپ نے فرمایا۔ ایک رسی اور چاقو بھی لاؤ۔

پوچھا۔ ان چیزوں کی دعوت میں کیا ضرورت ہے۔ فرمایا اس لیے کہ شاید وہاں کوئی قربانی ہی کرنا پڑ جائے۔

جناب ابراہیم علیہ السلام بیٹے کو لے کر منیٰ کی طرف روانہ ہوئے کچھ دُور چلے تھے کہ جناب ہاجرہ پیچھے پیچھے دوڑیں اور کہنے لگیں کہ اے خلیل خدا ذرا ٹھہر یئے میں اپنے بچے کو ناشتہ کرا دوں۔ نہ معلوم وہاں کس وقت کھانا ملے۔ مومنین اس ماں کے لئے یہ ممکن تھا کہ اپنے بھوکے بچے کو کھلا پلا کر باپ کے ساتھ کر دے لیکن آہ اُم لیلےٰ غریب کیا کرے جس کا اٹھارہ برس کا کڑیل جوان تین روز کا بھوکا پیاسا مرنے کے لیے میدانِ جنگ کو جا رہا ہے مگر اس کی ماں سے یہ ممکن نہیں کہ کھانا تو ایک طرف اس کے پیاسے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ٹپکا دے۔

الغرض جناب ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو لیے ہوئے منیٰ میں پہنچے اور اپنے بیٹے کو ذبح کا ارادہ کیا اور پوچھا اگر کوئی وصیت کرنا ہو تو بیان کرو تاکہ بعد ذبح اس کو بجالاؤں۔ جناب اسمٰعیل علیہ السلام نے عرض کی۔ میری تین خواہش ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ میرے ہاتھ پاؤں خوب کس کر باندھئے کہ وقت ذبح ذبیحہ ہاتھ پاؤں مارا کرتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں خدا صابرین کی فرد سے میرے نام کو محو نہ کر دے۔

اور دوسری خواہش یہ ہے کہ آپ پس گردن سے مجھے ذبح کریں تاکہ ایسا نہ ہو کہ میرا چہرہ سامنے ہونے سے شفقت پدری جوش مارے اور آپ کا ہاتھ چھری چلانے سے رُک جائے۔ اور میں اس سعادت سے محروم ہو جاؤں۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ میرے ذبح کی خبر یکایک میری والدہ سے بیان نہ کر دیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس صدمے سے ہلاک ہو جائیں۔ عورتوں کا دل اول تو یوں ہی نازک ہوتا ہے۔ پھر میں ان کا اکلوتا فرزند ہوں اور میری نئے قسم کی موت ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ باتیں سُن کر رونے لگے اور فرمایا اچھا بیٹا تمہاری خواہش کے مطابق کروں گا۔ آپ نے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیئے اور اس کے بعد جناب خلیل نے اپنے پیارے بیٹے کو لٹا لٹایا اور اپنی چھری کو پتھر پر خوب تیز کر کے پہلے تو اپنی آنکھوں پر کپڑا باندھا پھر بیٹے کی رگ گردن پر رکھ کر چلانا شروع کی ناگاہ دنبہ کی آواز چھری کے تلے سنائی دی۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں دیکھا کہ اسمٰعیل تو پہلو میں صحیح سلامت کھڑے ہیں اور ان کی جگہ دنبہ ذبح کیا ہوا پڑا ہے۔ آپ دیکھ کر آزردہ ہوئے اور خیال ہوا کہ میری قربانی شاید درگاہ ایزدی میں مقبول نہیں ہوئی۔ ناگاہ خدا کی طرف سے آواز آئی اے ابراہیم تم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔ لیکن اس کا فدیہ ہم نے ایک ذبح عظیم کو قرار دیا۔

حضرات! باپ کو اپنی اولاد سے جو محبت ہوا کرتی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں خاص کر جب بیٹا جوان ہوا اور سعید و صالح ہو۔ آپ نے سنا کہ جناب خلیلؑ باوجودیکہ مرضی خدا حاصل کرنے کے شوق میں بیٹے کی قربانی کرنے کے لیے بیٹھے تھے لیکن پھر بھی محبت پدری کا قوی ترجذبہ نہ رُک سکا۔ اور جناب خلیلؑ نے اپنی آنکھوں پر کپڑا باندھ ہی لیا۔ تاکہ بیٹے کا بہتا ہوا خون اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں۔ لیکن اللہ اکبر کیسا صابر و شاکر تھا خلیل کربلا کہ اٹھارہ برس کا کڑیل جوان سینہ پر برچھی کھائے خون میں نہائے انتہائی کرب سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہا تھا۔ اور حسینؑ صبر کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں کہ جب لشکر حسینؑ میں حضرت علی اکبر علیہ السلام کے سوا مجاہد باقی نہ رہا۔ تو شہزادہ علی اکبر نے باپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اجازت کارزار طلب کی۔ حضرتؑ نے ایک حسرت بھری نظر اپنے کڑیل جوان پر ڈالی اور رونے لگے۔ بیٹا کوئی باپ دنیا میں ایسا ہے کہ اپنے جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دے۔ لیکن آہ! حسینؑ پر ایسا وقت آپڑا ہے کہ بغیر اجازت دیئے چارہ کار نہیں۔ اچھا بیٹا! تم بھی جاؤ۔ اور اپنا داغ حسینؑ مظلوم کو دو۔ آہ! حسینؑ یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہ گیا کہ تجھ جیسا مہرو فرزند مرنے کی اجازت مانگے اور وہ اس کے روکنے پر قادر نہ ہو۔ میں نے اے جان پدر مرنے کی اجازت دے دی لیکن

اپنی ماں اور پھوپھی سے بھی خیمہ میں جاکر رخصت ہوآؤ۔ انھوں نے تم کو آخرا ٹھارہ برس پالا ہے۔

الغرض جناب علی اکبر علیہ السلام خیمہ میں آئے۔ اور اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ راوی کہتا ہے کہ اس وقت خیمہ میں کہرام بپا تھا۔ بی بیاں چاروں طرف سے علی اکبر کو گھیرے ہوئے تھیں اور حسرت بھری نگاہوں سے چہرۂ علی اکبر کو دیکھ رہی تھیں۔ بالخصوص جناب زینبؑ کا بُرا حال تھا۔ بار بار بلائیں لے کر کہتی تھیں بیٹا کیا ہم نے اسی لئے پالا تھا۔ اس عالم غربت میں جب کہ ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور تمہارا باپ مظلوم بے ناصر و بے مددگار ہو چکا ہے۔ تم بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دو۔ اے فرزند! میں نے تجھے بڑی محنت سے بڑے چاؤ پیار سے پالا تھا۔ کس دل سے کہوں کہ دشمنوں کے نرغے میں جاکر تیر و تبر اور نیزہ و خنجر کھاؤ۔

حضرات ایک طرف تو جناب زینب کا اس غم میں غیر حال تھا۔ دوسری جانب اُم لیلیٰ ماہی بے آب کی طرح بے چین تھیں۔ خدا کسی پر یہ وقت نہ لائے کہ اس کا جوان بیٹا سامنے کھڑا مرنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ آہ! جس ماں کے دل میں بڑے بڑے ارمان ہوں آج اس کی نظروں میں دُنیا تیرہ و تار ہے تمام حسرتیں خاک میں مل رہی ہیں۔ بیٹے کو چھاتی سے لگائے زار زار رو رہی تھیں اور فرما رہی تھیں بیٹا علی اکبر یہ دکھیا ماں تیری جدائی میں کیونکر زندہ رہے گی۔ بیٹا ماں کے حالِ زار پر رحم کرو۔ آہ میں صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ بیٹا! اب تم مجھ سے آکر نہ ملوگے۔ آہ میرا چاند میرے دل کا چین اب خاک میں مل جائے گا۔

جناب علی اکبر کہہ رہے ہیں مشیتِ ایزدی میں کیا زور۔ اب بغیر میدان کارزار میں جائے چارۂ کار نہیں دشمن بار بار مبارزطلبی کر رہے ہیں اگر میں مقابلہ کو نہ جاؤں گا تو یہ بے حیا بابا جان کو بے ناصر و مددگار سمجھ کر فوراً خیام پر حملہ آور ہو جائیں گے آہ سیدانیاں کیا کرتیں مجبوراً صبر کی سِل سینہ پر رکھتے ہی بنی اور ایک ایک بی بی نے جناب علی اکبر کو رخصت کیا۔

ایک روایت میں ہے کہ صبح عاشور جب دونوں طرف سے صف آرائی ہو چکی اور دشمن مبارزطلب ہوا تو امام مظلوم علیہ السلام نے نہ تو کسی ناصر پر نظر ڈالی اور نہ کسی عزیز پر بلکہ اپنے جوان بیٹے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر فرمایا۔

یا بنی تقدم۔ (بیٹا تم سب سے پہلے مقابلے کو نکلو) یہ سنتے ہی جناب علی اکبر گھوڑے کی طرف بڑھے۔ جب انصار نے یہ حال دیکھا تو تلواریں نیام سے نکال لیں اور کہنے لگے یا ابن رسول اللہ شہزادہ علی اکبر کو روک لیجئے۔ ورنہ ہم اپنی تلواروں سے اپنی گردنیں کاٹ کر مر جائیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا شہزادہ شبیہ پیغمبر

تو مرنے کو جائے اور ہم کھڑے تماشا دیکھیں۔ یہ حال دیکھ کر حضرتؑ نے علی اکبر کو روکا۔

آہ! کہاں تھے۔ اور یہ وفادار وجاں نثار اس وقت جب حضرت علی اکبرؑ زنانِ اہل حرم سے رخصت ہو کر نکلے تھے۔ اور لڑنے کو جا رہے تھے۔ لکھا ہے کہ جب علی اکبرؑ لڑنے کے لیے چلنے لگے تو حضرتؑ نے انہیں آلاتِ جنگ سے آراستہ کیا۔ خود ہی گھوڑے پر سوار کیا۔ اور جب علی اکبر میدانِ جنگ میں چلنے لگے تو آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

خداوندا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔ جو رفتار وگفتار اور صورت وسیرت میں تیرے رسولؐ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جب میں تیرے نبی کی زیارت کا مشتاق ہوتا تھا تو اپنے اس فرزند کے چہرہ پر نظر کر لیا کرتا تھا آج اس سے بھی محروم ہوتا ہوں۔ اس کے بعد بازوئے علی اکبر کو تھام کر کچھ دعائیں دم کیں اور اجازت کا رزار مرحمت فرمائی۔

منقول ہے کہ حضرت علی اکبر نے میدان میں آکر وہ شجاعانہ جنگ کی کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے جس طرف رُخ کرتے تھے دشمن کو بھاگنے کے سوا بن نہ پڑتی تھی۔ جب آپ فوجِ یزید کو دور تک بھگا چکے تو پلٹ کر پھر خدمت امام علیہ السلام میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے۔

يَا اَبَتَاهُ اَلْعَطَشُ قَدْ قَتَلَنِيْ وَثِقْلُ الْحَدِيْدِ قَدْ اَجْهَدَنِيْ

(بابا پیاس نے مجھے ہلاک کر ڈالا، اور ہتھیاروں کی گرانی سخت ایذا دے رہی ہے۔

فَهَلْ لِيْ اِلٰى شَرْبَةٍ مِنَ الْمَاءِ سَبِيْلٌ

کیا میرے لیے ایک گھونٹ پانی ملنے کی کوئی صورت ہے) حضرت یہ سُن کر آبدیدہ ہوئے اور فرمایا واللہ اے فرزند مجھ پر اور حضرت رسولؐ خدا اور حضرت علی مرتضیٰؑ اور جناب فاطمہ زہراؑ پر بہت شاق ہے کہ تجھ جیسا فرزند ایک جرعۂ آب مانگے اور مظلوم باپ اسے پورا نہ کر سکے۔

اس کے بعد فرمایا بیٹا علی اکبر! تم اپنی زبان میرے منہ میں دے دو شاید کچھ تسکین ہو جائے یہ سُن کر حضرت علی اکبر نے اپنی زبان حضرتؑ کے منہ میں دے دی۔ مگر فوراً ہی باہر نکال لی اور عرض کی۔ يَا اَبَتَا لِسَانُكَ اَيْبَسُ عَنْ لِسَانِيْ؟ (بابا جان آپ کی زبان تو میری زبان سے بھی زیادہ خشک ہے)

آہ! مومنین امام مظلوم علیہ السلام نے یہ عمل اس لیے کیا کہ علی اکبر کو یہ جان کر تسکین ہو جائے کہ بوڑھے باپ کی زبان تو مجھ سے بھی زیادہ خشک ہے۔ اس کے بعد حضرتؑ نے ایک انگوٹھی دے کر فرمایا اسے اپنے منہ میں رکھ لو۔ اور راہِ خدا میں جہاد کرو۔ چنانچہ حضرت علی اکبر اس انگوٹھی کو منہ میں رکھ کر پھر

میدانِ کارزار میں آئے۔

حمید بن مسلم راوی ہے کہ جناب علی اکبرؑ کے حملۂ ثانی نے فوجِ یزید میں تہلکہ برپا کر دیا۔ سوار اور پیادے، سپاہی اور سپہ سالار سب بدحواس تھے۔ یہ دیکھ کر عمر بن سعد بہت گھبرایا اور سردارانِ فوج کو ڈانٹ کر کہنے لگا۔

"کیسا شرم کا مقام ہے کہ ایک بھوکا پیاسا جوان اتنی بڑی فوج کو بھگائے پھرتا ہے۔ کیا تم میں کوئی جوان ایسا نہیں جو اس جوان کا جو کافی زخمی ہو چکا ہے سر کاٹ لائے اور یزید کی سرکار سے انعام و اکرام کا مستحق ہو۔ یہ سن کر سنان بن انس نخعی اپنے مقام سے چلا اور موقعہ پا کر ایک نیزہ حضرت علی اکبرؑ کے سینے پر ایسا مارا کہ آپ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے اور آواز دی۔

یَا اَبَتَاهُ اَدْرِکْنِیْ یَا اَبَتَاهُ اَدْرِکْنِیْ بابا جان میری خبر لیجیے۔ بابا جان میری خبر لیجئے میں نے اپنی جان آپ پر سے نثار کی۔

یہ سنتے ہی امام مظلوم علیہ السلام کی نظر میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ اور یہ فرماتے ہوئے قتل گاہ کی طرف روانہ ہوئے یَا بُنَیَّ عَلَی الدُّنْیَا بَعْدَکَ الْعَفَاءُ (بیٹا! تیرے بعد زندگانی دنیا پر خاک)

آہ! آہ! امام مظلوم علیہ السلام راہ میں جا بجا ٹھوکریں کھاتے باحال پریشان جب حضرت علی اکبرؑ کے قریب پہنچے تو اپنے کڑیل جوان کو ایسی حالت میں دیکھا کہ خدا کسی باپ کو بیٹے کی یہ حالت نہ دکھائے کہ اٹھارہ برس کی کمائی خاک میں مل رہی ہے۔ آپ بے اختیار زمین پر گر پڑے اور دم توڑتے ہوئے بیٹے کو چھاتی سے لگا کر فرمانے لگے۔

"بیٹا! کیا حال ہے؟"

عرض کی بابا جان اب وقت آخر ہے۔ بابا میرا دم ٹوٹ رہا ہے۔ آپ میرے چہرے پر نظر نہ رکھیے۔ آپ سے اپنے جوان بیٹے کو دم توڑتے دیکھا نہ جائے گا۔ یہ سن کر امام مظلوم زار زار رونے لگے۔

بحر المصائب میں ہے کہ جناب علی اکبر اس خیال سے کہ امام مظلوم علیہ السلام میری تباہ حالت دیکھ کر دنیا سے گزر نہ جائیں۔ اس چوڑے زخم کو جو سنان بن انس ملعون کی برچھی کھانے سے سینے پر پیدا ہو گیا تھا اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپائے ہوئے تھے۔ امام مظلوم علیہ السلام نے کئی بار چاہا کہ سینے سے ہاتھ ہٹا دیں لیکن حضرت علی اکبر نے نہ ہٹائے۔

حضرت نے پوچھا۔ بیٹا سینہ پر سے ہاتھ کیوں نہیں ہٹاتے۔ عرض کی بابا میرے سینے میں درد ہے۔ حضرت نے فرمایا بیٹا ہاتھ ہٹاؤ تاکہ میں تمہارا سینہ دباؤں۔ یہ کہہ کر حضرت نے وہاں سے علی اکبر کے ہاتھ ہٹائے

آہ! ہاتھوں کا ہٹانا تھا کہ خون کا ایک فوارہ سینہ سے پھوٹ نکلا جس کے ساتھ ہی اس شیر جوان کا منکا ڈھل گیا۔ اور ایک گہری سانس لے کر حسین مظلوم کی گود میں دم توڑ دیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

فرماتے ہوئے جوان پسر کی لاش سے اُٹھے۔

آہ! یہ عالم ضعیفی پھر بہتر شہیدوں کے دل پر داغ۔ پھر صبح سے لاشے اُٹھاتے اُٹھاتے یہ وقت آیا۔ تین دن کی بھوک اور پیاس۔ پھر جوان بیٹے کا غم۔ بدن میں اتنی طاقت کہاں کہ کڑیل جوان کی لاش اُٹھا کر خیمے میں لے جائیں۔

سخت متردد ہیں کہ یہ کام کیونکر انجام دیں۔ ایک بار حضرتؑ کا دل بھر آیا اور اپنے ناصروں اور دوستوں کو پکارنا شروع کیا۔

"اے حبیب ابن مظاہر، اے مسلم عوسجہ، اے زہیر بن قین۔ اے عباس، اے قاسم، اے عون و محمد میری مدد کو آؤ۔ اے میرے بہادر جوانو! جوان بیٹے کی میت حسینؑ سے نہیں سنبھلتی کیونکر اسے خیمے تک لے جاؤں۔ آہ! اس وقت بے کسی میں کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔

نہیں معلوم حضرت کس طرح سے لاشِ حضرت علی اکبر کو اُٹھا کر خیمہ گاہ تک لائے۔ آہ! خیمہ تک حضرت کو پہنچنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ ہر ہر قدم پر آہ کا نعرہ مارتے تھے اور علی اکبر کو مخاطب کر کے فرماتے تھے۔

"بیٹا! کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتا بیٹا علی اکبر یہ تمہارا کام تھا کہ تم ہماری لاش کو اُٹھاتے۔ لیکن آہ! یہ زمانے کا انقلاب ہے کہ ایک جوان بیٹے کی لاش کو ایک بوڑھا باپ اُٹھا رہا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ جب حضرت علی اکبرؑ میدانِ کربلا میں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے نکلے تو جناب اُم لیلیٰ نے یہ انتظام کیا کہ جناب فضہ کو درِ خیمہ پر کھڑے ہونے کا حکم دیا اور یہ کہہ دیا کہ فرزند رسول کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اگر میرے بچے کو کسی مصیبت کا سامنا ہوگا تو بہ حیثیت باپ ہونے کے مظلومؑ کربلا کے چہرے کا رنگ بدلے گا اور ان کو پریشان دیکھ کر فضہ کے چہرے پر تغیر ہوگا کیونکہ انہوں نے فرزند رسولؑ کو پالا ہے۔ پس فضہ کے چہرے سے مجھے یہ پتہ چل جائے گا کہ میرا بچہ خطرے میں ہے۔ چنانچہ جب حضرت علی اکبر کی آواز سن کر

امام مظلوم مقتل کی طرف روانہ ہوئے تو فضہ کے چہرے کی رنگت بدلی۔ جس سے جناب اُم لیلیٰ گھبرا گئیں۔

اور فضہ سے پوچھنے لگیں۔

"کیا بات ہے؟"

انہوں نے کہا بی بی تمہارے بچے کی خیر نہیں معلوم ہوتی۔ فرزند رسول گھبرائے ہوئے میدانِ جنگ کی طرف گئے ہیں۔

یہ سنتے ہی جناب اُم لیلیٰ گھبرائیں اور سر کے بال کھول کر اور درگاہ قاضی الحاجات میں عرض کرنے لگیں۔

"الہٰی میرے بچے کی خیر ہو۔ یا اللہ میری اٹھارہ برس کی کمائی ہے تو ہی اس کو اپنی حفظ و امان میں رکھنے والا ہے۔

مقتل ابوالمعالی میں ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام لاش علی اکبر کو مقتل سے لا رہے تھے تو فرطِ ضعف سے حضرتؑ کا یہ حال تھا کہ بار بار لاش زمین پر رکھ دیتے تھے اور فضہ در خیمہ سے یہ حال دیکھ رہی تھیں۔

روتی پیٹتی نکل پڑیں۔

اور امام مظلوم کے پاس جا کر عرض کرنے لگیں۔

"میرے مظلوم شہزادے فضہ تیری غربت اور بے کسی پر نثار لاؤ میں جوان بیٹے کی لاش کو اُٹھانے میں تمہاری مدد کروں۔"

ہائے ہمارے امام مظلوم علیہ السلام پر کیسا سخت وقت آ گیا تھا کہ بوڑھی فضہ کے سوا کوئی اتنا نہ تھا کہ شہزادہ علی اکبر کی لاش اُٹھانے میں مدد کرتا۔ چنانچہ اور دیگر کنیزوں کی مدد سے امام مظلوم علیہ السلام علی اکبر کی لاش کو خیمہ میں لے کر آئے۔

صاحب اکلیل المصائب لکھتے ہیں کہ

"خیام حسینی میں اس شہید پر ایسا کہرام بپا ہوا تھا کہ کسی شہید کی میت پر ایسا نہیں ہوا تھا جتنا شہزادہ علی اکبر کی لاش آنے پر ہوا۔

ہر طرف سے وا علی اکبر واہ علی اکبرا واثمرۃ الفواده کے نعرے بلند تھے۔

سیدانیوں کی جانوں پر بنی ہوئی تھی ۔ ہر بی بی اپنے اپنے عزیز کا ماتم بھولی ہوئی تھی جوان علی اکبر پر سینہ زنی ہو رہی تھی ۔ سب نے سر کے بال کھول دیئے تھے ۔ اور حسین مظلوم کے گرد بل جوان علی اکبر پر سینہ زنی ہو رہی تھی ۔ بالخصوص جناب زینبؑ اور اُم لیلیٰ کی حالت بہت خراب تھی ۔ ایک مرگ علی اکبر بہت ہی چیزوں کی موت تھی آج فاطمہ صغرا کی حسرت دوبارہ مر گئی ۔ بھائی کی آمد کا انتظار اور کنبہ سے جانے کا شوق ختم ہو گیا ۔

ام لیلیٰ اور جناب زینبؑ کا یہ ارمان مر گیا کہ علی اکبر کے سر پر شادی کا سہرا دیکھیں گے ۔ حسین علیہ السلام کی یہ تمنا مر گئی کہ بیٹا باپ کو دفن کرے ۔ سیدانیوں کی یہ امید ختم ہوئی کہ فرزند رسول بچ جائیں گے ۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۸/۱۱ هود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۲۷/۲۶

اٹھارہویں مجلس

تفسیر آیۂ اَفَمَن کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّن رَّبِّہٖ الخ

اور

شہادت حضرت علی اصغر علیہ السلام

اَفَمَن کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّن رَّبِّہٖ وَیَتلُوہُ شَاھِدٌ مِّنہُ وَمِن قَبلِہٖ کِتٰبُ مُوسٰٓی اِمَامًا وَّرَحمَۃً ط

(ھود ۱۷/۱۱)

ترجمہ:۔ کوئی اس کے برابر بھی ہو سکتا ہے جو اپنی صداقت پر اپنے رب کی طرف سے دلیل رکھتا ہو اور گواہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ جو اسی کا جزو ہو اور اس سے پہلے کتاب موسیٰ جو امام و رحمت ہے (اس کی صداقت کی گواہ ہے)

اس آیت میں سرکار دو عالم کی صداقت کے دو گواہ بنائے گئے ہیں۔ ایک کتاب خدا، دوسرے شاہد ناطق جو جزو بدن رسول ہے اور اسی کے نشان قدم پر چلنے والا ہے۔

ان دونوں گواہوں میں ایک مِّن رَّبِّہٖ یعنی خدا کی طرف سے ہے۔ (قرآن) دوسرے یعنی رسول کی طرف لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جو گواہ خدا کا ہے وہ نکلا رسولؐ کے گھر سے اور جو رسولؐ کا گواہ تھا (علی) وہ نکلا خدا کے گھر سے۔ یک جہتی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہماری چیز تمہاری، چیز تمہاری چیز ہماری چیز۔ تمہارا گھر، ہمارا گھر، ہمارا گھر تمہارا گھر۔ یا شاید یہ وجہ ہو۔ کہ قرآن صامت ہے اور علی ناطق۔ لہذا افضل کو اپنے گھر سے نکالا اور رسولؐ نے دونوں گواہوں کے دامنوں میں یہ کہہ کر گرہ لگادی عَلِیٌّ مَعَ القُراٰنِ وَالقُراٰنُ مَعَ عَلِیٍّ یعنی ایک دوسرے سے جدا ہونے والے نہیں۔

دو چیزیں جب ایک ساتھ رکھی جاتی ہیں تو ان میں کوئی مناسبت ہوتی ہے کتنا احمق ہوگا وہ شخص جو بلبل اور کوے کو ایک پنجرے میں بند کر دے۔ سیرت شناس تو ایسا نہیں کر سکتا۔

مدینہ پہنچ کر جب حضرت رسولؐ خدا نے مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کی تو ایک مہاجر کو ایک ناصر و انصار سے یہ کہہ کر ملا دیا کہ تم دنیا میں ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ جب غور کیا تو معلوم ہوا کہ جس کی جیسی سیرت تھی اس کو اسی سیرت والے سے ملایا گیا۔ مومن کو مومن سے اور منافق کو منافق سے۔

جب سب کے درمیان مواخات قائم ہو چکی۔ اور حضرت علیؑ کو کسی کا بھائی نہ بنایا گیا تو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہونے لگے کہ ان کا کوئی بھائی نہ بنا۔ یہ یوسف بے کارواں ہی رہے۔ یہ حال دیکھ کر حضرت علی آبدیدہ ہوئے۔ حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا اے علیؑ! میرے پاس آؤ۔ اس کے بعد اپنے سینے سے لگا کر فرمایا۔ یا علیؑ انت اخی فی الدنیا والاخرۃ۔ (اے علی تم میرے بھائی ہو دنیا اور آخرت میں۔

پس معلوم ہوا قرآن اور علیؑ میں کوئی مماثلت اور مشابہت ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ جس طرح قرآن کا جواب ناممکن ہے اسی طرح بلحاظ علم و عمل اور کمالات نفسانی علی کا جواب ناممکن۔

اب رسولؐ کی رسالت کے ان دونوں گواہوں کی خصوصیات سنیئے۔

قرآن اسلام کا ایک دائمی قانون ہے جو بطورِ معجزہ حضرتؐ پر نازل ہوا۔ قرآن ہر قول و فعل محمدی کی ثنا خوانی کرتا ہے۔ یہ شرف صرف زبان محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو حاصل ہوا کہ ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کلام خدا ہے۔ قرآن تصدیق رسالت میں ایک زبردست مثبتہ ہے۔ کہ باوجود انتہائی کوشش کے کفار اس کی مثل نہ لا سکے۔ پورا قرآن تو کیا دس سورے اور دس سورے تو کیا ایک سورہ اور ایک سورہ تو کیا ایک آیت ایسی نہ لا سکے۔ آخر مجبوراً مشرکین کو یہ کہنا پڑا کہ یہ کلام بشر نہیں ہے۔

اس بارے میں علمائے اسلام کا اختلاف ہے کہ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے با اعتبار الفاظ یا باعتبار معنی یا باعتبار الفاظ و معنی دونوں، ایک گروہ کہتا ہے خدا نے پورے قرآن کو ان ہی الفاظ میں جو ہمارے سامنے ہے اپنی قدرت سے لوح محفوظ میں لکھ دیا تھا وہاں سے جبریلؑ امین تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت حضرتؐ کے پاس لاتے رہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ (۸۵/۲۱-۲۲ بروج)

بعض کا خیال ہے کہ یہ الفاظ جبرائیل کے ہیں۔ یعنی ان کے معنی خداوند عالم نے ان پر نازل کئے اور انہوں نے ان معنی کو اپنے الفاظ میں حضرت صلعم کی خدمت میں پہنچایا جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿٤٠﴾

۴۰/۶۹ الحاقہ

بعض کا خیال ہے کہ معنی خدا کی طرف سے ہیں اور الفاظ آنحضرتؐ کے جیسا کہ فرماتا ہے۔ جیسا کہ

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ﴿١٩٥﴾

۱۹۵-۱۹۲/۲۶ سورہ شعرا

یعنی قرآن کے معجزہ ہونے اور اس کی عصمت کے لحاظ سے پہلی ہی رائے اولیٰ ہے۔ یعنی الفاظ اور معنی دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت جبرئیلؑ پر معنی کو اتارا اور انہوں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے قول کی تردید ہے جو قرآن کو شاعر یا کاہن کا کلام کہتے تھے پس ان کو بتایا گیا کہ یہ کلام ایک رسول کریم (جبرئیلؑ یا محمدؐ) کا ہے اس کے بعد صاف بتایا گیا۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ﴿٤٢﴾ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٣﴾

۴۱/۶۹ الحاقہ

چونکہ حضور یا جبرائیل کی زبان سے دوسروں کو ملا ہے اس لیے مجازاً قول رسول کریم کہا گیا ہے اسی طرح تیسرا قول

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى
قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾

(شعرا ۲۶/۱۹۲-۱۹۵)

اور اے رسولؐ بیشک یہ قرآن ساری خدائی کے پالنے والے خدا کا اُتارا ہوا ہے جسے روح الامین جبریلؑ صاحب عربی زبان میں لے کر تمہارے قلب پر نازل ہوئے تاکہ تم بھی اور پیغمبروں کی طرح لوگوں کو عذاب سے ڈراؤ۔

پس اس کے معنی یہ ہوئے کہ جبریلؑ عربی زبان میں قرآن لے کر تم پر اُترے تاکہ اس کے ذریعے سے تم لوگوں کو ڈراؤ۔ دوسرے خدا نے اپنے کلام مقدس کے لئے دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرے کتاب یہ الفاظ اور معنی دونوں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔

جو لوگ الفاظ قرآن کو معجزہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کا دعوےٰ ہے کہ ایسا کلام لے آؤ۔ یہ ان فصحا و بلغاء عرب کے مقابل تھا کہ جن کو اپنے کلام کی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا نہ کہ مفاہیم کی بلندی پر کیونکہ وہ اس کے دعوے دار ہی نہ تھے پھر اس معاملہ میں ان سے تحدی کیسی؟

جو لوگ معانی و مفاہیم کو معجزہ قرار دیتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر بلحاظ فصاحت و بلاغت الفاظ قرآن معجزہ ہو تو اس سے تحدی صرف عربوں کے مقابل ہو سکتی ہے نہ کہ ان لوگوں سے جو عربی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ اور اگر بلحاظ علوم و معارف معجزہ ہو گا تو تمام دُنیا کو چیلنج ہو سکے گا۔ بعض کی رائے ہے کہ قرآن کریم دونوں اعتبار سے معجزہ ہے اور یہی صحیح ہے۔

یہ بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے کہ وہ آج تک اصلی صورت پر باقی ہے۔ خواہ مسلمان کسی خطہ ارض پر ہوں کسی قوم اور ملک کے ہوں۔ ان کی مادری زبان کوئی بھی ہو۔ وہ ہر جگہ قرآن کو اصلی صورت میں رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے کوئی اور آسمانی کتاب اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں۔

توریت و انجیل کی اصل صورتیں غائب ہیں صرف ان کے ترجمے پائے جاتے ہیں ہر جگہ یہی وجہ ہے کہ علمائے یہود و نصاریٰ کو تصرفات و تحریفات کے بہت سے مواقع مل گئے ہیں۔

سوائے قرآن کے اور کسی آسمانی کتاب کا یہ دعویٰ نہیں کہ کائنات کی ہر شے کا بیان ان کے اندر ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی ان آیات سے ظاہر ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۵۹ ۶/۵۹ انعام

غیب کی کنجیاں تو اس کے پاس ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ جو درخت سے پتہ زمین پر گرتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ کہیں ہے وہ اُسے بھی جانتا اور کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب مبین کے اندر نہ ہو۔

لیکن دیکھنا یہ ہے ایسی جامع کتاب سے مسلمانوں سے لیا گیا۔

صرف چند فقہی مسائل انبیاء علیہم السلام کے چند قصے۔ گزشتہ قوموں کے چند واقعات باقی اللہ اللہ خیر سلاّ تو اگر قرآن صرف ان ہی چند چیزوں کا نام ہے تو پھر اس کا یہ دعویٰ کیونکر صحیح ہوگا کہ میرے اندر سب کچھ ہے چونکہ قرآن کریم کا دعویٰ غلط نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے الفاظ کو پڑھنے اور رٹنے سے غرض رکھی۔ اس کے حقائق و معارف میں غور و فکر سے کام نہ لیا اور اس کتاب کو ان سے نہ سمجھا۔ جن کے سینوں میں اس کتاب کا علم تھا۔ اور جو براہِ راست خدا و رسولؐ سے تعلیم حاصل کیے ہوئے تھا۔ جن کے متعلق قرآنِ کریم نے یوں خبر دی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۴۸ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾

۲۹/۴۸-۵۰ العنکبوت

اے رسول قرآن نازل ہونے سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھا کرتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا ہی کرتے تھے۔ ایسا ہوتا تو ضرور یہ جھوٹے تمہاری نبوت میں شک کرنے لگتے۔ مگر جن لوگوں کو خدا کی طرف سے علم عطا ہوا ہے اُن کے دلوں میں یہ (قرآن) واضح اور روشن آیتیں ہیں اور سرکشوں کے سوا ہماری آیتوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ (کفارِ عرب) کہتے ہیں کہ اس (رسولؐ) پر خدا کی طرف سے معجزے کیوں نہیں نازل ہوتے۔ تم کہدو کہ معجزے تو بس خدا ہی کے پاس ہیں۔ میں تو صاف صاف (عذابِ خدا سے) ڈرانے والا ہوں۔

حکومتوں کے جبر و تشدد نے علمائے اسلام کے تعصب نے، پبلک کی بے توجہی نے ان کو حقائق قرآن کے بیان کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

قرآن اور احادیث قدسی کا فرق بھی سمجھ لینا چاہیے۔ قرآن کے الفاظ معجزہ قرار دیئے گئے ہیں اور حدیث قدسی کے نہیں۔ البتہ اس کا مفہوم خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور وحی کے ذریعے سے تعلیم دیا جاتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ اس پر شاہد ہے۔

۵۳/۳-۴ النجم

قرآن کے خصوصیات بتاتی رہیں کہ اس کے کتاب خدا ہونے میں شک و ریب کو گنجائش نہیں

لاریب فیہ

اس کی پہلی صفت ہی یہ ہے لیکن اُمت محمدیہ کے بہت سے افراد تھے۔ جن کو در پردہ اس کے کلام خدا ہونے میں شک تھا۔ لہٰذا کتابِ خدا صرف ان ہی لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہو سکتی ہے جن کو کبھی اس میں شک ہوا ہی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن ان کے متعلق یوں خبر دیتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا

وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

(۱۵/۴۹ حجرات)

ترجمہ:۔ (جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر کبھی شک نہ کیا) یہ وہی مومنین تھے جو قرآن کے حقیقی وارث تھے اور جن کو رسولِ خدا نے اس طرح تعلیم دی تھی جس طرح طائر اپنے بچے کو بھراتا ہے اور جن سے وراثتِ قرآن کا صحیح معنی میں تعلق ہے البتہ جو لوگ بہ تکلّف وارث بن بیٹھے۔ وہ ہمیشہ شک میں پڑے رہے جیساکہ خدا فرماتا ہے۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۴﴾

(۱۴/۴۲ شوریٰ)

جو لوگ ان کے وارث بنائے گئے وہ قرآن کے متعلق ہمیشہ شک ہی میں پڑے رہے اور ثوا مجہول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں وارث بنا لیے گئے، ہم نے نہیں بنایا۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ قرآن کا اصلی تعلق کن لوگوں سے ہے۔ قرآن اس کا جواب یوں دیتا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾

۵۶/۷۹ واقعہ

یہ قرآن کریم ایک چھپی ہوئی کتاب کے اندر ہے جس سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر پاک و پاکیزہ لوگ کتاب سینۂ رسول میں پوشیدہ ہے اور اس کا تعلق مطہروں (پاک) سے ہے۔

کتاب اور قرآن میں ایک فرق ہے۔ اللہ نے اپنے قلم قدرت سے جو قلب رسولؐ پر لکھ دیا وہ کتاب اللہ ہے۔ المکتوب بید اللہ اور جو رسولؐ نے پڑھ کر سنایا وہ قرآن کہلایا۔ پس قرآن زبان سے کان

تک اور کان سے دل تک گیا اور اس کا تعلق عوام سے رہا۔ کتاب کا تعلق چونکہ خواص سے ہے اس لیے وہ دل سے دل میں پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا تعلق کتاب اللہ یا مفہوم کتاب سے تھا رسول اللہ ان کو اپنے سینے سے لگا کر دل کے نقش دل پر اُتار دیتے تھے۔ لیکن ہر سینہ اس قابل نہ تھا کہ سینۂ رسول سے متصل ہو کر الوہی فیض حاصل کر لیتا۔ اس کے لیے کچھ مخصوص سینے بنائے گئے تھے۔ اس کو ہم ایک مثال کے ذریعے سے واضح کرتے ہیں۔ فوٹو گرافک کیمرہ سے پلیٹ پر جو تصویر لی جاتی ہے۔ وہ معمولی کاغذ پر نہیں چھپتی۔ اگر کوئی نادان آدمی معمولی کاغذ پلیٹ پر لگا کر فریم میں کس دے۔ اور چند گھنٹے کیا اگر کئی دن متواتر بھی یہ انصالی باقی رکھے۔ تب بھی تصویر نہ اُترے گی۔ البتہ جو کاغذ اس کے لیے مخصوص ہے۔ مثلاً بروما ئڈ پی او پی پیپر تو تصویر اُتر آئے گی۔

کتاب اللہ قلب رسولؐ پر اُتاری گئی اور زبان سے بیان کی گئی۔ پس جن کا تعلق سینہ بہ سینہ اور قلب بہ قلب رہا۔ انہوں نے معنی حقیقی تک رسائی پیدا کی۔ اور جنہوں نے صرف زبان سے تعلق رکھا انہوں نے صرف الفاظ لیے چنانچہ آج تک ان ہی کو رٹتے جاتے ہیں۔ اور ان ہی کو شک رہا کیونکہ الفاظ محتاج تاویل ہوتے ہیں اور معنی حقیقی کو تاویل سے کوئی تعلق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دل سے دل تک کن لوگوں کے پاس پہنچا بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔ ۲۹/۴۹ عنکبوت

(وہ آیات بینات ان لوگوں کے سینوں میں ہیں۔ جن کو علم دیا گیا ہے)

نہ کہ جن کو پڑھایا گیا ہے۔ قرآن قلب رسولؐ پر اُترا اور وہاں سے چھلک کر زبان پر آیا متلاطم سمندر میں چھلک کر آنے والے جھاگ ہوتے ہیں موتی ہمیشہ تہہ میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کو تو غوطہ لگانے والے اور گہرائیوں میں اترنے والے ہی پاتے ہیں۔ ان موتیوں سے تعبیر ہم حقائق قرآنی کو کرتے ہیں۔ جو راسخون فی العلم کے سینوں میں محفوظ تھے۔ عام لوگوں نے تو اپنا تعلق تو صرف لفظوں سے رکھا۔ اور بس اس پر مستزاد یہ کہنا کہ ہمیں کتاب خدا کافی ہے۔

آیہ زیرِ عنوان میں رسول کی رسالت کے دو گواہ ہیں۔ قرآن اور علیؑ۔ قرآن کے وصف میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ اور علی علیہ السلام کے وصف میں ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ؀ (ہم نے امام مبین میں سے ہر شے کا احصا کر دیا ہے) رسولؐ کی رسالت کا حقیقی گواہ وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس علمِ قرآن ہے۔ کیونکہ رسالت کیا ہے۔ عین قرآن اور قرآن کیا ہے عین رسالت۔ اگر کسی کو علمِ قرآن نہیں اور وہ تصدیق رسالت کر دے تو ایسا

ہی ہے کہ ایک شخص واقعے سے بے خبر ہو اور گواہی دینے عدالت میں آجائے۔ اس گواہی کا ذکر اپنی گواہی میں خدا نے یوں فرمایا ہے۔

وَيَقُولُ

الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ

وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾ (۱۳/۴۳ رعد)

"اے رسولؐ کہہ دے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی دینے کو اللہ کافی ہے اور وہ ذات جس کے پاس علم کتاب ہے۔

یہی خاص گواہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ ویتلوہ شاھد منہ

یہ بات یاد رکھیئے کہ اہل بیت رسولؐ کے سوا آنحضورؐ کے جتنے گواہ تھے۔ سب سماعی تھے یعنی سرکارِ دو عالم نے انہیں کہا تھا کہ میں رسولؐ ہوں۔ یہ سُن کر انہوں نے کہہ دیا تھا امنّا و صدقنا کسی نے آنحضورؐ کو رسول بنتے نہیں دیکھا تھا۔ عینی گواہ تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو شریک نورِ رسالتؐ ہو اور وہ جناب علی علیہ السلام ہیں۔ جن کے متعلق رسولِ خدا نے فرمایا۔ انا و علی من نور واحد پس جب علی علیہ السلام شریک نورِ رسالت تھے تو لا محالہ جب سرکار دو عالم کے سر تا پر تاجِ رسالت رکھا گیا ہوگا تو اس کے دیکھنے والے علیؑ ہی ہوں گے۔ نورِ رسالت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی دو ہی مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ توحید خدا کے لئے مخصوص رہے دوسرے یہ کہ حضرتؐ کی نبوت کا عینی گواہ پیدا ہو جائے۔

یہ گواہ قرآن کے ساتھ ساتھ پیش کیا گیا ہے اگر دونوں گواہوں کی حیثیت برابر نہ ہو۔ یعنی ایک نہایت بلند مرتبہ ہو اور دوسرا حد درجہ پست تو گواہی میں سقم پیدا ہو جاتا ہے اور اعلیٰ مرتبے والے کی وقعت گر جاتی ہے۔ قرآن کے ساتھ اگر ایک جاہل کو گواہی میں پیش کر دیا جاتا تو اس سے قرآن کی توہین تھی لہٰذا ایک ایسا گواہ پیش کیا گیا جس کا مداح خود قرآن ہے۔ بلکہ ایک صورت میں وہ قرآن سے افضل ہے کیونکہ قرآن صامت ہے اور وہ ناطق قرآن نقشِ رسالت ہے اور وہ نفسِ رسالت۔ وہ مقدم ہے اور قرآن تالی کیونکہ قرآن کا بہت سا حصہ اس کے عمل نے بنایا ہے۔ جب علیؑ بسترِ رسولؐ پر سوئے۔ تب آیہ

ومن الناس من یشری نازل ہوئی۔ جب آپ نے الفائے نذر کی تب آیہ یوفون بالنذر نازل ہوئی۔ جب آپ نے رکوع میں انگوٹھی دی تب انما ولیکم اللہ کا نزول ہوا۔ جب جہاد میں ثابت قدم ہو کر لڑے۔ تب

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾ (۶۱/۴ الصف)

نازل ہوئی۔ علی علیہ السلام ہی وہ گواہ تھے۔ جنہوں نے پیدا ہوتے ہی رسالت کی بھی گواہی دی اور قرآن کی بھی تصدیق کی تاکہ سب لوگ جان لیں کہ وہ وہاں کے سیکھے ہوئے ہیں جہاں حضورؐ کو رسالت ملی ہے اگر بعد میں تصدیق کرتے تو لوگ کہہ دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ نے پڑھا دیا ہے۔

دُنیا میں سیکھے ہوئے قرآن کو زیادہ سے زیادہ دو چار روز میں ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن خدا کے یہاں کے سیکھے ہوئے جب ایک پیر رکاب میں رکھتے ہیں تو قرآن شروع کرتے ہیں اور جب دوسری رکاب میں دوسرا پیر رکھتے ہیں تو ختم کر دیتے ہیں جن کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی وہ بتائیں کہ چشم زدن میں رسولؐ کا معراج پاکر واپس آنا ان کی سمجھ میں کیسے آجاتا ہے۔ وہ معراج جسمانی تھی اور یہ معراجِ لسانی۔

رسالت کے دو جزو ہیں ایک علم اور دوسرے عمل۔ ان دونوں کے لیے دو گواہ قدرت نے بیان کیے۔ ایک قرآن جو علم صحیح ہے دوسرے علیؑ جو عمل صحیح ہیں۔ ان میں سے ایک بھی چھوڑنے کے قابل نہیں۔ حدیث میں ہے۔

اَلْعِلْمُ بِدُوْنِ الْعَمَلِ وَبَالٌ وَّالْعَمَلُ بِدُوْنِ الْعِلْمِ ضَلَالٌ۔

(علم بغیر عمل کے وبال ہے اور عمل بدون علم گمراہی ہے)

چونکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ لہٰذا رسولؐ نے دونوں کا بندوبست کر دیا جیسا کہ حدیث ثقلین سے ظاہر ہے۔ جس طرح قرآن قیامت تک باقی رہنے والا ہے اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کی ہدایت کا سلسلہ بھی قیامت تک باقی رہے گا اور یہ دونوں جب تک حوضِ کوثر پر رسول کے پاس نہ پہنچیں گے۔ ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔

جن لوگوں نے صرف کتاب خدا کو اپنی ہدایت کے لیے کافی سمجھا۔ انہوں نے لفظوں سے غرض رکھی اور معانی سے الگ رہے ان کی مثال اس نادان مریض کی سی ہے جو طبیب کے نسخہ کو چاٹ کر شفا حاصل کرنا چاہتا ہے

بالغیر طبیب کے مشورہ کئے کوئی دوا استعمال کرنے لگے۔ نہ اسے مرض کی تشخیص نہ ادویہ کے اثرات و مقدار سے واقفیت۔ نہ ان کی ترکیب سے آگاہی۔ نہ پرہیز کا علم۔ ایسی صورت میں اس کی ہلاکت یقینی ہے یا نہیں۔ آج دنیا میں فنِ طب کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بغیر کسی طبیب کے پڑھائے کتابوں کا مطالعہ کرکے کوئی شخص طبیب بن جائے۔ وہ کتابوں سے یہ تو جان سکتا ہے کہ فلاں دوا فلاں مرض کے لئے ہے۔ لیکن یہ کون بتائے گا کہ فلاں مریض کا مزاج کیا ہے۔ کس مرض میں مبتلا ہے۔ یا اس کو وہ مرض ہے بھی یا نہیں۔ جس کی وہ دوا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اصل مرض کو نہ سمجھنے والے کچھ کی کچھ دوا دے بیٹھے اور جب اُلٹا اثر دیکھا تو اصل طبیب کے پاس دوڑے آئے کہ اس کو سنبھالو۔ جب اس طبیب نے تشخیص مرض کرکے دوا دے دی تو کہنا پڑا کہ اے علیؑ! اگر تم نہ ہوتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔"

کتب تفاسیر سے ثابت ہے کہ قرآن کی قراءت میں اختلاف ہے۔ الفاظ میں حرکات و سکنات میں رموز و اوقاف میں ترتیب، آیات، املا میں، تاویل میں۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے تو یہ اختلاف ہے ہی نہیں۔ لامحالہ بندوں ہی کی طرف سے ہے۔ پس اگر قرآن کافی ہے تو مٹانے والے ذرا اس اختلاف کو مٹا دیں۔ ہاں یہ اختلاف مٹ سکتا ہے اگر ید قدرت سے لکھا ہوا نسخہ سامنے ہو۔ اللہ کا لکھا دغیرہ پر تو ہے نہیں بلکہ وہ تو قلبِ رسولؐ پر مکتوب تھا۔ وہاں تک نہ کسی کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے نہ آنکھ۔ علاوہ بریں اب رسولؐ دنیا میں موجود نہیں۔ ایسی حالت میں اب کیا ہو لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کی ایک نقل مطابق اصل (TRUE COPY) ہر زمانہ میں موجود رہے۔ اور اس سے ملا کر دیکھا جائے اور یہ نقل نہیں محفوظ ہو سکتی مگر معصوم کے پاس جو لایمسہ الا المطھرون کا مصداق ہو۔

قرآن کی اصل منزل غیب ہے لوحِ محفوظ میں سب سے پہلے اترا وہ غائب۔ وہاں سے قلب رسولؐ پر اترا وہ غائب۔ پھر سینوں سے سینوں میں چلا وہ بصورتِ غیب۔ جس کا کلام وہ بھی غائب جو امین وحی لے کر آیا وہ بھی غائب جن کی ہدایت کے لیے آیا وہ بھی یومنون بالغیب اب اصل کاپی جس کے پاس ہے وہ بھی غائب۔

خیال کرو قرآن وہ باعظمت کتاب ہے۔ کہ بغیر وضو اس کی کتابت مس نہیں کی جا سکتی۔ چاہے کسی کافر نے ہی لکھوا کر چھاپ دیا ہو۔ تو پھر اللہ کے قلم کا لکھا ہوا کتنا طاہر ہوگا اس کو عام لوگوں کی نگاہیں بھی مس نہ کر سکیں گی۔ ہاتھ لگانا تو درکنار۔ اس کو مس کرنے والے معمولی پاک لوگ کبھی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کو اللہ نے پاک کیا ہو۔

ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کو چھوتے کے لیے تو طہارت کی ضرورت مگر رسولؐ کو مس کرنے کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک کٹورا پانی اگر کسی سے منگائیں اور اس کے ہاتھ خراب ہوں تو آپ کہیں گے کہ بغیر دھوئے اس میں ہاتھ نہ ڈالنا۔ لیکن اگر دریا بہہ رہا ہو تو آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہاتھ دھو کر اس میں ڈالنا۔ کٹورے میں چونکہ پانی کم ہے۔ لہٰذا وہ ذرا سی نجاست میں نجس ہو سکتا ہے اور دریا میں چونکہ پانی کثیر ہے لہٰذا وہ نجس نہیں ہو سکتا۔

رسولؐ ایک دریا ہیں اور قرآن ان کے مقابل ایک کوزہ۔ دیکھا نہیں کہ رسولؐ کی صحبت میں ہر قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ منافق۔ مومن۔ مستضعف مولفۃ القلوب۔ مذبذب۔ بلکہ کفار و مشرکین تک آتے جاتے تھے۔ لیکن ان کے ملنے جلنے سے کوئی تغیر نہ طبع رسالتؐ میں واقع ہونا تھا نہ ظاہری برتاؤ میں کوئی فرق آتا تھا نہ رفتار و گفتار و لباس میں کوئی تبدیلی ہوتی تھی۔ لیکن قرآن اصلی ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں پہنچا تو ترتیب بدل گئی۔ املا بدل گئی تاویل و تفسیر بدل گئی اعراب بدل گئے۔

قرآن کتاب صامت ہے اس کو ایسے ترجمان کی ضرورت ہے۔ جس کا صحیح مفہوم بے کم و کاست ادا کر دے۔ بتاؤ یہ ترجمان کون ہے پہلے تو رسولؐ تھے جو

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ② وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ③ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ④

(۵۳/۱-۴ نجم)

ستارے کی قسم جب ٹوٹا کہ تمہارے رفیق نہ گمراہ ہوئے ہیں نہ بہکے۔ وہ تو اپنی خواہشِ نفسانی سے کبھی بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

اسی بناء پر بے کم و کاست منشائے الٰہی کو بتانے والے تھے ان کے بعد بھی کوئی ایسا ہی ہونا چاہیے کلام اللہ کا صحیح ترجمان لسان اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ وہی ذات ہے جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی۔

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ

(۲۶/۸۴ الشعرا)

جس کے جواب میں خدا نے فرمایا تھا۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا

(۱۹/۵۰ مریم)

پس قرآن صامت کا دوسرا نسخہ اہلِ بیت رسولؐ ہیں ۔ جن کی شان یہ ہے

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ حوالہ ۳۰/۷۶ دہر

(دہر ۷۶/۳۰)

یہ ہیں وہ ناطق و صامت دو گواہ جو رسالت کی تصدیق کے لیے خدا کی طرف سے بھیجے گئے۔

يَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہد اسی رسولؐ کا جز وہے کوئی غیر نہیں اور وہ وہی ہو سکتا ہے جس کے لیے رسولؐ خدا نے فرمایا تھا۔ یا علی اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ الرَّاسِ مِنَ الْجَسَد (اے علی! تم کو مجھ سے وہی قربت ہے جو جسم کو سر سے ہوتی ہے۔ یہ وہی ذات ہے کہ جب سورہ برات کی تبلیغ کے لئے حضرت ابوبکرؓ بھیجے گئے۔ تو جبرئیلؑ نے آکر کہا: لَا یُؤَدِّیْھَا اِلَّا اَنْتَ اَوْ رَجُلٌ مِنْکَ (اس کی تبلیغ نہیں کر سکتا مگر تم یا وہ شخص جو تم میں سے ہو) یہ گواہ تالی ہے

جیسے آفتاب کے پیچھے پیچھے چاند

وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ﴿١﴾ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا ﴿٢﴾ (۹۱/۱،۲ البلد)

قسم ہے سورج کی اور اس کی چڑھتی دھوپ کی اور قسم ہے چاند کی جو اس کے پیچھے پیچھے آنے والا ہے۔ لفظ مِن سے جب نسبت دی جاتی ہے۔ تو وہ انتہائی قربت پر دلالت کرتی ہے۔ جیسے قرآن میں طالوت کا یہ قول نقل ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَھَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْہُ فَلَیْسَ مِنِّیْ وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْہُ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ۔ ۲۴۹ آیت البقرہ ۲ اللہ تمہارا امتحان ایک نہر کے ذریعے سے لے گا۔ پس جو اس سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہ ہوگا اور جو اس کو چکھے گا بھی نہیں وہ مجھ سے ہے یعنی اس کو مجھ سے انتہائی قربت ہوگی۔ پس رسولؐ سے انتہائی قربت رکھنے والے چار ہستیاں تھیں علیؑ۔ فاطمہؑ اور حسنؑ و حسینؑ علیہم السلام۔ ان چاروں کو آپؐ نے اپنے سے نسبت دی ہے۔ یا علیؑ اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَۃِ الرَّاسِ مِنَ الْجَسَد اور جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے بارے میں ہے۔ فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِنِّی الحسنؑ و الحسینؑ و انا من الحسینؑ یہ وہی ہستیاں تھیں جن کو تحت کساء کے رسولؐ نے فرمایا تھا اللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ اور یہی وہ ہستیاں تھیں جن کی شان میں آیہ تطہیر نازل ہوئی۔ اور یہی وہ ہستیاں ہیں جو رسولؐ کی رسالت کے عینی گواہ تھے۔ یہی وہ تھے جو مباہلہ میں رسولؐ کے

ساتھ توحید و رسالت کی گواہی دینے اور اپنی صداقت کا ثبوت پیش کرنے کے لیے نکلے تھے۔ یہی وہ تھے جن کے نورانی چہرے دیکھ کر نصارائے نجران کے سردار نے کہا تھا۔

یَا مَعْشَرَ النَّصٰرٰی لَا تُبَاهِلُوْ بِهِمْ اِنِّیْ لَاَرٰی وُجُوْهًا لَوْ سَأَلُوا اللّٰهَ اَنْ یُزِیْلَ الْجَبَلَ عَنْ مَکَانِهٖ لَاَزَالَهٗ

(اے گروہ انصار ان سے مباہلہ نہ کرو بے شک میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ خدا سے سوال کریں کہ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا دے تو وہ ضرور ہٹا دے گا۔

زمانہ کا یہ انقلاب دیکھنے کے قابل ہے کہ رسولؐ کی رسالت کے دو گواہ جو خدا کی طرف معین کیے گئے تھے مسلمانوں نے ان کے ساتھ وہ عمل کیا جو ان کے احترام کے سخت خلاف تھا۔ ایک طرف قرآن کو پارہ پارہ کیا الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ ﴿۹۱﴾ (۱۵/۹۱ الحجر)

ترجمہ:۔ آیت ۱۵/۹۱ (اے رسولؐ ہم ان کفار پر اسی طرح عذاب نازل کریں گے) جس طرح ہم نے اُن لوگوں پر کیا جنہوں نے قرآن کو بانٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ دوسری طرف اہل بیت علیہم السلام کے گلے پر چھری چلائی۔

ایک طرف قرآن کو جلایا۔ دوسری طرف اہل بیت علیہم السلام کا گھر پھونکا۔ ایک طرف صفین میں نیزوں پر قرآن بلند ہوا اور دوسری طرف کربلا میں عترت رسولؐ کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائے۔

آہ! آہ! رسولؐ کی رسالت کا جو تھا گواہ کربلا میں یکہ و تنہا کھڑا ہوا یہ آواز استغاثہ بلند کر رہا تھا هَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَّنْصُرُنَا۔ هَلْ مِنْ مُغِیْثٍ یُّغِیْثُنَا اور لاکھوں مسلمانوں کے مجمع میں کوئی ایسا نہ تھا جس کے دل پر حسینؑ کی آواز چوٹ مارتی۔ جن کے دلوں پر یہ آواز اثر کرنے والی تھی۔ وہ سب سر کٹائے خون میں نہلائے کربلا کی جلتی ریت پر پڑے تھے۔ البتہ خیام حسینی میں دو دل ایسے تھے کہ حضرتؑ کی یہ دردبھری آواز سن کر تڑپ گئے ایک بیمار ایک طفل شیرخوار۔

راوی کہتا ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام نے آواز استغاثہ بلند کی تو بیمار کربلا نے غش سے آنکھیں کھول دیں اور ایک ٹوٹا ہوا نیزہ لے کر میدان کی طرف چلنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر جناب زینبؑ دوڑیں اور کہنے لگیں۔

"اے فرزند کہاں کا قصد ہے؟"

آپ نے فرمایا "اے پھوپی اماں مجھے چھوڑ دو کہ میرے بابا جان تن تنہا ہیں اور اپنی مدد کے لیے بلا رہے ہیں۔ اب تاب ضبط نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی جان بابا کے قدموں پر نثار کر دوں۔ یہ کہہ کر خیمہ کا پردہ

اٹھایا اور باہر تشریف لے آئے ۔ ناگاہ امام مظلومؑ کی نظر اپنے بیمار فرزند پر پڑی ۔ بے چین ہو گئے وہیں سے پکار کر کہا ۔

"اے زینبؑ! علی بن الحسینؑ کو روکو ۔ یہ میرے بعد حجّتِ خدا ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا کوئی تیر پڑ جائے اور زمانہ حجّت خدا سے خالی ہو جائے ۔"

دوسرا اثر استغاثہ امامؑ کا اس چھ مہینہ کی جان پر ہوا ۔ جس کی ماں کا دودھ خشک ہو گیا اور جو بھوک اور پیاس کی وجہ سے جھولے میں نڈھال پڑا تھا ۔

راوی کہتا ہے جب امام علیہ السلام استغاثہ بلند کر رہے تھے تو یکایک خیمے سے گریہ و بکا کی آواز بلند ہوئی ۔ حضرتؑ یہ سن کر بے چین ہو گئے ۔ اور میدان سے خیمہ کا رُخ کیا ۔ جب خیمہ کے اندر داخل ہوئے تو فرمایا " کیا کوئی بچہ پیاس سے ہلاک ہو گیا ہے ۔"

جناب زینبؑ نے فرمایا ۔ ہلاک تو نہیں ہوا لیکن آپ کی آواز استغاثہ سن کر علی اصغرؑ ایسے بے چین ہوئے کہ اپنے کو جھولے سے زمین پر گرا دیا ۔

یہ سن کر امام مظلوم علیہ السلام گہوارۂ علی اصغرؑ کے قریب تشریف لائے ۔ دیکھا بچّہ نڈھال ہے ۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں ۔ چہرہ کا رنگ اُڑ گیا ہے ۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں ۔ آپ نے جناب رباب سے فرمایا "لاؤ میں اس بچّے کو اس قوم ستم شعار کے سامنے لے جاؤں ۔ شاید کوئی صاحبِ اولاد رحم کھا کر چند قطرے پانی کے اس بچّے کے منہ میں ٹپکا دے یہ فرما کر حضرتؑ نے بچّے کو اپنی گود میں لیا اور عبا کے دامن سے ڈھک کر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے ۔

راوی کہتا ہے کہ اس شیر خوار بچہ کو اپنے ہاتھوں پر رکھے ہوئے ایک بلند مقام پر تشریف لائے اور بچّے پر سے دامن ہٹا کر اس طرح اس قوم زبوں کردار سے خطاب کیا ۔

"اے قوم یہ میرا چھ مہینے کا شیر خوار بچّہ جس کی ماں کا دودھ بھی سوکھ گیا ہے پیاس سے بے حال ہے اے قوم اگر تمہارے خیال ناقص میں حسینؑ گنہ گار ہے تو اس معصوم بچّے نے تو تمہارا کوئی گناہ نہیں کیا ۔ اے اولاد والو انصاف سے کہنا کہ اگر تمہارا بچّہ اس حال میں ہوتا تو تمہارا دل کیا کہتا " اس کے بعد آپ نے اصغر معصوم کا رُخ اس قوم کی طرف کر کے فرمایا ۔

" بیٹا! علی اصغر تم بھی تو حجت خدا کے فرزند ہو اپنی حجّت اس قوم پر تمام کر دو " یہ سننا تھا کہ علی اصغرؑ نے اپنا منہ کھول کر پیاس سے اینٹھی ہوئی زبان باہر نکال دی ۔ امام علیہ السلام نے فرمایا " دیکھو پیاس سے اس بچّے کی کیا حالت ہے ۔ اس کے بہانے سے پانی نہیں مانگ رہا ۔ تم میں سے کوئی آگے بڑھے اور اس پیالے سے بچّے کا حلق

تر کر دے۔
حضرتؑ کا یہ کلام سنتے ہی فوج یزید کے کئی سپاہی منہ پھیر کر رونے لگے۔ بعض نے عمر سعد سے جا کر کہا، او شقی! تیری سنگ دلی کی انتہا ہو گئی۔ ارے ظالم اس شیر خوار بچے کا کیا قصور ہے کہ تو نے اس پر بھی پانی بند کر رکھا ہے کسی کو حکم دے کہ جلد بچے کو پانی پلائے۔ ورنہ یہ با ور ہے کہ اب تیرے اور ہمارے درمیان تلوار چلے گی۔
فوج کی یہ حالت دیکھ کر عمر بن سعد گھبرایا۔ اس کے پہلو میں کوفہ کا مشہور تیر انداز حرملہ بن کاہل اسدی کھڑا تھا اس سے کہنے لگا کیا دیکھتا ہے۔ اِقْطَعْ کَلَامَ الْحُسَیْنِؑ کلامِ حسینؑ کو قطع کر دے۔ یہ سنتے ہی اس ظالم نے تیر کمان میں لگایا، ایک ایسا شعبہ تیر جو پتھر پر مارتا تو اس میں در آتا چلہ کمان میں جوڑ کر اس زور سے حلقِ علی اصغر پر مارا کہ بچہ کا گلا اور حسینؑ کا بازو توڑتا ہوا زین میں در آیا۔
بچہ تیر کھاتے ہی حسینؑ مظلوم کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا اور ایک ہلکی سی سسکی لے کر جان دے دی۔ آہ! اس وقت امام علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور درگاہ باری میں عرض کی۔
"اے پروردگار گواہ رہنا کہ ان ظالموں نے میرے ایسے بچے کو شہید کیا ہے جو بے گناہی میں کسی طرح ناقہ صالح سے کم نہ تھا۔"
ایک اور روایت میں ہے کہ حضرتؑ نے حلقِ اصغر کے نیچے اپنا چلو لگا دیا۔ آہ! آہ!! چند قطرے شہ کے گلے سے ٹپک کر رہ گئے۔ حضرتؑ نے اس خونِ ناحق کو آسمان کی طرف پھینکنا چاہا۔ ادھر سے آواز آئی یا بن رسول اللہؐ! اس خونِ ناحق کو میری طرف نہ پھینکئے۔ ورنہ اس غم میں ایک قطرہ پانی کا مجھ سے قیامت تک نہ برسے گا۔ پھر چاہا کہ زمین کی طرف پھینک دیں۔ ناگاہ آواز آئی یا بن رسول اللہؐ اس خونِ ناحق کو میری طرف نہ پھینکئے۔ ورنہ اس غم میں تا قیامت ایک دانہ غلہ کا مجھ سے روئیدہ نہ ہوگا۔ آہ! ایسی حالت میں امام مظلوم علیہ السلام کیا کرتے۔ مجبوراً اس خونِ ناحق کو اپنے چہرۂ اقدس پر مل لیا اور فرمایا ؎

انکار آسماں کو ہے راضی زمیں نہیں
اصغر تمہارے خوں کا ٹھکانا کہیں نہیں

ایک اور روایت میں ہے کہ خون علی اصغر اپنے چہرہ پر مل کر اس قوم جفا شعار سے فرمایا۔
"اے قوم آگاہ ہو کر روزِ حشر اسی طرح خون چہرہ پر ملے درگاہ ایزدی میں حاضر ہوں گا اور خدا اور رسولؐ سے تمہارے اس ظلم کی فریاد کروں گا۔" اس کے بعد حضرتؑ لاش علی اصغر ہاتھوں پر رکھے خیمہ گاہ کی جانب

روانہ ہوئے۔
جب قریب خیموں کے پہنچے تو کبھی چند قدم آگے بڑھتے تھے اور کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ اسی عمل کی تاسی میں ہم روز عاشور جو اعمال کرتے ہیں۔ تو سات بار آگے بڑھتے اور سات بار پیچھے ہٹتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ حضرتؑ نے سات بار ایسا کیا۔
مومنین اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرتؑ کو جناب رباب مادر حضرت علی اصغر کے سامنے جاتے شرم آتی ہوگی۔ کیونکہ آپ یہ وعدہ کرکے جناب علی اصغر کو میدان میں لائے تھے کہ پانی پلاکر لاؤں گا۔ اب آپؑ کے قدم اس خیال سے آگے بڑھ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ کہ کیوں کر اس حالت میں بچہ کو ماں کی گود میں دوں۔ دکھیا رباب جب اپنے بچّے کا گلا چھدا دیکھے گی۔ تو کچھ بعید نہیں کہ فرطِ غم سے ہلاک ہو جائے۔
مقتل ابوالمعالی میں ہے۔ کہ جب سے امام حسین علیہ السلام علی اصغر کو میدان جنگ میں لے گئے تھے۔ جناب رباب محبت مادری سے بے تاب ہو کر بار بار خیمہ کے دروازے تک جاتی تھیں۔ اور دیکھتی تھیں کہ فرزند رسولؐ بچے کو پانی پلا کر لا رہے ہیں یا نہیں۔ اتفاق سے ایک بار جب در خیمہ پر پہنچیں تو حضرتؑ کو انتہائی تردّد میں آگے پیچھے قدم ڈالتے دیکھا۔
گھبرا کر بآواز بلند پکاریں۔
"یابن رسول اللہؐ میرے بچّے کا کیا حال ہے۔ میں اس کی مفارقت میں بے چین ہوں۔ جلد اسے میری گود میں دیجیے۔"
آہ! جناب رباب کی یہ گفتگو سن کر امام مظلوم بے چین ہوگئے اور خیمے کے اندر آکر فرمایا۔
"لو رباب تمہارے بچّے کی پیاس بجھ گئی آہ! ظالموں نے اسے تیر ستم کا نشانہ بنا دیا۔" مومنین یہ سنتے ہی جناب رباب نے چھاتی کوٹی اور واعلی اصغراہ واہ ثمرہ فواداہ کے نعرے مارے۔ خدا کسی ماں کو اس کے معصوم بچّے کی یہ حالت نہ دکھلائے۔
راوی کہتا ہے کہ امام مظلوم علیہ السلام نے چاہا کہ علی اصغر کی لاش کو دفن کر دیں کیونکہ آپ بعلمِ امامت جانتے تھے کہ اشقیائے اُمّت حضرتؑ کی شہادت کے بعد تمام شہداء کے سر کاٹ کر نیزوں پر چڑھائیں گے۔
آپ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ کہ یہ ننھا سا سر بھی سب کے ساتھ نیزے پر چڑھے پس آپ لاش علی اصغر کو خیمہ سے لے کر باہر آئے اور ایک مقام پر تلوار سے ننھی سی قبر کھودی اور جناب رباب کے ناز وں کے پلے کو اس

میں لٹا کر دفن کیا ہے

پانی نہ تھا جو شاہ چھڑکتے مزار پر
آنسو ٹپک پڑے لحدِ شیر خوار پر

آہ! مومنین حضرتؑ کا یہ قصد پورا نہ ہوا ظالموں نے بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام قبر کو کھود ڈالا۔ اور ننھی سی میت کا سر کاٹ کر نوک نیزہ پر چڑھا دیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۸/۱۱ ھود
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ
مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷/۲۶

انیسویں مجلس

تفسیر آیۂ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ اور حالِ رخصتِ امام مظلومؑ اور اہلِ حرم

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ
اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

(البقرہ آیت ۱۸۹)

(اے رسولؐ لوگ تم سے چاندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو وہ لوگوں کے لئے وقت بتانے والے اور حج کا وقت معین کرنے والے ہیں۔ یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں کے اندر پشت کی طرف سے آؤ۔ بلکہ نیکی اس کے لیے ہے جو پرہیزگار ہوں اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوں اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پانے والے ہو جاؤ۔)

ایک سال کا پورا دورہ بارہ چاندوں پر ختم ہوتا ہے۔ اگر یہ چاند نہ ہوں تو سال کے حساب میں ابتری ہو جائے اور پتہ ہی نہ چلے کہ کون سا کام ہمیں کس وقت انجام دینا چاہیے۔ روزہ، عید۔ زکوٰۃ، اور حج وغیرہ تمام عبادات کا حساب چاند ہی سے ہوتا ہے۔ اگر یہ بارہ چاند نہ ہوں تو صالحین کا کوئی کام کوئی عمل صحیح وقت پر انجام نہ پاسکے اور فرائض اور سنن ترک ہو جائیں۔ تو پھر کوئی عبادت بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتی۔ سال کے اندر تمام عبادات داخل ہیں اور چاند کو خدا نے اس کا دروازہ بنایا ہے۔ پس جب تک دروازہ تلاش نہ کر لیا جائے۔ سال بھر کی عبادات کا حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ جس طرح خدا نے سال کے بارہ چاند بنائے ہیں۔ اسی طرح رسالتؐ کے بھی بارہ دروازے بنائے گئے۔ جن کا تعلق ان بارہ دروازوں سے نہیں تو سمجھ لو

کہ رسالت کا تعلق بھی اُن سے نہیں اور اگر ہے تو غلط۔

چاند سورج کا صحیح معنی میں جانشین ہے۔ ادھر سورج غروب ہوا ادھر چاند نکلا نیا چاند کوتا بینوں کو ذرا مشکل سے نظر آتا ہے۔ تین روز تک ہلال رہتا ہے یعنی چمک کم پڑتی ہے۔

چوتھی منزل پر اس میں کافی روشنی آجاتی ہے لیکن پہلے تین دن وہ نظروں سے غائب نہیں رہتا اس کا یہ زمانہ گوشہ گیری کا ہوتا ہے۔ اس لیے کم لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔ خداوند عالم نے رات اور دن کو دو قندیلوں سے روشن بنایا ہے دن کو آفتاب سے رات کو چاند سے۔ اگر چاند نہ ہو تو ہماری راتیں بالکل تاریک ہیں۔ اگرچہ رات کی تاریکی میں جو لوگ چراغوں سے تھوڑا بہت کام چلاتے ہیں مگر وہ اس روشنی کو کہاں پاسکتے ہیں۔ جو چاند سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے تو دنیا کا گوشہ گوشہ جگمگاتا ہے۔ پس خدا کے روشن کردہ چراغ اور بندوں کے روشن کیے ہوئے چراغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چراغ زیادہ سے زیادہ ایک گھر کو روشن کر سکتا ہے اور چاند تمام عالم کو روشن کرنے والا ہے۔ ہاں اگر چاند کا روشن کیا ہوا چراغ ہو تو پھر اس کی روشنی کا کیا ٹھکانہ۔ وہ سراج منیر کہلاتا ہے۔ اس کی روشنی سے قیامت کا میدان چمک اٹھتا ہے سال کے بارہ چاند بھی اس کے روشن کیے ہوئے بارہ چراغ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آفتاب کو روشنی براہِ راست خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہے یا یوں کہو کہ ایک چراغ کو خدا نے خود روشن کیا ہے اور بارہ چراغ اس سے روشن ہوتے ہیں اور اس طرح سال کی بارہ منزلیں جگمگا گئیں اور عبادات کے تمام اوقات اس کی ضو فشانی سے منور ہو گئے۔ چاند کسی مہینہ کا کیوں نہ ہو۔ نام سب کا ایک۔ کام ایک ماخذ نور ایک منزل ایک۔ مطلع ایک، رفتار ایک، یہی حال ائمہ امامت کا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا۔

اَوَّلُنَا مُحَمَّدٌ اَوْسَطُنَا مُحَمَّدٌ اٰخِرُنَا مُحَمَّدٌ وَکُلُّنَا مُحَمَّدٌ

جب تک دُنیا کا وجود ہے چاند کا بھی وجود ہے ناممکن ہے کہ دُنیا ہو اور چاند نہ ہو۔ خواہ وہ ظاہر رہے یا غائب۔ جس طرح دُنیا کو چاند کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی دُنیا کو امام کی ضرورت ہے۔

رسولؐ سراج منیر بن کر دُنیا میں آئے اور ان کے گردِ بہت سے پروانے جمع ہو گئے۔ ہم کو پروانوں کی جانثاری سے انکار نہیں، بے شک وہ شمع کے چاروں طرف بڑی دلسوزی سے طواف کرتے ہیں اور سب فدائی بنے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس جانثاری کا دور کب تک؟ صرف شمع کی زندگی تک ادھر وہ کشتہ ہوئی ادھر سب رخصت اور جانثاری کے دعوے ختم۔ انہوں نے شمع سے کیا حاصل کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ رات بھر اس

کے گرد گھومتے رہے لیکن اتنا نور بھی حاصل نہ کر سکے۔ کہ اگر تاریکی میں ضرورت پڑے تو ہاتھ پر اس کو رکھ کر کسی چیز کو دیکھ سکیں یا اس کی روشنی میں چند سطریں پڑھ سکیں۔ تاریکی میں ہم کو نور کی ضرورت ہے۔ نہ کہ ان کے تاریک وجودوں کی۔

تاریکی میں، میں آپ سے کہتا ہوں مجھے شمع دیجئے آپ ایک پرانا دیمک کھایا ہوا اُپلا یا کنڈا میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں کہ لیجئے اس سے کام چلا لیجئے۔ اس میں آگ کا شعلہ، چیونٹی کی چال کی طرح رینگ رہا ہے میں اسے پھینک کر کہتا ہوں اس میں تو دھواں بھرا ہوا ہے اسے چولہے میں جھونکو۔ اس سے چراغ کا کام تھوڑا ہی نکل سکتا ہے۔ اس کے بعد آپ ایک لمبا سا ڈنڈا میرے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں کہ لیجئے اس سے کام چلا لیجئے۔ یہ تو صورت میں موم بتی جیسا ہے مگر سیرت میں کیسا سخت ہے۔ میں یہ کہہ کر ہاتھ سے ڈال دیتا ہوں کہ یہ تو مار پیٹ کے کام کا ہے۔ اس کو چراغ کا قائم مقام کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اب آپ ایک موم کا گولہ مجھے تھمائے دیتے ہیں کہ یہ لو اس میں تیل بھی موجود ہے۔ یہ نرم دل بھی ہے۔ اس میں اون کا دھرا دھاگا بھی ہے۔ دو دھری روشنی دے گا۔ میں کہتا ہوں میرے کام کا یہ بھی نہیں یہ وہ رشتہ نہیں جو روشنی کو قائم رکھتا ہے۔ یہ تو اون کا بٹا ہوا ہے جل ہی نہیں سکتا اور جلے گا تو بُو دینے کی وجہ سے بجھانا پڑے گا۔ اب آپ مجھے ایک موم بتی دے دیتے ہیں۔ میں اسے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔ اور کہتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور کام کی چیز ہے۔ یہ ہو بہو ویسی ہی چیز ہے جیسے وہ پہلے جلنے والی شمع تھی۔ صورت اور سیرت دونوں ملتی جلتی ہیں پر جس طرح شمع کی قائم مقامی شمع ہی کر سکتی ہے۔ اسی طرح روحانی ہدایت بھی اس سے متعلق ہو سکتی ہے جو رسولؐ کی جیسی سیرت اور خصلت رکھتا ہو۔

آفتاب اپنی شعاعیں تمام عالم پر ڈالتا ہے۔ بے شمار ذرّے۔ سنگریزے۔ آبگینے اور چینی کے ٹکڑے اور در و دیوار اس سے جگمگا جاتے ہیں اور از سر تا پا نور سے بھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن سورج کے غروب ہونے کے بعد کیا کوئی چمک ان میں باقی رہتی ہے۔ کیا ان میں سے کوئی سورج کی قائم مقامی کر سکتا ہے حتیٰ کہ جواہرات بھی اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتے۔ ادھر سورج غروب ہوا اور سب کی چمک ماری گئی البتہ ایک چاند ایسا ہے کہ وہ صحیح معنیٰ میں سورج کی نیابت کر سکتا ہے۔ جن منزلوں کو سورج طے کرتا ہے ان ہی کو چاند بھی طے کرتا ہے۔ جہاں جہاں سورج روشنی ڈالتا ہے وہاں چاند بھی ڈالتا ہے جس طرح وہ غریبوں کے جھونپڑوں اور امیروں کے محلوں کو یکساں جگمگاتا ہے اسی طرح چاند جگمگاتا ہے۔ غرض کہ انتظام عالم میں چاند اور سورج دونوں کا برابر دخل ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ چاند لوگوں کے لیے وقت بتاتا اور حج کا زمانہ معین کرتا ہے اگر

چاند نہ ہو تو یہ پتہ ہی نہ چل سکے کہ حج کس روز ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سارا حساب کتاب چاند سے متعلق ہے۔ جس طرح ظاہری حساب ان چاندوں سے متعلق ہے اسی طرح قیامت میں حساب کچھ اور چاندوں سے متعلق ہوگا جو اقمار امامت ہیں۔

آگے چل کر اس آیت نے بتایا ہے کہ یہ نیکی نہیں ہے کہ گھروں کے اندر پشتوں کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی تو پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ اور گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ۔

احتجاج طبرسی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ پہلے حالتِ احرام میں لوگ دروازہ چھوڑ کر دیواروں سے مکانوں کے اندر داخل ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا خدا نے حکم دیا کہ ایسا نہ کرو۔ دروازوں سے آیا کرو۔

جب سے انسانی تمدن کی دنیا میں بنیاد پڑی ہے۔ ہر مکان کے لیے دروازہ کا ہونا ضروری سمجھا گیا ہے اور اس میں چند فوائد ہیں۔ اول یہ کہ مکان دشمن کے حملے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہر کس و ناکس داخل ہو کر گھر کا بھید معلوم کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ دوسرے دروازے سے مکان کی زینت اور شان ہوتی ہے۔ تیسرے حدود ملکیت کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اکثر دروازے حد ملکیت پر قائم ہوتے ہیں۔ سوائے مالک مکان اگر کوئی دوسرا شخص کسی کے مکان کی دیوار پھاند کر بدون اجازت اس کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو وہ چور سمجھا جاتا ہے کیونکہ صاحب دروازہ موجود تھا۔ تو وہ کھلم کھلا اس کے اندر کیوں نہیں آتا۔ یہ حق تو صرف مالک ہی کو ہے کہ وہ جس حصہ کو چاہے توڑ کر در بنائے اور داخل ہو جائے۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مخصوص گھر اپنے اہل بیت کے لیے بنوا دے یا اپنے گھر کی دیوار میں در بنا کر داخل کرے۔ جیسا کہ علی علیہ السلام کے لیے دیوار کعبہ شق ہوئی۔

جس طرح گھروں کے اندر داخل ہونے کے لیے دروازے بنائے جاتے ہیں اسی طرح شہروں میں داخل ہونے کے لیے بھی دروازے ہوتے ہیں مکان اور شہر کا دروازہ جتنا شاندار ہوگا اسی قدر گھر یا شہر کی رفعت زیادہ ہوگی، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ گھر اور در۔ شہر اور باب میں ایک مناسبت ضروری ہے اگر ایک ویرانہ مکان کا جس کے در و دیوار ٹوٹے پھوٹے ہوں ایک عالیشان دروازہ بنا دیا جائے تو یہ اس دروازے کی توہین ہوگی اور ہر شخص بنانے والے کی بے عقلی پر ہنسے گا۔ پس معلوم ہوا کہ دروازے کے لیے بڑی مناسبت درکار ہے۔ زیادہ لمبا نہ ہو، زیادہ پست نہ ہو، مضبوط ہو شاندار ہو۔ ہر قسم کا سامان اس میں داخل ہو سکتا ہو ورنہ دروازہ ناقص ہے۔ ان ہی باتوں پر نظر رکھتے ہوئے حضرت رسولِ خدا نے فرمایا۔ انا مدینۃ العلم وعلیٌ بابہا۔ اَنَا دَارُ الْحِکْمَۃِ وَعَلِیٌّ بَابُہَا۔ حکمت کا در ہو یا علم کا دروازہ علیؑ سے بہتر رسولؐ کو دُر عمل مل نہیں سکتا تھا۔ خود امیر المومنین علیہ السلام

نے فرمایا ہے۔

نَحْنُ الشِّعَارُ وَالْاَصْحَابُ نَحْنُ الْخَزَنَةُ الْاَبْوَابُ لَا يُؤْتَى الْبُيُوتُ اِلَّا مِنْ اَبْوَابِهَا وَمَنْ اَتَاهَا مِنْ غَيْرِ اَبْوَابِهَا سُمِّيَ سَارِقًا۔

(ہم شعار اسلام ہیں، ہم اصحاب رسولؐ ہیں۔ ہم علوم کے خزانے اور ان کے ابواب ہیں گھروں میں نہیں آتے مگر ان کے دروازوں سے جو کوئی دروازہ چھوڑ کر آتا ہے اس کو چور کہا جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کو پتہ چلانا ہوتا ہے تو گھر یا در دو ہی چیزیں پوچھی جاتی ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ سقف کون سی ہے۔ دیوار کہاں ہے۔ صحن کہاں ہے، پرنالہ کہاں ہے۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ گھر سے زیادہ دروازے کی پرستش ہوتی ہے۔ ہر شخص یہی پوچھتا ہے کہ فلاں شہر یا گھر کا دروازہ کدھر ہے۔ کیونکہ کسی گھر کا پتہ دروازہ سے بآسانی سمجھ لیا جاتا ہے۔ لوگ ہمیشہ کسی در کے پتہ ہی سے گھر یاد رکھتے ہیں۔ مہذب دنیا میں دروازہ کا خاص طور سے احترام کیا جاتا ہے۔ قلعہ شاہی کے دروازہ ہی کو دیکھ کر عام لوگوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ علماء کے دروازوں میں داخل ہوتے ہی خموشی چھا جاتی ہے اور رعب غالب آجاتا ہے پس دروازہ کا مرتبہ بھی خاص ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد رسولؐ کی طرف جو دروازے کھلے ہوئے تھے ان سب کے بند ہونے کا حکم ہو گیا۔ سوائے حضرت علی علیہ السلام کے دروازے کے وہ بدستور صحن مسجد کی طرف کھلا ہوا تھا، کھلا رہا اور دوسرے لوگوں کو مسجد کی طرف روشندان کیا سوراخ تک رکھنے کی اجازت نہ ملی، جب اس پر عباس بن عبدالمطلب معترض ہوئے تو حضرتؐ نے فرمایا:

مَا اَنَا فَتَحْتُهَا وَمَا اَنَا سَدَدْتُهَا لٰكِنَّ اللّٰهَ فَعَلَ ذَالِكَ

یعنی کہ میں نے نہ کسی کا دروازہ بند کیا اور کسی کا دروازہ کھولا۔ بلکہ خدا نے ایسا کیا۔

جب جناب علی علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ میں نیا دروازہ کھل گیا تو مسجد رسولؐ میں جو کھلا ہوا، دروازہ تھا وہ کیسے بند ہو سکتا تھا جو خدا کا رازدار تھا۔ مسجد رسولؐ میں اس سے کس بات کا پردہ علی خدا کے گھر کا احترام جانتے تھے۔ اور خدا کا گھر علی علیہ السلام کی حرمت سے واقف تھا۔ علی جیسے سخی کا دروازہ کبھی بند ہوا ہی نہیں۔ ہمیشہ راہ خدا میں سوال کرنے والوں کے لیے کھلا ہی رہا۔ ایسے دروازہ کو بند کرنے کا حکم کیوں کر دیا جاتا۔

لہٰذا اس آیت کا حکم یہ ہے کہ گھروں کے اندر دروازوں سے داخل ہوا کرو اور دیواریں پھاند کر نہ آیا کرو۔ لیکن حقیقی مفہوم جو اہل بیت علیہم السلام نے بیان فرمایا وہ یہ ہے کہ اگر علم حاصل کرنا ہے

تو جو ابواب علم ہیں ان سے حاصل کرو۔ اگر دوسروں سے حاصل کروگے تو ایسا ہے جیسے چور دیوار پھاند کر کسی گھر میں کود جائے گویا منشا یہ ہے کہ علم نبیؐ ان لوگوں سے حاصل کرو جو اہلِ مدینہ ہیں راسخون فی العلم ہیں۔ اور مدینہ علم نبیؐ کے باب ہیں اور چونکہ ان سب باتوں کے مصداق علی علیہ السلام ہیں سوا دوسروں سے علم لیا اس نے صحیح مرکز چھوڑ کر غلط حصولِ علم کا ذریعہ بنایا۔

شہر کے اندر جو چیز آتی ہے۔ وہ دروازے سے آتی ہے اور جو باہر جاتی ہے وہ بھی دروازہ سے جاتی ہے پس رسولؐ نے جس کو اپنے شہر علم کا دروازہ بنایا ہے۔ وہ اُمّت وسط ہے اسی کے متعلق قرآن میں وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ؕ (۲/۱۴۳ بقرہ)

ہم نے تم کو درمیانی اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسولؐ تم پر گواہ ہو) اُمّت کے اعمال میں جو رسولؐ تک پہنچتے ہیں وہ اسی دروازہ سے پہنچتے ہیں اور رسولؐ کے جو احکام اُمت تک آتے ہیں کا بھی اسی کے ذریعے سے۔

قرآن جو ماخذ علم رسولؐ ہے۔ وہ قلب رسولؐ پر نازل ہوا پس علم کا شہر قلب رسولؐ ہوا۔ علم وہ دروازہ زبان ہے جو انسان کے دل میں ہوتا ہے اور زبان سے نکلتا ہے پس رسولؐ نے اپنے علم کا دروازہ ایسی زبان کو بنایا جس کو لسان اللہ کا خطاب حاصل ہوا۔

دروازہ دراصل شہر کی تفصیلی حالات کا ایک اجمالی نقشہ ہوتا ہے۔ یعنی دروازہ کو دیکھتے ہی یہ پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ اس شہر کا کیا حال ہے۔ پس جو کچھ شہر علم نبیؐ میں ہے وہی اس کے دروازہ میں ہے۔ ایک شہر کی شان یہ ہے کہ اس میں تمام ضروریات زندگی بہترین صورت میں پائی جائیں۔ نبیؐ کے علم کی شان وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّت طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ أَن يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِن شَيْءٍ ۚ وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿١١٣﴾ (۴/۱۱۳ نساء)

ترجمہ:۔ اے رسولؐ اگر تم پر خدا کا فضل و کرم اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو ان بدمعاشوں میں سے ایک گروہ تم کو گمراہ کرنے کا ضرور قصد کرتا۔ حالانکہ وہ لوگ بس آپ اپنے کو گمراہ کر رہے ہیں اور یہ لوگ تمہیں کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور خدا ہی نے تو مہربانی کی کہ تم پر اپنی کتاب اور حکمت نازل کی اور جو باتیں تم نہ جانتے تھے تمہیں سکھا دیں۔

اور علی علیہ السلام کی شان میں یہ ہے

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (۳۶/۱۲ یٰسین)

(ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو عمل انہوں نے کیے ہیں اور دنیا میں جو آثار چھوڑے ہیں وہ ہم سب لکھ لیتے ہیں اور امام مبین میں گھیر دیا ہے)

یہ وہ شہر علم ہیں جس کی شہر پناہ عصمت و طہارت ہے اور جس طرح شہر کے اندر بہت سے گھر ہوتے ہیں۔ اسی طرح شہر علم میں تمام انبیاء سابقین کے علوم موجود ہیں اس کی تصویر دروازہ میں پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ من اراد ان ینظر الی آدم فی علمہ و نوح فی تقواہ و ابراہیم فی خلتہ و موسیٰ فی ہیبتہ و عیسیٰ فی زہدہ فلینظر الی وجہ علی بن ابی طالبؑ

(جو کوئی چاہتا ہو کہ آدم کو علم میں نوح کو تقوے میں ابراہیم کو خلت میں اور موسیٰ کو ہیبت میں اور عیسیٰ کو ان کے زہد میں دیکھے تو اس کو چاہیے کہ علی بن ابی طالب کے چہرہ پر نظر کرے)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر علم میں سامان کی وہ کثرت ہے کہ ابل کر دروازے تک پہنچ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سات انبیاء علیہم السلام کو کچھ فضیلتیں خاص طور سے عطا فرمائی ہیں۔

۱۔ آدم کو علم اسماء

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ (۲/۳۱ بقرہ)

یہی علم ملائکہ کے سجدہ کا سبب ہوا اور ان پر آدم کو فضیلت ہوئی۔

۲۔ حضرت خضر کو فراست دی

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

۱۸/۶۵ سورہ کہف

(ہم نے ان کو اپنی طرف سے علم دیا) اسی سے حضرت موسیٰ آپ کے شاگرد بنے۔

۳۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو علم تعبیر خواب دیا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

یہی چیز سبب حصول سلطنت ہوئی۔ ۱۲/۱۰۱ یوسف

۴۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو علم زرہ سازی دیا۔

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

۲۱/۸۰ سورۃ الانبیاء

ترجمہ:۔ اور ہم نے داؤد کو تمہاری جنگی پوشش یعنی زرہ بنانا سکھا دیا تاکہ تمہیں ایک دوسرے کے وار سے بچائے تو کیا اب بھی تم اس کے شکر گزار نہ ہوگے۔

۵۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم منطق الطیر دیا

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

(۲۷/۱۶ نمل)

ترجمہ:۔ سلیمان داؤد کے وارث ہوئے اور انہوں نے کہا لوگو ہم کو (خدا کے فضل سے) پرندوں کی بولی بھی سکھائی گئی ہے اور ہمیں (دنیا کی) ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ یہ خدا کا صریحی فضل و کرم ہے۔

جو سلطنت پانے کا سبب اور بلقیس کو محکوم بنانے کا باعث ہوا۔

۶۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو علم توریت و انجیل دیا۔

فرشتہ نے کہا اے مریم، خدا اس کو تمام کتب آسمانی حکمت اور توریت و انجیل کی تعلیم دے گا اور بنی اسرائیل کا رسول بنائے گا۔ یہی چیز حضرت مریم سے زوال تہمت کا باعث بنی۔

۷۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ②

۲-۱/۶۲ سورہ الجمعہ

ترجمہ:۔ خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ آسمان اور زمین کی ہر شے اس کی تسبیح کرتی ہے جو حقیقی بادشاہ پاک ذات حکمت والا ہے وہی تو ہے جس نے گمنام لوگوں میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرتا ہے اور تزکیہ نفس کرتا ہے عقل اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ㊽ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ

ترجمہ:۔ اور اے مریم خدا اسے تمام کتب آسمانی اور عقل کی باتیں اور خاص کر توریت اور انجیل سکھا دے گا۔ ۴۸/۳ آل عمران۔

اَلرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④

۴-۱/۵۵ رحمان

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۗ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ⑪③ ۱۱۳/۴ نساء

بلکہ ہر اس چیز کی تعلیم دی جس کو تم نہیں جانتے تھے۔

اے رسولؐ ہم نے تم پر برحق کتاب اس لئے نازل کی کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت کی ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ ۱۰۵/۴

ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو علم کتاب پیدا ہوتے ہی دے دیا گیا اور حضرت رسولؐ خدا کو چالیس برس بعد عطا ہوا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾

۱۹/۳۰ سورہ مریم

میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت بھی ان کو بچپن میں ملی اور حضرت رسولؐ خدا کو چالیس سال بعد۔ اسی طرح یحییٰ کو بچپن میں نبوت ملی۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (سورہ مریم ۱۹/۱۲) بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رتبہ حضرت رسولؐ خدا سے بڑھا ہوا تھا کیونکہ وہ حضرات بچپن میں اس قابل تھے اور حضرت چالیس برس کے بعد ہوئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کو جو کچھ ملا بعد پیدائش ملا اور حضرت رسولؐ خدا کو قبل پیدائش عطا ہوا۔

اَلرَّحْمٰنُ ﴿١﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿٢﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿٣﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿٤﴾

بڑا مہربان خدا نے قرآن کی تعلیم عطا فرمائی اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو اپنا مطلب بیان کرنا سکھایا۔ (رحمٰن)

اس پر شاہد ہے۔ یعنی خلقت بعد میں ہے اور تعلیم قرآن پہلے۔ جناب عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کی نبوت بعد میں ہے اور خلقت پہلے اور جناب رسولؐ خدا کی نبوت خلقت سے پہلے ہے۔ کنت نبیا و آدم بین الماء والطین میں اس وقت نبی تھا جب آدم آب و گل میں تھے۔ چالیس برس بعد آپ کو نبوت نہیں ملی بلکہ وہ وقت اظہار نبوت کا تھا۔ قرآن کا علم بھی چالیس برس بعد نہیں دیا گیا۔ بلکہ وہ وقت بیان کرنے کا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ علم پہلے تھا اور بیان بعد میں جیسا کہ آیہ الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان سے ظاہر ہے۔ اگر قرآن کا علم رسولؐ کو بعد میں دیا جاتا تو ان کے پہلے اور بعد کے افعال میں کچھ فرق ہوتا لیکن نہیں چالیس سال پہلے جو کچھ کیا وہ بالکل مطابق قرآن تھا۔ اس نور کے ایک جزو نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ کہ علم قرآن قبل خلقت حاصل تھا جیسا کہ امیرالمومنین علیہ السلام کے بعد پیدائش قرآن سنا دینے سے ظاہر ہوتا ہے۔ پس جس کے نائب کو قبل پیدائش علم قرآن حاصل تھا

اس کے منیب کو کیوں نہ حاصل ہوتا۔ قرآن کا نزول صرف یہ بتانے کو تھا کہ اب یہ آیت پہنچا دو اور اب یہ نبی کا وقت تبلیغی تھا۔ نہ کہ تعلیمی تھی وہ حکم تھا کہ جو جبریل امینؑ آنحضرتؐ کے پاس لے کر آتے تھے۔

بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو ان کا علم ہو چکتا ہے۔ لیکن وقت سے پہلے اظہار نہیں کیا جاتا اور قوت سے فعل میں لانے کا موقع نہیں ہوتا مثلاً

وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٤٨﴾ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿٤٩﴾ ۲۹/۴۸ عنکبوت

"اے رسولؐ تم اس سے پہلے نہ کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے تاکہ باطل پرستوں کو شک کا موقعہ نہ ملے" اگر ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے ضرور تمہاری نبوتؐ میں شک کرتے مگر جن لوگوں کو خدا کی طرف سے اُن کے دل میں علم عطا ہوا ہے (قرآن) واضح روشن آیات ہیں اور سرکشوں کے سوا تمہاری آیات سے کوئی انکار نہیں کرتا۔

اگر آنحضرتؐ کتابوں کو لکھا پڑھا کرتے تو لوگوں کو شک کرنے کا موقع مل جاتا کہ یہ قرآن حضرت نے دوسرے ادیان کی کتابیں پڑھ کر خود ہی لکھ لیا ہے۔ نبی اور علیؑ چونکہ ایک نور سے ہیں۔ لہٰذا جو کام اُن کا ہے وہ ان کا سمجھا جاتا ہے اور ان کا، اُن کا۔ صلح حدیبیہ میں صلح نامہ رسولؐ نے نہ لکھا بلکہ علیؑ نے لکھا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾

(۹/۷۳ سورہ توبہ)

کا حکم رسولؐ کو تھا۔ علیؑ نے منافقین سے لڑ کر اور رسولؐ نے کفار سے لڑ کر اس حکم کو پورا کر دیا۔ شب ہجرت علیؑ نے فرشِ رسولؐ پر سو کر رسولؐ کا کام انجام دے دیا۔

محمد و آلِ محمد علیہم السلام ایسے عالم ہیں کہ اُن کو خلقت آسمان و زمین کا گواہ گیا ہے۔ سورہ کہف میں ہے۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ

الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾ مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

(۵۱-۵۰/۹ سورۂ توبہ)

(وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ وہ قوم جن سے تھا پس حکمِ خدا سے نکل بھاگا تو (اے بنی آدم) تو اس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا سرپرست یا حاکم بنا لوگے۔ حالانکہ وہ تمہارا پکا دشمن ہے اور (ہمارے یہاں) ظالموں کے لیے برا بدلہ ہے۔ میں نے نہ تو ان کو آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت مدد کو بلایا تھا نہ ان کے نفسوں کی خلقت میں ان کو شریک کیا تھا۔ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بنایا کرتا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریت پیدائش آسمان و زمین اور اپنے نفسوں کی خلقت کے وقت موجود نہ تھی۔ پس قرینہ بتاتا ہے کہ دوستانِ خدا کی جماعت خلقت آسمان و زمین اور اپنے نفوس کی پیدائش کے موقع پر موجود ہونی چاہیے ورنہ شیطان اور اس کی ذریت کے لیے یہ کہنا ہی عبث ہوگا۔ یہ بھی یاد رہے کہ شیطان کے ساتھ اس کی ذریت کو بھی اس صفت کی نفی میں شامل کیا گیا ہے۔ پس جو مقرب ایزدی اور خلاصہ کائنات اس وقت موجود ہوگا وہ بھی مع اپنی ذریت کے ہونا چاہیے۔ یہی وہ گروہ ہے جو کہ عالین کہلاتا ہے۔ اسی کے متعلق کہا گیا تھا۔

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۷۶﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِیْمٌ ﴿ۚۖ۷۷﴾ وَّ اِنَّ

عَلَیْكَ لَعْنَتِیٓ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۷۸﴾

(۷۸-۷۵/۳۸ سورہ ص)

(پس خدا نے کہا اے ابلیس، جس کو میں نے اپنی قدرت کے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا ہے۔ تو نے تکبر سے کام لیا ہے یا تو عالین میں سے بن بیٹھا ہے۔ اس نے کہا میں کیوں سجدہ کروں) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ (اور آگ مٹی سے بہتر ہے) خدا نے فرمایا، تو یہاں سے نکل جا تو یقیناً مردود ہے اور تیرے اُوپر قیامت تک لعنت کی پھٹکار رہے گی۔

اور اس نے اپنی عباد مخلصین کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا۔ (سورۃ الحجر ۱۵/۱۴)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝

پالنے والے تو نے مجھے گمراہی میں چھوڑا ہی ہے میں بھی تیرے مخلص بندوں کے سوا سب ہی کو بہکاؤں گا۔

یہ عباد مخلصین محمد و آل محمد علیہم السلام کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تمام مخلوقات کی خلقت کے وقت موجود تھے۔ یہی وہ خالص بندے ہیں جنہوں نے خدا کے سوا کسی غیر کے سامنے سر جھکایا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن پر شیطان کے اغوا کا کبھی اثر ہوا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے جان و مال راہِ خدا میں کام آئے۔ جن کے دل انتہائی مصیبتوں میں خدا کی طرف سے نہ پھرے۔

چنانچہ منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کے تمام رفقا باری باری کام آئے اور آپ تن تنہا رہ گئے تو آپ نے اپنا منہ آسمان کی طرف کر کے فرمایا۔

تَرَكْتُ الْخَلْقَ طُرًّا فِیْ هَوَاكَ ۔۔۔ وَاَیْتَمْتُ الْعِیَالَ لِکَیْ اَرَاكَ
فَلَوْ قَطَّعْتَنِیْ بِالْحُبِّ اِرْبًا ۔۔۔ لَمَا حَنَّ الْفُؤَادُ اِلٰی سِوَاكَ

اے میرے معبود! میں نے تمام دنیا کو تیری محبت میں چھوڑ دیا۔ اور تیری ملاقات کے شوق میں اپنے بچوں کو یتیم بنا رہا ہوں۔ اگر تو میرا بدن اپنی محبت میں ٹکڑے ٹکڑے کر دے تب بھی میرا دل میرے سوا دوسروں کے طرف متوجہ نہ ہوگا۔

لکھا ہے کہ جناب حضرت علی اصغر کی شہادت کے بعد بار بار دشمن کی طرف سے مبارزطلبی ہونے لگی اور طنزاً کہنا شروع کیا۔

"اے حسینؑ! اگر فوج میں کوئی اور زندگی سے سیر موجود ہو تو اس کو مرنے کے لیے بھیجیے ورنہ خود آیئے

تاکہ جلد آپ کا سر کاٹ کر اطمینان سے اپنی کمریں کھولیں اور فتح کے باجے بجانے شروع کریں۔ ان ناخدا شناس ستم گاروں کے یہ ناروا الفاظ امام مظلوم علیہ السلام کے دل پر خنجر کا کام کر رہے تھے۔ آخر آپ سے ضبط نہ ہو سکا اور رخصتِ آخر کے لیے خیمہ میں تشریف لائے اور فرمایا۔

"اے زینبؑ! اے اُمِ کلثومؑ، اے سکینہ اے رباب تم سب پر میرا اسلام اور میری ماں فاطمہؑ کی کنیز فضہؑ تم پر بھی میرا اسلام۔ حضرت کی یہ آواز سنتے ہی تمام بی بیاں آپ کے گرد جمع ہو گئیں اور دریافت کر پوچھنے لگیں۔ اے فرزند رسولؐ آپ کس ارادے سے تشریف لائے ہیں۔ فرمایا الوداع الوداع الفراق الفراق یہ سنتے ہی ان بے کسوں کے دل سینوں میں ہل گئے۔ اور خیموں کے اندر ایک کہرام بپا ہو گیا۔ چاروں طرف سے دکھیا سیدانیاں امام مظلوم علیہ السلام کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھیں کہ ایک چار سالہ بچی نے آکر امام علیہ السلام کا دامن پکڑ لیا اور پوچھنے لگی۔ یَا اَبَتِ قَدِ اسْتَسْلَمْتَ لِلْمَوْتِ ۔ کیوں بابا کیا آپ نے مرنے پر کمر باندھ لی۔ فرمایا:

يَا بُنَيَّ كَيْفَ لَا يَسْتَسْلِمُ الْمَوْتَ مَنْ لَا نَاصِرَ لَهُ وَلَا مُعِيْنُ ۔

"اے بیٹی کیوں کر مرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ وہ بے کس جس کا کوئی یار و مددگار باقی نہ رہا ہو"

یہ سن کر بچی نے حسرت بھری نظر سے باپ کے چہرے کو دیکھا۔ اور کہنے لگی یا ابت ردنا الی قبر جدنا (اے بابا اگر یہ بات ہے تو ہم کو ہمارے جد کی قبر پر پہنچا دیجئے) امام مظلوم علیہ السلام نے ایک آہ سرد بھر کر فرمایا۔

يَا بُنَيَّ لَوْ تُرِكَ الْقَطَا لَنَامَ اے نورِ دیدہ اگر میرے امکان میں ہوتا تو تم کو اس مصیبت میں کیوں چھوڑتا۔ آہ یہ سن کر بالی سکینہ بلبلا کر رونے لگی۔ امام مظلوم نے بچی کو سینے سے لگایا اور دیر تک پیار کرتے رہے۔ اس کے بعد ہی آپ نے تمام بی بیوں سے فرمایا۔ موت برحق جب میرے جدِّ نامدار پدرِ بزرگوار، مادرِ نامدار اور برادرِ عالی مقدار ہی ہمیشہ نہ رہے تو پھر کون رہے گا۔ جس طرح ان سب پر صبر کیا میری جدائی پر بھی صبر کرو۔ آہ جن سے زندگی کا مزا تھا۔ جب باری باری وہ سب رخصت ہو گئے اور میرا سینہ مفارقت کے داغوں سے بھر گیا تو اب میں جی کر کیا کروں گا۔ دوسرے یہ سب ظالم میرے خون کے پیاسے ہیں یہ مجھے کسی حالت میں زندہ نہ چھوڑیں گے۔ پس سوائے مرگ اب چارۂ کار کیا ہے تم سب پر لازم ہے کہ اس مصیبتِ عظمیٰ پر صبر کرو۔ میری وصیت ہے کہ بعد میری شہادت کے صبر و ضبط سے کام لینا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری بے چینی اور سراسیمگی کا دشمن مذاق اُڑائے اور ان کے لیے خوشی کا باعث ہو۔

پھر جناب زینب سلام اللہ علیہا سے فرمایا۔ بہن کپڑوں کا بقچہ لاؤ۔ تاکہ حسین اپنی آخری پوشاک

بہن سے۔ یہ سُن کر جناب زینبؑ کپڑوں کا بقچہ لے آئیں۔ آپ نے ایک پُرانا بوسیدہ لباس زیب تن فرمایا اور جا بجا سے چاک کیا۔ جناب زینب نے پوچھا اے بھائی آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ فرمایا اے بہن میرے قتل کے بعد یہ اشقیا میرا لباس تک اُتار لیں گے۔ میں نے یہ لباس کہنہ اس لیے پہن لیا ہے کہ شاید ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دیں۔ اور میری لاش عریانی سے بچ جائے۔ جناب زینبؑ یہ باتیں سُن کر اس درجے حزین ہوئیں کہ قریب تھا کہ غش کھا کر گر پڑیں۔

اس کے بعد حضرتؑ نے تبرکات کا صندوق طلب فرمایا اس میں سے عمامہ رسولؐ نکال کر سر پر باندھا، عبا امیرالمومنین علیہ السلام زیب تن فرمائی۔ امام حسن علیہ السلام کا پٹکا کمر سے باندھا اسی طرح دیگر تبرکات سے جسم مبارک کو زینت بخشی۔ پھر اہل حرم سے فرمایا۔

اب تم سب حسینؑ کو رخصت کرو۔ کیونکہ میری شہادت کا وقت قریب آ لگا ہے۔ آہ! اس وقت خیام حسینی میں ایک کہرام بپا تھا۔ ہر بی بی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ الغرض حضرتؑ نے باری باری سب کو رخصت کیا جب حضرت زینبؑ سے رخصت کی باری آئی تو تا دیر بھائیؑ بہن گلے مل مل کر روتے رہے۔ پھر جناب زینبؑ نے کہا ماں جائے اس وقت آخر میں ایک تمنا زینبؑ کی پوری کر دیجئے۔ اور یہ وہ ہے کہ ذرا اپنی عبا کا تکمہ کھول دیجئے۔ حضرتؑ نے ایسا کیا تو جناب زینبؑ نے گلوئے مبارک پر بوسے دئے آپ نے سبب پوچھا تو فرمایا بھیّا! اماں جان نے مجھے یہ وصیت کی تھی کہ جب میرا حسینؑ رخصت لینے کے لیے خیمے میں آئے تو میری طرف سے اس کے گلے کے بوسے لینا۔ آہ! اس کا گلا خنجر ظلم سے کاٹا جائے گا۔

حضرت نے فرمایا اے بہن! ایک آرزو میری بھی پوری کرو۔ پوچھا وہ کیا ہے۔ فرمایا ذرا اپنی چادر شانوں پر سے ہٹا دو۔ جناب زینبؑ نے تعمیل حکم امام کی۔

حضرتؑ نے بہن کے دونوں شانوں پر بوسے دیئے۔ پوچھا ماں جائے بہن قربان ایسا آپ نے کیوں کیا فرمایا:

اے بہن میری شہادت کے بعد اشقیائے اُمّت تمہارے دونوں شانوں میں رسن باندھیں گے اے بہن جو بلا سر پر آئے اسے صبر سے برداشت کرنا۔

بہن سے رخصت ہو کر امام مظلوم سیّد سجّاد کے خیمہ میں تشریف لائے آپ اس وقت غشی کی حالت میں تھے۔ حضرتؑ نے شانہ ہلایا۔ تو آپ نے غش سے آنکھیں کھولیں۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "بیٹا ہم تمہارے پاس رخصت آخر کے لیے آئے ہیں۔ اب ہماری شہادت کا وقت آگیا ہے۔ بیٹا! ہمارے بعد تم حجت خدا ہو اور اس بے کس اور بے بس قافلے کے سالار۔ بیٹا جو بلا سر پر آئے صبر و شکر کے ساتھ جھیل لینا۔ یہ سُن کر

سید سجادؑ تڑپ گئے اور رو رو کر عرض کرنے لگے۔ بابا میرے چچا عباسؑ، بابا میرے بھائی علی اکبرؑ، قاسمؑ اور عونؑ و محمدؑ کہاں ہیں۔ جو آپ مرنے پر کمر بستہ ہیں۔ حضرتؑ نے آہ سرد بھر کر فرمایا! بیٹا! سب قتل کر دیئے گئے ہیں اب فوجِ خدا میں سوائے میرے کوئی باقی نہیں۔ یہاں تک کہ تمہارا شیرخوار بھیا علی اصغر بھی تیرِ ستم کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اس واسطے کپڑے یہ مرے خون میں بھرے ہیں
دم توڑ کے یہ سب مری گود ی میں مرے ہیں

یہ سنتے ہی بیمار کربلا کو غش آگیا۔ اس وقت خیمے میں ایک حشر برپا تھا۔ ہر طرف سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ آخر جس وقت بیمارِ کربلا کو ہوش آیا تو حضرتؑ نے اسرارِ امامت تعلیم فرمائے اور آپ سے رخصت ہو کر میدان کارزار کی طرف جانے کا قصد فرمایا:

راوی کہتا ہے کہ جب بھی حضرتؑ باہر جانے کا قصد فرماتے تھے تو سیدانیاں آپ کا دامن پکڑ لیتی تھیں اور رو رو کر کہتی تھیں۔ اے بیکسوں کی آس اے ٹوٹے دلوں کے سہارے ذرا دیر ٹھہر جایئے۔ آہ! کس دل سے آپ کو رخصت کریں۔ غرض خیمہ کا پردہ سترہ بار اٹھا اور گرا۔ حمید کہتا ہے کہ میں نے کسی سے پوچھا حسینؑ خیمے سے کیوں نہیں برآمد ہوتے۔ اس نے کہا ان بے کس کنبہ موئی ہوئی بیبیوں کا بس آخری سہارا حسینؑ ہیں وہ حسین کا دامن نہیں چھوڑتیں۔ الغرض امام مظلوم علیہ السلام بدقت تمام خیمے سے اس طرح برآمد ہوئے ؎

شبیر برآمد ہوئے یوں خیمے کے در سے
جس طرح نکلتا ہے جنازہ بھرے گھر سے

کتب مقاتل میں ہے کہ حضرت کا گھوڑا در خیمہ پر کھڑا تھا۔ آہ کوئی اتنا نہ تھا کہ حضرتؑ کی رکاب پکڑ کر کوئی سوار کر دے۔

اس وقت آپ کو اپنے وفادار اور جاں نثار اصحاب کا خیال آگیا۔ ایک بار مقتل کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

"اے میرے شیرو اے میری گود کے پالو! میں نے تم سب کی رکاب تھام کر سوار کیا تھا۔ آہ! اب حسینؑ کے سوار ہونے کا وقت ہے۔ اٹھو! میرے شیر دل جوانو! میری رکاب آ کر پکڑو اور مجھے گھوڑے پر سوار کرا دو تاکہ تمہاری طرح میں بھی اپنا سر کٹا کر اپنا فرض پورا کر دوں۔

راوی کہتا ہے میں نے دیکھا کہ یکایک خیمہ کا پردہ اٹھا اور ایک بی بی سر سے پیر تک سیاہ برقعہ پہنے برآمد ہوئیں

اور رو رو کر کہنے لگیں۔

بے کس بھیا! تیری غربت کے نثار! زینب رکاب تھامتی ہے آپ سوار ہو جائیے ؎

نہ آسرا تھا کوئی شاہ کربلائی کو
بہن نے آ کے کیا تھا سوار بھائی کو

الغرض حضرتؑ سوار ہو کر میدانِ کارزار کی طرف چلے تھے کہ یکایک گھوڑا رک گیا آپ نے ذوالجناح کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

کیا اس وقت بے کسی میں تو بھی مظلوم حسینؑ کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

اس نے بزبان حال عرض کی اے سوار دوش رسولؐ میری کیا مجال کہ حکم سے سرتابی کروں لیکن میرے مولا ذرا میرے پاؤں کو تو ملاحظہ فرمایئے۔ اب جو امام علیہ السلام نے جھک کر دیکھا تو بالی سکینہ سموں سے لپٹی ہوئی ہے اور کہہ رہی ہے اے گھوڑے خدا کے لیے میرے باپ کو نہ لے جا مجھے یتیمی کی مصیبت سے بچا لے امام علیہ السلام گھوڑے سے اتر پڑے، بیٹی کو پیار کیا۔ بچی رو رو کر کہنے لگی۔ بابا کیا کروں۔ کسی طرح دل کو چین نہیں آتا آپؑ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے" فرمایا بیٹی میں دوستوں میں نہیں بلکہ دشمنوں میں جا رہا ہوں۔ تمہارا ساتھ جانا مناسب نہیں۔ الغرض بدقت آپؑ نے بیٹی کو رخصت کیا اور آپ جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۸/۱۱
وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَيَّ
مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

بیسویں مجلس

تفسیر آیۂ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الخ

و

حالِ شہادتِ امامِ مظلوم علیہ السلام

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ فَمِنۡہُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ ۚ وَ مِنۡہُمۡ مُّقۡتَصِدٌ ۚ وَ مِنۡہُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَیۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَضۡلُ الۡکَبِیۡرُ ﴿ؕ۳۲﴾

۳۵/۳۲ فاطر

پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے (ہمارے بندے تین قسم کے ہیں) بعض ان میں سے (نافرمانی کی وجہ سے) اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض میانہ رَو ہیں، اور بعض ان میں نیکی کی طرف باذنِ خدا دوڑ لگانے والے ہیں۔ سب سے بڑا فضل خدا کا یہی ہے۔

خداوند عالم نے اپنی مخلوقات کو مختلف جنسوں میں اور مختلف جنسوں کو مختلف نوعوں میں اور نوعوں کو صنفوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور صنفوں میں بعض افراد کو بعض سے ممتاز بنایا ہے وہ اس اختلاف میں اپنی کمال قدرت کا اظہار کرتا ہے۔ سمندروں میں جو پانی موجزن ہے وہ اس درجہ کھاری اور بدمزہ ہے کہ اگر کوئی پی لے تو قے ہو جائے اور بیمار پڑ جائے۔ لیکن یہی پانی جب سورج کی گرمی سے بھاپ بن کر اوپر جاتا ہے تو وہاں دستِ قدرت ہلکا سا جھٹکا دے کر جب نیچے گراتا ہے تو ذائقہ اور تاثیر دونوں بدلے ہوئے ہوتے ہیں کھاری

ے شیریں اور بد ذائقہ اسے خوش ذائقہ اور مضر سے مفید بن جاتا ہے۔ پہلے جس پانی سے کھیتیاں جل جاتی تھیں اب اسی سے لہلہا رہی ہیں۔ پہلے جس کو پی کر متلی ہوتی تھی اب اس کو پی کر دل خوش ہوتا ہے بظاہر پانی وہی ہے۔ لیکن ایک ذرا سی تبدیلی میں یعنی نیچے سے اُوپر جانے میں کیا سے کیا گیا۔

پھر اسی پانی کے قطرے کو جب صدف کے منہ میں ڈال دیا تو وہاں موتی بن گیا پہلے سیال تھا اب جامد ہے پہلے شفاف تھا۔ اب منوّر ہے پہلے قطرہ تھا اب گوہر ہے۔ ایک ذرا سا مقام بدلا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب پانی کے ایک قطرے سے اور اس سے کوئی نسبت ہی نہ رہی۔ گو اصل پانی کا قطرہ ہے اور صورت بھی اس ملتی جلتی ہے لیکن خصائص میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔

وہ گرم ہوائیں جو لُو بن کر جھلس رہی تھیں دستِ قدرت نے ذرا سا جو ان کو پہاڑوں کی چوٹیوں سے ٹکرا دیا۔ تو اب وہ نسیم سحری کہلانے لگی۔ اب ان ٹھنڈی ہواؤں سے کلیاں کھلتی ہیں۔ دل و دماغ کو راحت ملتی ہے۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ پھول خوشبو کی لپٹیں اُڑاتا ہے۔ دیکھو! ذرا سی تبدیلی ہوئی تو کیا سے کیا بنا دیا۔

ان بے ہنگم اور بد صورت چٹانوں کے اندر جنہیں کوئی کوڑی کو نہیں پوچھتا سورج کی کرنوں کو ذرا سی چمک مروڑ دستِ قدرت نے دی تو بیش قیمت جواہرات بن گئے۔ ہرنوں کے معمولی خون کو ناف میں لا کر جو جمایا تو مشک نافہ بنا دیا۔ درختوں کی جڑیں جو پانی کھینچ رہی تھیں وہ پھلوں تک پہنچتے پہنچتے ایسا شہد ٹپکانے لگیں کہ زبان چٹخارے بھرنے لگی۔ چیز ایک ہی ہے ذرا سے تغیر سے کچھ سے کچھ ہو گیا۔ بنی نوع انسان میں جب کسی کے دل میں وحی کا نور اُتار دیا تو صورت میں ضرور بشر رہا۔ لیکن سیرت میں خدا سے ملا۔

قُلْ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۱۸/۱۱۰ الکہف

اب اس کی صنف ہی ایک جداگانہ صنف بن گئی۔

اللہ رے وحی تیری شان کیا کایا پلٹ دی وحی بات اللہ کی بات ہو گئی آدمی کی زبان اللہ کی زبان کہلانے لگی۔ آدمی کا کلام اللہ کا کلام بن گیا۔ آدمی کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو گیا۔

وہ بے نیاز ذات جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ بندوں سے ملتی جلتی نہیں۔ صورت والی نہیں، مکان و زبان والی نہیں۔ ایک انسان اس وحی کی بدولت اتنا بلند مرتبہ پا گیا کہ اس کے امکان میں وجوب کی شان جھلکنے لگی۔

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل
سلمائے حدوث تو دلیلائے قدم را

یہی وہی جب قلب رسولؐ پر لکھی گئی تو کتاب اللہ کہلائی جب زبان رسولؐ پر آئی تو کلام اللہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ سبحان اللہ کیا دریائے نور میں ڈھلی ہوئی ہے اور بحر عصمت و طہارت میں غوطہ کھائی ہوئی وہ زبان تھی جس پر چڑھے ہوئے الفاظ بھی ایسے پاک و پاکیزہ ہوئے کہ طہارت کے بغیر ان کا چھونا بھی جائز نہ ہوا اور کیسا پاک و پاکیزہ دل تھا جس کے نقوش کی اتنی حفاظت کی گئی کہ جب اس کا ٹھپہ اُتارا گیا تو بلحاظ احتیاط سینہ سے سینہ ملا کر کسی نامحرم کی آنکھ نہ دیکھ سکے کسی غیر کا کان نہ سُن سکے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿٤٨﴾ بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ﴿٤٩﴾ (۲۹/۴۹ عنکبوت)

(اے رسولؐ قرآن نازل ہونے سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھا کرتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا ہی کرتے تھے۔ ایسا ہوتا تو ضرور یہ جھوٹے تمہاری نبوت میں شک کرنے لگتے۔ مگر جن لوگوں کو خدا کی طرف سے علم عطا ہوا ہے اُن کے دلوں میں یہ (قرآن) واضح اور روشن آیتیں ہیں اور سرکشوں کے سوا ہماری آیتوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

الفاظ عام لوگوں کے لیے سرچشمہ ہدایت قرار پائے اور مفہوم خاص لوگوں کے لیے قلزم ہدایت رہا۔ اس کا تعلق ظاہری طہارت سے اس کا تعلق باطنی طہارت سے وہ زبانی باتیں، یہ دلی راز، وہ ہوا سے کانوں تک پہنچنے والی باتیں۔ یہ محبت سے دل میں بیٹھنے والے راز۔ اُن کا تعلق امت سے ان کا تعلق عترت سے وہ نقوش کے اندر محفوظ۔ یہ نقوش کے اندر مستور۔ ان میں ریب کی گنجائش ان کنتم فی ریب یہاں یقین کی منزل ثم یبرنا لوا وہ محکم و متشابہ یہ سب محکم۔ اس کے حافظ بندے۔ اس کا حافظ خدا وہ خلاف تنزیل یہ مطابق تنزیل

اب ذرا آیہ مذکورالصدر پر نظر ڈالیے ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا الخ۔ ہم نے کتاب کا وارث بنایا یعنی کتاب کے وارث بنانے والے ہم ہیں تم نہیں۔ کتاب تمہاری

ہدایت کے لیئے نازل کی گئی ہے نہ کہ ملکیت بنانے کو جس کی ملکیت ہوتی ہے اسی کو مالک بنانے کا حق بھی ہوتا ہے۔ ہماری چیز کے وارث بنانے والے تم کون ہو؟ کسی چیز کا وارث، اس کا حاکم، متصرف اور صاحب اختیار ہوتا ہے۔ اگر تم کتاب کے وارث بن جاؤ۔ تو اس صورت میں حاکم و متصرف قرار پاتے ہو۔ اور ہماری کتاب تمہاری محکوم بنتی ہے۔ تم کو اس صورت میں اختیار ہو جاتا ہے کہ جو چاہو پڑھ لو۔ جو آیت جہاں چاہو رکھ لو، چونکہ تم معصوم نہیں، لہذا ایسا کرنا تم سے بعید نہیں۔ کتاب بڑی گراں قدر چیز ہے قیامت تک کے لیے قانون ہے ہمارا قانون ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جائے تو اس کا الزام ہماری ذات پر آئے گا۔ تمہاری زبان پر عصمت کا پہرہ دار نہیں بیٹھا۔ تمہارے دلوں کو طہارت کے پانی سے نہیں دھویا گیا۔ تم کو ایسی گراں قدر امانت کا امین کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کام ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم ایسے کو امین بنائیں گے جو اس کا اہل ہو۔ جو مطالب قرآن کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کے قابل ہو اور یہ کتاب جس کے ہر عمل کی تصدیق کر رہی ہو۔ جن کی بات ہماری بات ہو جن کا فعل ہمارا فعل ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ وراثت کا قانون نسب میں چلتا ہے سبب میں نہیں۔ وارث خدا کا بنایا ہوا ہوتا ہے نہ کہ ہر وہ شخص جو مدعی وراثت ہو۔ اگر کسی کی وراثت کا مقدمہ جج کی کچہری میں ہو۔ اور ایک شخص جا کر یہ کہہ دے کہ جناب میں اس مال کا وارث ہوں۔ کیونکہ متوفی کا میں سالہ ہوں یا خسر ہوں تو جج اس کو دیوانہ سمجھ کر اپنی کچہری سے نکال دے گا۔

پس خیال کیجئے کہ جب مالی وراثت میں ایسا ہے تو بھلا وراثت کتاب نا اہلوں نافرمانوں اور غیر متعلق لوگوں تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اگر عملے کی غلطی سے کوئی داخل خارج ایسے شخص کے نام سے ہو جاتا ہے جو حقیقی وارث نہ ہو تو پردہ فاش ہونے پر اس کا نام سرکاری رجسٹر سے کٹ جاتا ہے اور حقیقی وارث کا نام چڑھ جاتا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا سورۂ برات کا واقعہ سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص دھوکے سے مال وغیرہ پر تصرف کر کے اپنی ملکیت کا اظہار کر بیٹھتا ہے تو یہ معاملہ چلتا نہیں۔ بہت جلد لوگوں پر حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایک چور کسی مکان سے رات کو ایک بکس چرا کر چلا۔ سپاہی نے ٹوک کر پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اس نے کہا۔ میں ایک مسافر ہوں۔ ریل پر جا رہا ہوں۔" سپاہی کو اس کی گھبراہٹ سے کچھ شبہ ہوا۔ پوچھا "یہ بکس کس کا ہے؟"

اس نے جواب دیا "میرا ہے" سپاہی نے کہا "ذرا اس کی کنجی تو مجھے دکھاؤ" اس نے کہا "کنجی تو میرے

پاس نہیں۔ گھر بھول آیا۔ سپاہی نے کہا۔ اچھا اتنا بتاؤ اس کے اندر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے ٹھیک طور پر خبر نہیں۔ یہ سن کر سپاہی اس کو چور سمجھ کر گرفتار کر لیتا ہے۔ اب اس بکس کا مالک وہاں پہنچا ہے اور کہتا ہے یہ بکس میرا ہے جسے چور چرا کے لے آیا ہے۔ سپاہی پوچھتا ہے کیا ثبوت؟ وہ کہتا ہے اسکی کنجیاں میرے پاس ہیں۔ اسمیں میرا بہت سا مخصوص سامان ہے دیکھو یہ تطہیر کی چادر ہے جو مجھے پاکیزگی کے انعام میں ملی ہے دیکھو یہ میری ولایت کا نشان ہے جو حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے کے صلے میں ملی ہے۔ یہ تیسری سند ہے جو ایفائے نذر کی تعریف ہے چوتھے یہ میرے علم کا سرٹیفکیٹ ہے۔ دیکھو اس میں لکھا ہے۔

اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَہُمۡ ؕ وَ کُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰہُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۲﴾

(۲۶/۱۲ یٰسین)

ہم ہی مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو عمل انہوں نے کیے ہیں اور دُنیا میں جو آثار چھوڑے ہیں۔ وہ سب ہم لکھ لیتے ہیں اور ہر شے کو امام مبین میں گھیر دیا ہے۔

یہ میری شجاعت کی سند ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾ ۴/۶۱ الصف

ترجمہ:۔ خدا تو ان لوگوں سے الفت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح پرا باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

یہ میری ولایت کی سند ہے۔ مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَہٰذَا عَلِیٌّ مَوۡلَاہُ

اسی طرح بے شمار اسناد ہیں کہاں تک دکھاؤں تم اس بکس کے اندر ایک ایک چیز کا حال پوچھ لو یہ سنتے ہی وہ سپاہی سمجھ جاتا ہے کہ اس بکس کا مالک یہی ہے کیونکہ اس کا صحیح علم اس کے پاس ہے۔ مال دُنیا کی وراثت اہل و نا اہل ہشیار و دیوانہ سب کو پہنچ جاتی ہے کیونکہ خدا نے نسل میں ہونے کی یہ رعایت رکھی ہے۔ لیکن علمی وراثت میں نا اہلوں کو حصہ نہیں اور نسل کا اس سے تعلق نہیں ہاں صاحب وحی سے اتنا قریبی تعلق رکھتا ہو کہ وحی کی آواز سن لیتا ہو۔ صاحب وحی کا نفس ناطقہ کہلاتا ہو پھر نسلی تعلق اس رشتہ کو زیادہ قوی بنا دیتا ہے۔

خدا نے اپنی کتاب کی وراثت کا تعلق اپنے برگزیدہ بندوں سے رکھا ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ عام لوگوں کا اس وراثت سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کا جمع کر لینا اور بات ہے۔ اور خدا کی طرف سے وارث بننا اور بات ہے جو لوگ اصطفائے الہیٰ میں آگئے ہیں۔ وہی اس منصب جلیلہ کے مستحق ہو سکتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جن کو بندوں نے اپنے میں سے انتخاب کر لیا ہو۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ خدا نے کن کن لوگوں کا اصطفا کیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ (۳۳) ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۳۴)

(۳/۳۳ عمران)

بے شک اللہ نے برگزیدہ کیا آدم و نوح اور اولادِ ابراہیم و اولاد عمران کو تمام عالموں پر بعض کی اولاد کو بعض سے (بلند مرتبہ بنایا) اور اللہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

مفسرین عامہ میں کسی نے آج تک اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ یہ اصطفے کس معیار پر ہوا کہ حضرت سے پہلے کے صرف چار اس معیار پر پورے اُتر سکے۔ حالانکہ وہ انبیاء اولعزم میں نہیں۔ انتہا یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسا نبی بھی اس معیار پر پورا نہ اُترا۔ تعجب ہے کہ ان کی اولاد تو حلقۂ اصطفےٰ میں داخل ہوا اور وہ خود نہ ہوں نہایت غور طلب بات ہے۔

سنیئے یہ اصطفےٰ دو جہت سے ہوا ابتدائے نبوت بتانے کو اور انتہائے نبوت بتانے کو اس بنا پر آدم اور ابراہیم کا اصطفا عمل میں آیا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت کی ابتدا ہوئی اور اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر انتہا دوسری جہت شریعت کی ابتدا اور انتہا کتاب خدا کی ہدایت کا آغاز اور آخر بتانے کے لیے ہے چنانچہ شریعت الہیہ کی ابتداء حضرت نوح علیہ السلام سے ہوئی یعنی نوح علیہ السلام سب سے پہلے وہ ہادی ہیں جنہوں نے کتاب خدا ہاتھ میں لے کر سب سے پہلے بندگان خدا کو شریعت کی تعلیم دی اور اس کی انتہا آل عمران یعنی اولاد ابو طالبؑ پر ہوگی۔ ابو طالبؑ کی نسل سے خدا کی بارہویں حجت یعنی ہمارے بارہویں امام علیہ السلام بہ حیثیت وارث کتاب اللہ دنیا کے آخر وقت تک دین محمدی کی تعلیم دیں گے اس آیت نے واضح کر دیا کہ وراثت قرآن کے لیے خدا نے اولاد ابو طالبؑ کا انتخاب کیا ہے۔

جو لوگ آل عمران سے مراد جناب موسیٰ علیہ السلام اور ان کی ذریت لیتے ہیں۔ وہ یہ تو بتائیں کہ آل ابراہیمؑ کہنے کے بعد آل عمران کہنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیا جناب موسیٰؑ اولاد ابراہیمؑ میں داخل نہیں

یہ صحیح ہے کہ آل عمران یعنی اولاد ابو طالب بھی داخلِ آل ابراہیم علیہ السلام ہے۔ لیکن علیحدہ سے ذکر کرنے کی ضرورت یہ بھی کہ اولاد ابراہیم علیہ السلام دو نسلوں میں منقسم ہے۔ ایک نسل اسمٰعیلی دوسرے نسل اسحاقی پہلی نسل کی ہدایت اور شریعت جناب عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گئی۔ اور دوسری نسل کا سلسلہ چونکہ صلب ابو طالب سے چلنے والا تھا۔ لہٰذا نسلی افتراق کرنے پر اور اقتباس کو دور کرنے کے لیے آل عمران کہنا ضروری تھا جو اس امر کو تسلیم نہیں کرتے ان کے لیے ناممکن ہو جائے گا کہ پھر وہ اس آیت کے متعلق اصطفا کا دوسرا معیار پیش کر سکیں۔

اصطفائے الٰہی کے معیار پر صحیح اُترنے کے لیے کم سے کم دو صفتیں تو ہونی چاہئیں اول علم دوسرے قوت جسم چنانچہ جناب طالوت کا اصطفا اسی بناء پر ہوا

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۲۴۷) البقرہ

ترجمہ (نبی نے کہا) خدا نے اسے تم پر فضیلت دی ہے اور (مال میں نہ سہی) مگر علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اسی کا خدا نے زیادہ فرمایا ہے۔ ۲/۲۴۷

اللہ نے طالوت کا تم پر اصطفا کر لیا اور علم و جسم میں ان کی طاقت کو بڑھا دیا۔ سب جانتے ہیں کہ طالوت کو اسی لیے بادشاہت ملی۔ کہ علم اور جسمانی زور میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ جب کسی قوم میں بادشاہ بنانے میں خدا ان باتوں کا لحاظ رکھتا ہے تو کیا وارثان کتاب میں اس سے زیادہ بہترین صفات نہ دیکھے گا اگر یہاں علم و جسم ہے تو وہاں عصمت و طہارت کا اور اضافہ ہو گا۔

خدا نے اپنے بندوں کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک ظالم لنفسہ، دوسرے میانہ رو اور تیسرے سابق بالخیرات۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تین قسم کے آدمیوں میں سے کون سی صفت والے انسان وارث کتاب بننے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ظالم تو وارث نہیں ہو سکتا۔ اب رہے میانہ رو وہ بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان سے بہتر صنف موجود ہے۔ اگر ایک شخص کو سفر کرنا مقصود ہو اور اس سے کہا جائے کہ بیل گاڑی بھی حاضر ہے گھوڑا بھی موجود ہے اور موٹر کار بھی تو اگرچہ دوسری سواریوں سے بھی منزل تک پہنچنا ممکن ہے مگر وہ یقیناً موٹر ہی کو پسند کرے گا۔ کیونکہ وہ آرام دہ بھی ہے اور تیز رو بھی ہے پس سابق بالخیرات کے ہوتے پہلے دو گروہ کس طرح وارث کتاب بن سکتے ہیں۔

ایک بار مامون رشید عباسی نے اپنے درباری عالم یحییٰ بن اکثم سے پوچھا کہ جس روز حضرت رسول خدا نے اعلانِ رسالت کیا سب سے بڑی نیکی کیا تھی۔ انہوں نے کہا آپ کی رسالت کی تصدیق مامون نے

کہا۔ پھر اس عملِ خیر کی طرف سبقت کس نے کی ؟ کہا جناب علیؑ نے لیکن چونکہ وہ کم سن تھے اس لیے ان کا تصدیق رسالت کرنا کافی نہ تھا۔ البتہ حضرت ابو بکرؓ کی تصدیق کافی کہی جا سکتی ہے کیونکہ وہ کبیر السن تھے۔ اسی وجہ سے ان کو صدیق لقب دیا گیا ہے۔

مامون نے کہا یحییٰ یہ تو بتاؤ کہ رسولؐ نے علیؑ کو اپنی طرف سے دعوت اسلام دی تھی یا بحکم خدا یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ اپنی طرف سے ایسا کیوں کیا کہ موافق آیہ

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ② وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ③ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ④ (۵۳/۱-۴ نجم)

تارے کی قسم جب ٹوٹا کہ تمہارے رفیق نہ گمراہ ہوئے ہیں نہ بہکے۔ وہ تو اپنی خواہش نفسانی سے کبھی بولتے ہی نہیں یہ تو بس وحی ہے جو بھیجی جاتی ہے۔

پس یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کے حکم سے یہ دعوت دی گئی تھی۔ یحییٰ ذرا سوچ کر بتاؤ۔ کیا خدا اپنے رسولؐ کو ایک ایسے شخص کی دعوت کا حکم دے سکتا تھا۔ جو عند الشرع مکلّف نہ ہو۔ اور اس کی تصدیق کسی شمار و قطار میں نہ ہو۔

یہ سنتے ہی یحییٰ کو پسینہ آگیا اور خاموش سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ مامون نے کہا اے یحییٰ یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم نے علیؑ کے نفس کو بچپن میں وہ کمال عطا فرمایا تھا کہ اوروں کو جوانی اور بڑھاپے میں بھی حاصل نہیں ہوتا۔

اس حکایت کا نتیجہ یہ نکلا کہ سابق بالخیرات حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہیں۔ پس وہی کتاب اللہ کے وارث ہیں وارث کتاب وہی شخص ہو سکتا ہے جو کتاب اللہ کا پورا علم اپنے سینہ میں رکھتا ہو۔ اگر ایک شخص اپنے کو گھر کا مالک کہے لیکن اسے یہ خبر نہ ہو کہ اس کے اندر کیا کیا سامان ہے اور کس مصرف اور کس قیمت کا ہے کب خریدا گیا اور کس ضرورت کے لئے خریدا گیا تو ایسا شخص برائے نام گھر کا مالک یا وارث سمجھا جائیگا وارث کتاب صرف وہی ہو سکتا ہے جس کی شان میں ہے۔ من عندہ علم الکتاب

کتاب اللہ قیامت کے لیے ایک قانونی کتاب ہے۔ اور کسی قانون کا وارث وہی شخص کہا جا سکتا ہے جو اس قانون کا صحیح جاننے والا ہو۔ آج سرکاری قانون ہر شخص کے ہاتھ میں ہے لیکن کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ میں اس کا وارث ہوں۔ بڑے بڑے بیرسٹر اور وکلا کچہریوں میں چلتے ہیں لیکن جج کی رائے کے

سامنے ان کی نہیں چلتی اور جج کی رائے کو ہائی کورٹ لوٹ دیتا ہے۔ اور ہائی کورٹ کی رائے سپریم کورٹ لوٹ دیتی ہے۔ لیکن سپریم کورٹ کے فیصلہ کی پھر اپیل نہیں۔ کیونکہ اب معاملہ ایسے لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جو سرکار کی طرف سے اس قانون کے صحیح سمجھنے والے قرار دیئے گئے ہیں۔ پس اصلی مالک اور وارث وہی لوگ کہے جا سکتے ہیں اسی طرح کتاب اللہ کے وارث نہیں بن سکتے۔ مگر وہی جو خدا کی طرف سے معین کیے گئے ہوں اور ان کا فیصلہ ہر حال میں ناطق ہو اور ایسے لوگ وہی ہو سکتے ہیں جن کے پاس پوری کتاب کا علم ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر آصف برخیا کتاب خدا کا تھوڑا سا علم رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی اتنی طاقت تھی کہ چشم زدن میں بلقیس کو مع تخت حاضر کر دیا۔ پس جس کے پاس کتاب خدا کا پورا علم ہو اس کی طاقت کی کیا انتہا ہوگی۔ وہ کائنات کی ہر شئے کو قابو میں رکھنے والا ہوگا انتہا یہ ہے کہ فرشتے اس کی خدمت کو اپنا فخر سمجھتے ہوں گے۔

حضرت رسولؐ خدا جو مورث کتاب اللہ ہیں۔ اس وقت تک دنیا سے نہیں اٹھے جس وقت تک وراثت کتاب کا بند و بست ہمیشہ کے لیے نہیں کر دیا آپؐ نے اپنے اہلبیت علیہم السلام کو اسی لیے قرآن کے ساتھ کیا کہ وہ قرآن کے صحیح معنی میں عالم تھے۔ آپ نے کھلے الفاظ میں یہ فرمایا تھا۔ علی مع القرآن والقرآن مع علی (علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ) دنیا نے بارہا امتحان کر کے جانچ لیا کہ علیؑ سے بہتر بعد رسول قرآن کا جاننے والا کوئی اور نہ تھا۔ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے زمانہ میں جب کوئی مشکل قضیہ آ پڑتا تھا تو حضرت علی علیہ السلام ہی کی طرف رجوع کی جاتی تھی اور آپ ہر معاملہ کو بآسانی قرآن سے حل کر دیتے تھے۔

ایک بار ایک مشکل قضیہ حضرت علی علیہ السلام نے قرآن سے حل کیا اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس کا ثبوت قرآن سے کیا ہے؟ آپ نے فوراً آیت سنا دی۔ عمرؓ نے کہا آپ نے فوراً آیت پڑھ دی۔ اتنی جلدی نہ کیا کیجئے مبادا غلطی ہو جائے۔ آپ نے فرمایا:

اے ابو حفص تمہارے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔ کہا پانچ۔ فرمایا:

تم نے جواب میں بہت جلدی کی۔ انہوں نے کہا یہ تو کوئی سوچنے کی بات نہ تھی۔ فرمایا: پس تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ پانچ انگلیاں ہیں اسی طرح پورا قرآن علی کی نظر کے سامنے ہے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ رسولؐ نے مسلمانوں کی ہدایت کے لیے دو چیزیں چھوڑی تھیں ایک قرآن دوسرے اہل بیت علیہم السلام اور یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ ایسا چولی دامن کا ساتھ ان دونوں کا ہے کہ حوض کوثر پر

یہ دونوں میرے پاس ساتھ ہی آئیں گے۔ اس سے قبل ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ اللہ رسولؐ تو اپنا اہتمام بلیغ فرمائیں کہ قیامت تک کا بندوبست کریں ۔ اور مسلمانوں کو دیکھو کہ آنحضرتؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی مخالفت نہ کی تو بات ہی کیا ہوئی۔ شاید ہی کسی قوم نے اپنے رسولؐ کی مخالفت اس شان سے کی ہو جتنی مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کی کی گویا انہوں نے اپنے مقام پر یہ طے کر لیا تھا کہ کفار و مشرکین سے ہمدردی کا برتاؤ کر لیں گے مگر عترت رسولؐ سے نہ کریں گے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی بات کان لگا کر سن لیں گے مگر ان کی نہ سنیں گے۔ چنانچہ رسولؐ کے مرتے ہی اس تجویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ابتداً ڈھکی چھپی مخالفتوں سے ان کی جان و مال اور آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا رہا۔ آخر ۶۱ھ ہجری کے محرم میں مخالفت بے نقاب ہو کر نکل پڑی۔ اور کھلم کھلا اولاد رسولؐ کی گردنوں کو تلواروں سے کاٹا جانے لگا۔

پنجتن پاک میں تین ہستیوں کا خاتمہ تو پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ اب صرف ایک دم حسین علیہ السلام کا رہ گیا تھا سو ان کو بھی ظالموں نے مہمان بلا کر گھیر لیا۔ اور کوئی امکانی ظلم اٹھا نہ رکھا۔ صبح عاشور سے بازار موت گرم تھا۔ اور امام مظلوم علیہ السلام کے رفقاء باری باری درجۂ شہادت پر فائز ہو رہے تھے یہاں تک کہ وہ وقت قریب آ گیا کہ رسولؐ کا پارۂ جگر علیؑ و فاطمہؑ کا نور نظر تن تنہا میدانِ کربلا میں رہ گیا۔

منقول ہے کہ جب امام مظلوم علیہ السلام اہل حرم کو رخصت کر کے میدانِ جنگ میں تشریف لائے تو اپنی تنہائی پر دل بھر آیا ؎

نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت النا ہے
نہ قاسم ہے نہ علی اکبر ہے نہ عباس ہے

اس وقت آپ نے اس طرح استغاثہ فرمایا:

هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا

ہے کوئی مددگار کہ اس وقت بے کسی میں ہماری مدد کرے۔ ہے کوئی فریاد رس جو اس وقت بے بسی میں ہماری فریاد پر پہنچے۔

آہ! حضرتؑ کی اس آواز استغاثہ سے زمین و آسمان ہل گئے۔ ملاء اعلیٰ میں شور مچ گیا۔ آہ ان لاکھوں خون کے پیاسوں میں کون ایسا تھا کہ سید مظلوم کی مدد کرتا۔

لکھا ہے کہ اسی حالت بے کسی میں آپ کی نگاہ مقتل شہدا پر جا پڑی۔ ایک بار بے چین ہو کر لاشہائے شہداء سے یوں خطاب کرنے لگے۔

يَا حَبِيبَ ابْنِ مَظَاهِر يَا زُهَيْرَ بْنَ الْقَيْنِ يَا مُسْلِمَ بْنَ عَوْسَجَة يَا عَلِيَّ الْأَكْبَر

یَا قَاسِمَ بْنَ الْحَسَنْ یَا اَبَاالْفَضْلِ الْعَبَّاسْ یَا اَبْطَالَ الصَّفَا یَا فُرْسَانَ الْهَیْجَا مَالِیْ اُنَادِیْکُمْ فَلَا تُجِیْبُوْنَ وَاَدْعُوْکُمْ فَلَا تَنْصُرُوْنِیْ هَلْ اَنْتُمْ نِیَامٌ اَمْ اَیْقَظُوْنَ اَمْ زَالَتْ مَوَدَّتُکُمْ عَنْ اِمَامِکُمْ فَلَا تَنْصُرُوْنَهُ قُوْمُوْا اَیُّهَا الْکِرَامُ وَادْفَعُوْا عَنْ حَرَمِ الرَّسُوْلِ الطُّغَاةَ اللِّئَامَ۔

دائے حبیب بن مظاہر اے زہیر بن القین اے مسلم بن عوسجہ اے علی اکبر اے قاسم اے عباسؑ اے بیشۂ شجاعت کے شیرو! اے میرے جنگ جو جوانو! تمہیں کیا ہو گیا۔ میں تمہیں پکارتا ہوں اور تم جواب نہیں دیتے۔ میں تم کو اپنی نصرت کے لیے بلا رہا ہوں اور تم میری مدد کو نہیں آتے۔ اے میرے بہادرو! تم سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو۔ تمہارے دل سے امام کی محبت نکل گئی کہ تم اس کی مدد نہیں کرتے اے نیک طینت مددگارو کھڑے ہو جاؤ اور حرم رسولؐ سے ان سرکشوں کو ہٹا دو۔

حضرتؑ کی اس درد بھری آواز کو سنتے ہی لاشہائے شہداء کانپ گئے اور ان کے حلق ہائے بریدہ سے آواز آئی اے فرزند رسولؐ آپ کی بے کسی کے قربان کیا کریں موت نے ہمیں مجبور کر دیا۔ ورنہ ایک کیا ہزار جانیں آپ پر سے قربان کرنے کو تیار ہیں۔

آپ اس کے بعد اس قوم جفاکار کے سامنے تشریف لائے اور بغرض اتمام حجت فرمایا اے قوم میں تمہارے نبی کا نواسہ ہوں۔ تم کیوں میرے درپئے قتل ہو۔ کیا میں نے کوئی نیا دین ایجاد کیا ہے۔ کیا میں نے کسی شریعت کو بدلا ہے۔ کیا میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے۔ کیا میں نے کسی کا مال چھینا ہے کہ تم میرے خون کے پیاسے بن رہے ہو۔

اے قوم کیا میرے سر پر تمہارے رسولؐ کا عمامہ نہیں، کیا میرے بدن پر یہ لباس تمہارے رسولؐ کا نہیں۔ کیا میں وہی حسینؑ نہیں ہوں جس کی شان میں تمہارے رسول نے فرمایا حسینؑ منی وانا من الحسینؑ اے اہل کوفہ و شام تمہیں کیا ہو گیا جس نبی کا کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسے کے قتل پر کمربستہ ہو۔ اے بے غیرتو! تم نے مجھے مہمان بلا کر چاروں طرف سے گھیر لیا اور آب رواں مجھ پر بند کر دیا ہے میرے ننھے ننھے بچے بھوک اور پیاس سے بلک رہے ہیں۔ اور تم چین سے بیٹھے ہو۔

آہ! تم نے میرے بھرے خاندان کی صفائی کر دی۔ میرے تمام انصار و احباب گوسفندان قربانی کی طرح تمہارے ہاتھوں ذبح کر دیئے گئے اس پر بھی تمہاری آتش عداوت نہ بجھی۔ اور اب مجھ بے گناہ کے قتل پر آمادہ ہو۔ اے ظالمو! عذاب آخرت سے ڈرو کہ وہ بہت سخت ہوگا۔ وہ وقت قریب ہے کہ عذاب الٰہی کے شعلے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیں۔

یہ سُن کر اس بے حیا قوم نے جواب دیا اے حسینؑ یہ وقت فضائل بیان کرنے اور نصیحت کرنے کا نہیں بلکہ ہم سے جنگ کرنے کا ہے۔ اگر جان پیاری ہے تو بیعت یزید پر راضی ہو جاؤ ورنہ اپنے قتل کی تیاری کرو۔

یہ سن کر امام مظلوم علیہ السلام لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور فرمایا اے بے حیا قوم میں جنگ کرنے سے عاجز نہیں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ بغرض اتمام حجت کہہ رہا تھا اچھا اب فاتح بدر و احد و خیبر و خندق کے بیٹے کی جنگ دیکھو۔

اس کے بعد آپؑ نے ذوالفقار حیدر کرار کو نیام سے نکالا اور شیرانہ رجز پڑھتے ہوئے اس قوم زبوں کردار پر حملہ آور ہوئے۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے۔ میں نے نہ آنکھوں سے دیکھا اور نہ کانوں سے سنا کہ جس کے عزیز، بوڑھے، جوان اور بچے اس کی آنکھوں کے سامنے مارے گئے ہوں۔ تین دن کا بھوکا پیاسا ہو۔ بدن زخموں سے چُور چُور ہو اور پھر حسینؑ کی طرح اس بہادری سے لڑا ہو۔

ایک تن تنہا کے حملے نے دشمنوں کے حلقوں میں ہل چل ڈال دی تھی۔ ایسی ابتری تھی کہ سپاہی پر سپاہی گر رہا تھا جس طرف رُخ فرماتے دشمن اس طرح بھاگتے پھرتے تھے۔ کانہم جراد منتشر گویا ہوا کے زور سے ٹڈیاں پریشان ہو رہی ہیں۔

صاحب بحر البکا لکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کا تیسرا حملہ اس زور کا تھا کہ فوج پیچھے ہٹتے ہٹتے کوفہ کے دروازے کے اندر داخل ہو گئی۔ اور بے شمار لوگ گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل گئے۔ ہر طرف سے الامان الاماں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حضرت نے جب عاقبت برباد وں کی یہ حالت دیکھی تو گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور ایک مقام پر کھڑے ہو کر ان کے انتشار کی حالت ملاحظہ فرمانے لگے۔ ناگاہ مابین آسمان و زمین ایک آواز پیدا ہوئی اے حسینؑ! اب کب تک لڑتے جاؤ گے۔ تمہارے وعدے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

یہ سنتے ہی حضرتؑ نے ذوالفقار آبدار کو نیام میں کر لیا اور لقائے الہیٰ کے شوق میں اپنی شہادت کی گھڑیاں گننے لگے۔ فوجِ یزید نے حضرتؑ کو ٹھہرا ہوا پایا اور ذوالفقار کو ہاتھ میں نہ دیکھا تو یہ سمجھ کر حضرت جنگ کرتے کرتے تھک گئے ہیں سب بھاگے ہوئے سپاہی پھر جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے گھیر کر حملہ پر حملہ اور وار پر وار شروع کر دیا۔ آہ! ایک مظلوم بھوکے پیاسے کو ہزاروں خون کے پیاسے گھیرے تھے۔ آپ کا تمام بدن زخموں سے چُور چُور تھا۔ کپڑے خون سے تر بہ تر تھے کمزوری سے غش پر غش آ رہے تھے۔ اور پیاس کی شدت سے زبان تڑپ رہی تھی۔ آہ کون تھا کہ اس حالتِ بے کسی اور بے بسی میں اس امام غریب پر رحم کھاتا۔ اسی حالت میں آپ نے ایک بار پھر آوازِ استغاثہ بلند کی۔ ھل من ناصر

ینصرنا ھل من مغیث یغیثنا اس آواز کے بلند ہوتے ہی ملاء اعلیٰ میں قیامت برپا ہوگئی جبریل امین نے درگاہِ الٰہی میں عرض کی۔ پالنے والے مجھ سے اپنے پیارے حسینؑ کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ یہ وہی حسین تو ہے جس کے لیے میں جنت سے میوے لے کر جاتا تھا۔ جس کی گہوارہ جنبانی کرتا تھا۔ پالنے والے مجھے اجازت دے۔ کہ میں اس وقت بے کسی میں حسین کی مدد کروں۔ حجاب قدرت سے آواز آئی اے جبریل اگر میرا حسینؑ تیری مدد قبول کرے تو ضرور مدد کر دینا۔ تبھی جبریل امین نے نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے مقام سے پرواز کی اور کربلا میں پہنچ کر امام کے سر پر اپنے پروں کا سایہ کر لیا۔ تاکہ پیاسے نبی زادہ کو حدّت آفتاب سے کچھ سکون حاصل ہو۔

لکھا ہے جب امام مظلوم علیہ السلام کو سایہ کی وجہ سے کچھ خنکی محسوس ہوئی۔ تو آپ نے آسمان کی طرف نظر کی۔ اور فرمایا: اے سایہ کرنے والی مخلوق تو کون ہے کہ اس وقت بے کسی کے عالم میں تجھ کو میری مدد کا خیال آیا۔ آواز آئی اے مظلوم حسینؑ میں تمہارا خادم جبرئیل ہوں۔ اجازت دو تو میں ابھی آپؑ کے دشمنوں کا خاتمہ کر دوں۔ آپ نے فرمایا اے جبریلؑ مجھے یہ منظور نہیں۔ میں لقائے الٰہی کا مشتاق ہوں۔ یہ وقت میرے امتحان کا ہے۔ میرے سر سے اپنا سایہ ہٹا لو۔ الغرض جبریلؑ امین مایوس ہو کر واپس ہو گئے اور ہمارے مظلوم امام علیہ السلام اپنا سوکھا گلا کٹانے پر تیار ہوئے۔ آپ نے اپنا عمامہ اور دیگر تبرکات گھوڑے کی زین سے باندھے اور گھوڑے سے فرمایا:

"اے اسپ وفادار جب تیرا سوار زین سے زمین پر آجائے تو یہ سب چیز بحفاظت تمام اہل حرم تک پہنچا دینا۔"

آہ! آہ!! کس زبان سے عرض کیا جائے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس قوم جفا کار نے یکایک چاروں طرف سے تیروں کی بارش شروع کر دی اور قریب آکر نیزے پر نیزے مارنے لگے۔ یہاں تک امام مظلوم سے گھوڑے پر نہ ٹھہرا گیا۔ اور آپ رضاً بقضائہ وتسلیماً لامرہ کہتے ہوئے زمین پر تشریف لے آئے۔ آہ! آہ!! مومنین آپ کے جسم مبارک پر اتنے تیر پیوست تھے۔ جیسے ساہی کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؑ کا جسم مبارک زمین سے متصل نہ ہو سکا اور تیروں پر معلق رہا۔

منقول ہے جب حضرتؑ گھوڑے سے گرے تو پسر سعد نے سرداران لشکر سے کہا جلد حسینؑ کا سر کاٹ کر اس قصہ کو ختم کر دو۔ لیکن کسی سردار کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس سخت کام کو انجام دے۔ آخر شمر ملعون اس کام پر آمادہ ہوا کہ نبی زادہ کا سوکھا گلا کاٹ کر زمین و آسمان کو ہلا دے۔ چنانچہ وہ شقی خنجر بکف اس نشیب کی طرف روانہ ہوا جہاں امام مظلوم علیہ السلام خاک و خون میں آغشتہ تھے۔ یہ وقت عصر کا تھا حضرتؑ اسی تباہ حالت میں اشاروں سے نماز ادا فرما رہے تھے کہ شمر ملعون وہاں پہنچا اور بے محابہ حضرتؑ کے سینے

پر چڑھ بیٹھا۔
لکھا ہے کہ جب حضرتؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لائے تھے تو جناب زینبؑ بے تابانہ خیمہ سے نکل پڑیں اور واہ حسیناہ واہ حسیناہ کے نعرے مارتی ہوئی اس ٹیلہ پر پہنچ گئیں جو تل زینبیہ کے نام سے مشہور ہے اور وہاں سے فریاد کرنے لگیں۔ اے ظالمو میرے مظلوم بھائی پر رحم کرو۔ جب آپ نے دیکھا شمر بد انجام خنجر بکف حضرتؑ کی طرف آرہا ہے تو آپ بلبلا گئیں اور انتہائی بے چینی میں پسر سعد کو مخاطب کر کے فرمانے لگیں۔
یَابْنَ سَعْدٍ قَطَعَ اللّٰہُ رَحِمَكَ اَخِیْ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ یُقْتَلُ وَاَنْتَ تَنْظُرُ
اے ابن سعد خدا تیری نسل کو قطع کرے میرا بھائی ابو عبداللہؑ قتل ہو رہا ہے اور تو دیکھ رہا ہے آہ آہ۔
جناب زینبؑ فریاد کرتی رہیں اور وہاں شمر ملعون نے بوسہ گاہ نبوی پر خنجر پھیر دیا جس سے زمین کربلا میں زلزلہ آگیا سورج کو گہن لگ گیا سیاہ آندھی چلنے لگی۔ ہر طرف قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاءِ ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَاءِ کی صدائیں گونجنے لگیں۔ خوشی کے باجے بجنے لگے۔
لکھا ہے جب حلق امام پر خنجر چل رہا تھا تو تین خاص باتیں لوگوں نے دیکھیں ایک چیز اوپر سے نیچے کو آئی۔ ایک چیز نیچے سے اوپر کو گئی اور ایک چیز چاروں طرف گھومنے لگی۔ جو چیز اوپر سے نیچے کو آئی وہ جبرئیلؑ فرشتہ تھے۔ جو چیز نیچے سے اوپر کو گئی وہ امام علیہ السلام کا سر تھا جو خولی کے نیزے پر چڑھا اور جو چیز چاروں طرف گھومی وہ حسین کی دکھیا بہن زینب تھی جو اپنے بھائی کی لاش کے گرد بے چینی سے گھوم رہی تھی۔ اور کلیجہ ہاتھوں سے پکڑے فریاد کر رہی تھی۔ وامحمداہ واعلیاہ ہائے ہیں کربلا کے بن میں لٹ گئی۔ ہائے میری ماں کا پھولا پھلا باغ پردیس میں اجڑ گیا' اے میرے مظلوم برادر کاش ستم رسیدہ بہن اس سے پہلے اندھی ہو جاتی۔ اور آپ کو اس حالت میں نہ دیکھتی۔ آہ خدا کسی بہن کو بھائی کی یہ حالت نہ دکھائے جو ہماری شہزادی جناب زینب نے اپنے بھائی کی دیکھی۔ بار بار زمین پر غش کھا کر گر پڑتی تھیں۔
حضرت امام عصر علیہ السلام اپنے جدِ مظلوم کی واقعہ زیارت ناحیہ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔
یَا جَدَّاہُ قَدْ عَجِبَتْ مِنْ صَبْرِكَ مَلَائِكَۃُ السَّمٰوَاتِ فَاَحْدَقُوْا بِكَ مِنْ کُلِّ الْجِہَاتِ وَاَثْخَنُوْكَ بِالْجِرَاحِ وَحَالُوْا بَیْنَكَ وَ بَیْنَ الرَّوَاحِ وَلَمْ یَبْقَ لَكَ نَاصِرٌ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ تَذُبُّ عَنْ نِسْوَتِكَ وَاَوْلَادِكَ حَتّٰی نَکَسُوْكَ عَنْ جَوَادِكَ فَھَوَیْتَ اِلَی الْاَرْضِ جَرِیْحًا عَلَی التُّرَابِ طَرِیْحًا تَطَؤُكَ الْخُیُوْلُ بِحَوَافِرِھَا وَیَعْلُوْكَ الطُّغَاۃُ بِبَوَاتِرِھَا قَدْ رَشَحَ الْمَوْتُ جَبِیْنَكَ

وَاخْتَلَفَتْ بِالْانْقِبَاضِ وَالْاِنْبِسَاطِ شِمَالُكَ وَيَمِيْنُكَ طَرْفاً خَفِيّاً اِلٰى رَحْلِكَ وَبَيْتِكَ وَشُغِلْتَ بِنَفْسِكَ مِنْ وُلْدِكَ وَاَهَالِيْكَ وَاَسْرَعَ فَرَسُكَ شَارِداً وَاِلٰى خِيَامِكَ قَاصِداً مُحَمْحِماً بَاكِياً فَلَمَّا رَاَيْنَ النِّسَاءُ جَوَادَكَ مَخْزِيّاً وَنَظَرْنَ اِلٰى سَرْجِكَ مَلْوِيّاً بَرَزْنَ مِنَ الْخُدُوْدِ نَاشِرَاتِ الشُّعُوْرِ عَلَى الْخُدُوْدِ لَاطِمَاتِ الْوُجُوْهِ۔

اے جدِ نامدار ملائکہ سموات آپ کے صبر سے تعجب میں رہ گئے۔ ہر طرف سے دشمنوں نے آپ کو گھیر لیا تھا اور زخموں سے آپ کو گھائل کر دیا تھا اور آپ کے اور پانی کے درمیان حائل ہو گئے تھے اور کوئی ناصر آپ کا باقی نہ رہا تھا۔ اس پر بھی آپ صابر تھے۔ دشمنوں کو اپنی عورتوں اور بچوں سے ہٹاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو گھوڑے سے گرا دیا۔ پس آپ زمین پر مجروح گرے۔ گھوڑوں نے اپنی ٹاپوں سے آپ کو کچلا اور اپنی تلواریں لے کر دشمن آپ کی طرف بڑھے۔ آپ کی پیشانی پر موت کا پسینہ تھا اور کرب میں آپ کبھی بایاں پاؤں پھیلاتے تھے کبھی دایاں اور حالتِ نزع میں اپنے جوانوں کے لاشوں اور بچوں کی طرف دیکھتے تھے۔ آپ کا گھوڑا خیمہ کی طرف چیخ پکار کرتا دوڑا۔ جب عورتوں نے گھوڑے کو اس حالت میں دیکھا کہ زین ڈھلا ہوا ہے تو وہ خیموں سے سر کھلے نکل پڑیں، منہ پر طمانچے مارتی تھیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۲۷/۲۶

اکیسویں مجلس

تفسیر آیۂ ما کان محمدؐ الخ

و حال پامالی لاشہائے شہداء و تاراجی خیام

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَ

لَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٤٠﴾

(پ۲۲/۲۲ سورہ احزاب)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور رسولوں کی مُہر ہیں (اُن پر نبوت ختم ہوتی ہے) اور خدا تو ہر شے سے خوب واقف ہے۔

یہ آیت زید بن حارثہ سے متعلق ہے۔ سرکار رسالتؐ نے ان کو متبنیٰ کر لیا تھا اور لوگ ابن رسولؐ اللہ کہتے تھے۔ کفار نے ان پہ طعنہ زنی کی کہ ہم پر تو رسول اللہ متبنیٰ بنانے پر معترض ہیں، لیکن خود زید کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ اس قول کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی۔ چونکہ آنحضرتؐ قاسم اور ابراہیم اور طیب و طاہر چار لڑکوں کے باپ تھے۔ اس لئے آیت کا مفہوم بظاہر اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ادنیٰ تامل کے بعد یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ آیت میں رِجَالِکُمْ ہے اور حضرتؐ کی اولاد رجال تک پہنچی نہ تھی۔ علاوہ بریں لفظ رِجَالِکُمْ سے یہ ظاہر ہے کہ حضرتؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں نہ یہ کہ اپنے بیٹوں کے بھی نہیں۔

اس پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب آنحضرتؐ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تو حسنؑ و حسینؑ

علیہم السلام کے باپ کیسے ہوگئے۔ جواب یہ ہے۔ کہ باپ ہونے کی نفی غیر لوگوں کے متعلق ہے نہ کہ نبی کی اولاد کے متعلق۔ حضرت رسولؐ خدا میں دو جنبے پائے جاتے ہیں۔ ایک بشریت کا دوسرے رسالت کا جس طرح بشریت اپنے کچھ رشتہ دار رکھتی ہے۔ رسالت بھی اپنے تعلقات رکھتی ہے۔ بشری اولاد اور ہے۔ رسالت کی اولاد اور ہے اور اگر اس آیت میں یہ کہا جاتا ما کان الرسول ابا احد من رجالکم تو فرزند حسین علیہم السلام اولاد رسولؐ ہونے سے خارج ہو جاتے لیکن آیت میں لفظ محمدؐ ہے جس سے مراد بشریت ہے۔ نہ کہ رسالت پس اگر بشری اعتبار سے حسین علیہم السلام فرزند نہیں تو رسالت کے اعتبار سے تو ہیں۔ چونکہ رسالت کا مرتبہ بشریت سے مافوق ہے۔ لہذا حسنین علیہم السلام کا مرتبہ صلبی اولاد سے زیادہ ہے یہی وجہ تھی کہ حضرتؐ نے اپنے فرزند ابراہیم کو اپنے نواسہ حسینؑ پر قربان کر دیا۔

چنانچہ مروی ہے کہ ایک روز آنحضرتؐ اپنے فرزند ابراہیمؑ کو ایک زانو پر بٹھائے اور امام حسینؑ کو دوسرے زانو پر لیے پیار کر رہے تھے کہ جبرئیلؑ امین نازل ہوئے اور عرض کی خداوند عالم بعد تحفہ درود و سلام ارشاد فرماتا ہے کہ یہ دونوں محبتیں ایک ساتھ آپ کے دل میں جمع نہیں ہو سکتیں لہذا ان میں سے ایک کو دوسرے پر قربان کرنا گوارا کیجئے حضرت نے غور کرنے کے بعد فرمایا۔ میں نے ابراہیمؑ کو قربان کیا جبرئیلؑ نے پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا۔ فرمایا اس لیے کہ اگر میں حسینؑ کی موت کو گوارا کرتا تو اس سے میرے دل کو بھی صدمہ پہنچتا۔ اور پھر میری پیاری فاطمہؑ کو بھی اور میرے قوت بازو علیؑ کو بھی اور میرے پارۂ جگر حسنؑ کو بھی۔ اس طرح چار برگزیدہ ہستیوں کے قلب اذیت پاتے اور ابراہیمؑ کی موت سے صرف دو دل متاثر ہوں گے۔ میرا اور مادر ابراہیمؑ کا۔ دوسرے حضرتؐ بعلم نبوت جانتے تھے کہ حسینؑ کی نسل سے نو ہادی میرے دین کے ہونے والے ہیں۔

اگر قطعاً ابنیت کی نسبت حضرت رسولؐ خدا کی طرف ہو ہی نہ سکتی تو یہ آیہ مباہلہ

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَ
أَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾ (۳/۶۱ عمران)

کیوں ہوتا کیونکہ مباہلہ کا تعلق رسالت سے تھا نہ کہ بشریت محمدیہ سے اس لیے حضرت اسی اولاد

کو رہ گئے جو ابنائے رسالت تھے اگر معمولی رشتہ داروں کا معاملہ ہوتا تو نسائنا کے تحت میں اپنی ازواج کو لے کر جاتے نہ کہ جناب سیدہؑ کو۔ یاد رکھیئے قرآن مجید میں جتنی آیات اہل بیت علیہم السلام کی شان میں ہیں ان میں کوئی آیت ایسی نہیں جس کی کوئی نہ کوئی غلط تاویل کر کے بجائے اہل بیت السلام کے کسی دوسرے کو خواہ مخواہ اس کا مصداق نہ بنا لیا گیا ہو۔ دو آیتیں ایسی ہیں جہاں یار لوگوں کو تاویل کرتے ہی نہیں بنی ایک آیہ و من الناس من یشری اور دوسرے آیہ مباہلہ ان دونوں آیتوں سے کفار و مشرکین کے مقابل آنحضرتؐ کی رسالت کا انتہائی کمال ظاہر ہوتا ہے۔

اولاد کے متعلق صاحب مفاتیح المطالب نے معتبر اسناد سے آنحضرتؐ کی یہ حدیث نقل کی ہے اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ ذُرِّیَّۃَ کُلِّ نَبِیٍّ فِی صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِی فِی صُلْبِ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ (اللہ نے ہر نبی کی اولاد کو اس کے صلب میں قرار دیا ہے۔ اور میری اولاد کو صلب ابو طالب میں)

حضرت رسولؐ خدا اپنی اُمت کے شرعی باپ ہیں نہ کہ اصلی اسی بناء پر حضرت کی ازواج امہات المومنین ہیں نہ کہ اصلی مائیں۔ پس خدا کا یہ فرمانا کہ محمدؐ تم میں سے کسی کے باپ نہیں۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ زید بن حارثہ جیسے رسولؐ نے پرورش کر لیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ رسولؐ کا بیٹا بن گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حضرتؐ نے زید کو خرید لیا اور اس کے باپ حارثہ کو پتہ چلا تو وہ حضرت ابو طالبؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ آپ میرے لڑکے کو اپنے بھتیجے سے دلوا دیجئے۔ حضرت ابو طالبؑ نے سفارش کی تو حضرتؐ نے زید کو آزاد کر دیا مگر وہ اپنے باپ کے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوا۔ اس وقت حارثہ نے غصہ میں کہا لوگو! گواہ رہنا کہ میں نے اس کو اپنی فرزندی سے علیحدہ کر دیا۔ یہ سُن کر زید بہت شکستہ دل ہوئے ان کی دل جوئی کے لیے حضرت نے اپنا متبنیٰ کر لیا۔ یہ تبنیت کفاّر کی تبنیت کی مانند نہ تھی کیونکہ وہ متبنیٰ کو صلبی اولاد میں داخل کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ شریک میراث بھی بن جاتا اور اپنے قریب ترعزیز دں سے اس کی شادی نہ کرتے تھے پس تبنیت نے زید میں کوئی استحقاق وراثت پیدا نہ کیا تو بھلا دوسرے صلبی رشتوں تک اس کا کیا اثر ہوتا۔

وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ کا جملہ بتا رہا ہے کہ مجھ سے جو تعلق عام لوگوں کا ہے وہ رسولؐ اور اُمت کا ہے نہ کہ باپ بیٹے کا یہ تعلق ہے تو کچھ مخصوص ہستیوں سے نہ کہ عام لوگوں سے کفار حضرتؐ کو ابتر ہونے کا طعنہ دیتے تھے کیونکہ آنحضرتؐ کے اولاد مذکور میں سے کوئی نہ تھا لیکن سورہ انا اعطینٰک الکوثر سے معلوم یہ ہوا کہ کفار کے اس طعنے کو خدا نے قبول نہ کیا اور ان کے جواب میں رسولؐ کی دل شکنی مٹانے کو کہہ دیا کہ خدا نے تم کو کثیر اولاد دی ہے۔

کوثر کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ کسی نے حوضِ کوثر مراد لی ہے۔ کسی نے خیرِ کثیر لیکن شانِ نزول اور سیاق و سباق یہ بتاتا ہے کہ مراد اس سے کثیر اولاد ہے۔ جیسا کہ شرح مسلم میں بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؐ کی اولاد کثیر یعنی سادات ہر مقام پر موجود ہیں پس جب حسنین علیہم السلام کو اولادِ رسولؐ نہ مانا جائے حضرت سے ابتر ہونے کا طعنہ رفع نہیں ہو سکتا۔

بیشک رسولؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن ان کے باپ ہیں جن کو ابنائے شرف بننے کا شرف حاصل ہوا ہے چونکہ حضرت علی علیہ السلام کا شرف و فضل حضرت رسولِ خداؐ سے جدا نہیں بلکہ شریکِ نور ہونے کی جہت سے دونوں کی فضیلتیں ایک ہیں۔ لہٰذا ان کی اولاد رسولؐ کی اولاد ہے جس طرح جاھد الکفار والمنافقین کی آیت میں رسولؐ کو منافقین سے جہاد کا حکم ہوا تھا لیکن رسول اللہؐ کسی منافق سے نہیں لڑے۔ ہاں علیؑ نے اس حکم کو پورا کر دیا۔ اس طرح شہادت کا اعلیٰ مرتبہ حضرت رسولِ خداؐ کو حاصل نہ تھا وہ امام حسین علیہ السلام نے پورا کر دیا۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے سر الشہادتین میں لکھا ہے۔

جس طرح حضرت ہارون سے نسل جناب موسیٰ علیہ السلام چلی اسی طرح حضرت علی علیہ السلام سے نسل حضرت محمد مصطفےٰ چلی۔ چونکہ عرب کے لوگ لڑکیوں کو ورثہ سے محروم کر دیتے تھے اور ان کو اپنی نسل میں شمار ہی نہ کرتے تھے۔ لہٰذا خداوند عالم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے اپنے رسولؐ کے تمام ورثہ کا مالک رسولؐ کی اکلوتی بیٹی جناب فاطمہؑ کو بنایا اور ان کی اولاد کو اولاد رسولؐ گردانا۔ اگر رسولؐ کی اولاد ذکور میں سے کوئی باقی رہتا تو یقیناً لوگ رسولؐ کی بیٹی کو بھی رسم جہالت کی بناء پر محروم الارث قرار دیتے۔ کیا یہ کوئی تعجب کی بات ہے جب اولاد ذکور نہ ہونے کی صورت میں جناب سیدہؑ کو محروم کر دیا گیا تو اس صورت میں بدرجہ اولیٰ ہر چیز سے محروم کر دی جاتیں۔ البتہ جہت محرومی بدل جاتی۔ اسی جاہلیت کی قدیم رسم نے ابوبکر کو مجبور کیا کہ وہ حدیث نحن معاشر الانبیا کو گڑھ لیں۔ اسلامی قانون کے مطابق محروم تو نہ کیا جا سکتا تھا اور عرب کی عصبیت اور اہل بیت علیہم السلام سے بے تعلقی نے شرکت وراثت کی اجازت بھی نہ دی لہٰذا ایک یتیم الاسناد حدیث بھی بنالی۔ جس سے کام چلا لیا گیا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن میں ورث سلیمان داؤد (سلیمان داؤد کے وارث ہوئے) کے اور یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ آلِ یَعْقُوْبَ (جناب ذکریا نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ایک لڑکا عطا فرما جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوبؑ کا بھی) کے قرآن میں موجود ہوتے ہوئے جناب سیدہؑ کو ان کے باپ کے ترکہ سے کیوں محروم کر دیا۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (۴/۱۱ نساء)

میں اولاد کو اپنے باپ کے ترکہ ملنے کا صریحی حکم ہے۔ جس میں رسول اور تمام اُمت داخل ہے تاوقتیکہ رسولؐ کا استثنا کسی خاص آیت سے نہ ہو۔ یہ حکم رسولؐ کے لیے باقی رہے گا۔ کہتے ہیں کہ مراد پہلی دو آیتوں میں وراثت علمی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ حضرت ذکریا کے دعا کے الفاظ یہ تھے

وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَرَاءِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۝۵ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝۶ (۱۹/۶ مریم)

(میں اپنے بعد میں رہنے والے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو مجھے اپنی طرف سے ایک ولی عطا کر جو میرا بھی وارث ہو اور آلِ یعقوبؑ کا بھی۔)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے چچا زاد اولاد کے ولی ہونے سے ڈرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کا اور ان کے خاندان کا سرمایہ غلط کاموں میں صرف کریں رہا علم نبوت تو وہ تقسیم ہونے کی چیز ہی نہ تھا۔ لہٰذا اس میں خوف کیسا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک نبی کو اپنے مال سے محبّت کیوں تھی کہ وہ دوسروں کو دینا ہی نہ چاہتے تھے تو اس کی جہت یہ نہ تھی بلکہ خوف اس کا تھا کہ وہ انفاق فی سبیل اللہ کے بجائے کاموں میں صرف کریں گے۔ کیونکہ ان کی عادتوں اور طریقوں سے اس کا پتہ چلتا تھا۔ لفظ میراث لغت اور شریعت میں اسی مال پر عموماً بولا جاتا ہے۔ جو مورث کے وارث کی طرف منتقل ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص فلاں کا وارث ہوا تو ذہن فوراً میراث کی طرف منتقل ہوتا ہے نہ علم کی طرف کیونکہ علم تو ترکہ میں تقسیم ہونے کی چیز ہی نہیں۔ پس ظاہر کلام اور حقیقی معنی سے عدول نہیں کیا جا سکتا جب تک کوئی قرینہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ حضرت ذکریا کی دعا میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝۶ (۱۹/۶ سورہ مریم)

پس اس آیت میں اگر میراث مال مراد نہ ہو تو اس دُعا کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ کیونکہ نبی کے قائم مقام کے لئے رضا سب سے پہلی چیز ہے اس کے مانگنے کی ضرورت ہی نہ تھی یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مانگے خدا ہماری طرف ایک نبی کو بھیج جو سچّا اور صاحبِ عقل ہو پس جب وراثت مال ثابت ہے تو ہمارے نبی کے ہی لیے کیوں نہیں کیا حضرت کی حالت میراث میں انبیائے سابقین سے جُدا تھی۔

تعجب ہے کہ حضرت رسولؐ خدا کی بیٹی تو ایک وضعی حدیث کی رو سے ترکہ پدری سے محروم کردی جائے اور حضرت کی بی بی حصّہ پالے اور بجائے ۹/۸ کے کل پر تصرف کرے۔ جیسا کہ ابن عباس کا قول ہے۔

لَكِ التِّسْعُ مِنَ الثُّمُنِ وَفِي كُلٍّ تَصَرَّفْتِ
تَبَغَّلْتِ تَجَمَّلْتِ وَلَوْ عِشْتِ تَفَيَّلْتِ

(تمہارا آٹھویں میں نواں حصّہ تھا اور تم نے کل میں تصرّف کرلیا۔ تم خچّر پر چڑھیں اور اونٹ پر چڑھیں۔ اور اگر کچھ اور زندہ رہتیں تو ہاتھی پر بھی ضرور چڑھتیں)

مذکورہ بالا آیت میں ایک صفت خاتم الانبیا بھی بیان کی گئی ہے کس قدر احمق ہیں وہ لوگ جو آنحضرتؐ کو خاتم الانبیاء نہیں مانتے۔ تعلیم کا عام قاعدہ ہے کہ مبتدی لڑکوں کو پڑھانے کے لیے معمولی لیاقت کا معلّم مقرّر ہوتا ہے۔ پھر جوں جوں درجہ بڑھتا جاتا ہے معلّم بھی اسی قابلیت کا رکھا جاتا ہے اس کے بعد جب تعلیم ختم ہوجاتی ہے تو عمل ہمیشہ کے لیے باقی رہتا ہے۔ بس یہی حال انبیاء کا ہے۔ پہلے لوگ بتدریجاً جیسے جیسے عرفانِ الٰہی، تمدن و معاشرت میں ترقی کرتے رہے۔ ویسے ہی ان کی ہدایت کے لیے معلّم بھی آتے رہے۔ جب تعلیم کا آخری درجہ آیا تو خداوند عالم نے اس کا لحاظ کرکے ایسا نبی بھیجا جو ہر لحاظ سے اکمل و یگانہ تھا۔ اور کسی قسم کا کوئی نقصان اس میں نہ تھا۔ بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کے علم کا حامل تھا۔ جب وہ نبی اپنی تعلیم کو مکمل کرچکا تو آیہ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوگئی پس اگر اب بھی کسی نبی کی ضرورت باقی ہے تو کمالِ دین ایک بے معنی چیز ہے اگر اس دین کی یہ صفت ہے

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ
وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ
لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ (۹/۳۳ سورہ توبہ)

یہ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ پھونکیں مار مار کر خدا کے نور کو بجھا دیں لیکن خدا اس کے سوا کچھ مانتا ہی نہیں کہ اپنے نور کو پورا کر ہی دے چاہے کفار کتنا ہی برا مانیں۔ اللہ ہی تو ہے جس نے رسولؐ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ تمام ادیان پر اُسے غالب کر دے چاہے مشرک کتنا ہی برا مانیں۔

تو کسی اور نبی کا ہونا عبث ہے۔ پس کسی نئے نبی کی ضرورت کو تسلیم کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ دین اسلام ناقص ہے۔ قرآن مکمل قانون نہیں۔ اور اگر مکمل نہیں

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۸۹/۱۶ نحل)

ترجمہ:۔ اور ہم نے تم پر کتاب قرآن نازل کی جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے اور مسلمانوں کے لئے سرتاپا ہدایت رحمت اور خوشخبری ہے

جیسی آیات بے معنی ہیں۔

اگر کوئی نبی حضرتؐ کے بعد آیا یا آنے والا ہے تو اس کے متعلق یہ سوال کیا جائے گا۔ کہ وہ کیا کام کرے گا۔ اگر اسی شریعت کا معلم ہوگا اور اسی دین کو چلائے گا تو دین کو اس کی ضرورت کیا ہے۔ کتاب مکمل دین مکمل نبی کی تعلیم ختم۔ اگر کہا جائے کہ جس طرح اور مرسلین کے بعد اور انبیاء آئے اور اسی شریعت کی تعلیم دیتے رہے۔ اسی طرح نیا نبی بھی اسی شریعت کی تعلیم دے گا تو یہ بھی صحیح نہیں۔ انبیاء کی ضرورت دو رسولوں کے درمیان ہوتی ہے۔ انبیا درحقیقت اوصیاء مرسلین ہوتے ہیں پس جب کوئی نیا قانون اور نیا رسول آنے والا ہی نہیں اور یہ زمانہ فطرت نہیں تو پھر انبیاء کی بھی حاجت نہیں صرف اوصیاء کی ضرورت ہے جو تبلیغ احکام کرتے رہیں اور شریعت محمدیہؐ کی حفاظت کریں اور وہ بنا برحدیث رسولؐ معین ہو چکے دنیا کا فرض ہے کہ ان اوصیا کی معرفت حاصل کرے اور مصداق آیہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۵۹/۴ نساء)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں صاحبانِ حکومت ہوں ان کی۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

ان کی اطاعت کو بھی فرض سمجھے اور علمِ دین سے جو کچھ حاصل کرنا ہو ان ہی سے کرے۔ ان میں سے کسی ایک کا وجود ہر زمانہ میں ضروری ہے۔ کیونکہ زمانہ حجت خدا سے خالی نہیں رہتا۔ یہی وہ وجہ تھی کہ امام مظلوم علیہ السلام نے کربلا میں امام زین العابدین علیہ السلام کو مرنے کی اجازت نہیں دی۔ آپ نے بے چین ہو ہو کر کئی بار خیمے سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن امام مظلوم علیہ السلام نے اس خیال سے باہر نہ آنے دیا کہ مبادا کوئی تیر آپ کے آلگے۔ اور دنیا حجّت خدا سے خالی ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیمار امام علیہ السلام نے بحالت بیماری وہ وہ تکلیفیں کربلا میں اٹھائیں کہ ان کے تصوّر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بعد شہادت امام مظلوم علیہ السلام تو آپ پر مصائب کی انتہا ہی نہ رہی۔ آہ! اشقیائے اُمت نے اہل حرم کو ایذا پہنچانے اور ہتک و حرمت کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا ہی نہ رکھا۔ اور اسلام کی ہر تعلیم کو ان کے مقابل فراموش کر دیا۔ اسلام نے میت کا احترام اتنا ملحوظ رکھا ہے۔ کہ بدن سے لوہا مس کرنے کی اجازت نہیں دی۔ یعنی اگر کسی میت کا لباس تنگ ہو اور غسل کے وقت آسانی سے نہ اتر سکے۔ تو حکم شرع یہ ہے کہ اسے پھاڑ کر اتار دو۔ چاقو یا قینچی سے نہ کاٹو۔ آہ! آہ!! عام مسلمانوں کے لیے تو یہ حکم اور اولادِ رسولؐ کی لاشوں کے ساتھ اشقیائے اُمت یہ سلوک کریں کہ گھوڑوں کی نعل بندی کرا کے ان کو اس طرح پامال کیا جائے کہ کسی شہید کا کوئی عضو صحیح و سالم نہ رہے۔

آہ! رسولؐ کا ہرا بھرا باغ کاٹ کر سارا خاندان تباہ کر کے جوان، بوڑھے اور بچے نہ تیغ کر کے بیکسوں کی لاشوں کو پامال کر کے بھی ان ستم ایجادوں کو چین نہ آیا اور ستم رسیدہ کنبہ کی بی بیوں کو لوٹنے کے لئے جن کے سر پر کسی والی وارث کا سایہ نہ تھا۔ بے رحم قزاقوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور لوٹنا شروع کر دیا۔ ان غریبوں کے پاس بزرگانِ دین کے چند تبرکات کے سوا اور رکھا ہی کیا تھا جس کو لوٹا جاتا مگر ان ظالموں کو ناموس نبی کی ہتک کرنا اور مظلوموں کو ہر طرح ستانا تھا۔ اس لیے ان کے جو کچھ ہاتھ لگا لے بھاگے یہاں تک کہ کسی بی بی کے سر پر ظالموں نے چادر تک نہ چھوڑی۔ پیروں سے نعلین تک نکال لیں۔ بلکہ وہ کھال بھی نکال لے گئے جس پر بیمار کربلا غش کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ کاش وہ ظالم اسی پر بس کرتے۔ انہوں

نے تو یہ غضب ڈھایا کہ اہلِ حرم کو لوٹنے کے بعد خیموں میں آگ لگا دی۔

آہ! آہ!! اس وقت اہلِ حرم کی مصیبت کا حال کیوں کر بیان کیا جائے۔ سر و پا برہنہ، تمام بچے اور بی بیاں پریشان پھر رہے تھے اور رو رو کر فریاد کر رہے تھے۔ مگر کوئی ان بے کسوں پر رحم کرنے والا اور ان کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ آہ! نبی کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں بالوں سے منہ چھپائے انتہائی بدحواسی میں وامحمداہ، واعلیاہ کے درد انگیز نعرے مار رہی تھیں۔ آہ! کہاں تھے قاسمؑ علی اکبرؑ کہاں تھے۔ عباسؑ علمدار و عون و محمد جیسے دلاور کہ اپنی ماں بہنوں اور پھوپھیوں کو ظالموں کے اس ظلم سے بچاتے۔

کہاں تھے امام مظلوم علیہ السلام کہ اپنے کنبے کو اس ہتک سے محفوظ رکھتے۔ آہ! وہ سب سر کٹائے خون میں نہلائے قتل گاہ میں پڑے تھے۔

خدا کسی دشمن پر بھی ایسا وقت نہ لائے۔ جیسا ان غریب الوطن سیدانیوں پر پڑا تھا۔ لکھا ہے کہ جب ایک خیمہ میں آگ لگی تھی تو سیدانیاں بہ حالِ تباہ اس سے نکل کر دوسرے خیمے میں جاتی تھیں اور جب دوسرے خیمہ میں آگ لگتی تھی تو سیدانیاں تیسرے میں پہنچتی تھیں۔ آہ! جب صرف خیمہ بیمار کربلا کا باقی رہ گیا تو جناب زینبؑ بے تابانہ حضرتؑ کے پاس پہنچیں اور فرمایا بیٹا۔

"آپ امامِ وقت اور حجتِ خدا ہیں بتاؤ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ یہی ایک خیمہ باقی رہ گیا ہے اس صورت میں اب سر برہنہ نکل پڑیں۔ یا جل کر مر جائیں۔ حضرتؑ نے فرمایا:

"جس حالت میں ہو باہر نکل جاؤ۔ اور اپنے ہاتھوں سے اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

راوی کہتا ہے جب خیامِ حسینی میں آگ لگ رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ ایک بی بی ایک خیمہ کے اندر جس کے قریب آگ پہنچ چکی تھی۔ بار بار بے تابانہ آتی جاتی ہے۔ میں نے قریب جا کر کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خیمے میں تمہارا کوئی بہت قیمتی مال ہے جس کو بچانے کے لیے تم اپنے کو خطرے میں ڈال رہی ہو انہوں نے رو کر جواب دیا اے شیخ! ہم آوارہ وطن غریبوں کے پاس مال کہاں۔ البتہ اس خیمے میں میرا بھتیجا غش کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس کو بچانے کے لیے بار بار اس کے اندر جاتی ہوں۔ اے شخص ہم ناموسِ نبیؐ ہیں۔ اگر ہو سکے تو اتنا احسان ہم پر کر کہ اس بیمار کو اس کے اندر سے نکال لے۔

راوی کہتا ہے کہ یہ سنتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا اور میں خیمہ کے اندر گیا دیکھا کہ ایک نحیف و نزار جوان خاک زمین پر پڑا ہوا ہے۔ مجھے یہ حال دیکھ کر بڑا ہی ترس آیا اور جس طرح بنا ان کو نکال لایا۔

حمید بن مسلم فوج یزید کا پرچہ نویس راوی ہے کہ جب خیامِ حسینی میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے

ایک کم سن بچی کو مقتل گاہ کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اس کے کرتے میں پیچھے کی طرف آگ لگی ہوئی تھی، مجھے اس کی حالت پر رحم آگیا۔ دوڑا ہوا اس خیال سے اس کے پیچھے گیا کہ اس کے کرتے کی آگ بجھا دوں جوں ہی اس نے میرے قدم کی آواز سنی گھبرا کر کہنے لگی۔ اے شیخ تو کس ارادے سے آرہا ہے میں نے کہا صاحبزادی! تمہارے کرتے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو بجھا دوں۔

بچی نے کہا اے شیخ ہم آل رسولؐ ہیں۔ ہم کو جل جانا گوارا ہے۔ مگر نامحرم کا اپنے بدن سے مس ہونا گوارا نہیں۔ میں نے پوچھا تم کون ہو۔؟ اس بچی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "میں سکینہ بنت الحسینؑ ہوں۔

"اے شیخ! اگر تجھ کو میرے حال پر رحم آیا ہے تو اتنا سلوک میرے ساتھ کر کہ مجھے نجف کا راستہ بتلا دے میں نے کہا صاحب زادی وہاں جا کر کیا کرو گی۔ بچی نے رو کر کہا۔ میں اپنے جد سے اس ظلم و ستم کی فریاد کروں گی۔ حمید کہتا ہے۔ یہ سن کر میں رو پڑا۔ اور کہنے لگا۔ نجف تو یہاں سے بہت دُور ہے۔ تم کیسے وہاں پہنچ سکتی ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم خیمہ گاہ کی طرف چلی جاؤ۔ اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ تم گھوڑوں کی ٹاپوں میں آجاؤ۔

ابھی اس یتیم بچی سے یہی گفتگو کر رہا تھا کہ ایک طرف سے خولی ملعون ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے دوڑا ہوا آیا۔ اور اس معصوم بچی کے دونوں گوشوارے کانوں کو چیر کر اُتار لے گیا۔ اس معصوم بچی کے کانوں سے خون کے فوارے چھوٹ پڑے اور وہ بچی وا ابتاہ وا عماہ کا نعرہ مار کر زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

ہائے اس گھر کی لڑکیاں کیسی بد نصیب تھیں کہ باپ کے عطیوں سے انہیں بجائے خوشی کے غم ہی نصیب ہوا۔ سیدہ عالم حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کو ان کے باپ نے فدک دیا تھا۔ وہ دشمنوں نے ان سے چھین لیا۔ سکینہ کے باپ نے عیدی میں دو گوشوارے دیئے تھے وہ کربلا میں نہایت بے دردی اور بے رحمی سے چھین لیے گئے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷/۲۶

بائیسویں مجلس

تفسیر آیہ یَاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ الخ

اور ذکر شام غریباں

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ
شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا (۴۵) وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا
مُّنِیْرًا ۲۲-۴۵/۳۳ احزاب

اے نبی! ہم نے تم کو شاہد و مبشر و نذیر بنا کر بھیجا اور اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والا بنایا اور تم کو سراج منیر بنایا۔

ہر ایک نبی کو خدا نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ مثلاً یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔ اللہ ہم نے آدم سے کہا تم اپنی بی بی سمیت جنت میں رہا سہا کرو۔ (۲/۳۵ سورہ البقرہ)

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ
مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ
یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴۸) (۱۱/۴۸ هود)

وَ نَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ (۱۰۴) (۳۷/۱۰۴ الصّٰفّٰت)

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۹﴾ (۹/۲۷ نمل)

حضور سرور انبیاء کا یہ احترام مقصود ہے کہ کسی جگہ یا محمدؐ کہہ کر نہیں پکارا۔ انتہائی محبت میں عاشق اپنے معشوق کو بلحاظ اس کی صفات کے پکارا کرتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہے۔ جو دھج پیاری معلوم ہوئی ہے رسول کو اسی نام سے پکار لیا۔ رسولؐ نے کمبل اوڑھا اسے یہی شان پیاری معلوم ہوئی پس پکار لیا یا ایہا المزمل۔ اے میرے کملی والے۔ رسولؐ نے چادر اوڑھی اسے یہی دھج بھلی معلوم ہوئی پس فرما دیا یا ایہا المدثر اے میرے چادر پوش۔ رسولؐ کی سیادت کی شان پسند آئی۔ اس نے پکار لیا یٰسٓ طہارت کی شان پسند آئی تو پکار لیا۔ طٰہٰ اے طیب و طاہر۔ عشق مجازی میں جب محبت کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے تو اپنے محبوب کے نشان قدم کی قسمیں کھانے لگتا ہے۔ خدا نے اپنے محبوب کو اس خصوصیت سے بھی محروم نہ رکھا اور فرمایا۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ (۹۰/۱۔۳ سورہ بلد)

ترجمہ: اے میرے حبیب اس شہر مکہ کی قسم (جس میں تم) چلتا پھرتا ہے ایک باپ اور بیٹےؑ کی قسم اللہ اکبر انسانیت کا یہ کمال حد عقل و فہم سے باہر ہے۔

اس آیت میں خدا نے یا ایہا النبی کہہ کر خطاب کیا ہے۔ رسولؐ کہہ کر نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ نبوت رسالت سے مقدم ہے۔ رسالت کا پودا اسی زمین پر اگا کیسی پُر عظمت یہ رسالت تھی جس کی تخم ریزی کے لیے خلقت آدم سے ہزاروں برس پہلے نبوت کی زمین تیار کی گئی۔

المائدۃ البطن۔

حکیم فیثا غورث کہتا ہے کہ تمام دنیا دائرۃ الوجود کے تحت اپنے مدارج کمال کو طے کر رہی ہے یعنی ہر شئے جہاں سے شروع ہوتی ہے جب اسی حد پر اپنی ارتقائی منزلیں طے کر کے پہنچ جاتی ہے۔ تو اس کو کمال حاصل ہو جاتا ہے درمیان کی تمام منزلیں نقصان کی منزلیں کہلاتی ہیں۔ ان کی ضرورت صرف حصول کمال کے لیے ہوتی ہے۔ مثلاً جو دانہ زمین میں بویا جاتا ہے جب تک وہی دانہ پیدا نہیں ہوتا۔ درخت اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ ادھر ویسا ہی دانہ آیا اور وہ اپنے کمال کو پہنچا۔ شروع سے آخر تک تخم کا اثر باقی رہتا

ضروری ہے۔ ہر شاخ و برگ سے اس کی تخم کا اثر نمایاں ہونا ضروری ہے۔ اب اس مسئلے کے تحت ہم نبوت ختم الانبیاء کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کی نبوت ہدایت کا ایک تخم تھی۔ جب آخر میں وہی نبوت آگئی۔ تو کمال نبوت ختم ہو گیا۔ چنانچہ تخم کا اثر ارتقائی منزلوں میں باقی رہنا ضروری ہے۔ لہذا تو یہ نبوت محمدی ہر اک نبی کے ساتھ رہا یہی وہ پیکر نور تھا جس کے پسینے کے قطروں سے خلقت انبیاء ہوئی۔ اسی لیے اس دنیا کے تمام کارخانے کو بجایا گیا۔ لولاک لما خلقت الافلاک اسی کی شان میں ہے۔

یا ایھا النبی کے خطاب کے بعد کہا گیا ہے۔ انا ارسلنک ہم نے تجھے رسول بنایا اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو درجہ نبوت پہلے ملا اور درجہ رسالت بعد میں۔ آپؐ کی نبوت تمام انبیاء کی نبوت سے پہلے ہے اور رسالت سب کے آخر میں۔ وہاں آپ سے پہلے کوئی نبی نہ تھا یہاں آپؐ سے بعد میں کوئی نبی نہیں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سرکار دو عالم خدا کی توحید کے گواہ بن کر آئے ہیں۔ رسولؐ ایک طرف خدا کی الوہیت ربوبیت اور وحدانیت کے گواہ ہیں۔ دوسری طرف اپنی اُمت پر گواہ ہیں جیسا کہ آیہ

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ⑮

(۱۵/۷۳ مزمل)

ہم نے تمہاری طرف ایک رسولؐ کو بھیجا جو تم پر گواہ ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول کو بھیجا تھا۔ بلکہ سرور دو عالم صلعم تمام عالم پر گواہ ہیں اور ایسے گواہ ہیں جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ⑤⓪ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ

(۵۱/۱۸ کہف)

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ملائکہ سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ وہ قوم جن سے تھا پس حکم خدا سے نکل بھاگا تو (اے بنی آدم) کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو مجھے چھوڑ کر اپنا سرپرست بنا لوگے حالانکہ وہ تمہارا ایکا دشمن ہے اور (ہمارے یہاں) ظالموں کے لیے بُرا بدلہ ہے۔ میں نے نہ توان کو آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت مدد کو بلایا تھا نہ ان کے نفسوں کی خلقت میں ان کو شریک کیا تھا۔ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بنایا کرتا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیطان اور اس کی ذریت نہ زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت موجود تھی۔ نہ اپنے نفسوں کی پیدائش کے وقت لہذا کچھ لوگ ضرور ایسے ہونے چاہئیں۔ جو آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت موجود ہوں۔ ورنہ شیطان اور ان کی ذریت کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا پس جب محمد و آل محمد اپنے نفوس پر بھی گواہ ہیں تو ان کا علم خلقت پہلے ہوا۔ اسی کی تصدیق ہے۔ آیہ

اَلرَّحْمٰنُ ۝١ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝٣ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝٤ ۵۵/۱-۴

ترجمہ:- بڑا مہربان خدا جس نے قرآن کی تعلیم عطا کی انسان کو پیدا کیا اور اسے اپنا مطلب بیان کرنا سکھایا۔ سے کہ انسان کی خلقت سے پہلے علم کا ذکر ہے اور یہ انسان محمد و آل محمدؐ کے سوا دوسرا ہو نہیں سکتا نفوس کی خلقت سے پہلے آنحضرتؐ کا نور خلق ہوا۔ اول ما خلق اللہ نوری لہذا اس کے بعد ان کے اور تمام لوگوں کے نفوس خلق ہوئے پس یہ اس طرح اپنے نفوس کی خلقت سے پہلے موجود ہوئے آدم علیہ السلام کو خلقت کے بعد علم۔ اور محمد و آل محمد علیہم السلام کو قبل خلقت اگر البیان نہ ہوتا تو زیر عرش الٰہی خلقت آدم سے نو ہزار برس پہلے یہ تسبیح و تقدیس الٰہی کیسے کرتے جیسا کہ حدیث میں ہے

خلقت انا وعلی من نور واحد قبل ان یخلق ادم بتسعۃ الاف عام

میں اور علی ایک نور سے پیدا کیے گئے۔ خلقت آدم سے نو ہزار برس پہلے، لوگوں نے پوچھا اس زمانے میں آپ کہاں تھے۔ فرمایا:

كُنَّا اَشْبَاحًا مِنْ نُوْرٍ تَحْتَ عَرْشِ اللّٰهِ نُسَبِّحُهُ نُقَدِّسُهُ (ہم ایک نور کا پرتو تھے عرش الٰہی کے نیچے اس کی تسبیح و تقدیس کرتے تھے۔ فرمایا:

فَسَبَّحَتِ الْمَلَائِكَةُ بِتَسْبِيْحِنَا پس ملائکہ نے ہماری تسبیح سے تسبیح سیکھی۔ لولا نَحْنُ مَا عُرِفَ اللّٰهُ وَلَوْلَا نَحْنُ مَا عُبِدَ اللّٰهُ (اگر ہم نہ ہوتے تو اللہ کی معرفت نہ ہوتی۔ اگر

ہم نہ ہوتے تو اللہ کی عبادت نہ ہوتی)
پس جو ذات آسمان و زمین اور خلقت نفوس کے وقت بہ حیثیت گواہ موجود رہی ہو اس قابل ہے کہ وہ تمام عالموں کے لئے نبی ہو۔ ہمارے رسولؐ عالم نور میں شاہد علی الخلق بھی تھے یعنی ان کی خلقت و فطرت کے شاہد تھے۔ اس کے بعد ہر زمانے کے لوگوں کے شاہد بنے۔ ہر نبیؑ کی پیشانی یا صلب میں آپ کا نور اسی لیے امانت رکھا گیا۔ کہ آپ ہر زمانے کے لیے شاہد رہیں۔ جس طرح حضورؐ سرور کائنات پر شاہد علی الخلق ہیں۔ اسی طرح آپ کے جانشین ائمہ اثنا عشر بھی شاہد علی الخلق ہیں جیسا کہ قرآن خبر دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط (۱۴۳/۲ بقرہ)

ہم نے تم کو درمیانی اُمت قرار دیا تاکہ تم تمام لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا اور اللہ سب پر گواہ ہے۔ یہ گواہی دے سکتا ہے جس کے لیے ہر حالت میں شاہد و غائب یکساں ہیں۔ ۳۳/۴ نساء

دوسری صفت حضورؐ کی آیت مذکورۃ الصدر میں یہ بیان ہوئی ہے کہ آپ بشیر و نذیر ہیں۔ یہ صفت ہر نبی کے لیے ہوتی ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط ۲/۲۱۳ بقرہ

سب لوگ ایک ہی گروہ سے تھے پس اللہ نے بشارت دینے والے اور عذاب سے ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ بدی سے بچانے اور نیکی کی طرف شوق دلانے کے لیے بہترین ذریعہ یہی ہے کہ کسی کو سزا سے ڈرایا جائے اور کسی کو اجر کی اُمید دلائی جائے۔ اگرچہ تمام انبیاء بشیر و نذیر تھے مگر آنحضرتؐ اور ان میں فرق یہ ہے کہ وہ مخصوص وقت اور مخصوص گروہ کے لیے تھے اور حضورؐ سرکار دو عالم ہر زمانہ اور ہر گروہ کے لیے تا قیامت بشیر و نذیر ہیں۔
اگرچہ حضورؐ اب دنیا میں نہیں مگر آپ کے معصوم اوصیائے کرام کے ذریعہ آپ کی بشارات و نذرات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ برخلاف اور انبیاء کے کہ ان کی بشارت اور نذرات کا سلسلہ اس لیے ختم ہو گیا

کہ ان کی شریعتیں منسوخ ہوگئیں۔ اسی لیے ان کے اوصیائے کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔
تیسری صفت حضرت کی اس آیت میں

یَاۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾

(۳۳/۴۵ - ۴۶ احزاب)

ترجمہ:۔ اے نبی ہم نے تم لوگوں کا گواہ اور نیکوں کو بہشت کی خوش خبری دینے والا اور بدوں کو عذاب سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف اسی کے حکم سے بلانے والا اور ایمان وہدایت کا روشن چراغ بنا کر بھیجا۔
یعنی بت پرستی وغیرہ کی وجہ سے بندوں نے اللہ سے اپنا جو تعلق قطع کر لیا ہو۔ رسولؐ اس کو قائم کردیں اور لوگوں کو مخلوق کی پرستش سے ہٹا کر خالق کی طرف لائیں۔ اس رسولؐ کی دعوت کے متعلق یہ بات خاص طور پر بیان کرنی ہے کہ آپ تمام احکام عقلی وفطری روشنی میں بیان کرتے تھے تقلیداً کوئی بات کسی سے منوانی نہیں چاہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ﴎ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

(۱۲/۱۰۸ یوسف)

میں تم کو بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں بھی اور میرا اتباع کرنے والا بھی ایسا ہی داعی ہے۔ باذنہ کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ حضرتؐ کی ہر دعوت باذن الہٰی ہوتی ہے۔
سراجاً منیرا۔ آنحضرتؐ کی مخصوص صفت ہے۔ تمام دنیا جب عدم کی تاریکی میں تھی اس وقت سب سے پہلے یہی سراج منیر ضوفشاں ہوا۔ یہ وہ سراج منیر ہے جو اللہ کا روشن کیا ہوا ہے اور جس کے نور کا اجالا فرش سے عرش تک ہے۔

ارسطو نے کہا ہے جو شے کامل ذات سے نکلتی ہے وہ درجہ کمال پر فائز ہوتی ہے کیونکہ کامل ذات بہ سبب ہر نقصان سے بری ہونے کے اپنی مخلوق میں نقصان کو روا نہیں رکھتی۔ لیکن اس صورت میں خالق و مخلوق کے درمیان اس جہت میں مساوات نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ذات واجب کا کمال اور ہے اور ذات ممکن کا اور۔ واجب کامل ہے پس وہ امکانی دائرہ میں بھی کمال کو دوست رکھتا ہے اور سب سے پہلی چیز جس کو وہ خلق کرتا ہے۔ کامل بالذات ہوتی ہے۔ اس کے بعد جس قدر خلقت آگے بڑھتی جاتی ہے ایک

کے مقابل دوسرے کی بہ نسبت نقصان پہنچتا رہتا ہے اور اس طرح کائنات کی ہر صنف میں بے شمار مدارج متضاد قائم ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک کسی مخلوق میں نقصان نظر آئے سمجھنا چاہیے کہ اس سے بالاتر ضرور کوئی مخلوق ہے جس میں یہ نقصان نہ ہوگا۔ اس طرح تلاش کرتے کرتے ایک ایسی ذات مل جائے گی جو نقصان سے محفوظ ہو۔ مثلاً روشنی کے تعلقات پر غور کرو۔ سب سے چھوٹی چیز خاک کا وہ ذرّہ ہے جس میں چمک تو ہے لیکن اس کے وجود سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور اس کا نور اطراف میں نہیں پھیلتا۔ اس کے بعد جواہرات ہیں۔ مثلاً لعل و الماس کو دیکھو ان کی ضیاباری اطراف میں بھی ہوتی ہے مگر بہت دھیمی اب چراغ دیکھو کہ اس کی روشنی جواہرات سے زیادہ دور جاتی ہے۔ اور چیزوں کو زیادہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ لیکن بہت محدود۔ اس کے بعد چاند کی روشنی ہے جو کہ ساری دُنیا پر پھیلتی ہے۔ لیکن تاریکی کا دھبّہ اس کے دامن پر بھی ہے۔ اس کے بعد سورج کا نمبر آتا ہے۔ روشنی یہاں آ کر اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے پس روشنی میں اکمل فرد آفتاب ہے اور سب سے ناقص ذرّہ ان دونوں کے درمیان بہت سے افراد مدارج مختلفہ رکھتے ہیں۔

ارسطو نے روشنی کا مرکز آفتاب کو قرار دیا ہے لیکن اس پر غور نہیں کیا سورج میں بھی نقصان پایا جاتا ہے۔ باوجودیکہ وہ روشنی کا سب سے بڑا گولہ ہے۔ لیکن اس کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ ایک پتلی سی سینک جو دھوپ میں کھڑی کر دی جائے تو اس کے تمام اطراف کو روشن کر سکے۔ علاوہ بریں جدید آلات سے دریافت ہوا ہے کہ سورج کے اندر بہت بڑا حصّہ ایسی گیسوں کا بھی شامل ہے جو نہایت تاریک دھوئیں کی صورت میں ہیں۔ اور کسی وقت بھی اطراف و جوانب کی شعلہ فشانی اسے بالکل روشن نہیں بنا سکتی۔ یہ تاریک گیسیں اس عظیم الشان کرہ پر داغوں کی صورت میں ایک طرف سے دوسری طرف جاتی نظر آتی ہے۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ سورج کے وجود میں تاریکی کا بہت بڑا حصّہ شامل ہے۔ لہٰذا اس میں نقصان موجود ہے۔

پس ارسطو کے قاعدے کے مطابق ایک اور ایسا نورانی وجود ہونا چاہیے۔ جو اس تاریکی کے عیب سے بالکل پاک و صاف ہو اور وہ وجود محمدی ہے جو اوّل مخلوق ہے اور اس میں کوئی نقصان نہیں سورج کے گیسوں نے اس کے اندر تاریکی پیدا کر دی ہے لیکن وجود محمدی میں تاریکی کا نام نہیں نہ ظاہر میں تاریکی کیونکہ آپ کے جسم کا سایہ نہ تھا اور نہ باطن میں تاریکی ہے کیونکہ طہارت الٰہیہ نے ہر تاریکی کو دور کر دیا ہے۔ اور الم نشرح لک صدرک نے تمام قوائے باطنیہ کو روشن و منوّر بنا دیا ہے اسی لیے حضرتؐ کو سراجِ منیر کہا گیا ہے۔

ایک پارسی میگزین ۱۹۲۴ء میں زردشت کے جو حالات شائع کیے گئے تھے۔ اس میں زردشت کے بہت سے اقوال بھی درج تھے۔ ان میں ایک قول یہ بھی تھا۔ آگ تمام دُنیا کی روشنیوں کا مرکز ہے معمولی آگ تمام چیزوں کو روشن بناتی ہے چونکہ ظاہراً دیا طنا یہی چیز باعث ہدایت خلق ہے لہذا نور مطلق کی سب سے بڑی جلوہ گاہ یہی ہے اس کے ذریعے سے انسان عرفان الہٰی کے بہت سے منازل طے کر سکتا ہے۔ اس لیے انسان پر آگ کی پرستش واجب ہے۔

اس قول سے معلوم ہوا کہ زردشت نے آگ کی پرستش کو اس لیے واجب قرار دیا ہے کہ وہ خدا کی بہترین جلوہ گاہ ہے۔ اور تمام دُنیا میں روشنی اسی کے دم سے ہے۔ ہم زردشت سے دریافت کرتے ہیں دُنیا میں وہ کون سی شئے ہے جس میں خدا کی قدرت کا جلوہ نہیں۔ ہر ذرّہ ہر برگ دیا اس کی معرفت کا بہترین درس دینے والا ہے۔ کیا آگ کی طرح پانی اور ہوا سے تمام دُنیا کی حاجت براری نہیں ہوتی۔ آگ بے شک تمام روشنیوں کا مرکز ہے۔ لیکن لاعقل محض ہے اسے نہ فائدہ پہنچانے کی خبر نہ نقصان پہنچانے کی اس سے زیادہ بے خبری کیا ہوگی ؎

اگر صد سال گبر آتش فروزد
چو یک دم اندراں افتد بسوزد

ایک ظالم، ایک مظلوم کا گھر آگ سے پھونک دیتا ہے۔ اور آگ ایسی بے بس ہے کہ قطعاً اپنے کو جرم کی شرکت سے نہیں بچا سکتی۔ کیا حکیم مطلق خدا ایک ایسی بے عقل اور بے حس چیز میں حلول کر کے اپنی ہدایت کا نور پھیلا سکتا ہے کیا اس سے زیادہ کار آمد ذات اس کو اپنی ہدایت کے آلہ کار بنانے کے لیے نہیں ملتی تھی۔ آگ کو پانی بجھا دیتا ہے وہ روک نہیں سکتی۔ جب آگ بجھتی ہے تو جو ذات اس میں حلول کیے ہے کیا وہ خود فنا نہ ہوگی۔ خدا کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ کہ ایسی کمزور ذات کو آلہ کار بنائے۔ جب آگ میں قوائے عقلیہ اور مدرکہ نہیں تو یقیناً مخلوق میں اس کا حصّہ انسان سے پست ہے جس میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ پس کیا وجہ ہے کہ افضل کو چھوڑ کر ناقص کو آلہ کار بنایا جائے کیا وجہ ہے کہ انسانوں میں اس نورِ کامل کو تمام عالموں کی ہدایت کے لیے منتخب نہ فرمائے۔ جو نہ کسی کے بجھائے بجھ سکتی ہے اور نہ کسی کے دبائے دب سکتی ہے ؎

چراغے را کہ ایزد برفروزد
اگر کس پف زند ریشش بسوزد

وہ آگ کی طرح پانی سے بجھنے والا نہ ہو بلکہ اس کی شان میں یوں فرمائے۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا

نُورَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۹﴾ تو یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اور اللہ اس نور کا تمام کرنے والا ہے چاہے مشرکوں کو ناگوار ہی گزرے) یہ ہے وہ نور تمام اور نور کامل جس کو خدا ہدایت کے لیے خاص کرتا ہے۔ اس سے آگ بے چاری کو کیا نسبت یہ نار ہے وہ نور ہے یہ مختار ہے وہ مجبور ہے وہ بے عقل یہ عقل کل اور معلم حکمت، آگ کا مرکز آفتاب، اس نور کا مبداء اللہ نور السمٰوات والارض۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ کی ذات کو سراج منیر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

چراغ امیر و غریب سب کی حاجت برابری و راہنمائی کرتا ہے جس طرح ایک بادشاہ کا محل اس سے روشن ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک غریب بڑھیا کا جھونپڑا بھی منور ہوتا ہے۔ رسولؐ کی بھی یہی شان ہے وہ بھی رحمۃ للعالمین بن کر دنیا میں آئے۔ اور خلق عظیم بن کر دنیا پر چھائے۔ امیر و غریب سب سے ان کا یکساں تعلق ہے۔ اگر بڑے بڑے ذی مرتبہ لوگ حضرتؐ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ تو وہ فقرائے صفہ بھی برکات صحبت سے مالامال ہوتے ہیں۔ جن کے جسموں سے پسینہ کی بو آتی ہے۔ آپؐ کی رسالت امیر و غریب سب کے لیے تھی۔ اور آپ کی نظر میں تمام دنیا کی مخلوق بلحاظ اپنے حقوق کے یکساں تھی

۲۔ چراغ کی روشنی میں دوست اور دشمن، نیک و بد۔ مفید و مضر کی شناخت ہوتی ہے اسی طرح حضرتؐ کی وجہ سے خدا کے دوستوں اور دشمنوں کی تمیز ہوتی ہے۔ نیک و بد کا پتہ چلا۔ صحیح اور غلط راستہ سے آگاہی ہوئی۔

۳۔ ایک چراغ سے بہت سے چراغ روشن کر لو اس کی ضو فشانی میں کمی نہیں آتی۔ حضرت ایسے سراج منیر ہیں کہ قبل خلقت آپ سے ایک لاکھ چوبیس ہزار شمعیں روشن ہوئیں۔ یہ سب شمعیں ایسی تھیں کہ عصمت کا فانوس ان پر لگا ہوا تھا۔

۴۔ چراغ کے روشن ہوتے ہی بہت سے پتنگے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ان جاں نثاروں کے ساتھ اور بھی بہت سے کیڑے مکوڑے آ جاتے ہیں۔ جو بعض اوقات سخت تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ چھپکلیاں وغیرہ اس لیے نہیں آتیں کہ روشنی حاصل کریں۔ بلکہ اس لیے کہ غریب پروانوں کو اپنی غذا بنائیں۔ ٹڈے اس لیے آتے ہیں کہ ہر طرف چھلانگیں مارتے پھریں۔ وہ شمع کے جاں نثار نہیں بلکہ روشن فضا دیکھ کر شکار کی جستجو میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔ آنحضرتؐ کی صحبت

میں یہی حال منافقوں کا تھا ان کا ایمان لانا ذاتی مفاد کے ماتحت تھا۔
۵۔ شمع سے ان ہی آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے جو آشوب سے پاک ہوں کیونکہ آشوب زدہ آنکھ کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ جلد سے جلد روشنی اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائے یہی صورت تھی منافقوں اور کافروں کی ان کی دلی تمنا تھی کہ دنیا آپ کے وجود سے جلد از جلد خالی ہو جائے۔
۶۔ شمع کے گرد جو کیڑے جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ شمع کے گل ہوتے ہی اپنے اپنے مقام پر واپس چلے جاتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنی جان نثار کر کے شمع کے قدموں پر پڑے رہتے ہیں یہی حال تھا بعض ایسے تھے کہ رسولؐ کے مرتے ہی اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ گئے اور بعض ایسے تھے کہ ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم رہے۔
۷۔ سراج منیر کی ضیا باری کا کیا ٹھکانا ہے۔ اس کی کرنوں کا آخری حصہ دامن قیامت پر اپنی روشنی ڈال رہا ہے۔
۸۔ اس سراج منیر سے بارہ کرنیں پھوٹیں جو بلحاظ چمک دمک اور بلحاظ قد و قامت ہو بہو ایک تھیں ان سب پر عصمت و طہارت کا فانوس چڑھا ہوا تھا آہ! آہ! اس نور کی ایک کرن پر کربلا میں ظلم و ستم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ آہ یہ ہدایت کے پیکر جن خیموں کے اندر تھے۔ ظالموں نے ان کو جلا کر خاک کر دیا۔ آہ! بہتر شہیدوں کی سوگوار بی بیاں بے حال تباہ سر کھولے خاک پر بیٹھی تھیں اور کوئی ان بے کسوں کا تسلی دینے والا نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر سے ایک جنازہ نکل جاتا ہے۔ تو اس گھر والوں کا غم سے کیا حال ہوتا ہے۔ اور یہاں تو ایک دو نہیں۔ بہتر جنازے ایک دن میں ایک گھر سے نکلے تھے۔ بھرا گھر خالی ہو گیا تھا جس گھر میں صبح تک بوڑھوں اور جوانوں اور بچوں کی چہل پہل تھی آج شام کو وہاں چند خاک نشین بیبیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔
منقول ہے کہ جب ذریت رسولؐ کو دشمنانِ دین اچھی طرح لوٹ چکے اور خیام جل کر خاک ہو چکے تو لٹی ہوئی بی بیاں آہ کنبہ موئی بی بیاں بے والی و وارث بن کر خاک کے اوپر بیٹھ گئیں اور ایک جلی ہوئی قنات کھڑی کر کے پردہ کر لیا۔ اب جناب زینبؑ نے سب بچوں کو جانچنا شروع کیا معلوم ہوا کہ جناب سکینہ اور کئی بچے غائب ہیں اور جناب اُمِ کلثومؑ سے فرمانے لگیں۔ بہن کئی بچے غائب ہیں کیا کرنا چاہیے انہوں نے کہا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں اور آپ تلاش کریں۔
الغرض دونوں بہنیں رات کی تاریکی میں بچوں کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑیں۔ آہ دخترانِ فاطمہؑ پر

کیا وقت آپڑا تھا کہ ننگے سر مقتلِ شہداء میں ہر طرف بچوں کو پکارتی پھر رہی تھیں۔ یہ وہی دختران علیؑ و فاطمہؑ ہیں کہ جب مدینہ سے روانہ ہوئی تھیں تو ان کی سواری کے لیے کیا کیا اہتمام ہوئے تھے۔

آہ! اب کہاں تھے قاسمؑ و علی اکبرؑ و عباسؑ اور حسین علیہ السلام کہ ان کے پردے کا انتظام کریں۔ آہ! پردیس میں یہ پہلی رات ہے کہ جناب زینبؑ و اُمِ کلثومؑ با حال تباہ میدان کربلا میں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھیں۔ ایک طرف نگاہ گئی تو دیکھا کہ سکینہ ایک لاش سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی ہیں۔ جناب زینبؑ نے پوچھا بیٹی یہ کس کی لاش ہے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی ہو۔ سکینہ رو رو کر کہنے لگیں اے پھوپھی اماں یہ لاش میرے بابا جان کی ہے۔ پوچھا لاش کی پہچان دو طریقے سے ہوتی ہے۔ ایک سر سے دوسرے لباس سے۔ لیکن اس لاش کے بدن پر نہ سر ہے نہ لباس۔ تم نے ایسی حالت میں کیسے پہچان لیا۔ بچی نے جواب دیا۔

کہ جب خیام میں آگ لگ رہی تھی تو میں مقتل کی طرف بھاگی اور ہر طرف پکارتی پھرتی تھی۔ بابا جان آپ کہاں ہیں میری خبر لیجیے۔ ناگاہ اس نشیب کی طرف سے مجھے یہ آواز سنائی دی یا بابا حسنی الیّ الیّ۔ اے بیٹی ادھر آؤ کہ میں یہاں سر کٹائے پڑا ہوں۔ جب اس لاش کے قریب پہنچی تو اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر چھاتی سے لگالیا۔ پس میں سمجھ گئی کہ یہی لاش میرے بابا جان کی ہے۔

اس کے بعد جناب زینبؑ و جناب اُمِ کلثومؑ اور بچوں کو تلاش کرنے کے لیے چلیں ایک جھاڑی کے نیچے دیکھا کہ دو بچے گلے میں باہیں ڈالے پڑے ہیں۔ جناب زینبؑ نے شانہ ہلا کر جگانا چاہا مگر آہ کون جاگتا دونوں کی روح پرواز کر چکی تھی۔ آہ! جب ان کو جدا کر کے دیکھا گیا تو ان کے چاند سے سینوں پر گھوڑوں کی ٹاپوں کے نشان پائے گئے۔ آہ! اولادِ رسولؐ کس بے دردی سے پامالِ سم اسپاں کی گئی۔

لکھا ہے کربلا میں جب شام غریباں نمودار ہوئی تو شکستہ دل بی بیوں نے اپنے اپنے وارثوں کو یاد کر کے رونا شروع کیا۔ آہ کل رات کتنے جوان اور بوڑھے حفاظت کے لیے موجود تھے لیکن آج ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں جناب زینبؑ نے فرمایا۔ بی بیوں کل کی بات ہے ہماری حفاظت کے لیے حبیب ابن مظاہر، زہیر بن القین، مسلم بن عوسجہ، قاسمؑ، علی اکبرؑ، عباسؑ علمدار اور خود میرے ماں جائے حسین علیہ السلام موجود تھے۔ لیکن آج کی رات دنیا ان سب سے خالی ہے۔ پس اب زینبؑ کا یہ فریضہ ہے کہ آج کی رات تم سب کے گرد طلایہ پھرے۔ کیونکہ میرے بھیّا نے تم کو میرے سپرد کیا ہے۔ یہ سن کر بی بیاں رونے لگیں اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں۔

"اے ثانی زہراؑ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ہماری موجودگی میں اس خدمت کو انجام دیں۔ لیکن جناب

زینبؑ کسی طرح راضی نہ ہوئیں۔ اور ایک ٹوٹا ہوا نیزہ لے کر پہرہ دینے لگیں۔ ناگاہ ایک روشنی آپ کو نظر آئی۔ سمجھیں کہ ظالم لوٹنے کو آرہے ہیں۔ جب روشنی قریب ہوئی تو آپ نے فرمایا اے ظالمو! ہم کہیں بھاگ نہ جائیں گے۔ صبح کو جتنا چاہو لوٹ لینا اس وقت ہمارے بچے روتے روتے سو گئے ہیں۔ لیکن وہ روشنی قریب ہوتی چلی جارہی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو ایک عورت سر پر کوئی شے رکھے مشعل کی روشنی میں چلی آرہی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خاک پر بیٹھ گئیں۔ جب وہ عورت قریب آئی تو جناب زینبؑ نے پوچھا۔

"اے بی بی تم کون ہو؟"

اس عورت نے کہا۔ میں حر کی بیوہ ہوں۔ یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ نے حر کا پرسا دینا شروع کیا۔

زوجۂ حر نے کہا۔ "اے بی بی میرا فرض تھا کہ پہلے آپ کو بہتر شہیدوں کا پرسا دیتی۔ یہ اولاد رسولؐ کا اخلاق ہے کہ میں بولنے بھی نہ پائی کہ آپ پہلے سے میرے شوہر کا پرسا دینے لگیں۔"

"اے بی بی میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت عمر بن سعد کی فوج کے کچھ لوگ اس شقی کے پاس جا کر کہنے لگے۔

"اے ظالم ہم نے تیرے کہنے سے اولاد رسولؐ کے گلے تہ تیغ کر دیئے جو تیرا منشا تھا۔ وہ پورا ہو گیا۔ اب تجھ کو لازم ہے کہ جلد از جلد ان دکھیا عورتوں اور یتیم بچوں کو جن کا سارا کنبہ ہمارے ہاتھوں سے قتل ہوا ہے۔ اور جو تین دن سے بھوک اور پیاس کے مارے تڑپ رہے ہیں کچھ کھانا اور پانی بھیج اگر اب بھی تو نے توجہ نہ کی تو پھر ہمارے اور تیرے درمیان تلوار چلے گی۔

یہ سن کر اس شقی نے کہا۔

میں کب منع کرتا ہوں کسی سے کہو کہ تھوڑا سا بھنا ہوا اناج اور ایک مشکیزہ پانی ان کے پاس لے جائے۔ انہوں نے کہا اے پسر سعد یہ ذریت رسولؐ ہے وہ بھوک سے مر جانا گوارا کر لیں گے لیکن نامحرم کے ہاتھ سے لینا گوارا نہ کریں گے۔ اگر تجھے بھیجنا ہے تو کسی عورت کے ہاتھ بھیج۔

پس اس شقی نے تمام لشکر کی عورتوں کو جمع کیا۔ اور اس مسئلے کو ان کے سامنے رکھا لیکن ان سب نے انکار کر دیا۔ کسی نے کہا اے امیر کیا منہ لے کر جاؤں میرے شوہر نے حسینؑ کے کڑیل جوان کے سینے پر برچھی ماری ہے۔

کوئی کہتی تھی میرے شوہر نے حسینؑ کے بتیس برس کے بھائی کے بازو کاٹے ہیں کوئی کہتی

تھی میرے بیٹے نے حسینؑ کے شش ماہہ بچے کے گلے پر تیر مارا ہے۔ غرض کہ جب کوئی عورت آنے پر تیار نہ ہوئی تو سب نے یہ تجویز کی کہ زوجہ حر کو بھیجنا چاہیے۔ کیونکہ حرؑ نے حسینؑ کے ساتھ احسان کیا ہے پس اس بنا پر میں غلہ اور پانی کی یہ مشک لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ کا دل بھر آیا۔

مقتل کی طرف منہ کر کے کہنے لگیں۔

"میرے غیرت دار بھیا۔ میرے مظلوم ماں جائے پسر سعد کے یہاں سے آپ کی یہ حاضری آئی ہے۔ آہ! زینبؑ کیونکر اسے حلق سے اتارے۔ کاش مجھے موت آجاتی۔ اور یہ وقت نہ دیکھتی اس کے بعد زوجہ حر سے فرمایا۔

بی بی یہ پانی کس لیے لائی ہو کون اس کو پیے گا؟ آہ اس گھر کے بچے، جوان اور بوڑھے سب اس پانی کو ترستے چلے گئے۔ یہانتک کہ چھ ماہ کا شیر خوار بچہ بھی تادم مرگ ایک قطرۂ آب نہ پاسکا۔ اب اس پانی کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ پھٹتا ہے۔ اس آب و دانہ کو واپس لے جاؤ۔ اب ہم میں سے کسی کو بھوک ہے نہ پیاس۔ ہمارے پاس غم کھانے کو اور آنسو پینے کو بہت کافی ہیں۔

زوجہ حر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی بی بی اگرچہ آپ کے رنج و غم کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن کھانا پینا ایسی چیز نہیں کہ چھوٹ سکے یہ ننھے ننھے بچے جو غش میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر چند گھنٹے اور آب و غذا نہ پائیں گے تو فرطِ ضعف سے ہلاک ہو جائیں گے۔

الغرض زوجہ حر نے باصرار تمام ان چیزوں کو وہاں رکھ دیا۔ اور واپس گئی۔ اس کے جانے کے بعد جناب زینبؑ نے سب بی بیوں سے کہا جب پانی آگیا ہے تو ان پیاسے بچوں کو غش سے چونکا کر پلاؤ ورنہ یہ ہلاک ہو جائیں گے۔

چنانچہ سب سے پہلے جناب سکینہ کو جگایا اور کہا کہ بیٹی پانی پیو تمہارا پیاس سے حال غیر ہو گیا ہے۔

بچی یہ سن کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور کہنے لگی جو اس پانی کو لائے ہیں میں تو ان ہی کے ہاتھ سے پیوں گی۔

یہ سنتے ہی اہل حرم کا دل ہل گیا۔ جناب زینبؑ نے رو کر فرمایا۔

اے بیٹی تیرا خیال کہاں ہے یہ پانی تیرے چچا عباسؑ نہیں لائے۔ بلکہ فوج یزید کی طرف سے آیا ہے۔ یہ سن کر بچی نے پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن جناب زینبؑ نے جب زیادہ زور دیا تو سکینہ

نے پوچھا۔

"سب سے۔ پہلے آپ مجھ ہی کو کیوں بلا رہی ہیں ؟"

فرمایا۔ اسے بیٹی تو سب سے چھوٹی ہے۔ یہ سنتے ہی جناب سکینہ پانی کا کوزہ لے کر مقتل کی طرف چلیں۔ پوچھا بیٹی کہاں جاتی ہو۔ کہنے لگیں مجھ سے چھوٹا علی اصغر میرا بھیا ہے اس کو پلانے جاتی ہوں۔ جناب زینبؑ نے رو رو کر فرمایا اے نور دیدہ اب علی اصغر کہاں کہ تم ان کی پیاس بجھادو۔ وہ تو پہلے ہی تیر ستم کا نشانہ بن چکے۔

آہ! مومنین کس زبان سے عرض کروں کہ اہل حرم نے یہ وحشت ناک رات کیونکر لبسر کی تمام رات دکھیا بی بیاں خاک پر بیٹھی اپنے وارثوں پر نوحہ و ماتم کرتی رہیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

تیئسویں مجلس

تفسیر آیۂ ھُوَ الَّذِیٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اور حال روانگی اہل حرم از کربلا

وَعَلَى اللّٰهِ قَصۡدُ السَّبِيۡلِ وَمِنۡهَا جَآئِرٌ‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ لَهَدٰٮكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۹ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً‌ لَّـكُمۡ مِّنۡهُ شَرَابٌ وَّمِنۡهُ شَجَرٌ فِيۡهِ تُسِيۡمُوۡنَ ۝۱۰ يُنۡۢبِتُ لَـكُمۡ بِهِ الزَّرۡعَ وَالزَّيۡتُوۡنَ وَالنَّخِيۡلَ وَالۡاَعۡنَابَ وَمِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ۝۱۱ (۱۱/۱۶ نحل)

اور سیدھی راہ دکھانا تو اللہ ہی کے ذمہ ہے اور ان میں بعض راستے ٹیڑھے ہیں اور اللہ اگر چاہے تو تم سب کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمان سے تمہارے لیے مینہ برسایا جس میں سے تم پیتے ہو اور اس سے درخت شاداب ہوتے ہیں جن سے تم اپنے مویشی چراتے ہو اور اس پانی سے تمہارے لیے کھیتی، زیتون، خرمے اور انگور اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے اس میں فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

دنیا میں خلاقِ عالم نے جتنی چیزیں خلق فرمائی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو فعلی اور انفعالی دو قوتیں عطا فرمائی ہیں اگر یہ نہ ہوں تو دنیا میں کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ جس میں فعلی قوت زیادہ ہے اس کو حاکم و متصرف بنایا ہے جس میں قوت فعلی کم ہے اور انفعالی زیادہ ہے اسے محکوم۔ زمین میں قوت

فعلی کم ہے اور انفعالی زیادہ اسی لیے تمام قوتوں کا اس پر عمل ہوتا رہتا ہے۔ پانی میں بہ نسبت زمین کے فعلی قوت زیادہ ہے اس لیے وہ زمین پر متصرف ہے۔ وہ زمین پر جہاں چاہتا ہے حاکمانہ شان سے بہتا ہے۔ زمین اس کو روک نہیں سکتی۔ ہوا میں بہ نسبت پانی کے فعلی قوت زیادہ ہے اس لیے اس کو پانی پر حاکم بنایا ہے جہاں چاہتی ہے اس کو اڑا کرلے جاتی ہے۔ آگ کو ہوا پر حاکم بنایا ہے کہ وہ نہ ہو تو آگ نہ جلے اسی طرح جمادات پر نباتات کو فوقیت دی ہے اور نباتات پر حیوانات کو۔ اور حیوانات پر انسان کو۔ فطرت نے ایک قاعدہ یہ بھی رکھا ہے کہ جس پر جس کو حاکم بنایا ہے۔ ماتحت چیز کو اس کی غذا بنا دیا ہے جمادات نباتات کا رزق ہے نباتات حیوانات کا اور چونکہ انسان ان سب پر حاکم و متصرف ہے لہذا اس کی غذا ان تینوں ماتحت چیزوں کو قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھیے کہ انسان کا چوتھا درجہ ہے۔ اور وہ تین ماتحت چیزوں پر حاکم و متصرف ہے۔

بہرحال چونکہ ہوا پانی پر متصرف ہے اس لیے اسے زمین سے اٹھا کر اوپر لے جاتی ہے۔ ہوا کی طاقت کا اندازہ تو کرو۔ کروڑوں من پانی کس آسانی سے اپنے دامن میں بھر لیتی ہے اور پھر کس طرح روئی جیسا دھنک کر ادھر ادھر اڑاتی پھرتی ہے۔ دیانت دار اتنی بڑی کہ ایک قطرہ ضائع نہیں ہونے دیتی متصرف اتنی بڑی کہ پانی کو جس صورت میں چاہے تبدیل کر دے۔ اولا، پالا، شبنم، برف کا بنانا اس کے اختیار میں ہے۔ پھر چاہے موسلا دھار برسائے چاہے ہلکی ہلکی پھوار لائے۔ جہاں اپنے دامن کو جو ململ اور تن زیب سے ہزار درجہ باریک ہے ذرا نچوڑ دیتی ہے تو چھما چھم مینہ کی جھڑی لگ جاتی ہے۔ اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھو ذرا سی دیر میں جل تھل ہو جاتے ہیں۔ خشکی میں تری آجاتی ہے۔

ہزاروں سقوں سے جو کام برسوں میں نہ ہوتا وہ ابر کا سقہ منٹوں میں کر دیتا ہے۔ جو پانی دریاؤں میں موجیں مار رہا تھا، سمندروں میں تلاطم برپا کر رہا تھا کس طرح اوپر کو کھنچا چلا جا رہا ہے۔ دست قدرت نے ذرا سا اچھالا دیا تھا کہ صورت و سیرت اور خواص سب ہی تو بدل گئے۔ پہلے تلخ اور کھاری تھا اب خوشگوار اور شیریں بن گیا جو پہلے زمین کی چھاتی چیر رہا تھا۔ اب چپ چاپ ہوا میں اڑا اڑا پھر رہا ہے اور دم نہیں مارتا، پہلے کچھ اور تاثیر تھی اب کچھ اور ہے قطروں کے موتی ہیں کہ ہوا کی لڑیوں میں گندھے چلے آرہے ہیں۔ ذرا سی حرکت میں رشتہ غیر محسوس ٹوٹ گیا تو ایک ایک لڑی سے ہزارہا موتی بکھر پڑے۔ اور ایک مینہ کا چھالا ہزاروں مرضوں کی دوا بن گیا۔ پیاسوں کے لئے آب شیریں ہے۔ کھیتوں میں سبزہ لہلہاتا ہے اور درخت برگ و بار نکالتے ہیں۔ باغوں میں پھل پکتے ہیں اور پھلواریوں میں پھول مہکتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے تخم جو خاک میں ملے پڑے تھے ایک چھاپے نے دم عیسیٰ کا کام لیا

اور سب مُردے جی اُٹھے۔ قسم قسم کے پودے مادرِ گیتی کی چھاتی چیرتے خاک کی نقاب اُلٹے باہر آگئے۔ کس نے ان کے کانوں میں پھونک دیا۔ کہ اب عدم سے وجود میں آنے کا وقت آگیا ہے۔ قوتِ نامیہ نے ننھے ننھے دانوں سے سر نکال کر جو اپنا اُبھار دکھایا تو گزوں اُونچے درخت کھڑے ہو کر اپنی شاندار چھتریاں پھیلانے لگے۔ ابھی جو چیز پانی بن کر زمین پر بہہ رہی تھی۔ سبزہ کا روپ بھر کر نکل آئی۔ اور جو سبزہ کہلاتا تھا۔ وہ جانوروں کے پیٹ میں جاکر دودھ بن گیا۔ جسے دودھ کہتے ہیں۔ وہ انسان کے بدن میں خون نظر آنے لگا سبحانہٗ ما اعظم شانہٗ۔

یہ سلیقہ کہاں نیچر کو ہے گل کاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

خالص پانی میں دانہ ڈالو تو نہ اُگے۔ سوکھی مٹی میں دباؤ تو نہ اُگے۔ جب پانی اور زمین دونوں مل جائیں تو بہار آ جائے۔ زمین اس وقت تک دانوں کو اپنے اندر چھپائے رہتی ہے۔ جب تک اس کا معین و مددگار نہ آجائے اور وہ آیا اور کایا پلٹی۔

یہ بھی خدا کی قدرت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب پانی سمندر میں موجزن تھا تو نہ اس میں رعد کی سی گرج تھی نہ بجلی کی سی چمک لیکن ذرا سی معراج پاتے ہی کالی گھٹاؤں کے دامنوں میں آگ لگ گئی اور تسبیح کی آواز رعد کی گرج بن گئی۔ تاریکی میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ مذکورہ بالا آیت میں قدرت نے ہم کو اس طرف توجہ دلائی ہے تاکہ معرفت کے دروازے ہم پر کھلیں۔ پانی پر توجہ دلانے کے بعد زیتون کے درخت پر خصوصیت سے توجہ دلائی ہے۔

یہ مبارک درخت طورِ سینا پر زیادہ پیدا ہوتا ہے اور قدرت کاملہ الٰہیہ کی بہترین صنعت ہے۔ زیتون کی جڑیں زمین سے جو پانی کھینچتی ہیں اس کو روغن میں تبدیل کرتی جاتی ہیں۔ کیسا مفید روغن ہے کھاؤ تو خوش ذائقہ، جلاؤ تو صاف و شفاف روشنی دے۔ اس کا دھواں بصارت کو قوت بخشنے والا اس کا تیل ہزاروں مرض کی دوا۔ اس کے پتے گندہ ذہنی کو دُور کرنے والے۔ اس کی چھال کا عرق بھی مقوی قلب ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے جس درخت سے آواز آتی تھی وہ یہی تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اسی درخت کا تھا۔ نُورِ ربانی کو جس چراغ کے نُور سے تشبیہ دی گئی وہ اسی درخت کا تیل ہے

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ

فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ
مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّ لَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ
لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ
وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۳۵) فِیْ
بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَ یُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا
بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ (۳۶)

(۳۶-۳۵/۲۴ نور)

اس کے بعد قدرت نے کھجور کے درخت کا ذکر کیا ہے یہ بھی اس کی صنعت کاملہ کا بہترین نمونہ ہے۔ ذرا دیکھنا اس کی گٹھلی کیسی پتھر کی طرح سخت ہے۔ یہ اسی قادر مطلق کی شان ہے کہ پانی کا ایک چھینٹا دے کر اسے موم جیسا بنا دیتا ہے۔ اور ایسے گرم خطوں اور ریگستانی مقاموں میں جہاں پانی نہ ہونے کی وجہ سے گھاس تک نہیں اگتی۔ اس عجیب و غریب درخت کو اگاتا ہے جو اپنی خصوصیات کی بناء پر دنیا کے تمام درختوں میں ممتاز ہے۔ بے شمار فوائد پر مشتمل ہے۔ حضرت رسولؐ خدا نے صرف اسی درخت کے اکرام کی ہدایت فرمائی ہے۔ اکرموا عمتکم النخلۃ (اپنی پھوپھی نخلہ کا اکرام کرو)

انسان خدا کی کس کس نعمت کا شکریہ ادا کرے گا۔ اس آیت میں صرف ان نعمتوں کو بتلایا جا رہا ہے۔ جو بارش کے پانی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں ایک انگور کی بیل بھی ہے۔ جو باوجود نازک ہونے کے کیسے کیسے وزنی خوشے اپنے میں لٹکاتی ہے۔ یہی پانی جو حنظل کی جڑ میں پہنچ کر انتہائی تلخی اس کے پھلوں میں پیدا کرتا ہے جب انگور کی جڑوں میں پیوست ہوتا ہے تو اس کے خوشنما چھوٹے بڑے پیالوں میں کیسا لذیذ شربت بھر دیتا ہے۔

اس کے بعد اپنی اور نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے۔ کہ ہم نے تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا یعنی ان کی طاقت نہیں کہ اپنے دورے سے رک جائیں۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کا آنا ضروری ہے اگر دن ہوتا اور رات نہ ہوتی تو آدمی کام کرتے کرتے مر جاتا اور اگر رات ہی رات ہوتی تو سوتے سوتے

اکتا جاتا اور معطّل ہو کر اپنے اعضا کی چستی کھو بیٹھتا۔ رات کی قدر دن سے ہوتی ہے اور دن کی رات سے اس نے رات اور دن کا نظام برقرار رکھنے کے لیے چاند اور سورج کو پیدا کیا اور ان کو ہمارے لیے مسخر کیا۔ پھر ستاروں کو بنا کر رات کو ہماری ہدایت کا سامان کیا۔

یہ سب کام اس لیے ہو رہے ہیں کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اپنی زندگی اطمینان سے بسر کر سکے۔ اور اپنے معبود کی معرفت حاصل کرے۔ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے لہٰذا تمام مخلوقات کی خصوصیت اس میں پائی جاتی ہیں تاکہ ان کی وجہ سے اس کا انس باقی رہے۔ آنسوؤں کی بارش بھی ہے بالوں کی نباتات بھی۔ چربی کا زیتون بھی خرمے کا سایہ دار بھی۔ آنکھوں کے چاند سورج بھی۔ بالوں کی سیاہ رات بھی چہرے کی روشنی کا دن بھی خون کا سمندر بھی۔ رگوں کی نہریں بھی نسوں کے راستے بھی ہڈیوں کے پہاڑ بھی خیالات کے طیور بھی اور سب سے زائد بات یہ ہے کہ صاحب عقل و شعور بھی ہے۔ اور عقل خدا کی خاص نعمت ہے کہ جس میں کسی مخلوق کو حصّہ نہیں ملا۔

خدا نے اپنی یہ نعمت تو تمام انسانوں کو عطا کی ہے لیکن ہر شخص نے عقل سے وہ کام نہیں لیا جس کے لیے یہ نعمت اس کو دی گئی ہے۔ عقل کی تعریف احادیث میں یہ ہے۔ ما عبد به الرحمٰن واکتسب به الجنان (جس سے خدا کی عبادت کی جائے اور جنّت کو حاصل کیا جائے) اگر خدا کی عبادت نہیں کی جاتی اور جنّت حاصل کرنے کا سامان نہیں کیا جاتا تو سمجھو یہ خصوصیت برطرف ہو گئی اور وہ اشرفیت کے درجے سے گر گیا۔ کیونکہ اور فطری مقتضیات تو دیگر مخلوقات میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ پس جو شخص صاحبِ عقل سلیم ہے وہ معرفت معبود اپنی عقل کا پہلا کام سمجھتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اول الدین معرفته دین میں سب سے پہلی چیز خدا کی معرفت ہے۔ لیکن انسان کی عقل پر پتھر پڑے ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو اپنی معرفت قرار دیا تھا وہ اُن ہی کو خدا سمجھ بیٹھا۔ دنیا میں ایسی کون سی چیز ہے جس پر انسان کو خدا کا دھوکا نہیں ہوا اور اس کی پرستش نہیں کی اس کی گمراہی کو دُور کرنے کے لیے خدا نے اپنی حجّت کو یوں تمام کیا کہ :

ہدایت کے لیے انبیاء اور مرسلین کو بھیجا تاکہ وہ معبود حقیقی کی معرفت کرائیں لیکن انسان مادیت میں پھنس کر ایسا غافل ہوا کہ انبیاء علیہ السلام کے راستہ پر چلنا گوارا نہ کیا اور بجائے ان کی قدر کرنے کے ان کو طرح طرح سے ایذا دینا اور قتل کرنا پسند کیا اسی طرح ناشکری پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوئے مگر انسان پھر بھی نہ چونکا باوجودیکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام آ چکے لیکن انسان اب بھی خدا کی معرفت سے کوسوں دُور ہے۔

بہر حال خدا نے اپنی معرفت کا پورا بندوبست کیا۔ اس بازار معرفت کے پہلے سجانے والے آدم علیہ السلام تھے۔ جنہوں نے سطح زمین پر صفوت کی دکان آراستہ کی اور تعلیم اسماء اور توحید و نبوت وغیرہ کا سودا اس میں بھرا۔ اس وقت دنیا میں تھوڑے سے لوگ تھے اور بازارِ معرفت میں صرف ایک اکیلی دکان تھی۔ لہٰذا جس کو جو لینا ہوتا وہیں آتا تھا۔ اور چونکہ گاہکوں کو خدائی سودے پر لگانا مقصود تھا۔ لہٰذا ہر جنس بے قیمت دی جا رہی تھی۔ پھر خریداروں کی تعداد کم تھی۔ لہٰذا دکان میں مال بھی کم تھا۔ اور پبلک کے لحاظ سے سیدھا سادھا بھی۔

آدم علیہ السلام کے بعد یہ دکان ایمان سلسلہ بہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچی۔ یہاں اس نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ یعنی وقتی مصلحت کی بنا پر ایک بڑی کشتی میں سجائی گئی۔ اور خریداروں کو کشتی میں بلا کر ایک ایک مال دکھایا گیا۔ اب بہ نسبت پہلے کے سامان بہت بڑھ گیا تھا۔ لوگ جب پوچھتے کہ اس مال کی کیا قیمت ہے۔ تو جناب نوح علیہ السلام جواب دیتے تھے۔ مفت۔ وہ کہتے تھے اپنا کچھ حق المحنت تو لیجئے تو وہ فرماتے تھے۔

اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۴۷/۳۴ سبا)

میں اپنی مزدوری خدا سے لوں گا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یہ اسلامی سودا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا۔ اب تک کوئی مستقل دکان نہ تھی جہاں موقع ہوا خدائی کارپردازوں نے اپنا سامان رکھا اور بیچنے لگے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے ایک چھوٹی سی دکان مکّہ میں بنوائی۔ اور اس کا نام کعبہ رکھا جس کے سائن بورڈ پر لکھا ہوا تھا

وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (۹۷/۳ عمران) ترجمہ: جو اس گھر میں داخل ہوا امن میں آگیا۔

پھر حکم ہوا اے ابراہیمؑ دنیا والوں کو آواز دے کر بلاؤ تاکہ وہ یہاں آکر سامان نجات آخرت خریدیں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (۲۷)

اور لوگوں کو حج کی خبر کر دو لوگ تمہارے پاس پیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو دور دراز سے راستہ طے کرکے آئے ہوں آپہنچیں گے ۲۷/۲۲ الحج

لوگوں کو حج کے لیے بلاؤ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پکارا۔ قدرت نے ان کی آواز کو دنیا کے ہر گوشہ

میں پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ جو بچے رحم مادر میں جو نطفے صلب پدر میں تھے انہوں نے بھی اس آواز کو سُن لیا چنانچہ جنہوں نے اس آواز پر لبیک کہہ دیا ان کو حج نصیب ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اس بازارِ معرفت میں بہت سی دکانیں کھُل گئیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک مقام پر سینکڑوں خوردہ فروش متاع نجات فروخت کرتے نظر آنے لگے۔ دنیا کے حریص بندوں نے جب اسلامی سودے پر خلق اللہ کا ہجوم دیکھا تو دلوں میں حسد کی آگ بھڑکی۔ اور مقابلہ میں انہوں نے بہت سی دکانیں کھول لیں جن میں سارا سامان امی ٹیشن یا نقلی تھا۔ یہ سب ابلیسی اسٹور کے ایجنٹ تھے۔ انہوں نے دھوکا دینے کے لیے بہت سے سامان اسلامی سودے سے ملتے جلتے بنائے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سی چیزوں کے نام بھی یہ رکھ لیے تھے۔ کچھ فہم اور ناواقف لوگ صاف دھوکا کھا جاتے تھے۔

خدائی کاروباریوں کو یہ بات ناگوار ہوئی وہ بے محابا ٹوکنے لگے۔ اس پر شیطانی ایجنٹ بگڑے اور ان بے گناہوں کو قتل کر ڈالا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ (۲۱/۳ عمران)

ترجمہ:۔ بیشک جو لوگ خدا کی آیات سے انکار کرتے ہیں اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور انھیں بھی قتل کرتے ہیں جو انہیں انصاف کا حکم دیتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔

یہاں تک کہ ستر ستر نبیوں کو قتل کر کے اپنی دکانیں کھولتے اور رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد یہ اسلامی دکان سرزمینِ مکہ پر

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی زیر نگرانی کھولی گئی۔ اب اس کے سامان کی کیا انتہا تھی قیامت تک کے انسانوں کو بلحاظ تمدن و معاشرت و تدبیر منزل و عبادت و ریاضت و سیاست خواہ علمی ہو یا عملی جتنے سامانوں کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ سب اس دکان میں موجود تھا۔ پچھلے زمانوں میں جو سامان لوگوں کی وقتی ضرورت کے لحاظ سے آ چکے تھے۔ وہ بھی اس دکان میں موجود تھے۔

غرضیکہ ہر طرح سے یہ دکان معرفت مکمل تھی۔ اب یہ دکان نہ تھی بلکہ متاع دُنیا و آخرت کا ایک پورا شہر تھا انا مدینۃ العلم وعلی بابہا۔ اس دکان کا ہر سودا موافق اس قاعدہ اور قانون کے فروخت ہوتا تھا۔ جو خدا کی طرف سے آیا ہوا تھا۔ چونکہ اس کے بعد قیامت تک اب کوئی دکان کھُلنے والی نہ تھی لہٰذا ہر سامان جانچ جانچ کر لگا دیا گیا تھا اور ہر حیثیت سے مکمل کر دیا گیا تھا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو پسند کیا۔ ۳/۵ سورہ مائدہ

اس کی تکمیل کا یہاں تک انتظام کیا گیا تھا کہ قیامت تک اس کے متاع بیچنے والے بھی معین کر دیئے گئے اور ان کی تعداد بھی مقرر ہو گئی۔ یہ سب کے سب عصمت پوش، حقیقت نیوش اور صداقت کوش تھے۔ خدا اور رسولؐ کو ان کی دیانت پر پورا بھروسہ تھا یہ کسی خریدار کو اصل کی جگہ نقلی چیز دینے والے نہ تھے۔ ان کو شہر معرفت کے اندر جو کچھ تھا اس سے پوری پوری واقفیت تھی۔ ان سے دھوکا کھانے اور دھوکا دینے کا امکان ہی نہ تھا۔

جب سرزمین عرب پر یہ دکان کھلی تو حسب دستور قدیم پہلے تو ضرورت مندوں کو مفت سودا دیا گیا پھر خدا کی طرف سے اس کی ایک قیمت مقرر ہوئی۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۲۳) (۴۲/۲۳ شوریٰ)

(اے رسولؐ) کہہ دیں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہلبیتؑ) کی محبت کے سوا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اور جو نیکی کرے گا ہم اس کی خوبی میں اضافہ کر دیں گے۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

یہ قیمت ایسی تھی کہ ہر شخص اس کو آسانی سے ادا کر سکتا تھا لیکن پھر بھی بہت سے مفت خوروں نے ناک بھوں چڑھائی اور اپنے مقام پر یہ طے کر لیا کہ ہرگز اس قیمت کو ادا نہ کریں گے۔ بلکہ یہ بھی طے کر لیا کہ جس طرح از منہ سابقہ میں اس دکان کے مقابل دوسری نقلی دکانیں مصنوعی سودے کی کھولی گئیں تھیں۔ ہم بھی کھولیں گے اور جس طرح ہم سے پہلے لوگوں نے اس دکان کے محافظوں کو قتل کیا ہے ہم بھی قتل کریں گے۔ چنانچہ بعد وفات رسولؐ اس اسکیم پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پہلے ڈھکی چھپی مخالفتیں رہیں۔ لیکن چند سال بعد ہی للّہی بغض اتنا بڑھا کہ ان خدا رسیدوں کے قتل پر کھلم کھلا کمریں باندھنے لگے۔

آہ ان ظالموں کو کیسی عداوت تھی کہ کربلا میں رسولؐ کا خاندان چند گھنٹوں کے اندر اندر کاٹ کر رکھ دیا اور وہ وہ مظالم کیے کہ ان کے تصور سے کلیجہ کانپتا ہے۔ کافر و مشرک کے ساتھ وہ ظلم روا نہیں رکھے جاتے جو ان نام

نہاد مسلمانوں نے اپنے رسولؐ کی اولاد پر کئے۔

منقول ہے کہ گیارہویں محرم کو پسر سعد نے حکم دیا کہ اس کی فوج کے تمام نجس لاشے دفن کئے جائیں۔ ایک سردار نے پوچھا حسینؑ اور اس کے انصار کے لاشوں کے متعلق کیا حکم ہے اس شقی نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ ان سب لاشوں کو یونہی بے غسل و کفن خاک پر پڑا چھوڑ دو۔ چنانچہ صبح سے سہ پہر تک وہ نجس لاشے دفن ہوتے رہے جب ایک ایک لاش دفن ہو گئی تو پسر سعد نے اہل حرم کی گرفتاری اور کوفہ کی روانگی کا حکم دیا۔

اب تھوڑا سا حال ان ستم رسیدہ آفت رسیدہ اور مصیبت زدہ بی بیوں کا بھی سن لیجئے جو صبح سے سہ پہر تک یوں ہی بغیر کسی سائے کے سر و پا برہنہ جلتی ریت پر بیٹھی رہی تھیں۔ دن بھر ان آوارہ وطنوں پر تیز دھوپ پڑتی رہی، جو دماغوں کو کھولا دینے والی تھی۔ آہ! بہتر شہیدوں کی سوگوار بی بیوں کو بجائے تسلی دینے کے ایک اور مصیبت میں ڈالا گیا۔ شمر اور خولی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے وہاں پہنچے ان کے ہاتھوں میں رسیاں ہتھکڑیاں اور طوق تھے۔ سب سے پہلے بیمار کربلا کے پاس آئے۔ اور ان کو زنجیروں میں جکڑ کے گلے میں طوق ڈالا۔ پھر بے کس بی بیوں کو رسیوں میں باندھا اور ان سب کو بہ ہزار ذلت و خواری کھینچے ہوئے لشکر گاہ پسر سعد کی طرف لے گئے آہ وہ ظالم ذریت رسولؐ کو اس ذلت و خواری کی حالت میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اس کے بعد کچھ برہنہ پشت اونٹوں کو قریب لائے اور انہوں نے چاہا کہ ایک ایک بی بی کا بازو پکڑ کر اونٹوں پر سوار کریں۔ جناب زینبؑ نے ان کا یہ ارادہ معلوم کر کے فرمایا۔

"اے ظالمو! ہم سے دور رہو۔ ہم ناموسِ رسولؐ ہیں۔ ہم کو نامحرم کا ہاتھ لگانا گوارا نہیں۔ ہم مر جائیں گے مگر تمہارے سہارے سوار نہ ہوں گے۔"

پسر سعد نے کہا۔ اچھا جلد سوار ہو۔ چنانچہ جناب زینبؑ اور جناب ام کلثومؑ نے ایک ایک بی بی کو پکڑ کر سوار کرنا شروع کیا، جب سب بی بیاں اور بچے سوار ہو گئے تو جناب زینبؑ نے ام کلثومؑ سے فرمایا آؤ بہن! اب تم کو بھی سوار کر دوں چنانچہ بازو پکڑ کر ان کو بھی سوار کیا اب جناب زینبؑ تنہا رہ گئیں آپ نے مقتل کی طرف رخ کیا اور رو رو کر فرمانے لگیں۔

"میرے ماں جائے حسینؑ، میرے مظلوم برادر! آیئے اب اپنی دکھیا بہن زینبؑ کو سوار کیجئے۔"

جناب زینبؑ کا یہ کلام سن کر بی بیوں میں کہرام برپا ہو گیا۔ آہ کیوں کر بیان کروں کہ بی بی کیسے سوار ہوئیں۔ حضرت بیمار کربلا روتے ہوئے تشریف لائے اور فرمانے لگے اے پھوپھی اماں آیئے میں آپ کو سوار کراؤں یہ کہہ کر آپ نے جناب زینبؑ کا بازو پکڑا اور سوار کیا۔ آہ! ان بے کسوں کے اونٹوں پر نہ کجاوا نہ عماری۔ امام زین العابدین علیہ السلام کے لیے پسر سعد نے حکم دیا کہ ان کو پا پیادہ لے چلو اور اونٹوں کی مہار ہاتھ میں دو۔ الغرض اس طرح سوار کر کے وہ اشقیا روانہ ہوئے اور مقتل شہداء کی طرف سے گزرے۔ اس وقت اہل حرم کی بے قراری اور گریہ و زاری کا کیا حال بیان کروں۔ شہیدوں کے بے گور و کفن لاشے جب نظر پڑے تو ایک ایک

بی بی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ قریب تھا کہ فرطِ غم سے ہلاک ہو جائیں! آہ ان بیکسوں کو اول تو برہنہ پشت اونٹوں پر بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ پھر ضعف کا غلبہ۔ اسیری کی حالت نامحرموں کا سامنا بندھے ہوئے ہاتھ۔ ہر قدم پر غش۔ کئی بی بیاں اونٹوں پر سے غش کھا کر گر پڑیں۔ وہ اشقیا تازیانے مار کر ہوش میں لاتے اور جبراً باندھ پکڑ کر اونٹوں پر بٹھاتے۔ الغرض قریب شام یہ قافلہ مقتل شہداء سے گزرتا ہوا کوفہ کی طرف روانہ ہوا ابھی تھوڑی دور چلے تھے کہ یکایک وہ نیزہ جس پر سر امام مظلوم علیہ السلام نصب تھا چلنے سے رک کر زمین پر گڑ گیا۔ ہر چند خولی شقی نے زور لگایا مگر سر انور نے جنبش نہ کی۔ شمر بیمارِ کربلا کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ کہ کیا وجہ ہے کہ تمہارے باپ کا سر آگے کیوں نہیں بڑھتا۔ حضرتؑ نے فرمایا:

"اے شقی اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی بہن سکینہ اونٹ سے گر گئی ہے۔ جب تک وہ ہم سے نہ مل جائے گی۔ بابا کا سر اقدس آگے نہ بڑھے گا۔

یہ سن کر شمر غصہ میں بھرا ہوا مقتلِ شہدا کی طرف پلٹا۔ اور بچی کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ آہ! وہ دکھیا اپنے باپ کی لاش سے لپٹی ہوئی فریاد کر رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔ بابا آپ ہماری خبر کیوں نہیں لیتے۔ دشمن ہمیں قید کر کے لے جا رہے ہیں۔ اے بابا! ظالموں نے ہمارے خیموں میں آگ لگا دی۔ مگر آپ نے خبر نہ لی ہم کو ایسا لوٹا کہ کسی کے سر پر چادر تک نہ چھوڑی اور میرے کان چیر کر گوشوارے چھین کر لے گئے۔ دیکھئے میرا کرتا خون سے بھرا ہوا ہے۔ آہ! بابا! آپ کے سینے پر سونے والی سکینہ تمام رات خاک پر پڑی رہی اور آپ نے بات نہ پوچھی۔ آہ! آہ!! وہ بے کس بچی اپنے باپ سے پوری داستانِ غم نہ کہنے پائی تھی کہ شمر شقی وہاں آ پہنچا اور غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی۔ پہلے بچی کے پھول سے رخساروں پر طمانچے مارے۔ کہ وہ معصوم بچی بلبلا گئی۔ پھر ننھے ننھے بازو پکڑ کر لاشِ حسینؑ مظلوم سے انتہائی بے رحمی سے جدا کیا اور کشاں کشاں قافلے کی طرف لے چلا۔ سکینہ آہ! نادان سکینہ مڑ مڑ کر لاش کی طرف دیکھتی جاتی تھی اور بلبلا بلبلا کر فریاد کرتی جاتی تھی۔ بابا مجھے اس ظالم سے بچا لیجئے۔ افسوس! یتیم بچی کے حالِ زار پر اس سنگدل کو رحم نہ آیا اور اسی طرح کھینچتا ہوا قافلہ تک لے گیا اور اونٹ پر بٹھا کر وہاں سے کوچ کیا۔

لکھا ہے کہ جب فوج یزید کربلا سے روانہ ہوئی تو قبیلہ بنی اسد کے کچھ لوگ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لاشہائے شہدا یوں ہی بے گور و کفن خاک پر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر ان کے دل سینوں میں ہل گئے اور اپنے قبیلے والوں سے جا کر اس کا ذکر کیا۔ جب عورتوں نے یہ بات سنی تو بے چین ہو گئیں اور اپنے مردوں سے رو رو کر کہنے لگیں کیا غضب کی بات ہے کہ اولادِ رسولؐ کے لاشے یوں بے گور و کفن پڑے رہیں اور ہم اپنے گھروں میں آرام چین سے بیٹھے رہیں۔ ان کے مردوں نے کہا۔ ہم یہ کام کیونکر انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ابن زیاد کو پتا چل گیا تو ہم سب کو قتل

کرادے گا اور ہمارے املاک ضبط کر کے گھر بار لوٹ لے گا۔ جب ان دین دار عورتوں نے یہ دیکھا کہ مردوں پر بزدلی غالب ہے تو ان سے کہا کہ۔

اگر تم پر ابن زیاد کا خوف غالب ہے تو یہ ہماری چادریں تم اوڑھ لو اور اپنی تلواریں ہم کو دے دو ہم خود نواسۂ رسولؐ کی لاش دفن کریں گے۔ خاک ہے اس مسلمانی پر کہ نبی زادہ بے گور و کفن پڑا رہے۔

جب ان لوگوں نے اپنی عورتوں میں یہ غیر معمولی جوش دیکھا تو ان کو شرم آئی اور اپنی کمریں کس کر لاشہائے شہداء کے دفن کے لئے روانہ ہوئے اور کربلا میں پہنچ کر ہر ایک شہید کی لاش کو سپرد خاک کیا۔ اس قبیلہ کا آج تک یہ دستور ہے کہ روز عاشورہ زن و مرد اور بچے بیلچے اور پھاوڑے لیے کربلا میں ابن الحسینؑ۔ این الحسینؑ (کہاں ہیں حسین کہاں ہیں حسین) کے نعرے مارتے ہوئے کربلا میں آتے ہیں ان کی آمد پر ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے۔

الا لعنة اللہ علی الظالمین ۰ وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۰ ۲۶/۲۲۷

چوبیسویں مجلس

تفسیر آیۂ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور حال ورود اہلِ حرم در کوفہ اور روایت اُمِّ حبیبہ

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

(رعد ۱۳/۴۳)

اے رسولؐ کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو تم ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کی گواہی کے لیے خدا کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے۔

رسولؐ کی رسالت کے دو گواہ ہیں ایک اللہ اور دوسرے من عندہٗ علم الکتاب گواہوں کا ذی اقتدار ہونا دعوے کی صداقت کی دلیل ہوتا ہے۔ پس کیا کہنا اس دعوے کا جس کا ایک گواہ تو اللہ ہے، اور دوسرا جو نفس اللہ ہو۔ عین اللہ ہو، وجہ اللہ ہو، جنب اللہ، لسان اللہ ہو، کہ اس پر خدائی کا لوگوں پر دھوکا ہوتا ہو۔ خدا نے اپنے رسولؐ کی صداقت کا گواہ اپنے ساتھ ایک ایسی ذات کو بنایا ہے کہ اگر بزم قدس میں بیٹھے تو وجہ اللہ نظر آئے بزم ملک میں ہو تو استاد جبرئیل کہلائے۔ محفل رسولؐ میں بیٹھے تو نفس رسولؐ لقب پائے۔ مومنین کی صف میں ہو تو کامل الایمان دکھائی دے۔ اگر وحدانیت کی گواہی کی ضرورت ہو تو اس کا تعارف اولوا العلم کی صفت سے کرایا جائے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

آل عمران ۳/۱۸

اللہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے اور ملائکہ اور علم والے اس کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ عادل ہے اور جب رسالت کی گواہی کی ضرورت ہو تو اس کو من عندہ علم الکتاب کہہ کر بلایا جائے اگر رسول کی مدد کی ضرورت ہو تو اس کو صالح المومنین کہہ کر بنایا جائے اور جب مباہلہ کا موقع ہو تو وہی نفس رسول بن کر نکلے۔ جب مومنین کے ولی شمار کرائے جائیں تو اس کو

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ

رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ (۵۵/۵ مائدہ)

کی صفات سے بیان کیا جائے جب مطاع خلق بیان ہو تو اس کو اولی الامر کا لقب دیا جائے۔

اب بیان یہ کرنا ہے کہ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے کون مراد ہے آیہ فی صدور الذین اوتوا العلم (المائدہ آیت ۵۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کا تعلق قلب سے ہوتا ہے نہ کہ زبان سے مفہوم شئے ایک چیز ہے۔ جس کے لیے الفاظ کی علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔ جو لوگ الفاظ کو مفہوم اور حقیقی علم سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں بھلا علم سینے سے سینے میں کیسے پہنچ سکتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ آنکھوں سے آنکھوں میں علم کیسے پہنچ جاتا ہے حواس خمسہ سے جو علم ہم کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ براہ راست قلب سے تعلق رکھتا ہے۔

جب اظہار کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم الفاظ کی علامتوں سے اس علم کو دوسروں پر ظاہر کرتے ہیں مثلاً ہم نے ایک لذیذ شئے کو چکھا تو اس کی صفت ان الفاظ میں بیان کی کہ وہ میٹھا ہے یا کھٹا لیکن شیرینی یا ترشی کا جو اصل لطف ہمارے قلب کو حاصل ہوا تھا۔ وہ پوری طرح ان الفاظ میں ادا نہیں ہو سکا۔ صرف یہ سرسری اظہار اس لطف کا کیا گیا ہے۔ حقیقی ذائقہ سے وہی شخص باخبر ہو سکتا ہے جس نے اس شئے کو کھایا ہو آنکھوں سے بہت سے مناظر دیکھ کر جو لطف ہم حاصل کرتے ہیں۔ وہ الفاظ میں پوری طرح بیان نہیں ہو سکتے الفاظ ایک مجمل نشان ہوتے ہیں۔ اس تفصیل کا جو ہم کو کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا سونگھنے یا چھونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اجمال تفصیل کی صورت اسی وقت اختیار کر سکتا ہے۔ جب ہمارے الفاظ سننے والے نے بھی وہ منظر دیکھا ہو۔ پس الفاظ قرآن ان ہی کے سینوں میں جاکر پھیل سکتے ہیں۔ جو معنی و مفاہیم قرآن کے پہلے سے عالم ہوں۔

الفاظ بدل سکتے ہیں۔ کم و بیش ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم نہیں بدل سکتا۔ میں ایک بات کو سو زبانوں

میں ادا کر سکتا ہوں۔ الفاظ ضرور بدل جائیں گے۔ مگر مفہوم وہی ایک رہے گا پس معلوم ہوا کہ الفاظ میں تغیر و تبدل ممکن ہے۔ لیکن مفہوم میں جس کا تعلق قلب سے ہے ممکن نہیں۔ الفاظ میں سہو و نسیان ہو سکتا ہے لیکن مفہوم میں اس کی گنجائش نہیں۔ الفاظ میں شک و شبہ ہو سکتا ہے لیکن مفہوم میں یہ صورت نہیں۔ پس معلوم ہوا اصل شے علم یا مفہوم ہے۔ جب تک یہ باقی ہے۔ حقیقت باقی ہے۔ الفاظ میں تاویل کی بہت گنجائش ہے مگر مفہوم میں یہ دروازہ بند ہے۔ کیونکہ مفہوم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ الفاظ کے معنی سینکڑوں ہوتے ہیں۔ الفاظ جتنی زبانوں میں منتقل ہوتے رہیں گے اتنا ہی ان میں تغیر کا اندیشہ بڑھتا جائے گا اور معنی کے پہلو بدلتے رہیں گے۔

اور ہر شخص اپنی فہم و دانش کے مطابق ان کا مطلب جُدا جُدا بیان کرتا رہے گا۔ لیکن قائل کا مفہوم ان کا ساتھ نہ دے گا۔ اس مفہوم کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو قائل نے بتایا ہو یا سننے والے نے اس سے پوچھا ہو۔

جو چیز دل پر نقش ہوتی ہے وہ نہ مٹتی ہے نہ بدلتی ہے لیکن جو زبان تک محدود رہتی ہے وہ بہت جلد کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ جھوٹی بات غلط ہونے کی وجہ سے دل پر نقش نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ جھوٹا آدمی خود ہی اپنے کلام کی تردید کر دیتا ہے۔ لیکن سچا آدمی ایک بات کو ہزار بار کہتا ہے۔ اور ان ہی الفاظ میں کہتا ہے کیونکہ وہ بات اس کے دل پر نقش ہوتی ہے۔

پس علم قرآن جن کے سینوں میں ہے وہ الفاظ قرآن کا ہمیشہ وہی مفہوم مُراد لیتے ہیں جو ان کے دل پر نقش ہے۔ ان کی زبان اور بیان میں مفہوم اور منطوق ہوتے ہیں۔ البتہ جو اصل مفہوم سے بے خبر ہوتے ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ الفاظ کتاب کا تعلق ہر خاص و عام سے ممکن ہے لیکن مفہوم یا معنی کا تعلق مخصوص لوگوں ہی سے ہے چونکہ عام لوگ مفہوم کتاب کے امانت دار بننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ لہذا ان کو صرف الفاظ کا امانت دار بنایا جاتا ہے۔

ایک دستر خوان پر بے شمار لذیذ کھانے چُنے ہوئے ہیں اور مختلف مزاجوں کے لوگ میٹھے کھا رہے ہیں۔ اگرچہ ظاہری لذت سب کو حاصل ہو رہی ہے۔ لیکن باطنی اثر سے فیضیاب وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی صحت اچھی ہوتی ہے۔ بیماروں کو تو بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی صحت اور مزاج کے لحاظ سے فائدہ حاصل کرتا ہے یہی حال قرآن کی تعلیم کا ہے جیسی کسی کی عقل ہے، جیسا کسی کا ایمان ہے ویسی ہی اُس کی ہدایت ہے۔

حکیم بیماروں کو نسخہ لکھ کر دیتا ہے لیکن اگر کوئی بیمار نسخہ ہی کو دوا سمجھ کر چاٹنے لگے اور کہہ دے میرے لیے یہی کافی ہے تو وہ کس قدر احمق سمجھا جائے گا۔ ایک بیمار دوا تو استعمال کرے لیکن مجوزہ ترکیب سے

نہ کرے تو بھی فائدہ نہ ہوگا۔ لیکن مجوزہ ترکیب سے کرے، لیکن پرہیز نہ کرے تو بھی فائدہ نہ ہوگا۔

اگر کوئی شخص کتاب میں نسخہ لکھا ہوا دیکھ کر استعمال کرنے لگے تو نقصان پہنچنے کا قوی امکان ہے صرف نسخہ مفید نہیں بلکہ حکیم سے پہلے تشخیص مرض کرانا ضروری ہے۔ پھر ان ادویات کی تاثیر معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر بلحاظ اوزان ان کو اپنے مزاج کے موافق بنانا ضروری ہے۔ کتاب میں نسخہ بالکل صحیح لکھا ہے۔ لیکن چونکہ مریض اس کا استعمال غلط کرتا ہے۔ لہٰذا نقصان پہنچ جاتا ہے۔ پس اس صورت میں قصور مریض کا ہے نہ کہ طبیب کا۔ یہی حال قرآن کا ہے۔ اسی سے لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ اور اسی سے ضلالت میں پڑ جاتے ہیں۔ پس اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کتاب کے محض الفاظ کافی نہیں تا وقتیکہ مفہوم کتاب تک رسائی نہ ہو۔

ادویات کے اثر و کیفیات کا علم مریضوں کی حالت کے لحاظ سے طبیب کے سینے میں ہوتا ہے اگر اثر صحیح کا علم ہے اور مرض تشخیص میں آچکا ہے تو دوا کبھی نقصان نہیں دے سکتی۔ ایک دوا کے متعلق یہ تو علم ہے کہ وہ مقوی قلب ہے۔ لیکن یہ خبر نہیں کہ اس سے جگر میں حرارت بھی بڑھ جاتی ہے۔ پس طبیب کو ان دونوں کا لحاظ کرکے دوا تجویز کرنا ہوگی۔

جن سینوں میں کتاب اللہ کا اصلی علم ہے۔ وہی الفاظ کی صحیح تاویل جانتے ہیں۔ قرآن ان کے سینوں میں اسی طرح پھیلتا ہے۔ جیسے زرخیز زمین میں ایک درخت لہلہاتا اور پھل پھول لاتا ہے۔ شورہ زاروں میں یہ توقع عبث ہے۔ وہاں تو بیج مارا جاتا ہے۔ جن کے سینوں میں مفہوم کتاب ہے۔ انہیں اس بات پر قدرت ہے کہ تمام قرآن کا مفہوم ایک سورہ فاتحہ میں کھینچ کرلے آئیں۔ اور تمام سورۂ فاتحہ کا بسم اللہ میں اور تمام بسم اللہ کا بائے بسم اللہ میں اور اس کو ایک نقطہ میں۔ اسی طرح ایک لفظ کو پھیلائیں تو پورے قرآن کی تفسیر بیان کردیں۔ صرف الفاظ جاننے والوں میں یہ قدرت کہاں۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔ لَوْشِئْتُ لَاَوْقَرْتُ سَبْعِیْنَ بَعِیْراً مِّنْ تَفْسِیْرِ فَاتِحَۃِ الْکِتَابِ اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بار کردوں۔

یہ بات سطحی نظر والوں کی نظر میں نہیں آسکتی کہ پوری دنیا ایک نقطہ میں کیسے سما سکتی ہے۔ لہٰذا ہم اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے دانہ میں برگد کا کتنا بڑا درخت چھپا ہوا ہوتا ہے لیکن نظر کسی کو نہیں آتا۔ ہماری طاقت سے باہر ہے کہ ہم آلے کے ذریعے اسے دیکھ لیں۔ البتہ قوت نامیہ جب چاہے اسے شگافتہ کرکے اس میں برگد کا درخت پیدا کردے۔ اور پھر اس درخت کی ہیئت کو یکجا کرکے ایک دانے میں لے آئے۔

جب انسان میں یہ قدرت ہے کہ ایک حرف سے تمام حروف تہجی پیدا کرے تو کیا جن کو علم کتاب دیا گیا ہے۔ وہ ایک لفظ کو پھیلا کر پوری کتاب کا مفہوم بیان نہیں کر سکتے۔ دیکھو ایک حرف سے اٹھائیس حروف کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ الف کے عدد ۱۱۱ یعنی ایک اکائی ایک دہائی ایک سینکڑہ اکائی سے الف بناؤ۔ دہائی سے ی اور سیکڑہ سے ق۔ اب اسی عدد کو دوگنا، تگنا، چوگنا کرتے چلے جاؤ۔ سب حروف نکل آئیں گے۔

۱۱۱، ۲۲۲، ۳۳۳، ۴۴۴، ۵۵۵، ۶۶۶، ۷۷۷، ۸۸۸، ۹۹۹ ایک باقی رہا۔ ان اعداد کے حروف یوں ہوں گے۔ ا ی ق۔ ب ک ر، ج ل ش، د م ت، د ن ث۔ و س خ، ز ع ذ، ح ف ض۔ ط ص ظ۔ یہ ایک ہزار عدد ہوتے ہیں۔ چونکہ الف اور الف بمعنی ایک ہزار میں تجنیس خطی ہے۔ لہذا یہ بھی داخل۔

قرآن کی صفت یہ ہے تبیاناً لکل شیء اس میں ہر شئے کا بیان ہے۔ پس جس کے پاس کتاب کا علم ہو اس کی شان بھی یہی ہونی چاہیے کہ جو بات اس سے دریافت کی جائے وہ فوراً اس کا جواب دے اور یہ شان سوائے رسولؐ اور اولاد رسولؐ دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ﴿١٢﴾

(۱۲/۳۶ یس)

ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو عمل انہوں نے کیے ہیں اور دنیا میں جو آثار چھوڑے ہیں وہ سب ہم لکھ لیتے ہیں اور امام مبین میں گھیر دیا ہے۔

سے ظاہر ہے کہ رسول خداؐ اور وصی رسولؐ ہر شئے کا علم رکھتے تھے۔

قرآن رسول کو لفظ بہ لفظ پڑھایا نہیں گیا۔ بلکہ رسولؐ کے دل پر اتارا ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾

(۲/۹۷ بقرہ)

اور جو شخص خدا اور اسکے فرشتوں اور اسکے رسولوں اور خاص کر جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو بیشک خدا بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ سے واضح ہے لیکن دوسرے مقام پر ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ۵۳/۵ نجم ترجمہ:۔ ان کو نہایت طاقتور نے تعلیم دی ہے۔

(جبرئیل نے تعلیم دی) ان دونوں آیتوں میں تطابق کیونکر ہو۔ جواب یہ ہے کہ قرآن تو خدا نے قلب رسولؐ پر پہلے ہی نقش کر دیا تھا۔ پس جبرئیل حقیقت میں قرآن سکھانے والے نہیں بلکہ محل آیات بتانے والے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ماں باپ جب اپنے بچوں کو نماز کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ تو پہلے سورے ذکر رکوع و سجود و تشہد یاد کرا دیتے ہیں۔ پھر جب نماز کے لیے کھڑا کرتے ہیں تو بتاتے جاتے ہیں۔ اب یہ پڑھو۔ پس اب تین صورتیں ہوئیں۔ علم القرآن خلق الانسان جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل خلقت آنحضرت صلعم کو علم دیا گیا دوسرے نزلہ علی قلبک (یعنی پیدائش کے بعد دل پر اتار گیا۔ تیسرے علمہ شدید القویٰ۔ یعنی فرشتہ محل بتانے آیا۔ پس ان تینوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ قبل پیدائش عالم نور میں حقیقتِ قرآن کی تعلیم ہوئی۔ بعد پیدائش قلب پر اس حقیقت قرآن کی کتابت کی گئی۔ اور بعد بعثت اس حقیقت و کتابت کو الفاظی صورت میں لانے کے لیے محل و توقع بتایا گیا ہے۔ پس علم قرآن کا تعلق تین چیزوں سے ہے۔ حقیقت کتابت۔ الفاظ۔ حقیقت کا علم خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ کتابت کا علم اسی کو حاصل ہوتا ہے جو پہلے سے رسم الخط جانتا ہو۔ الفاظ سن کر لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے پس من عندہ علم الکتاب۔ ایسا شخص ہونا چاہیے جو حقیقتِ قرآن کی تعلیم بھی پا چکا ہو۔ کتابت سے بھی واقف ہو اور محلِ تعلیم سے بھی آگاہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام میں یہ سب جہتیں موجود تھیں۔ بمصداق انا و علی من نور واحد اس وقت نورِ رسالتؐ میں شریک تھے۔ جب قبل خلقت حقیقتِ قرآن کی تعلیم ہو رہی تھی پھر قلب رسولؐ پر کتابت ہوئی تو اسی کتاب کا صحیح عکس رسولؐ نے علیؑ کے سینے میں اتار دیا۔ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (یہاں اوتوا العلم (جن کو دیا گیا) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیات بینات بعد کو آئی ہیں۔ پہلے ان کو علم دیا گیا ہے۔ ۲۹/۴۹ عنکبوت پھر جبرئیل نے محل کی تعلیم دی۔ رسولؐ نے اسی طرح علیؑ کو تعلیم دے دی علمنی رسول اللّٰہ فانا...

رسول اللہ میں اور علیؑ میں فرق یہ ہے کہ رسولؐ نے براہِ راست خدا سے دو تعلیمیں حاصل کیں اور علیؑ نے ایک تعلیم خدا سے حاصل کی اور دو تعلیمیں رسولؐ سے یعنی حقیقتِ قرآن کی تعلیم عالم نور میں خدا سے پائی اور حقیقت کتاب۔ اور محل نزول کی رسولؐ سے اسی لیے حضرت علیؑ کا مرتبہ رسولؐ کے مقابل شاگرد کا ہوا۔ لیکن جبرئیلؑ کے مقابل استاد کا کیونکہ حقیقت قرآن کا علم اور حقیقت کتاب کا علم علیؑ کو جبرئیلؑ

سے زیادہ حاصل تھا۔

ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جبرئیلؑ رسولؐ کے تو استاد تھے اور علیؑ کے شاگرد۔ اس صورت میں علیؑ کا رتبہ رسولؐ سے بڑھ گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت علیؑ استادِ جبرئیلؑ تھے۔ رسولؐ بھی استاد تھے یعنی عالمِ نور میں۔ اس وقت نورِ رسالتؐ بزبانِ ولایت معلم جبرئیلؑ بن رہے تھے۔ اور جبرائیلؑ نے جو تعلیم رسولؐ کو دی۔ وہ عالمِ مادی میں دی۔ بحیثیت پیغامبر کے نہ کہ بحیثیت ایک معلم کے۔ حقیقت یہ ہے کہ نورِ رسالتؐ نے ہی جبرائیلؑ کو اس قابل بنایا کہ وہ تعلیم ربانی کے امین ہوئے۔ اگر تعلیم رسولؐ وہاں جبرائیل امین کو نہ ہوتی تو جبرائیل یہاں تعلیم دینے کے قابل نہ ہوتے۔ نورِ رسولؐ کے دو حصے تھے دو کام ان سے متعلق ہوئے نورِ رسالتؐ وجہ خلقت جبرئیلؑ بنا۔ اور نورِ امامت وجہ تعلیم جبرئیلؑ۔

من عندہ علم الکتاب کا مصداق اللہ کے ساتھ گواہ بنتا ہے۔ اللہ کا علم عین ذات ہے تو جو اس کے ساتھ گواہ ہو۔ اس کا علم اگر عین ذات نہ ہو تو داخل ذات تو ہو۔ یعنی جب سے ذات حادث ہو جب ہی سے ذات کے ساتھ علم بھی ہو۔ ورنہ وہ ایسی ذات کی گواہی کیونکر دے سکتا ہے جس کی نبوت خلقت آدم سے ہزارہا سال پہلے ہو۔

قرآن کے تین نام خاص ہیں۔ اوّل نورؐ، دوسرے کتاب اور تیسرے ذکر یا قرآن یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ وہ بحالت نور تھا۔ دوسرا وہ وقت تھا کہ وہ علم و قدرت سے مکتوب بنا۔ تیسرا وقت ایسا آیا کہ وہ زبان رسولؐ سے ذکر یا مکتوب بنا۔ پس حقیقت کا تعلق نورؐ سے ہے۔ کتابت کا قلب سے۔ ذکر کا زبان سے۔ جب تک بصورتِ حقیقت عالمِ نور میں رہا۔ تمام انبیاء و اوصیاء اور ملائکہ کی تعلیم ہوئی۔ جب تک بحیثیت کتاب رہا علیؑ کو تعلیم دیتا رہا۔ جب بصورت ذکر آیا تعلیم عام ہو گئی۔ پس من عندہ علم الکتاب وہی ذات ہو سکتی ہے جس کا تعلق کتاب کی ہر حالت میں رہا ہو۔

رسولؐ اللہ نے کتاب کے ساتھ اہلِ بیت علیہم السلام کو کیا ہے فقط قرآن کے ساتھ نہیں یعنی مفہوم کے ساتھ کیا ہے نہ کہ صرف الفاظ کے ساتھ کیونکہ الفاظ کی صورت بدل سکتی ہے مفہوم کی نہیں بدل سکتی الفاظ کا تعلق عام لوگوں کی زبان سے ہے اور مفہوم کا تعلق خاص لوگوں کے سینے سے۔ کتاب اللہ کا حقیقی علم ان ہی لوگوں کے سینوں میں ہے جن کا تعارف رسولؐ نے اہل بیت علیہم السلام کے نام سے کرایا ہے۔ ان کو قرآن کے ساتھ مسلمانوں کی ہدایت کا قیامت تک کے لیے پورا پورا بندوبست کر دیا تھا لیکن افسوس مسلمانوں نے رسولؐ کی تعلیم پر عمل نہ کیا اور جس عترت کی عزت اور اتباع کا حکم دیا گیا تھا اس کے ستانے اور ذلیل و حقیر کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ غضب خدا کا کہاں بازار کوفہ و شام اور کہاں رسولؐ کی اولاد۔

ترک و دیلم کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کیا جاتا جو ان ایمان فروش اور عاقبت برباد مسلمانوں نے آلِ رسولؐ کے ساتھ کیا۔ آہ! آہ!! جس کوفہ میں آج سے چند سال قبل بھی زینبؑ و امِ کلثومؑ شہزادیاں کہلاتی تھیں۔ آج اسی کوفہ میں انتہائی ذلت کے ساتھ تشہیر کی جا رہی ہیں۔

صاحب سیرۃ الائمہ لکھتے ہیں کہ ایک بار رؤسا و اعیان کوفہ نے امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہماری عورتوں کی یہ دلی خواہش ہے کہ اپنی شہزادیوں کی قدم بوسی حاصل کریں۔ کیا ان کی یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ میں اندر جا کر زینبؑ و امِ کلثومؑ سے دریافت کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ بیت الشرف میں تشریف لائے اور اہلِ کوفہ کا پیغام پہنچایا۔

دونوں شہزادیوں نے عرض کی کہ رؤسائے شہر کی بی بیاں زرق برق لباس میں آئیں گی۔ ہمارے لباس بوسیدہ ہو رہے ہیں ایسی حالت میں ان کو بلاتے شرم آتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے گھر میں کوئی سامان آرائش و زیبائش بھی نہیں۔ حضرت امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

اس کی پرواہ نہ کرو۔ ہم کو ان چیزوں سے تعلق نہیں۔ الغرض آپ نے اعیانِ کوفہ کی اس درخواست کو منظور فرمالیا۔ وہ لوگ اپنے اپنے گھر واپس آئے اور اپنی عورتوں سے کہا خوشا النصیب تمہارے کہ دخترانِ علیؑ و فاطمہؑ نے ہماری درخواست منظور فرمائی۔ اب تم کو چاہیے کہ بغیر زیور کے معمولی لباس میں جاؤ تاکہ ہماری شہزادیاں سبک نہ ہوں۔ چنانچہ وہ عورتیں اسی شان سے آئیں۔ پہلے جناب زینبؑ و امِ کلثومؑ سلام اللہ علیہا کے قدم چومے پھر اس بوریے پر بیٹھنے لگیں جس پر شہزادیاں بیٹھی تھیں۔ جناب زینبؑ سلام اللہ علیہا نے اپنی چادر بچھا کر فرمایا:

آپ اس پر بیٹھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں۔ اے دخترِ زہراؑ ہماری کیا تاب کہ اس مقدس چادر پر اپنے قدم رکھ سکیں۔

آہ! جس زینبؑ و امِ کلثومؑ کا ایک وقت یہ عزت اور یہ احترام تھا۔ آج وہ بندیاں ترک و دیلم کی طرح برہنہ سر در بدر پھرائی جا رہی ہیں۔ اور ایک منادی آگے آگے ندا کرتا جاتا ہے۔ اے اہلِ کوفہ یہ دخترانِ فاطمہؑ ہیں جو برہنہ سر اونٹوں پر سوار ہیں ؎

شامیاں بستند بازوئے زینبؑ و کلثومؑ را
اے فلک آں ابتدا ایں انتہائے اہلبیت

لکھا ہے جب یہ لٹا ہوا قافلہ کوفہ میں داخل ہوا۔ تماشائیوں کا ہر طرف ہجوم تھا۔ ہر سمت کوٹھوں پر نئے لباس پہنے زیورات سے آراستہ عورتیں تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور یہ اس مجمع میں

برہنہ پشت اونٹوں پر سوار بے مقنع و چادر اس طرح جا رہی تھیں کہ ان کے ہاتھ پس گردن سے اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ سر کے بالوں کے سوا کوئی سامان منہ چھپانے کا نہ تھا۔ آہ! خدا دشمن پر بھی یہ وقت نہ ڈالے۔ جوان غریب الوطن اور بے والی و وارث ستم رسیدہ سیدانیوں پر آ پڑا تھا۔

جب یہ قافلہ بازار کوفہ میں پہنچا تو وہاں تماشائیوں کا زیادہ ہجوم تھا۔ کچھ لوگ آل رسولؐ کی تباہ حالی پر رو بھی رہے تھے۔

جناب زینبؑ کو تاب ضبط نہ رہی۔ ان سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں۔

"اے اہل کوفہ! اے مکر و فریب کے پیکرو۔ تم کتنے بے حیا و بے غیرت ہو کہ جس رسولؐ کا کلمہ پڑھتے ہو اسی کے نواسے کا گلا کاٹتے ہو۔ پھر اس کے ناموس کو مقید کر کے انتہائی ذلت کے ساتھ کوچہ و بازار میں تشہیر کرتے ہو۔ اور پھر ظلم و ستم کرنے کے بعد ہماری مصیبت پر آنسو بہاتے ہو۔ ایمان فروشو! مکارو! تم کو کیا خبر کہ تم نے کس کے کلیجے پر چھری پھیر دی۔ کس کا پھولا پھلا باغ تیغوں سے کاٹ ڈالا۔ یہ کس کے ناموس ہیں جن کی تم تشہیر کر رہے ہو۔ لوگو۔ خدارا سوچو۔ تمہارے نبیؐ کی آل ہے جس کو تم نے اپنے ظلم و ستم کا شکار بنایا ہے۔ اے ظالمو! عنقریب خدا کا عذاب تم پر نازل ہونے والا ہے۔"

جناب زینبؑ کی اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہ اپنا سر جھکا کر زار زار رونے لگے۔ شمر نے یہ حال دیکھ کر حکم دیا کہ وہاں سے اونٹوں کو بڑھاؤ اور باجے بجاؤ تاکہ ان کی آواز سنائی نہ دے۔

جب یہ قافلہ کوچہ و بازار سے گزر رہا تھا تو سر ہائے شہداء آگے آگے نیزوں پر تھے۔ اور اہل حرم کے اونٹ پیچھے تھے۔ اتفاقاً خولی اس نیزے کو۔ جس پر سر امام حسین علیہ السلام نصب تھا۔ قریب جناب زینبؑ کے لے آیا۔ آہ! آہ! جوں ہی جناب زینبؑ کی نظر حضرت امام مظلومؑ کے سر پر پڑی بے چین ہو گئیں اور سر مبارک سے مخاطب ہو کر فرمانے لگیں۔

یَا هِلَالاً لَمَّا اسْتَتَمَّ كَمَالاً غَالَهُ خَسْفُهُ فَأَبْدَا غُرُوبَا
أَخِي يَا أَخِي فَاطِمَةُ الصَّغِيرَةُ كَلِّمْهَا فَقَدْ كَادَ قَلْبُهَا أَنْ يَذُوبَا

اے میری ماں کے چاند۔ ابھی تو تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ غروب ہو گیا۔ اے میرے مظلوم بھیا! ذرا فاطمہ صغریٰ سے کچھ بول لیجئے۔ قریب ہے کہ آپ کی جدائی میں اس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ اس کے بعد آپ نے انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنا سر چوب پالان پر دے پٹکا جس سے پیشانی مبارک شق ہو گئی آہ اس وقت کی مصیبت کا حال کیونکر بیان کیا جائے چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے اور پیاسے اپنی ماؤں سے کھانا پانی مانگتے تھے۔ تو ان کے کلیجے اس غم سے شق ہو جاتے تھے۔ زنان کوفہ جب صدقے کے خرمے اور روٹیاں

ان پر پھینکتی تھیں۔ تو بھوکے بچے ان کو لے کر کھانا چاہتے تھے تو مائیں ان کے ہاتھوں سے لے کر پھینک دیتی تھیں۔ اور اہل کوفہ سے کہتی تھیں۔

"اے بے غیرتو! ہم عترت رسولؐ ہیں صدقہ ہم پر حرام ہے۔ اے بدبختو! تمہارے مردوں نے ہمارے مردوں کو قتل کیا۔ اور اب ہم پر صدقہ پھینک پھینک کر ہمارے دکھی دلوں کو اور دکھاتی ہو۔ خدا جلد اپنا عذاب نازل کرے۔" آہ! جناب زینبؑ کا اونٹ ایک ایسے کوٹھے کے قریب پہنچا۔ جس پر بہت سی تماشائی عورتیں جمع تھیں۔ ایک ضعیفہ نے جناب سکینہؑ کو بھوک سے نڈھال دیکھ کر جناب زینبؑ سے پوچھا۔ بی بی! تمہاری یہ بچی بیمار ہے۔ فرمایا بیمار تو نہیں ہے۔ لیکن باپ کی جدائی کے غم میں اور بھوک پیاس کے صدمے سے یہ حال ہو گیا ہے۔ وہ ضعیفہ اہل دل تھی، رحم آگیا دوڑی ہوئی گئی۔ اور کھانا لے کر آئی۔ اور کہنے لگی بی بی! یہ کھانا اور پانی حاضر ہے۔

جناب زینبؑ نے فرمایا: ہم کو اس کی حاجت نہیں۔ یہ بچی ایسے خاندان کی نہیں کہ تنہا کھا لے۔ جب تک ہم سب اسیروں کو یہ ظالم کھانا نہ دیں گے۔ ہم میں سے کوئی تنہا نہیں کھا سکتا۔ جب اس ضعیفہ کے اصرار پر بھی وہ کھانا لینا منظور نہ کیا تو اس نے کہا "اچھا! میری ایک حاجت ہے آپ اسے ضرور پورا کر دیجئے۔ پوچھا وہ کیا ہے۔ اس نے کہا سنتی ہوں کہ یتیم کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ چاہتی ہوں کہ یہ بچی میرے لیے دو دعائیں کر دے۔ فرمایا بیان کرو۔ کہ وہ حاجتیں کیا ہیں۔ اگر خلاف شرع نہ ہوں گی تو میری بچی ضرور ان کے لیے دعا کر دے گی۔

اس نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا میرے بچوں کو اس طرح یتیم نہ کرے جس طرح یہ بچی یتیم ہوئی ہے۔ دوسری میری حاجت یہ ہے کہ خدا جلد مدینہ منورہ پہنچا دے۔ مدینہ کا نام سنتے ہی جناب زینبؑ کے کلیجے پر چھری چل گئی۔ فرمایا اے بی بی! مدینہ میں تمہارا کیا کام ہے۔ اس نے کہا کہ دنیا میں بس ایک وہی تو جگہ جہاں جانے کی اہل ایمان کے دل میں خواہش رہتی ہے۔ فرمایا مدینہ میں تم کس غرض سے جانا چاہتی ہو۔ اس نے کہا وہاں اپنی شہزادی جناب زینبؑ کی زیارت کروں گی۔ اور اپنے سید و مولا امام حسینؑ کے قدم چوموں گی۔

یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ کا کلیجہ ہل گیا چہرے سے بال ہٹا کر بغور دیکھا تو وہ آپ کی آزاد کردہ کنیز ام حبیبہ ہے آپ نے سر جھکا کر کہا اے کنیز خدا اگر تو زینبؑ کو دیکھے گی تو پہچان لے گی۔ اس نے کہا بھلا اس بی بی کو کیوں نہ پہچانوں گی جن کی خدمت میں برسوں رہی ہوں۔ جناب زینبؑ کو تاب ضبط نہ رہی۔ چہرے سے بال ہٹا کر فرمایا ام حبیبہ! انا زینبؑ (میں ہی تو زینبؑ ہوں) جونہی ام حبیبہ نے غور سے دیکھا پہچان گئی سر و سینہ پیٹ کر بولی "ہائے دختر زہرا اور بلوائے عام۔ ہائے میری شہزادی اور یوں کھلے سر اونٹ پر سوار

اے لوگو! یہ کیا انقلاب دُنیا میں آگیا۔ اے آسمان تو کیوں نہ پھٹ پڑا۔ اے زمین تو کیوں نہ شق ہوگئی ہے ہے نبیؐ کا کنبہ اس مصیبت میں گرفتار ہے ہے مجھے کیا خبر تھی کہ میری شہزادیاں قید کر کے لائی جا رہی ہیں! کاش! میں اندھی ہو جاتی اور اپنی شہزادی کی یہ حالت نہ دیکھتی۔ پھر جناب زینبؑ سے کہنے لگی۔ اے میری شہزادی میں تیری غربت اور بے کسی کے نثار۔ یہ تو بتاؤ میرے سید و مولا امام حسینؑ کہاں ہیں۔ ابوالفضل العباس قمرِ بنی ہاشم کہاں ہیں، شبیہ پیغمبر علی اکبر کہاں ہیں کہ دشمنوں نے اس طرح آپ کو قید کیا ہے۔ جناب زینبؑ نے ایک آہ سرد دلِ پُردرد سے کھینچی اور فرمایا۔ اُم جلیبہ کس کو پوچھتی ہے۔ قتل الحسینؑ بکربلا ذبح الحسین بکربلا۔ اے اُم جلیبہ کس کس کا نام لوں۔ روزِ عاشورہ صبح سے لے کر شام تک بھرے گھر کی صفائی ہوگئی ایک دن میں بہتّر جنازے ہمارے گھر سے نکل گئے۔ آہ! پنجتن پاک کا خاتمہ ہوگیا۔ زینبؑ بے والی و وارث ہو کر اعدائے دین کے ہاتھوں قید ہوگئی۔ اے جلیبہ اگر تجھ سے ہوسکے تو چند چادریں ہم بے کسوں کو لا دے تاکہ اپنے سر چھپا لیں آہ! ہم پر نامحرموں کی نگاہیں پڑ رہی ہیں اور ہم زمین میں گڑے جا رہے ہیں۔

یہ سن کر اُم جلیبہ روتی پیٹتی اپنے گھر پہنچی اور چند چادریں لا کر سیدانیوں کو دیں۔ آہ مومنین شمر نے جو دیکھا کہ اسیروں کو چادریں دی گئی ہیں تو اس نے نیزہ بردار سپاہیوں کو حکم دیا کہ نیزوں کی نوکوں سے ان سب کی چادریں چھین لو" آہ کیسے سنگ دل اور بے رحم تھے وہ ظالم کہ غصّہ میں بھر کر نیزوں کی انیاں ان بیکسوں کے جسموں میں چبھونے لگے۔ یہاں تک کہ تکلیف سے بے چین ہو کر ان سب بی بیوں نے اپنی اپنی چادریں پھینک دیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

پچیسویں مجلس

تفسیر آیہ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ اور روایت عبداللہ بن عفیف اور رہبر حضرت مسلمؑ

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ
وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ
وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ
كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝۱۶۴

(۲/۱۶۴ نساء)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور دریا میں کشتیوں کے چلنے میں جو لوگوں کے لیے نفع کی چیزیں (مال تجارت) لے کر چلتی ہیں اور پانی میں خدا نے جو آسمان سے برسایا جس سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد جلا دی (شاداب کردیا) اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادل میں جو آسمان زمین کے درمیان حکم خدا سے گھرا رہتا ہے۔ عقل والوں کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

زمین صنعت صانع کا بہترین مظہر ہے۔ بظاہر اس میں آثارِ حیات نہیں پائے جاتے لیکن غور کی نظر سے دیکھو تو ایک جاندار میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس میں بھی موجود ہیں۔ سورج بمنزلہ حرارت غریزی کے کام کر رہا ہے۔ ہوائیں اس کا سانس ہیں۔ سمندر اس کا قلب ہے جہاں سے ہر طرف کو پانی کھینچا

رہتا ہے اور دریا بڑی بڑی رگیں ہیں اور نالہ نہریں چھوٹی چھوٹی نسیں ہیں۔ پہاڑ ہڈیاں ہیں تو نباتات بال قوت نامیہ بمنزلہ روح ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ بمنزلہ جگر۔ اس کے طبقات بمنزلہ معدہ چاند اور سورج دو آنکھیں ہیں۔ زلزلہ اس کی حرکت۔ غار اس کے بدن کے مسامات ہیں۔ اس کو موت بھی ہے اور حیات بھی۔ امراض بھی ہیں اور شفا بھی۔ اس آیت میں خداوند عالم نے یہ خبر دی ہے کہ جب زمین مر جاتی ہے تو ہم اس کو آسمان سے پانی برسا کر زندہ کر دیتے ہیں۔ زندگی کی علامت یہ ہے کہ اس کے اندر قوتِ نامیہ جوش مارنے لگتی ہے۔ اور وہ لکھوکھا تخم جو اس کے اندر امانات رکھے ہوئے ہیں۔ پانی برستے ہی پھوٹ نکلتے ہیں۔ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں سے آئے۔ ہوا اپنے دامنوں میں بھر بھر کر لاتی ہے اور زمین اپنے اندر امانت رکھتی جاتی ہے۔ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی کہ زمین کے سینہ میں کیا کیا چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن جونہی پانی کا ایک چھینٹا آتا ہے ان سب خزانوں پر سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ شاخیں جھکنے لگتی ہیں۔ پھول کھلنے لگتے ہیں پانی کی رو نے بات کہتے کہتے ایک طلسم خانہ کھول ڈالا۔

یہ قوتِ نامیہ کی تمیز ہے کہ ایک چھوٹے سے قطعہ زمین میں ہزاروں قسم کے بیج پھوٹ رہے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ ذرا چوک جائے اور ایک کا پھل پھول دوسرے میں لگا دے۔ ہر دانہ سے نگاہ لڑی ہوئی ہے اور جس بیج سے جیسا پودا مخصوص ہے۔ شروع سے آخر تک ویسا ہی چلا آ رہا ہے۔ اسی کا پھول اسی کا رنگ ذرا چوک نہیں، ذرا بھول نہیں۔ نہ ذائقہ میں نہ رنگ میں اختلاف۔ ہر دانہ کی تفصیلی حالت اس کو معلوم ہے۔ اور یہ ایک ایسا علم ہے کہ کبھی اس میں بھول کر بھی غلطی واقع نہیں ہوئی۔ آج تک کبھی نیم کے درخت میں انگور نہ پھلے۔ انگور کی بیل میں نبولیاں نہ آئیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ قوت نامیہ کے پردے میں کوئی حکمت مطلقہ اپنی صنعت نہیں دکھا رہی۔ جو زمین ایک مدت سے مُردہ پڑی تھی۔ پانی نے اس کے اندر جاتے ہی ایک ایسی روح پھونک دی۔ کہ اب کوئی طاقت اس کی بڑھتی ہوئی قوت کو روک نہیں سکتی۔ بیج کی اندر موجود خوردبینی درخت خود جانتا ہے کہ اسے زمین سے کیا لینا ہے۔

ذرا دیکھنا نباتات میں جا کر پانی نے کیا کیا رنگ بدلے۔ کھجور میں شیرہ بن کر آیا۔ انگور سے رس بن کر ٹپکا۔ پھولوں میں شہد۔ چھوٹی سی مکھی کو وحی کی تو پہاڑوں میں مکانوں کی چھتوں میں اپنا چھتہ بنا۔ اس خدائی اشارے کو پاتے ہی ننھی سی جان خوشبودار اور میٹھے پھل پھول سونگھنے نکل پڑی۔ کہیں سے موم کہیں سے رس لے کر اُڑی اور پہاڑوں درختوں اور چھتوں میں اپنی چھالیں لٹکا دیں اور ان میں وہ وہ عجیب و غریب گھر بنائے کہ مہندس عقل ان کو دیکھ کر چکرا گیا۔ پیمانہ اور پرکار سے وہ

زاویے نہیں بن سکتے۔ جو اس نے اپنے منہ سے بنا کر رکھ دیئے۔

اب ذرا اس کے انتظامات کو دیکھئے۔ سینکڑوں مسدّس۔ اضلاع کے گھر بنائے۔ پھر گھروں میں جانے کے راستے بنائے۔ کیا ممکن کسی گھر کی لمبائی و بلندی طول و عرض صورت و شان میں بال برابر فرق تو آجائے۔

موم کا گھر تھا مگر آندھیاں اٹھ اٹھ کر اور تیز ہوائیں چل چل کر رہ گئیں۔ سورج اپنی پوری تیزی سے چمکتا رہا۔ مینہ موسلا دھار زور سے برستا رہا۔ مگر اس طلسم ہوش ربا کا ایک گوشہ نہ ٹوٹ سکا بغیر بادشاہ کے چونکہ اتنے بڑے تمدّن کا انتظام ممکن نہ تھا لہٰذا خدا کی طرف سے ان پر ایک بادشاہ مقرر ہوا جس کو یعسوب کہتے ہیں۔ یہ بلحاظ جسم و فہم و فراست ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ چونکہ مکھیوں پر خدا کی طرف سے اس کی اطاعت فرض ہے۔ لہٰذا وہ سب اس کے حکم کو بے چوں و چرا مانتی ہیں اور کبھی ایسا نہیں کرتیں کہ اس کے مرنے کے بعد اجماع کر کے اپنے میں سے کسی کو بادشاہ بنا لیں۔ بلکہ اسی کے خاندان میں سے ان ہی صفات رکھنے والے کو اس کا جانشین اور پیشوا مان لیتے ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے تو اس بارہ میں اتنے محتاط اور حضرت انسان اتنے کج فہم کہ اپنی ہدایت کے لیے بجائے کسی منصوص من اللہ کو امام ماننے کے اپنے میں سے کسی ایسے شخص کا انتخاب کر کے اپنا پیشوا بنا لیتے ہیں۔ جس کو ان صفات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو خدا کے معین کردہ امام میں ہوا کرتے ہیں

امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک لقب یعسوب الدین بھی ہے یعنی آپ کا مرتبہ جماعت مسلمین میں وہی ہے جو شہد کی مکھیوں میں یعسوب کا ہے۔

یعسوب کی اطاعت شہد کی مکھیوں پر فرض ہے اسی طرح امیرالمومنین علیہ السلام کی اطاعت تمام مکھیوں پر فرض ہے جس طرح یعسوب النحل کو اللہ نے جسمانی طاقت اور علم و فہم میں تمام مکھیوں پر تفضیلت دی ہے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کا مقابلہ بھی کوئی زور بازو اور علم و فہم میں نہیں کر سکتا۔ اسی وجہ سے خدا اور رسولؐ نے آپ کو تمام مسلمانوں پر امیر بنایا تھا۔ عہد رسالت کا کوئی غزوہ ایسا نہ تھا جو حضرت علی علیہ السلام کے زور بازو سے فتح نہ ہوا ہو۔

جناب علی علیہ السلام نے نہ کبھی کسی لڑائی میں فرار کیا اور نہ کسی سریہ میں آپ کسی سردار کے ماتحت بن کر کبھی نکلے برخلاف اور لوگوں کے کہ وہ کبھی امیر تھے کبھی مامور اس کی وجہ یہ تھی کہ سوائے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے اور کسی کی شجاعت اور پرخلوص نصرت دین پر آنحضرتؐ کو کافی بھروسہ نہ تھا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کے علم اور شجاعت کے متعلق چند باتیں اس مجلس میں بیان کرتے ہیں

علم کے متعلق تو بالاختصار اتنا کافی ہے کہ قرآن میں آپ کے علم کی یوں تعریف کی گئی ہے وَيَقُولُ

(۱) الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿۴۳﴾ (۱۳/۴۳ رعد)

اے رسولؐ کافر لوگ کہتے ہیں تم پیغمبر نہیں ہو تو تم اُن سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان میری رسالت کی گواہی کے واسطے خدا اور وہ شخص جس کے پاس آسمانی کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔

(۲) إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ﴿۱۲﴾ (۳۶/۱۲ سورہ یٰس)

ہم ہی مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو عمل انہوں نے کیے ہیں اور دُنیا میں جو آثار چھوڑے وہ سب ہم لکھ لیتے ہیں اور امام مبین میں گھیر دیا ہے۔

(۳) هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿۷﴾ (۳/۷ عمران)

خدا وہ ہے جس نے کتاب نازل کی اس میں بعض آیات محکم ہے یعنی بہت صریح ہیں وہی عمل کرنے کے لئے اصل (بنیاد) کتاب ہیں اور کچھ آیات متشابہ (گول گول جس کے معنی میں سے پہلو نکل سکتے ہیں) بس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان ہی متشابہ آیات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ (دین) میں فساد برپا کریں۔ اس خیال سے انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لیں۔ حالانکہ خدا اور ان لوگوں کے سوا جو علم میں بڑے پایہ پر فائز ہیں اُن کا اصلی مطلب کوئی نہیں جانتا۔ وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے جو سب محکم ہو یا متشابہ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور عقل والے ہی سمجھتے ہیں

(۴) اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا

اب رہی امیر المومنین علیہ السلام کی شجاعت تو اس کے مفصّل بیان کرنے کے لیے بڑا وقت درکار ہے ۔ چند واقعات بالاختصار بیان کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

۱۔ اوّل شب ہجرت آپ نے وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی جس کی نظیر صفحات تاریخ پر ڈھونڈے بھی نہیں ملتی وہ جتنی خوفناک رات تھی ۔ آپ اتنے ہی زیادہ اطمینان سے سوئے تھے ۔

۲۔ جنگ بدر میں وہ حیرت انگیز شجاعت دکھائی کہ دشمن کے ہوش اُڑ گئے ۔ اس جنگ میں ستّر کفار مشرکین مسلمانوں کے ہاتھوں سے مقتول ہوئے ۔ ان میں سے اس تعداد کا نصف یعنی ۳۵ صرف حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں سے مقتول ہوئے ۔

۳۔ جنگ احد میں تو اسلام کی فتح ہی حضرت علی علیہ السلام کی بدولت ہوئی ۔ اس جنگ میں آپ نے وہ غیر معمولی بہادری دکھائی ۔ کہ دشمن کی فتح یک بیک شکست میں بدل گئی اور اس شجاعت کی تعریف میں مابین زمین و آسمان میں یہ صدا بلند ہوئی ۔

لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوْالْفِقَارِ

یہ کوئی معمولی معرکہ نہ تھا ۔ مشرکین اپنی طاقت سے کام لے رہے تھے اور مسلمانوں کو بدحواسی نے کچھ اس طرح آگھیرا تھا ۔ کہ بڑے بڑے مدعیان شجاعت سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے چلے جا رہے تھے یہانتک کہ بعض تو ایسے خوفزدہ ہوئے کہ پہاڑ پر جا چڑھے ۔

دشمنوں نے حضرت رسولؐ خدا پر چاروں طرف سے حملے کئے یہانتک کہ آپ کے دندان مبارک بھی شہید ہو گئے اور کفار نے یہ شور مچایا کہ محمدؐ قتل ہو گئے ۔

اگر اس نازک وقت میں حضرت علی علیہ السلام مدد نہ کرتے اور خون کے پیاسے دشمنوں کو حضورؐ کے پاس سے مار کر نہ ہٹاتے تو اس روز مشرکین شمع رسالتؐ و ہدایت کو ضرور گل کر دیتے ۔ حضرت علی علیہ السلام نے دشمنوں کا نہایت دلیری سے مقابلہ بھی کیا اور آنحضورؐ کی حفاظت بھی کی ۔

۴۔ جنگ خندق میں تو امیر المومنین علیہ السلام نے زور بازو سے وہ بے نظیر خدمت اسلام کی ، کہ حضرت رسولؐ خدا کو یہ فرمانا پڑا

ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَۃِ الثَّقَلَیْنِ ۔

(علیؑ کی وہ ضربت جو روزِ خندق عمرو بن عبدود پر پڑی جو دو جہان کی عبادت سے بہتر ہے ۔)

یہی وہ لڑائی تھی کہ جب حضرت علی علیہ السلام عرب کے مایۂ ناز پہلوان عمرو بن عبدوُد کے مقابلے کو نکلے تو حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا:

بَرَزَ الْاِیْمَانُ کُلُّہٗ اِلَی الْکُفْرِ کُلِّہٖ

آج پورا ایمان پورے کفر کے مقابل جا رہا ہے۔

اللہ اکبر جس شخص کو زبان رسولؐ کل ایمان کہے اس کو مسلمان چوتھے درجے پر [illegible] لوگوں کو مقدم کر دیں جنہوں نے نصرتِ اسلام میں کبھی کافروں پر تلوار ہی نہ اٹھائی تھی۔ [illegible] جنگ میں کبھی جم کر لڑے ہی نہ تھے۔

۵۔ حنین کا معرکہ بھی علیؑ کے زور بازو سے فتح ہوا باوجودیکہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن جب دشمن کی زد پر آئے تو ایسا میدان چھوڑ کر بھاگے کہ رسولؐ پکارتے رہ گئے۔ مگر انہوں نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا۔ اگر علی علیہ السلام نہ ہوتے تو مسلمانوں کو وہ شکست فاش ہوتی کہ مدت العمر منہ دکھانے کو جگہ نہ ہوتی۔

جنگ خیبر کے متعلق صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ انیس روز متواتر اسلام کے تمام نامی گرامی سردار باری باری کفار کے مقابل زور آزما ہوئے۔ لیکن ہر ایک سردار کو سوائے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار جب رسولؐ خدا پریشان خاطر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا۔

"کہ میں کل اپنا علم اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو کرار غیر فرار ہوگا اور وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے وہ معرکۂ جنگ سے ہرگز نہ پلٹے گا جب تک خدا اس کے ہاتھوں پر فتح نہ دے۔ چنانچہ دوسرے روز جب آپ نے علم نصرت شیم حضرت علیؑ کو عطا فرمایا تو آپ نے پہلے ہی روز اس معرکہ کو سر کر لیا۔ حضرت علی علیہ السلام کی عدیم المثال شجاعت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوگا کہ رسولؐ نے کرار غیر فرار فرمایا:

چونکہ حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے کافروں کے بہت سے خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ اس لیے ان بہت سے نام نہاد مسلمانوں کو جن کے بزرگ علی علیہ السلام کی تلوار سے جنگ بدر و احد خندق اور خیبر حنین اور دوسرے غزوات میں قتل ہوئے تھے ان خاندانوں کو اہلبیتؑ اور خاص کر جناب امیر علیہ السلام سے سخت عداوت تھی۔ خاص کر بنی اُمیّہ اور ان میں بھی خاص کر اولاد ابوسفیان جو بدر و احد کے کفار مقتولوں کا انتقام لینے کو تُلی بیٹھی تھی۔ یہ عداوت صرف علی علیہ السلام

کی ذات ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ جب تک بنی اُمیہ کا اقتدار دنیا میں باقی رہا۔ یہ بدبخت اولادِ علی علیہ السلام کے گلے تلواروں سے کاٹتے ہی رہے۔

اس منحوس خاندان کے دو بدنام ترین شخص یزید اور ابن زیاد ولد الحرام کو اولادِ علیؑ سے اتنی سخت عداوت تھی کہ جب کوئی سیّد یا ان کا کوئی دوست مرتا تھا تو یہ مردود الحمد للہ کہہ کر مسکراتا تھا انتہا یہ ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کے قتل کی خبر اس شقی کو کوفہ میں پہنچی تو پہلے سجدہ شکر ادا کیا پھر اپنے غلاموں اور کنیزوں کو حکم دیا کہ دارالامارہ کو اس طرح سجائیں جس طرح عید کے موقعہ پر سجایا جاتا ہے اور اربابِ نشاط کو حکم دیا کہ رقص و سرور کے لیے آمادہ ہوں۔ دوسرے روز جب یہ خبر پہنچی کہ اہل حرم کو اسیر کر کے کوفہ میں لا رہے ہیں تو اس شقی نے تمام شہر کی آئینہ بندی کا حکم دیا اور اعلان کیا کہ سب لوگ جامع مسجد میں جمع ہوں۔ مجھے کچھ ضروری باتیں کہنا ہیں۔

لکھا ہے کہ جناب عبداللہ بن عفیف کوفی جناب امیر المومنین علیہ السلام کے بڑے کامل الایمان صحابی تھے۔ ان کی ایک آنکھ جنگ جمل میں جاتی رہی تھی اور دوسری جنگِ صفین میں۔ جب سے نابینا ہوئے تھے شب و روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے عبادتِ خدا کیا کرتے تھے۔ جب کوفہ میں اہل حرم کے ورود کی دھوم مچی۔ اور ابنِ زیاد کا یہ اعلان ہوا تو بہت گھبرائے کہ یکایک ایسا کیا حادثہ ہوا کہ شہر بھی سج رہا ہے اور اعیان کوفہ کو بھی بلایا جا رہا ہے۔ باوجودیکہ نابینا تھے پھر بھی مسجد میں پہنچے۔ ابن زیاد نے خطبہ پڑھنے کے بعد کہا۔

ایہا الناس! تم کو مبارک ہو کہ ہم نے کربلا میں حسین بن علیؑ کی مہم کو بخیر و خوبی سر کر لیا ہے اب ان کی عورتیں اسیر ہو کر کوفہ آ رہی ہیں۔ تم سب کو چاہیے کہ اس خوشی میں پوری طرح حصہ لو اور اپنے اپنے گھروں کو اچھی طرح سجاؤ جس طرح عید کے موقعہ پر آراستہ کیا کرتے ہو۔

یہ سن کر عبداللہ بن عفیف بے چین ہو گئے۔ اور غصہ سے تھر تھر کانپنے لگے کھڑے ہو کر فرمایا۔

"اے شقی! تجھ پر لعنتِ خدا ہو۔ تو نبیؐ کے نواسے کو قتل کر کے اس کی خوشی منا رہا ہے او ملعون تیرا قتل واجب ہے۔ یہ کہہ کر تلوار سونت لی۔ اور اس شقی کے قتل کے ارادے سے بڑھے۔ اگر ابن زیاد کا غلام اور اس کے ارکانِ سلطنت بیچ میں حائل نہ ہو جاتے تو عبداللہ نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

ابن زیاد پر کچھ ایسا خوف غالب ہوا کہ وہ فوراً منبر سے اُتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے غلام عبداللہ

پر حملہ آور ہوئے۔ یہ دیکھ کر ان کے قبیلے کے لوگ دوڑ پڑے اور ان کو وہاں سے بچا کر نکال لے گئے جب گھر پہنچے تو اپنی بیٹی سے جس کا سن دس یا رہ سال کا تھا اور جس کی ماں مر چکی تھی فرمانے لگے۔

"اے نور دیدہ اب وہ وقت قریب ہے کہ تیرا باپ ہمیشہ کے لیے تجھ سے جدا ہو جائے۔ اس کے بعد آپ نے تمام واقعہ بیان کیا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جناب عبداللہ سمجھ گئے کہ میری گرفتاری کے لیے لشکر ابن زیاد آ پہنچا پس آپ گھر میں سے نکل کر صحن میں آئے اور فرمانے لگے۔ اے جانِ پدر جب دشمن گھر میں گھس آئیں اور میں ان پر حملہ کروں تو تم بتاتی جانا کہ وہ میری داہنی طرف ہیں کہ بائیں طرف۔ چند منٹ نہ گذرے تھے کہ ابن زیاد کے سپاہی گھر میں گھس آئے بہادر عبداللہ تلوار کھینچ کر ان کی طرف بڑھے۔ لڑکی بتاتی جاتی تھی کہ بابا اب داہنی طرف حملہ کیجئے اور اب بائیں طرف۔

چنانچہ یہ جمل و صفین کے میدانوں میں دھاڑنے والا شیر ان پر ہر طرف سے حملہ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ چند اشقیا کو مار کر زمین پر ڈال دیا۔ آخر بیچارے کہاں تک لڑتے اول تو ضعیفی پھر نابینا ایک شقی نے موقعہ پاکر تلوار سر پر ماری کہ جناب عبداللہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ آہ! آہ!! ان ظالموں نے فوراً تلواروں میں دھر لیا اور اس عاشقِ اہل بیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ یتیم عبداللہ بے تابی سے باپ سے لپٹ رہی تھی اور رو رو کر کہہ رہی تھی۔

او ظالمو! او بے حیاؤ! تمہیں شرم نہیں آتی۔ کہ ایک تن تنہا پر سب ٹوٹ پڑے ہو۔

ان ظالموں نے اس بچی کو گرفتار کر لیا اور جناب عبداللہ بن عفیف کا سر کاٹ کر ابن زیاد کے پاس لے گئے۔

آہ! مومنین مجھے اس وقت ایک اور بچی یاد آ گئی وہ حضرت مسلم بن عقیل کی چھوٹی صاحبزادی ہیں لکھا ہے کہ جب اہلِ حرم کا لٹا ہوا قافلہ کوفہ کے اس دروازے کے قریب پہنچا جہاں مسلم بن عقیل کا سر مبارک لٹکا ہوا تھا تو اس بچی نے اپنی ماں سے بے چین ہو کر کہا۔ اماں جان میں اس وقت اپنے بابا جان کی یاد اپنے دل میں پا رہی ہوں۔ اور ان کی خوشبو بھی میرے دماغ میں آ رہی ہے کیا میرے پیارے بابا جان مجھ سے قریب ہیں۔ خدا کے لیے مجھے جلد ان سے ملاؤ۔ یہ سن کر ماں کے دل پر چھری چل گئی۔

کہنے لگیں! بیٹی تمہارے باپ کہاں زندہ ہیں کہ ان سے ملو گی۔ آہ! ظالم کوفیوں نے قتل کر ڈالا ان کی لاش کو گلی کوچوں میں گھسیٹا بیٹی! تیرے بابا مظلوم کا سر ہے جو سامنے دروازہ پر لٹکا ہوا ہے۔ یہ سن کر وہ بچی تڑپ گئی۔ اور وا ابتاہ وا ابتاہ کے نعرے مارنے لگی اور ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر کہنے لگی۔

"بابا میرے پاس آیئے۔ آہ! ہم پر بڑی بڑی مصیبتیں گزر گئیں۔"
اس بچی کے دردناک بین سُن کر اہل حرم میں کہرام بپا ہو گیا۔
منقول ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام کا سر قریب سرِ مسلم کے پہنچا تو دونوں سروں کے لبوں کو جنبش ہونے لگی آہ! مومنین اس وقت ہمارے آقا مظلوم نے جناب مسلم سے فرمایا ہوگا۔ اے بھائی اگر ان ظالموں نے تمہارا سر دروازہ پر لٹکایا ہے تو ہمارا سر بھی کربلا سے یہاں تک نیزہ پر چڑھا لائے ہیں۔ اگر تمہاری لاش بے گور دکفن رہی تو اے بھائی مسلم ہم کو بھی گور دکفن میسر نہ ہوا۔
منقول ہے کہ زید بن ارقم صحابیٔ رسولؐ اس وقت اپنے کوٹھے پر کھڑے تھے۔ جب اہل حرم اونٹوں پر سوار دربار ابن زیاد کی طرف جا رہے تھے۔ زید کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جب ان کی نظر اسیرانِ حرم پر پڑی تو ایک آہ سرد کھینچ کر ایک بی بی سے پوچھنے لگے۔ تم کس قوم و قبیلہ کے لوگ ہو۔ فاشارت الی علیؑ بن الحسینؑ ان بی بیوں نے بیمارِ کربلا کے اونٹ کی طرف اشارہ کرکے بتایا ان سے پوچھو۔ جب امام زین العابدین علیہ السلام کا اونٹ قریب زید کے پہنچا تو انہوں نے حضرتؑ سے پوچھا۔
من ایّ قبیلہ انتم۔ اے قیدیو! تم کس قبیلہ و قوم سے ہو۔ حضرتؑ نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ کیا تم نے قرآن پڑھا ہے زیدؓ نے کہا جی ہاں۔ حضرت نے پوچھا سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت بھی پڑھی ہے۔ وآت ذوالقربیٰ حقہ۔ رسولؐ کے ذوالقربیٰ کو ان کا حق دو۔ زید نے کہا جی ہاں کیا وہ لوگ آپ ہی ہیں۔ جن کے حق ادا کرنے کا خدا نے ہم کو حکم دیا ہے۔
حضرتؑ نے فرمایا ہاں وہ ہم ہی ہیں۔ زیدؓ نے پوچھا آپ کا نام کیا ہے؟ یہ سُن کر حضرت نے سر جھکا لیا اور نیچی آواز میں فرمایا:
میں علیؑ بن الحسین ہوں۔ یہ سنتے ہی زید تڑپ گئے اور کہنے لگے۔
این ابن سیدی و مولای ابوعبد اللہ الحسینؑ
میرے سید و مولا ابوعبداللہ الحسین کہاں ہیں؟
حضرتؑ نے فرمایا:
اے زید فرزند رسولؐ کربلا میں تین روز کے بھوکے پیاسے قتل کر دیئے گئے۔ یہ سامنے نیزۂ طویل پر ان کا سر جا رہا ہے۔ ہم سب ان کی شہادت کے بعد قید کر لیے گئے۔ اے زید ھذہ بنات رسولؐ یہ رسولؐ زادیاں ہیں جو جا بجا سر برہنہ شتران بے کجاوہ و عماری پر تشہیر کی جا رہی ہیں۔
یہ سُن کر زید نے ایک آہ کا نعرہ مارا اور سرِ امام مظلومؑ کے پاس جا کر کہنے لگے۔ السلام علیک

يَا اَبَا عَبْدَ اللّٰهِ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللّٰه۔ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا علیکؑ السلام یَا زیدؓ۔

زیدؓ کہتے ہیں کہ زار زار رو رہا تھا اور حسرت سے سرِ حسینؑ کو تک رہا تھا۔ ناگاہ میں نے دیکھا کہ حضرت کے لب ہائے مبارک جنبش میں آئے۔ میں نے خیال کیا اس وقت حسینؑ اپنے قاتلوں کے لیے بد دعا کر رہے ہوں گے۔ لیکن جب کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ آپ سورۂ کہف کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ بیشک اے حسینؑ! آپ کا واقعہ اصحاب کہف کے واقعے سے زیادہ عجیب ہے اور بیشک آپ کے جد نے صحیح کہا ہے کہ قرآن اہل بیتؑ کے ساتھ ہے اور اہل بیتؑ قرآن کے ساتھ ہیں۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰالِمِيْنَ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۲۷/۲۶

چھبیسویں مجلس

تفسیر آیۂ اِذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت

داخلہ اہل حرم دربار ابن زیاد ملعون میں

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

(۲ بقرہ ۱۲۷/۲ - ۱۲۹)

جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانۂ کعبہ کی دیواریں بلند کر رہے تھے تو خدا سے یہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر لینا تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم دونوں کو اسلام کے راستہ پر ثابت قدم رکھنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ لوگوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کر لے بیشک تو بڑا توبہ کا قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے اس اُمت مسلمہ میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ کر دے۔ بیشک تو غالب اور

اور صاحب تدبیر ہے۔

یہ دعا جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر اس وقت آئی تھی۔ جب انہوں نے خانہ کعبہ کی عمارت بنانی شروع کی تھی۔ دونوں باپ بیٹے دل میں بہت خوش تھے کہ ہم خالق کائنات کا گھر بنا رہے ہیں۔ کام کی عظمت سمجھتے ہوئے اس کی اُجرت پانے کی بھی دل میں اُمنگ تھی۔ جانتے تھے کہ جواد و کریم کی سرکار ہے۔ منہ مانگی مراد ملے گی۔ نبی و رسولؐ پیسے کے تو لالچی ہوتے نہیں کہ سونے چاندی کے پہاڑ مانگ لیتے وہ تو ایسی چیزیں مانگا کرتے ہیں جس سے خدا پرستوں کا بھلا ہو۔ ذرا دیکھنا اپنی محنت کی اُجرت حضرت ابراہیمؑ نے کس کس شان سے مانگی ہے واللہ روح ایمان وجد کرتی ہے اور معرفت جوش میں آ کر سر دھنتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کام بھی کرتے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ بارگاہ الٰہی میں اپنی درخواستیں بھی پیش کرتے جاتے تھے۔ ذرا درخواستوں کا مضمون توجہ سے سنیئے اور لطف اُٹھائیے۔

۱۔ پہلی درخواست

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

(۱۲۹/۱۲۷/۲ بقرہ)

جب ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو خدا سے یہ دُعا کر رہے تھے کہ ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر لینا تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم دونوں کو اسلام کے راستہ پر ثابت قدم رکھنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ لوگوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کرلے۔ بیشک تو بڑا توبہ کا قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے اس اُمتِ مسلمہ میں سے ایک رسولؐ کو بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور

حکمت کی تعلیم دے۔ ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ کردے۔ بے شک تو غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

پہلے اس درخواست کا مطلب سمجھ لیجئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسلام بتا رہا تھا یعنی خدا نے ان سے کہا (اَسْلِمْ۔ اسلام لے آؤ) قال اسلمت لرب العالمین۔ میں رب العالمین پر ایمان لے آیا) حضرت ابراہیمؑ چاہتے تھے کہ میری خاص اولاد بھی اسی طرح بلا واسطہ اسلام رکھنے والی یعنی وہ خدا کے مسلمان کئے ہوئے دنیا میں آئے ہوں۔ یہ درخواست جب منشی قضا و قدر کے ہاتھ میں پہنچی تو سرکار الٰہی سے حکم ہوا کہ اسے فائل میں لگا دو۔ جب وقت آئے گا۔ جواب دے دیا جائے گا۔

۲۔ دوسری درخواست:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۲/۱۲۹ بقرہ)

ترجمہ:۔ اے ہمارے پالنے والے مکّہ والوں میں ان ہی میں سے ایک رسولؐ کو بھیج جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور آسمانی کتاب اور عقل کی باتیں سکھائے اور ان کے نفوس کو پاکیزہ کردے بیشک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

(۲/۱۲۹ بقرہ)

جب ابراہیم و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے تو خدا سے یہ دعا کر رہے تھے کہ ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول کر لینا تو بڑا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم دونوں کو اسلام کے راستہ پر ثابت قدم رکھنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ لوگوں کو بھی اپنا فرمانبردار بنائے رکھنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کے مقامات دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے پالنے والے اس امت مسلمہ میں سے ایک رسولؑ کو بھیج جو ان کو تیری آئتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دے ان کے نفوس کو پاک و پاکیزہ کردے۔ بے شک تو غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

مطلب اس درخواست کا یہ ہے کہ وہ رسول امت مسلمہ کے درمیان مبعوث ہو کر ہدایت کرے

کفار کے درمیان مبعوث نہ ہو۔ یعنی اس رسول کی بعثت سے پہلے وہ اُمّت مسلمہ موجود ہونی چاہیے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے جو صفات اس رسول کی جناب ابراہیم علیہ السلام نے مانگی ہیں ان کو لفظ بلفظ یاد رکھیے۔ تاکہ جواب میں لطف آئے۔

منشی قضا و قدر نے یہ درخواست بھی سرکار الٰہی میں پیش کی۔ حکم ہوا اسے بھی فائیل کر دو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

۳۔ تیسری درخواست:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۳۵/۱۴ ابراہیم)

مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچائے رکھنا۔ یعنی میری ذرّیت جو اُمّت مسلمہ کے نام سے موسوم ہو۔ کبھی آن واحد کے لیے اپنا سر کسی بُت کے سامنے نہ جھکائے۔ اس درخواست کو بھی فائیل میں لگانے کا حکم ہوگیا۔

۴۔ چوتھی درخواست:

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (۸۴) (۸۴/۲۶ شعرا)

آخر زمانہ میں مجھے ایک سچی زبان بھی دینا۔

یعنی جب کچھ جھوٹے اپنے کو صادق اور صدیق کہلانے لگیں تو میری اولاد میں سے کچھ ایسے لوگ ہوں جو لسان صدق کہلانے کے اہل ہوں۔

یہ درخواست بھی فائل ہوگئی۔

۵۔ پانچویں درخواست:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۲۶) ۲/۱۲۶ بقرہ

اپنے اس گھر کے اہل کو ثمرات کا رزق بھی دینا۔ ثمرات سے اہل ظاہر ہوتو پھل پھلواری ہی مراد لیتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے جلیل القدر نبی کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ وہ آم امرود اور سیب دنیا کے لیے سرکار الہٰی سے درخواست کرے بلکہ ثمرات سے آپ کی مراد ثمرات فواد یعنی اولاد ہے۔ حکم ہوا کہ یہ بھی قائل کر دو۔

۶۔ چھٹی درخواست:

رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجۡعَلۡ أَفۡـِٔدَةٗ مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهۡوِيٓ إِلَيۡهِمۡ وَٱرۡزُقۡهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُونَ ﴿٣٧﴾ ۳۷/۱۴ ابراہیم

ترجمہ:۔ اے ہمارے پالنے والے میں نے تیرے معزز گھر کعبہ کے پاس ایک ویران بیابان مکہ میں اپنی کچھ اولاد کو بسایا ہے تاکہ اے ہمارے پالنے والے یہ لوگ برابر نماز پڑھا کریں تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انہیں ثمرات کا رزق عطا کر تاکہ یہ تیرا شکر ادا کریں اور لوگوں کے دل اس گھر کے وارثوں کی طرف مائل کر دینا۔ یہ درخواست بھی بدستور سابق قائل ہو گئی

حضرت ابراہیمؑ جب خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو جواد مطلق خدا کو یہ پسند نہ آیا کہ ابراہیم علیہ السلام کی ساری مزدوری ادھار ہی رہے اور یہ یوں ہی ہاتھ جھاڑتے گھر کو چلے جائیں تو کچھ اس وقت بھی ملنا چاہیے۔ لہذا پیغام پہنچا۔

وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٖ فَأَتَمَّهُنَّۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامٗاۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِيۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي ٱلظَّـٰلِمِينَ

(سورہ البقرہ ۲/۱۲۴)

اے ابراہیمؑ! میں تم کو لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔ یہ سن کر ابراہیم علیہ السلام باغ باغ ہو گئے اور ساتویں درخواست اور پیش کی۔

۷۔ ساتویں درخواست:

وَمِن ذُرِّيَّتِي (اور میری اولاد میں سے بھی امام بنائے گا؟) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سرکار

الٰہی سے کسی عہدے سے ملے۔ عبد ہوئے۔ نبی ہوئے۔ رسول ہوئے۔ خلیل ہوئے۔ مگر کسی وقت اولاد یاد نہ آئی۔ اور جب امام بننے لگے فوراً اولاد یاد آگئی۔ غالباً اسی کی وجہ یہ ہوگی کہ نگاہ خلیل غیب سے یہ دیکھ رہی تھی کہ یہ سب عہدے کچھ دن بعد ختم ہو جائیں گے۔ البتہ امامت ایسا عہدہ ہے کہ اس کا سلسلہ تا قیامت چلنے والا ہے۔ پس سوچا کہ ایسی چیز خدا سے کیوں نہ مانگوں۔ جو ہمیشہ دنیا میں میری اولاد کے اندر باقی رہے۔

اب سنیئے ایک مدت گزر جانے کے بعد جب سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی درخواستوں کی وہ فائل پیش ہوا ایک ایک درخواست پڑھی جانے لگی اور قلم قدرت سے ان پر احکام لکھے جانے لگے۔ پہلی درخواست تھی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ الخ ۱۲۸/۲ بقرہ

حکم لکھا گیا ہے کہ درخواست اس صورت سے منظور کی جاتی ہے کہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں ایک گروہ ایسا ہی پیدا ہوگا جو بطن مادر ہی سے مسلمان پیدا ہوئے ہوں اور فعلیت اسلام پر باقی رہے ہوں اور اس آیت کے مصداق ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ ۵۳/۵۲/۲۸ قصص

ترجمہ :۔ جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا کی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے یہ پڑھا جاتا ہے تو بول اُٹھتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاچکے۔ بیشک یہ ٹھیک ہے اور ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور ہم تو اس کو پہلے سے مانتے تھے۔

دیکھا آپ نے جناب ابراہیم علیہ السلام اپنی ذرّیت کے لیے بلا واسطہ اسلام مانگ رہے تھے خدا نے ان کی ذرّیت کا وہی قول نقل کر دیا ہے جس سے ان کا بلا واسطہ اسلام لانا ثابت ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت علی علیہ السلام بعد پیدائش قرآن سُنا کیسے دیتے۔ اگر مسلمان ہی پیدا نہ ہوتے تو کعبہ میں دو دن اس خیال سے آنکھیں کیوں بند رکھتے کہ پہلی نظر بتوں پر نہ پڑے۔

اس کے بعد منشی قضا و قدر نے دوسری درخواست پیش کی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۱۲۹)

۱۲۹/۲ سورۃ البقرۃ

حکم ہوا کہ اس پر لکھ دو اور ابراہیم کو منہ مانگی مراد دے دو۔ الفاظ دعا کو ملاتے جانا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿٢﴾

(سورہ جمعہ ۲/۶۲)

وہ۔ وہ ہے جس نے مکّہ والوں میں ایک رسول کو انہی میں سے بھیجا تاکہ ان پر آیات الٰہی کی تلاوت کرے اور ان کا تزکیۂ نفس کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اگرچہ وہ پہلے سے کھلی گمراہی میں ہوں۔

کیا خدا نے اتنا ہی دیا جتنا ابراہیم علیہ السلام نے مانگا تھا؟ سخی کی شان سے یہ بعید ہے کہ مسائل کو اتنا ہی دے جتنی اس کی احتیاج ہو۔ سخی تو ہمیشہ بڑھا کر دیتا ہے غور کیجئے کہ الفاظ کے ذرا سے تغیر میں بخشش کتنی زیادہ ہوگئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ رسول ایسا ہو جو آیات کی تلاوت کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ پھر ان کے نفسوں کو پاک کرے۔ خدا نے یزکیھم کا لفظ یعلمھم الکتاب والحکمۃ سے پہلے ذکر کرکے یہ بتایا کہ ابراہیم تمہاری وہ ذرّیت ایسی ہوگی کہ اس کا تزکیہ نفس کتاب اور حکمت کی تعلیم سے پہلے ہو چکا ہوگا۔ اللہ اکبر اس صورت میں ذرّیت ابراہیمی کا مرتبہ کتنا بلند ہو جاتا ہے یہی وجہ تھی کہ حضرت رسولؐ خدا اور حضرت علی علیہ السلام نے قبل نزول قرآن جو عمل کئے وہ بالکل تعلیم الٰہی کے مطابق تھے۔

اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے کہ بعثت رسولؐ کے وقت وہ اُمت مسلمہ موجود ہونی چاہیے جس کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی یعنی ایسی اُمّت جس کا اسلام بلا واسطہ ہو۔ کم از کم ایک آدمی بھی ایسا موجود ہو تو اُمت کا اطلاق ہو جائے گا۔ کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایک فرد پر بھی اُمت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا (ابراہیم ایک امت قانت تھے) ۱۶/۱۲۰ یہی وجہ تھی کہ جب تک علی علیہ السلام پیدا نہ ہوئے تھے رسول نے اپنی بعثت کا اعلان نہ کیا۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اس اُمت مسلمہ کو خانہ کعبہ سے کیا نسبت تھی۔ جب حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ اس وقت یہ اُمت یاد آرہی تھی۔ وہ بعلم نبوت جانتے تھے کہ اس گھر میں وہی شخص پیدا ہوگا جو امت مسلمہ کا مصداق ہوگا اور جس کے درمیان رسول اپنی بعثت کا اعلان کرے گا اور رسول اسی اُمت مسلمہ کے خاندان سے ہوگا

ان ہی کا جزو ہو گا ۔ پھر یہ کہ رسول کتاب و حکمت کی تعلیم بالذات ان ہی کو دینے کے لیے مبعوث ہو گا اور ان ہی کے نفوس کا بالذات تزکیہ کرے گا ۔ کیونکہ ان کو عمل رسالت کا ایک نمونہ بنانا ہو گا ۔ رسول در حقیقت اہلبیت علیہم السلام کی تعلیم کے لیے بالذات آئے تھے اور ان کے صدقے میں تمام دنیا کی تعلیم کے لیے ۔ یہی وجہ تھی کہ عمل رسول کا نمونہ اہل بیت علیہم السلام ہی ہیں ۔ نہ کہ عام لوگ ۔ اگر یہ بات نہ ہو ۔ ابراہیم علیہ السلام کا کوئی وزن نہیں رہتا ۔

الغرض اس کے بعد تیسری درخواست پیش ہوئی ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ

هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِیْ وَ بَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۱۴/۳۵ سورہ ابراہیم

مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا ؟ اس پر یہ حکم لکھا گیا ۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ

الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ﴿۳۳﴾

۳۳/۴۴ سورۂ احزاب

دیکھا آپ نے اس آیت میں اہلبیت کا لفظ کیا مزہ دے رہا ہے ۔ جو ابراہیمؑ کے دل میں تھا ۔ وہی قدرت کی زبان ہے ۔ بیت اللہ کے بناتے وقت دعا کی تھی ۔ قدرت نے اہلبیت کا لفظ ذکر کر کے بتا دیا کہ اس گھر کے مالک کون ہیں ۔ پھر یہ بھی دیکھئے بخشش سوال سے کتنی بڑھ گئی ۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے چاہا تھا کہ اس کے گھر والے بتوں کی عبادت نہ کریں ۔ خدا نے کہا نہیں ۔ اے ابراہیمؑ میں اس گھر والوں کو ایسا بنا دوں گا کہ دنیا کی کوئی نجاست ظاہری ہو یا باطنی چھوٹی ہو یا بڑی ان کے قریب بھی نہ آئے گی ۔

اس کے بعد چوتھی درخواست پیش ہوئی ۔

رَبِّ هَبْ لِیْ حُكْمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۳﴾

وَ اجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۸۴﴾ وَ اجْعَلْنِیْ مِنْ وَّرَثَةِ

جَنَّةِ النَّعِیْمِ ﴿۸۵﴾

۲۶/۴۸ سورہ الشعراء

(پھر یہ دُعا کی) اے میرے رب مجھے علم و فہم عطا فرما اور مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر اور آخر زمانہ میں میرے لیے سچی زبان قرار دے اور مجھے جنت نعیم کے وارثوں میں سے قرار دے۔

وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۞ ۱۹/۵۰ سورۂ مریم

ہم نے ان کے لیے سچی زبان علیؑ کو قرار دیا۔ یہاں اس گھر کے اہل کا بھی ذکر کر دیا تاکہ شک و شبہ کا موقعہ ہی نہ رہے۔ جناب ابراہیم علیہ السلام نے مصلحتاً ذکر نہ کیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے کھلم کھلا بیان کر دیا۔ اگر کوئی زبان دراز کہے کہ علی کے معنی یہاں لمبی اور اونچی زبان کے ہیں تو خدا اس کی زبان قطع کرے۔ وہ جھوٹا ہے زبان کی درازی صفت مذموم ہے اور بلندی بے معنی۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پانچویں درخواست پیش ہوئی

فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ ۱۴/۳۷ ابراہیم

ترجمہ: (لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دینا) حکم ہوا اس پر لکھ دو۔ (سورۃ الشوریٰ ۴۲/۱۰)

قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۗ وَمَن يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ۞ ۴۲/۲۳ سورۃ الشوریٰ

(اے رسول) کہہ دیں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابت داروں (اہلبیتؑ) کی محبت کے سوا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اور جو نیکی کرے گا ہم اس کی خوبی میں اضافہ کر دیں گے۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا اور قدر دان ہے۔

جناب ابراہیمؑ نے یہ دُعا کی تھی کہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل کر دے۔ خدا نے کہا اے ابراہیمؑ مت گھبراؤ۔ میں نے ان کی محبت لوگوں پر واجب کر دی جناب ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ اہل بیت علیہم السلام کے دشمن بکثرت ہوں گے، اسی لیے یہ دُعا کی خدا نے ویسا ہی حکم اس پر لکھا یعنی محبت اہلبیت علیہم السلام کو تمام مسلمانوں پر واجب کر دیا تاکہ محبت نہ کرنے والوں کو اس جرم میں دوزخ کا کندہ بنا دے۔ فی القربیٰ کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن میں رسول مبعوث ہوا ہے۔ اور جو بمنزلہ اس کے جزو کے ہیں۔

اس کے بعد ساتویں درخواست کا نمبر آیا وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ (اور میری ذریت سے بھی امام بنائے گا) حکم ہوا اس کا جواب لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِيْنَ (میرے عہد نامہ کو ظالم نہیں پا سکتے) جناب ابراہیمؑ کا یہ سوال اسلیے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ جب یہ امت مسلمہ دنیا میں ہو گی۔ تو کچھ ظالم ادعائے امامت کریں گے۔ پس لسان قدرت سے اس کے متعلق نفی کا حکم سنوانا چاہتے تھے۔ باری تعالیٰ نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ ظالم تک یہ چیز نہیں پہنچ سکتی اے ابراہیمؑ! تمہاری اولاد میں امام ہوں گے اور سب معصوم ہوں گے ظالموں سے عہدۂ امامت کا تعلق نہ ہوگا اگر ظالم امام ہوں گے تو وہ بندوں کے بنائے ہوئے ہوں گے۔

اس کے بعد دریائے الہیٰ جوش میں آیا اور حکم ہوا کہ جتنی ہماری رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ سب ہمارے خلیل کے دونوں بیٹوں پر تقسیم کر دو۔ تاکہ کسی کو شکایت کا موقعہ نہ رہے۔ اب ذرا اس تقسیم کامل کو دیکھنا۔

نبوت اس میں دونوں بھائیوں کی اولاد شریک ہے فرق اتنا ہے کہ اولاد اسحٰقؑ میں بہت سے نبی گزرے اولاد اسمٰعیلؑ میں صرف ایک۔ بظاہر ایک کا پلہ ہلکا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن ختم کا وزن بڑھا کر دونوں پلّے برابر کر دیئے ان سب کا زمانہ نبوت بحیثیت مجموعی اتنا طولانی نہیں جتنا ختم الانبیاؐ کی نبوت کا ہے۔ بظاہر تقسیم مساوی نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن بڑے بھائی کا حق چونکہ زیادہ ہے لہٰذا اولاد اسمٰعیل علیہ السلام کو یہ شرف بخشا گیا۔

آسمانی کتابیں بھی دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک طرف انبیاؑ و مرسلین زیادہ تھے۔ لہٰذا ان کو تین کتابیں ایک سو بیس صحیفے دیئے ادھر صرف ایک تھے۔ لہٰذا ایک کتاب دی۔ اگر یہ تقسیم مساوی نہ ہوتی تو قرآن کے ساتھ ناسخ کا لفظ اور شامل کر دو تو وزن بڑھ جائے گا۔

۳۔ خدا کے دو گھر ہیں۔ ایک بیت المقدس۔ دوسرے کعبہ ان میں سے ایک اولادِ اسحٰقؑ کو دے دیا اور دوسرا اولادِ اسمٰعیلؑ کو۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ایک کو باقاعدہ قبضہ دلا دیا۔ دوسرے کو اس سے محروم رکھا شاید یہ اس لیے ہوا کہ کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شریک تھے۔ یا یہ کہ بڑے بھائی کی اولاد کو یہ امتیاز خصوصی بخشا گیا۔

۴۔ دو ہتھیار تھے۔ ایک عصا دوسرے ذوالفقار ان میں سے ایک چیز ایک بھائی کی اولاد کو دے دی اور دوسری دوسرے بھائی کی اولاد کو۔ جناب موسیٰؑ صاحب عصا بن گئے اور جناب علیؑ صاحب ذوالفقار۔

۵۔ امامت کا عہدہ دونوں بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

۶۔ کتاب خدا کے محافظ دونوں سلسلوں میں بارہ بارہ قرار پائے۔

۷۔ ایک بی بی نساء عالمین پر فضیلت کے لیے اس سلسلہ یعنی جناب مریمؑ اور ایک سلسلے سے یعنی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا۔ ۸۔ ایک بی بی کو وہاں طہارت کی سند حاصل ہے

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَىٰكِ عَلَىٰ نِسَآءِ الْعَٰلَمِينَ ﴿٤٢﴾ يَٰمَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾ (۳/۴۲ عمران)

ترجمہ: مریم سے کہا اے مریم تم کو خدا نے برگزیدہ کیا اور تمام گناہ اور برائیوں سے پاک صاف رکھا اور سارے جہان کی عورتوں میں سے تم کو منتخب کیا اور ایک بی بی کو نسلِ اسمٰعیل میں طاہر بنایا تو اے مریم اس کے شکریہ میں اپنے پروردگار کی شکر گزاری (سجدہ) اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔

ایک بی بی کو نسلِ اسمٰعیل میں طاہر بنایا۔ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿٣٣﴾

(۳۳/۳۳ احزاب)

بڑے بھائی کی نسل کو یہ امتیاز دیا گیا کہ سیدہ کی طہارت کو تطہیراً کہہ کر کامل بنا دیا گیا۔ یعنی طہارت متعدی الی غیرہ ہو گئی۔ اور ایک نہیں اُن کی نسل میں گیارہ معصوم ہوئے۔

۹۔ سلسلہ اسحاقی کی آخری حجت لڑکی کی اولاد کو قرار دیا۔ یعنی حضرت مریمؑ کے فرزند حضرت عیسیٰؑ اس سلسلہ کی آخری حجت ہوئے، سلسلہ اسمٰعیلی میں بھی یہی سلسلہ ملحوظ رکھا۔ یہاں بھی آخری حجت قائم آل محمد علیہ السلام لڑکی ہی کی اولاد سے ہیں۔

۱۰۔ اس سلسلے کی آخری حجت حضرت عیسیٰؑ کو ایک مدت کیلئے نظروں کے سامنے رکھا اسی طرح دوسرے سلسلے کی بھی آخری حجت کو وقت خاص تک لوگوں کی نظروں کے سامنے رکھا۔

۱۱۔ اس سلسلے کی آخری حجت کو آسمان پر پوشیدہ کیا ہے اور دوسرے سلسلہ کی آخری حجت کو زمین پر پوشیدہ کر دیا۔

۱۲۔ کتاب کائنات بند ہوتے وقت دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا ایک گواہ ایک نسل کا محفوظ رکھا اور دوسرا دوسری نسل سے۔ ان کو آسمان پر اس لیے بلایا گیا کہ یہ زمانہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ کی رسالت اور اولاد ابوتراب کی امامت کا تھا۔ اگر جناب عیسیٰؑ زمین پر ہوتے تو معطل بن کر رہتے اور نبی کے لیے معطل رہنا اس کی شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ لہٰذا ان کو آسمان پر جگہ دی۔ اور ابوتراب کے پوتے کو زمین پر قیامت میں یہ لوگ جمع ہو جائیں گے تو امامت کا حق حضرت حجت کا ہے کیونکہ بڑے بھائی کی اولاد ہیں جب ہی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکی اقتدا نماز میں ادا کریں گے۔

۱۳۔ ایک بچہ اسحاق کی اولاد میں پیدا ہوا جس کی مدّت چھ ماہ کی تھی یعنی حضرت یحیٰ بن زکریا تو ایک بچہ نسل اسمٰعیل میں بھی پیدا ہوا یعنی حسین بن علی علیہ السلام ۱۴۔ نسل اسحٰقؑ میں تابعین انبیاء کا نام شیعہ رکھا حضرت موسیٰ کے قصے میں ہے۔ وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۲۸/۱۵ قصص

اور ایک دن اتفاقاً موسیٰ شہر میں ایسے وقت آئے کہ وہاں کے لوگ نیند کی غفلت میں پڑے ہوئے تھے تو دیکھا وہاں دو آدمی لڑتے مرتے ہیں ایک تو اپنی قوم بنی اسرائیل کا ہے اور دوسرا اُن کے دشمن کی قوم قبطی کا ہے۔

تو نسل اسمٰعیلؑ میں بھی تابعین آئمہ کا یہی نام ہوا۔ یا علیؑ انت و شیعتک ھم الفائزون۔

۱۵۔ ایک فضائی سواری وہاں عطا کی جو بساط سلیمانی کہلائی ایک سواری یہاں بھی بخشی جو براق کہلائی۔

۱۶۔ ایک بی بی وہاں اپنے شوہر سے لڑی اور اس کے نفاق کا پردہ چاک ہوا یعنی صفورہ زوجہ جناب موسیٰؑ جس نے جناب یوشع بن نون سے محاربہ کیا۔ یہاں بھی ایک بی بی اپنے شوہر کے وصی سے لڑی۔

۱۷۔ ایک دریا اس نسل سے مخصوص کیا گیا یعنی نیل اور ایک اس نسل سے مخصوص کیا گیا یعنی فرات۔

۱۸۔ ایک پہاڑ اس نسل سے مخصوص کیا گیا یعنی طور اور ایک اس نسل سے یعنی کوہ حرا۔

۱۹۔ ایک پتھر وہاں خانہ خدا سے مخصوص ہوا۔ یعنی صخرا ایک یہاں مخصوص ہوا یعنی حجر اسود۔

۲۰۔ وہاں موسیٰؑ نے ساحروں کے سانپوں پر اپنا اعجاز دکھایا۔ یہاں علیؑ نے اژدہے کو پیدا ہوتے چیر دیا۔

۲۱۔ وہاں موسیٰؑ کو طور پر معراج ہوئی۔ یہاں محمد مصطفیٰؐ کو عرش پر۔

۲۲۔ وہاں جنت کے میوے جناب مریمؑ کے لیے آئے۔ یہاں حضرت فاطمہؑ زہرا کے لیے آئے۔

۲۳۔ وہاں آغوش مادر میں جناب عیسیٰؑ نے کلام کیا یہاں حضرت علی علیہ السلام نے آغوش رسول میں۔

۲۴۔ وہاں جناب موسیٰؑ کے کوہ طور پر جاتے ہی ساری قوم گمراہ ہو کر گوسالہ پرست ہو گئی تو یہاں بھی آنحضرتؐ کے مرتے ہی لوگ راہ حق سے ہٹ گئے۔ جناب موسیٰ اپنا قائم مقام حضرت ہارونؑ کو بنا کر گئے تھے جن سے ان کی قوم نے مخالفت کی۔ اور یہاں حضرت علیؑ کو سرکار دو عالم نے اپنا قائم مقام بنایا تھا۔ امت محمدی ان کے خلاف ہو گئی۔

۲۵۔ وہاں جناب ہارونؑ وصی جناب موسیٰؑ کی اولاد حضرت موسیٰؑ کی اولاد سمجھی گئی۔ یہاں بھی حضرت علیؑ کی اولاد حضرت رسولؐ خدا کی اولاد قرار پائی۔

۲۶۔ وہاں حضرت عیسٰیؑ پر لوگوں کو خدا کا گمان ہوا۔ یہاں حضرت علی علیہ السلام پر۔
۲۷۔ ایک سلسلہ کے شہید مظلوم حضرت یحیٰیؑ بن زکریا ہیں۔ دوسرے ہیں حسینؑ بن علیؑ ہیں۔
۲۸۔ وہاں ظلم فرعون سے بنی اسرائیل کو جلا وطن ہونا پڑا۔ یہاں حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کو ظلم یزید سے گھر چھوڑنا پڑا۔ وہاں ان کی مظلومیت نے فتح حاصل کی۔ یہاں ان کی مظلومیت نے۔
۲۹۔ وہاں جناب یحیٰیؑ کا خون جوش مار کر زمین سے اُبلا۔ یہاں حسینؑ بن علیؑ کا خون آج تک جوش مار رہا ہے۔
کتب تواریخ مقاتل میں ہے کہ برسوں زمین کربلا کی یہ حالت رہی۔ کہ جو پتھر وہاں سے ہٹایا جاتا تھا۔ اس کے نیچے سے تازہ خون جوش مارتے ہوئے نکلتا تھا بے شک یہ خون ناحق ایسا نہ تھا کہ زمین کے تختے سے دبا سکتے۔
عبداللہ خضرمی ناقل ہے کہ جب اسیران حرم کا قافلہ کوفہ پہنچا۔ تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ جب سرہائے شہداء میرے قریب آئے۔ تو میری نظر اس نیزۂ طویل پر گئی جس پر سر حسینؑ نصب تھا۔ واللہ میں نے دیکھا کہ گلوئے مبارک سے اس طرح خون بہہ رہا ہے جس طرح مقتول کے گلے سے قتل کے فوراً بعد بہتا ہے۔ وہاں ایک قوم حضرت یحیٰیؑ کے غم میں روئی یہاں رونے والے حسینؑ کے غم میں روتے چلے آرہے ہیں منقول ہے کہ جب جناب زینبؑ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اشقیاء دربار ابن زیاد میں لے جانے والے ہیں تو آپ کو بڑی غیرت آئی۔ جناب فضہ کو بلا کر فرمایا تم شمر کے پاس جاؤ اور میری طرف سے کہو کہ ہم ناموس رسولؐ ہیں۔ ہم کو کھلے سر دربار پسر زیاد میں جاتے شرم آتی ہے۔ اگر تو ابن زیاد کے سامنے لے جانا ہی چاہتا ہے تو ایک ایک چادر ہم بے کسوں کو دے دے۔ تاکہ ہم اپنا بدن اس سے چھپا لیں۔ اور اگر یہ صورت تجھے منظور نہ ہو تو ہمارے ہاتھوں سے رسی کھول دے۔ تاکہ ہم اپنے چہرے اپنے ہاتھوں سے چھپا سکیں۔
جناب فضہ جب شمر کے پاس پہنچیں تو اس شقی نے اپنا منہ داہنی طرف پھیر لیا۔ داہنی طرف آئیں تو اس نے اپنا منہ بائیں طرف کر لیا۔ اس شقی کی یہ بے التفاتی دیکھ کر جناب فضہ کو غصہ آگیا اور فرمایا۔
اے شمر کیا تو نے مجھے کوئی معمولی عورت سمجھا ہے۔ میں جناب زہرہ کی کنیز خاص ہوں اگر میری شہزادی نے مجھے حکم نہ دیا ہوتا تو میں ہرگز تیرے سامنے نہ آتی۔
یہ سن کر شمر کو کچھ غیرت سی آئی کہنے لگا کہو کیا کہنا چاہتی ہو انہوں نے فرمایا۔
میری شہزادی جناب زینبؑ نے تجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ ہم عترت رسولؐ ہیں ہمیں نامحرموں کے سامنے کھلے منہ دربار میں جاتے شرم آتی ہے۔ اگر تو دربار میں لے جانا ہی چاہتا ہے تو اتنا سلوک ہم بے کسوں کے ساتھ کر ہم کو ایک ایک چادر منہ چھپانے کے لیے دے دے۔ شمر شقی نے کہا۔
زینبؑ سے کہہ دو۔ کہ اب تم کوفہ کی شہزادی نہیں ہو۔ پسر زیاد کی قید میں ہو۔ جس طرح ہم چاہیں گے

ے جائیں گے۔ جناب زینبؑ نے ایک آہ سرد بھر کر فرمایا۔

اچھا اگر یہ منظور نہیں تو اتنا ہی کر کہ ہمارے بازو کھلوا دے۔ تا کہ اپنے منہ ہاتھوں ہی سے چھپا لیں۔ شمر ملعون نے غصہ سے کہا۔ نہیں، ہمیں اسی صورت میں تشہیر کرنا ہے۔ جناب فضہ مایوس ہو کر واپس آئیں، اور شمر ملعون کا جواب جناب زینبؑ سے بیان کیا۔

شیرِ خدا کی بیٹی کو یہ سن کر جلال آ گیا۔ فرمانے لگیں زینبؑ تو اس صورت سے ہرگز دربار ابنِ زیاد میں نہ جائے گی۔ شمر سے کہہ دو جو کچھ کرنا ہے کرے۔ جب شمر کو معلوم ہوا کہ زینب کسی طرح دربار میں جانے پر راضی نہیں۔ تو وہ تازیانہ لے کر جناب بیمار کربلاؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

اے علی ابن الحسینؑ اپنی پھوپھی سے کہو کہ وہ دربار پسر زیاد میں کھلے منہ چلیں ورنہ اس تازیانہ سے سخت اذیت پہنچاؤں گا۔ آہ یہ سن کر بیمار کربلا طوق و زنجیر سنبھالے جناب زینبؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے پھوپھی آپ دربار ابن زیاد میں کیوں نہیں چلتیں۔ شمر مجھے تازیانے سے اذیت دینی چاہتا ہے فرمایا۔ بیٹا سید سجادؑ مجھ سے تو ہرگز نہ ہو گا کہ کھلے منہ دربار پسر زیاد میں چلی جاؤں۔ آخر میں بھی جناب فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہوں۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جناب زینبؑ کی نظر اس نیزۂ طویل پر جا پڑی۔ جس پر سرِ امام حسینؑ نصب تھا۔ دیکھا کہ حضرتؑ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ رو رو کر کہنے لگیں۔

میرے مظلومؑ برادر تیری غربت و بے کسی کے نثار اس وقت رونے کا کیا سبب ہے۔ علی اکبرؑ کی یاد نے رُلایا۔ برابر کے بھائی عباسؑ کی یاد نے آہ! آہ!! لبِ مبارک امامؑ سے آواز آئی۔ اے بہن زینبؑ میری محنت کو ضائع نہ کرو۔ اور جس طرح یہ تمہیں لے جانا چاہتے ہیں چلی جاؤ۔ یہ سننا تھا کہ جناب زینبؑ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئیں اور امام زین العابدینؑ سے فرمایا۔ بیٹا زینبؑ اب دربار میں جانے کے لیے تیار ہے۔ شمر سے کہہ دو جس طرح چاہے دربار میں لے جائے۔

اب تھوڑا سا حال دربارِ ابن زیاد کا بھی سُن لیجئے۔ اس شقی نے حکم بھیجا تھا کہ جب تک دربار کو آراستہ نہ کر لوں اسیروں کو یہاں نہ لایا جائے۔ چنانچہ شمر نے تشہیر کے بعد دربار پسر زیاد کے قریب ہی ایک مقام پر اہل حرم کو ٹھہرا رکھا تھا۔ جب یہ خبر آئی کہ دربار آراستہ ہو گیا۔ تو شمر نے تمام قیدیوں کو دربار میں چلنے کا حکم دیا۔

آہ! آہ!! اس وقت اہل حرم پر کیا گزری ہو گی۔ اس کا بیان دشوار ہے، شرم سے سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور فرطِ حیا سے ایک ایک قدم اُٹھانا دشوار تھا۔ اس وقت ابنِ زیاد کا دربار کئی سو کرسی نشینوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور بہت سی زرّیں کمر غلام چاروں طرف استادہ تھے۔ امام حسینؑ کا سرِ انور ایک طشت

میں اس شقی کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اور وہ بار بار اپنی چھڑی دندان مبارک پر مار کر مسکراتا تھا۔ زید بن ارقم صحابی رسولؐ اس وقت دربار میں موجود تھے۔

ان سے اس شقی کی گستاخی نہ دیکھی گئی۔

رو کر کہنے لگے۔ اے پسر زیاد اپنی چھڑی ان ہونٹوں پر سے ہٹا لے۔ میں نے حضرت رسولؐ خدا کو دیکھا ہے کہ ان لب ہائے حسینؑ کو اس طرح چوستے تھے جیسے کوئی رطب تازہ کو چوستا ہے۔ یہ سن کر ابن زیاد کو غصہ آگیا۔

اور کہنے لگا۔ اے دشمن خدا اگر بڑھاپے سے تیری عقل ضائع نہ ہوگئی ہوتی تو میں تجھے ابھی قتل کرا دیتا۔

منقول ہے کہ ابن زیاد اہل بیتؑ کو اسیر دیکھ کر بڑی خوشی کے ساتھ کہنے لگا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو ذلیل و خوار کیا اور قتل کیا اور تمہارے جھوٹ کو تم پر ظاہر کیا۔ جناب زینبؑ سے ضبط نہ ہو سکا۔ فرمانے لگیں۔

او شقی تو جھوٹا ہے۔ اللہ اپنے نیکوکاروں کو کبھی ذلیل نہیں کرتا۔ اس شقی نے غضب ناک ہو کر شمر سے پوچھا۔

یہ کون بی بی ہے کہ میرے سامنے اس بے باکی سے بول رہی ہے۔

شمر نے کہا یہ حسینؑ کی بڑی بہن زینبؑ ہیں۔

ابن زیاد نے حکم دیا کہ زینبؑ کو قتل کر دیا جائے۔ عمر بن حریثؓ کو یہ سن کر غصہ آگیا۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا۔

اے پسر زیاد تو کس قدر بے غیرت ہے۔ اب تیری جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ تو عورتوں کو بھی قتل کرانے لگا۔ خدا کی قسم اگر تو نے دختر علیؑ کو قتل کرایا۔ تو ابھی دربار میں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ عمر بن حریث کے بگڑے تیور دیکھ کر ابن زیاد ڈر گیا اور جناب زینبؑ کے قتل سے باز رہا۔

اس کے بعد اس نے امام زین العابدینؑ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کسی نے کہا یہ علی بن الحسین ہیں۔

اس نے کہا کیا علیؑ بن الحسینؑ کو خدا نے ابھی تک قتل نہیں کیا۔ حضرت نے نہایت نحیف آواز میں اس سے فرمایا۔ اے پسر زیاد میرا ایک جوان بھائی تھا۔ اس کا نام بھی علی بن الحسین تھا۔ تیرے لشکر نے ان کو قتل کر ڈالا۔ وہ بولا۔ میرے لشکر نے نہیں۔ خدا نے اس کو قتل کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ اے شقی تو جھوٹا ہے خدا تجھ پر

لعنت کرے۔ پسرزیاد کو غصّہ آگیا حکم دیا کہ اس کو باہر لے جاکر قتل کر دو۔ یہ سنتے ہی جناب زینبؑ بے چین ہوگئیں اور فرمایا۔

"اے ظالم! ہمارا سارا گھر تہ تیغ کرنے کے بعد بھی تجھے چین نہ آیا۔" یہ کہہ کر بیمار کربلا سے لپٹ گئیں اور فرمایا! میں ان کو ہرگز نہ چھوڑوں گی۔ اگر تو ان کو قتل کرنا ہی چاہتا ہے تو ان سے پہلے مجھے قتل کرا دے۔ ہمارے وارثوں میں ان کے سوا اب کوئی باقی نہیں۔ جناب زینبؑ کی یہ تقریر سن کر بہت سے درباری بگڑ گئے اور ابن زیاد خائف ہو کر حضرت کے قتل سے باز رہا۔ اس کے بعد ابن زیاد نے اہل حرم کو قید میں بھیجنے کا حکم دیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۸/۱۱ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

ستائیسویں مجلس

تفسیر آیہ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ

وحال ورود اہل حرم بہ شام

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۵ شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾ (۱۵/۷۳ مزمل)

ترجمہ :- ہم نے تمہاری طرف ایک رسول کو اسی طرح تمہارے اوپر گواہ بنا کر بھیجا جیسے فرعون کی طرف ایک رسول کو بھیجا تھا۔ اس آیت میں حضرت رسول خدا کی تشبیہ حضرت موسیٰ سے بلحاظ ذات نہیں بلکہ بلحاظ صفات ہے یعنی پورا جملہ تشبیہ پورے جملے کی ہے۔ وجوہ تشبیہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جس طرح جناب موسیٰؑ صاحب کتاب و صاحب شریعت ہیں۔ اسی طرح آنحضرتؐ بھی صاحب کتاب و شریعت ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت منسوخ ہو گئی اور آنحضرتؐ کی شریعت تا قیامت چلنے والی ہے۔

۲۔ جناب موسیٰؑ کے وصی حضرت یوشع بن نون تھے۔ جناب موسیٰؑ کے بعد ان کی بی بی صفورا نے حضرت یوشعؑ سے جنگ کی۔ اسی طرح حضرت رسول خداؐ کی ایک بی بی نے آپ کے وصی حضرت علیؑ سے جنگ کی۔

۳۔ حضرت موسیٰؑ کے بارہ قائم مقام ہوئے جو اثنائے عشر نقیب کہلائے۔ حضرت رسول خداؐ کے بھی بارہ قائم مقام ہوئے جو بارہ امام کہلائے۔

۴۔ حضرت موسیٰؑ کی امت شیعہ کہلائی۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

فَاسْتَغَاثَهُ

الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ ۙ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾

۱۵/۲۸ سورہ قصص

ترجمہ :- ایک دن موسیٰ شہر میں ایسے وقت آ گئے کہ وہاں کے لوگ بے خبر پڑے سو رہے تھے آپ نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں ان میں ایک انکی قوم (بنی اسرائیل) کا ہے اور دوسرا ان کی دشمن قوم کا ہے۔ پس اُس شخص نے جو موسیٰ کی قوم کا تھا اُس شخص پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے جو اس کا دشمن تھا موسیٰؑ سے مدد مانگی۔ موسیٰؑ نے اس (قبطی) کے ایک گھونسہ مارا۔ وہ مر گیا پھر (دل میں) کہنے لگے کہ یہ شیطان کا کام تھا۔ بیشک شیطان کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔

اسی طرح حضرت رسول خداؐ کی اُمت بھی شیعہ کہلاتی ہے جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا یا علیؑ انت و شیعتك هم الفائزون سوائے اس فرقے کے نام کے اور کسی اسلامی فرقہ کا نام قرآن میں نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے تین دشمن تھے۔ فرعون، ہامان اور قارون۔ لہذا آنحضرتؐ کے بھی تین ہی دشمن ہوئے۔

اگر موسیٰؑ ان کی طرف بھیجے گئے تھے تو آنحضرتؐ بھی ویسے ہی ان کی طرف بھیجے جانے چاہئیں۔ پس وہ تین دشمن ابولہب، ابوجہل اور ابوسفیان تھے۔ وہاں فرعون کا نام خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾

۱۵/۷۳ مزمل

اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اور کافر تھے اور فرعون کافر گر تھا۔ اسی طرح قرآن میں ابولہب کا ذکر خاص طور سے مذکور ہے۔ نام ضرور بدلے ہوئے تھے۔ مگر صفات برابر جس طرح فرعون کے دعویٰ خدائی کرنے سے خدا کی خدائی نہیں چھن گئی۔ اسی طرح خدائی منصب داروں کے عہدے نہیں چھن سکتے۔ فرعون باوجودیکہ مدعی الوہیت تھا مگر خدا نے طرح دی اور فوراً ہی نہ دھر پکڑا۔ بلکہ مصلحت پر نظر رکھ کر خموشی اختیار کی اسی طرح خاصان خدا انتقام

میں جلدی نہیں کرتے اور مصلحت پر نظر رکھ کر خموش ہو جاتے ہیں۔ دوسرے خدا یہ جانتا تھا کہ اس دعویٰ خدائی سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ میری خدائی میں فرق نہیں آ سکتا۔ فرعون بندۂ خدا تھا اور اس کا مقابلہ کیا۔ اس کی گردن ہر وقت اس کے ہاتھ میں تھی۔ پس وہ کیوں جلدی کرتا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ عذاب کیا تو اس کو مع اس کی قوم کے دریائے نیل میں غرق کر دیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خدائی مقابلہ کی سزا نہ تھی۔ بلکہ اپنے رسول حضرت موسیٰؑ کی نافرمانی کی سزا تھی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾

۷۳/۱۶ سورۃ المزمل

ترجمہ: فرعون نے اس رسولؑ کی نافرمانی کی ہم نے بھی اس کی سزا میں اس کو سخت پکڑا۔

پس اسی پر قیاس کرو۔ کہ حضرت علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ علیہم السلام کا مقابلہ سے خاموش رہنا ان حضرات کے پیش نظر جو مصالح تھے۔ عام لوگ اسے کیا سمجھتے۔
متقی نہیں ہوتی تو دشمن کے سینے پر سے اتر آتے ہیں جب لوگ سبب پوچھتے ہیں تو جواب میں فرماتے ہیں اس نے لعاب دہن میری طرف پھینکا۔ ایسی حالت میں اگر میں اسے قتل کرتا تو میرا نفس شامل ہو جاتا پس جو علیؑ اتنی اتنی باتوں پر نظر رکھتا ہو اگر اس نے کسی بڑی دینی مصلحت کی وجہ سے اپنے مخالفوں کا مقابلہ نہ کیا تو کیا قابل اعتراض بات ہے۔
خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی اب ہم پھر اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ایک تشبیہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت رسولؐ خدا کے درمیان یہ بھی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے تابعین کا مذہب تقیہ تھا چنانچہ مومن آل فرعون جن کا شمار صدیقین اوّلین میں ہے اور جو نبوت حضرت موسیٰؑ کا مصداق اوّل تھا تقیہ پر عامل تھا چنانچہ قرآن حکیم میں ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا
اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ

۴۰/۳۸ مومن

ترجمہ: فرعون کے خاندان میں سے ایک شخص (حزقیل) نے جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا لوگوں سے کہا کیا تم ایک ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ

ہے اور وہ تمہارے رب کی طرف سے معجزات لے کر آیا ہے۔ اس کی صفت بیان کی گئی ہے۔ آنحضرتؐ کے مصداق اول اور صدیق اکبر حضرت علی علیہ السلام کا مذہب بھی تقیہ تھا۔

لوگ شیعوں کو رافضی کہتے ہیں۔ یہ لفظ سب سے پہلے ان لوگوں پر بولا گیا جو فرعون کو چھوڑ کر حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے پس معلوم ہوا جس طرح تابعین حضرت موسیٰؑ رافضی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح تابعین آنحضرتؐ ختمی مرتبت رافضی کہلائے۔ حضرت موسیٰؑ نے شرح صدر کے لیے دعا کی۔ خدا نے ان کے سینے کو کشادہ کر دیا۔ اسی طرح حضرت رسولؐ خدا کا شرح صدر ہوا لیکن فرق یہ ہے وہاں جناب موسیٰؑ نے شرح صدر کا سوال کیا تھا

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ﴿٣١﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾ (سورہ طہٰ ۲۰/۲۵/۳۲)

ترجمہ:۔ پالنے والے میرے سینہ کو کشادہ کر دے (دلیر بنا دے) میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔ لکنت زبان کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھیں۔ میرے اہل سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اس سے میری پشت مضبوط کر دے۔ (۲۰/۲۵/۳۲ طہٰ)

اور یہاں بدون خواہش خدا نے یہ فضیلت عطا فرمائی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٥﴾ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٦﴾ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ﴿٧﴾ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَب ﴿٨﴾ (۹۴/۱-۸ سورہ شرح)

ترجمہ:۔ اے رسول کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہیں کر دیا (ضرور کیا) اور تم سے وہ بوجھ اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی ہے اور تمہارا ذکر بھی بلند کر دیا تو (ہاں) مشکل کے ساتھ آسانی بھی

ہے۔ ہاں مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے پس جب تم (کارِ رسالت سے) فارغ ہو جاؤ تو مقرر کردو اور پھر اپنے پروردگار کی طرف رغبت کرو۔

جب موسٰیؑ توریت لینے کے لیے طور پر گئے تو اپنے بھائی ہارونؑ کو اپنا قائم مقام بنا کر گئے۔ قوم نے ان سے غداری کی۔ اور ان کو اتنا کمزور بنا دیا کہ انہیں اپنے قتل کیے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جناب موسٰیؑ جب واپس آئے تو جناب ہارونؑ نے شکایت کی قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْأَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۱۵۰﴾ ع ۱۴/ ۷ الاعراف

اپنے بھائی ہارونؑ کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے اس نے ہارون سے کہا اے میرے ماں جائے میں کیا کرتا قوم نے مجھے حقیر سمجھا اور میرا کہنا نہ مانا بلکہ قریب تھا کہ مجھے مار ڈالیں مجھے ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ قرار دیجئے۔

میرے ماں جائے اس قوم نے مجھے کمزور بنا دیا۔ اور قریب تھا کہ یہ لوگ مجھے قتل کر ڈالیں۔ یہی حالت یہاں بھی ہوئی۔ حضرت رسولؐ خدا کے بعد لوگ حضرت علی علیہ السلام سے پھر گئے اور آپ کی ہدایت پر عمل نہ کیا اور ان کے اور ان کی اولاد کے خون کے پیاسے بن گئے۔ یہ عداوت رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ ۶۱ھ میں واقعہ کربلا ہو گیا افسوس ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ کی محبت خدا نے لوگوں پر واجب کی تھی۔ جن کی اطاعت و پیروی کا حکم دیا تھا۔ بدبخت مسلمانوں نے ان پر وہ وحشیانہ مظالم روا رکھے۔ جو سخت سے سخت دشمن پر بھی روا نہیں رکھے جاتے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ دشمن کے قتل کے بعد آدمی کے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ اور اس کے انتقامی جذبات دب جاتے ہیں لیکن وہ کیسے شقاوت کردار تھے جن کو رسولؐ کے بھرے گھر کی صفائی کرنے کے بعد بھی چین نہ آیا۔ اور مردوں کے قتل کے بعد ان دکھیا عورتوں کے ستانے پر کمر باندھی۔ جن کا دنیا میں کوئی وارث نہ تھا۔ آہ رسولؐ کی نواسیاں اور علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹیاں سر ننگے بلوائے عام میں پھرائی جا رہی تھیں۔ اور کسی کے دل پر چوٹ نہ لگتی تھی۔

لکھا ہے کہ جب اہل حرم کا لٹا ہوا قافلہ دمشق پہنچا تو جناب اُم کلثومؑ نے شمر سے کہا کہ یہ شہر دمشق ہے یہاں تماشائیوں کا بہت زیادہ ہجوم ہوگا لہذا تو ہمیں چادریں دے یا پھر ایسے راستے سے چل جہاں لوگوں کا ہجوم کم ہو۔ اور اگر یہ دونوں باتیں منظور نہیں تو کم سے کم اتنا کر کہ شہیدوں کے سر ہمارے اونٹوں کے برابر کر دے تاکہ تماشائی ان کے دیکھنے میں مشغول ہوں اور ان کو ہمیں دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ آہ اشمر ایسا غیرت دار کہاں تھا کہ امام زادی کی درخواست منظور کر لیتا۔ اس نے یہ غضب ڈھایا کہ باب الساعات کی طرف سے کر چلا جہاں پر خلق خدا کا سب سے زیادہ ہجوم تھا جب یہ قافلہ قریب مسجد جامع کے پہنچا تو ایک شامی نے یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ

کفار ہیں۔ کہا خدا کا شکر ہے کہ خدا نے تم کو ہلاک کیا۔ اور فتنہ کی جڑ کو اکھاڑ ڈالا۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام بڑے صبر و ضبط سے اس کا یہ گستاخانہ کلام سنتے رہے۔ جب وہ کہہ چکا تو آپ نے فرمایا۔ اے شخص تو نے قرآن پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہاں پڑھا ہے۔ فرمایا یہ آیت بھی پڑھی ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ (۴۲/۲۳ شوریٰ)

ترجمہ:۔ (اے رسول) کہہ دو میں اس (تبلیغ رسالت) کا اپنے قرابتداروں (اہلبیتؑ) کی محبت کے سوا کوئی اجر نہیں چاہتا۔ اور جو نیکی کرے گا ہم اس کی خوبی میں اضافہ کر دیں گے۔

اس نے کہا یہ بھی پڑھی ہے۔ فرمایا اے بھائی یہ سب آیتیں ہماری ہی شان میں ہیں۔ ہم ہی وہ اہلبیتؑ ہیں جن کو خدا نے ہر برائی سے پاک کیا ہے۔

آپ نے آیہ تطہیر کی تلاوت فرما کر پھر یہ آیت پڑھی:۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ ۳۰/۳۸ الروم

یہ سن کر وہ مرد شامی گھبرا گیا۔ اور اپنے ہاتھ اٹھا کر درگاہ باری میں عرض کرنے لگا۔ خداوندا میں توبہ کرتا ہوں اور ان لوگوں سے سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جنہوں نے تیرے نبی کی آل کو قتل کیا۔ خدایا تو جلد اپنا عذاب اب ان پر نازل کر۔

سہل سعدی حضرت رسولؐ خدا کے مقدس صحابی بیت المقدس کی زیارت کو تشریف لے گئے تھے وہاں سے دمشق آئے۔ شہر کو غیر معمولی طور پر سجا پا کر لوگوں سے پوچھا۔ آج یہاں کون سی عید ہے۔ ایک شامی نے کہا عید کیسی یہ اس واقعہ کی خوشی ہے کہ جس کی وجہ سے اگر آسمان خون برسائے اور زمین شق ہو جائے تو بھی کم ہے آج حسینؑ بن علیؑ کا سر دربار یزید میں آ رہا ہے۔ یہ سنتے ہی سہل کے ہوش و حواس باختہ ہو گئے اور کہنے لگے۔

ہائے ہائے کیا ظالموں نے فرزند رسولؐ کو قتل کر ڈالا۔ ارے کیا قیامت آ گئی۔ نبیؐ کے نواسے کا قتل اور یہ خوشیاں

اولادِ رسول کی اسیری اور شہر میں یہ عید، پھر پوچھا سرِ حسینؑ کس دروازے سے لایا جائے گا۔ اس نے باب الساعات کی طرف اشارہ کیا۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شور سنائی دیا اور بہت سے جھنڈے نمودار ہوئے۔ پھر بے کجاوہ اونٹوں پر کچھ بے کس بی بیاں کھلے سر دکھائی دیں۔ ایک اونٹ پر ایک کم سن لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کی صغر سنی، بھولا پن اور قید کا تصوّر کر کے سہل زار زار رونے لگے۔

آگے بڑھ کر پوچھا۔ آپ کون ہیں؟ بچی نے جواب دیا۔

"میں سکینہ بنت الحسینؑ ہوں۔"

سہلؓ نے یہ سن کر منہ پیٹ لیا۔ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور کہا اے شہزادی میں آپ کے جد کا صحابی سہل ساعدیؓ ہوں۔ کاش میری آنکھیں اندھی ہو جاتیں کہ اولادِ رسول کو میں اس حالت میں نہ دیکھتا۔ اچھا مجھے بتاؤ کہ اس وقت میں تمہاری کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں۔

جناب سکینہ نے کہا اگر ہو سکے تو ان سروں کو ہمارے اونٹوں کے قریب کرا دو۔ تاکہ تماشائی ان کو دیکھنے میں مشغول ہو جائیں اور ہم پر نامحرموں کی نظر نہ پڑے۔

سہل نے یزیدی گروہ کو کچھ دے کر سروں کو اونٹوں سے قریب کرا دیا۔ سہلؓ کہتے ہیں کہ اسی عالم میں، میں نے دیکھا کہ ایک شامی عورت نے سرِ مبارک امام مظلومؑ پر ایک پتھر مارا۔ میں نے اپنی آنکھیں فوراً بند کر لیں اور خدا سے دعا کی۔

کہ اس ملعونہ کو اور اس کے ساتھ کی ان چار عورتوں کو جو اپنے ہاتھوں میں پتھر لیے بیٹھی تھیں ہلاک کر۔ ابھی میری بد دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ پانچوں کوٹھے سے گر کر مر گئیں۔

اب تھوڑا سا حال اہلِ حرم کا دربارِ یزید میں، جانے کا بھی سن لیجئے۔ لکھا ہے جب اہلِ بیت کو دربارِ یزید میں لائے تو وہ شفقی شراب پی رہا تھا اور شطرنج سامنے بچھی ہوئی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ سرِ امام مظلومؑ تخت کے نیچے رکھ دیں۔

یہ دربار اسی مسجد میں ہوا تھا جو اب تک مسجد بنی اُمیّہ کے نام سے مشہور ہے اس میں وہ جگہ بھی ابھی تک ہے جہاں یزید کا تخت تھا اور وہ جگہ بھی ہے جہاں اسیرانِ اہلبیتؑ رسیوں میں بندھے اور زنجیروں میں جکڑے کھڑے کیے گئے تھے۔ اب اس مقام پر جنگلے کے اندر رحلوں کے اندر قرآن مجید کھلے ہوئے رکھے ہیں۔ سبحان اللہ کیا شان ہے اہل بیت طاہرین کی جہاں ان کے قدم پڑ گئے مسجد بن گئی اور سبحان اللہ کتنا قریبی تعلق ہے ان کا قرآن سے کہ جہاں یہ ہیں قرآن بھی ان کے ساتھ ہے۔ بہر حال بھرے دربار میں یزید جام پر جام چڑھائے جا رہا تھا اور تھوڑی سی شراب جو رہ جاتی تھی وہ اسی طشت میں ڈال دیتا تھا۔ جس پر سرِ مبارک حضرت امام حسین علیہ السلام

رکھا تھا وہ ملعون اس بیہودگی میں مشغول تھا اور اہلِ حرم مجرموں کی طرح بندھے ہوئے اس کے سامنے کھڑے تھے ۔ وہ شقی نشہ میں سرشار بار بار چوبِ بید سے سرِ امام مظلومؑ کے ساتھ بے ادبی کر رہا تھا اور ابو برزہ اسلمی صحابی رسولؐ سے یہ گستاخی نہ دیکھی گئی ۔ بگڑ کر کہنے لگے ۔

"اے یزید دندانِ حسینؑ سے اپنی چھڑی ہٹالے ۔ بخدا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حضرت رسولؐ خدا حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے دانتوں اور لبوں کے بوسے لے کر فرمایا کرتے تھے ۔ تم دونوں جوانانِ جنت کے سردار ہو ۔ خدا تمہارے قاتلوں کو ہلاک کرے اور دوزخ میں ان کو جگہ دے ۔ یہ سُن کر یزید کو غصہ آگیا اور ابو برزہ کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا ۔

منقول ہے کہ جب یزید کی نظر اہلِ حرم پر پڑی تو دیکھا کہ ایک کمسن بچی بار بار اپنے پیر زمین سے اُٹھاتی ہے ۔ اور رکھ دیتی ہے ۔ پوچھا یہ لڑکی کون ہے ؟ کسی نے بتایا یہ سکینہ بنت الحسین ہے ۔ اب یزید جناب سکینہؑ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔

"اے لڑکی تو بار بار اپنے پیر زمین سے کیوں اُٹھاتی ہے ۔" جناب سکینہؑ نے فرمایا کیا تو نہیں دیکھتا کہ تیری فوج نے ہم بارہ اسیروں کے گلے ایک رسّی میں باندھ رکھے ہیں ۔ چونکہ دونوں طرف کی بی بیاں مجھ سے قد میں لمبی ہیں اس لیے ان کے کھڑا ہونے کی حالت میں میرا گلا گھٹتا ہے اور میں بار بار پیر اُٹھاتی ہوں ۔ یہ سُن کر یزید نے حکم دیا کہ اس بچی کی گردن سے رسّی ڈھیلی کر دی جائے ۔

مقتل ابن رشید میں ہے کہ یزید نے شمر سے کہا ۔ کہ میں زینبؑ بنت علیؑ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ، کنیزوں کو اس کے سامنے سے ہٹا دے ۔ یہ سُن کر شمر تازیانہ لے کر بڑھا ۔ اور کنیزوں کو جناب زینبؑ کے سامنے سے ہٹانے لگا ۔ اور سب تو ہٹ گئے مگر ایک زنِ حبشہ (فضہ) کسی طرح ہٹنے پر تیار نہ تھی ۔ شمر نے چاہا تازیانے سے اذیت پہنچائے ۔ اس وقت یزید کے پسِ پشت حبشی غلاموں کی ایک جماعت برہنہ تلواریں لیے کھڑی تھی ۔ جناب فضہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا ۔

"اے حبشیوں تمہاری غیرت و حمیت کو کیا ہو گیا کہ تمہاری قوم و قبیلہ کی ایک عورت کو شمر تازیانے سے مارنا چاہتا ہے اور تم چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہو ۔" یہ سنتے ہی وہ حبشی جوان تلواریں سونت کر یزید کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ۔" اے یزید ! شمر کو منع کر دے کہ وہ اس زنِ حبشہ پر ہاتھ نہ اُٹھائے ورنہ ابھی بھرے دربار میں تلوار چل جائے گی ۔" یزید یہ حال دیکھ کر خائف ہو گیا اور شمر کو منع کر دیا ۔ اس وقت جناب زینبؑ کا دل بھر آیا ۔ سرِ حسینؑ کی طرف منہ کر کے کہنے لگیں ۔ اے غیرت دار بھیّا ایک زنِ حبشہ کے بچانے والے تو اس دربار میں اتنے موجود ہیں ۔ مگر تمہاری دُکھیا بہن کو بچانے والا کوئی نہیں ۔ ... جناب زینبؑ سے یزید مخاطب ہو کر

کہنے لگا۔ اے بنتِ علیؑ تمہارے بھائی نے میری بیعت نہ کی تو خدا نے ان کو قتل کرا دیا۔ اور تم لوگوں کو ذلیل و خوار کیا

جناب زینبؑ نے فرمایا۔

"اے شقی! تو جھوٹا ہے۔ خدا نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ ان کا قاتل تو ہے یاد رکھ کہ خاصانِ خدا کبھی ذلیل نہیں ہوتے۔ اور برگزیدگان باری مصیبتوں سے کبھی نہیں گھبراتے ہمارا اجر خدا پر ہے۔ اے یزید! جو مہلت خدا نے تجھے دے رکھی ہے اس پر مغرور نہ ہونا وہ وقت قریب آرہا ہے۔ میرا خدا تجھ سے اس ظلم کا مواخذہ کرے اے یزید تجھے شرم نہیں آتی۔ کہ جس نبیؐ کا تو کلمہ پڑھتا ہے اسی کی اولاد کو ذبح کرتا ہے اور ان کے ناموس کو قید کرا کے سر برہنہ کشادہ رو شہر بشہر تشہیر کرتا ہے۔ جناب زینبؑ کی اس تقریر سے یزید کے دربار میں کہرام بپا ہوگیا۔ ہر شخص آبدیدہ نظر آرہا تھا اور اس کا دل یزید پر نفرین کر رہا تھا۔ یہ حال دیکھ کر یزید نے حکم دیا کہ ان قیدیوں کو زندان میں لے جاؤ۔

أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ۱۱/۱۸ ھود

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ ۲۶/۲۲۷

اٹھائیسویں مجلس

تفسیر آیہ وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ؕ

اور حال اہل حرم و زندان شام

وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۱۵﴾

(۲۶/۲۱۴) الشعریٰ

اور اے رسول تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو (عذابِ خدا سے) ڈراؤ اور جو مومنین تمہارے پیرو ہو گئے ہیں ان کے سامنے اپنا بازو جھکاؤ۔

منقول ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرتؐ نے تمام اولاد عبدالمطلب کو دعوت کے سلسلے میں جمع کیا جب کھانے سے فراغت ہو گئی تو فرمایا۔

"اے قوم خدا کی طرف سے میں تمہارے پاس ایسی چیز لے کر آیا ہوں کہ اگر تم نے اسے قبول کر لیا تو تمہارا دین و دنیا دونوں جگہ بھلا ہو گا۔ میں اس اہم کام کو انجام دینے کے لیے تم میں اپنا ایک وصی و وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ تم میں سے کوئی ایسا ہے کہ اس بوجھ کو بٹائے۔ یہ سن کر سب پر موت کی سی خاموشی چھا گئی اور کسی طرف سے جواب نہ آیا۔ یہ دیکھ کر حضرت علی مرتضیٰؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی۔

یا رسول اللہؐ اس خدمت کو میں انجام دوں گا۔ حضرتؐ نے فرمایا اے علیؑ بیٹھ جاؤ۔ دوسری بار آپ نے پھر وہی کلمات فرمائے۔

پھر حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر وہی عرض کیا۔ آپؐ نے پھر ان کو بٹھا دیا۔ تیسری بار پھر انہی الفاظ کا اعادہ فرمایا۔ اس مرتبہ بھی حضرتؑ نے وہی جواب دیا۔ اور وہ سب لوگ ہنسی مذاق کرتے ہوئے اٹھ کر

چلے گئے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ بغیر اپنا وصی اور خلیفہ بنائے دُنیا سے چلے گئے وہ غلط کہتے ہیں۔ حضرتؐ نے بعثت کے پہلے ہی روز اپنی خلافت کے مسئلے کو پیش کر دیا تھا۔ اور بھرے مجمع میں حضرت علی علیہ السلام کو یہ کہہ کر زبان دے دی تھی۔

یَا عَلِیُّ اَنْتَ وَصِیِّیْ وَ وَزِیْرِیْ وَ خَلِیْفَتِیْ ایسے ضروری امر کو بغیر انجام دیئے چھوڑ کیسے سکتے تھے۔ رسولؐ کا ذکر ہی کیا دُنیا کی سلطنتوں کا یہ قاعدہ ہے کہ بادشاہ کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ ولیعہدی کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔

جو وعدہ اپنی وصایت و خلافت کا آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام سے دعوت ذوالعشیرہ میں کیا تھا، ارباب عقل و انصاف ذرا بتائیں کہ اس کا پورا کرنا لازم تھا یا نہیں۔ جب آپ کا پہلا ہی وعدہ غلط ہوتا تو اور وعدوں پر کیوں کر اعتبار ہوتا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے جتنے وعدے اُمورِ دین کے متعلق تھے ان سب کا شمار آخرت سے تھا نہ کہ اس دُنیا سے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ جتنے اعمال ہیں۔ ان کے تمام ثواب جنت، حور، کوثر، سلسبیل وغیرہ سب کے سب بصورت وعدہ تھے اور یہ سب وعدے آخرت میں پورے ہونے والے تھے۔ نہ اس دُنیا میں یہاں پورا ہونے کے قابل تھا تو وہی ایک وعدہ جو دعوت ذوالعشیرہ میں حضرت علی علیہ السلام سے کیا تھا۔ اگر یہ وعدہ پورا نہ ہوتا اور وعدوں پر کیا بھروسہ کیا جائے۔ پس اس صورت میں آپ کی رسالت میں لوگوں کو بہت سے شبہات پیدا ہو جاتے۔ آیت نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (۵/۶۷ مائدہ) یعنی اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو گویا تم نے رسالت کا کوئی کام انجام ہی نہ دیا۔

ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کتاب اور حکمت کی تعلیم دینے کے لیے آئے تھے اور حکمت نام ہے فکر و عمل کا یعنی کسی چیز کو بذریعہ فکر پیدا کرنا اور پھر اس کو بذریعہ عمل جاری رکھنا پس اسلام جو دراصل اصلاح روحانی اور نظامِ جسمانی کا نام ہے۔ فکر و عمل کے دو ستونوں پر قائم ہے۔ جب آنحضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے اور وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ○ (۲۶/۲۱۴ شعراء) نازل ہوئی اور آپ نے سب کنبہ کو جمع کر کے دعوت طعام اور اسلام دی تو صرف حضرت علی علیہ السلام نے پیغمبرؐ کی نصرت کا علانیہ اقرار کیا اور پیغمبرؐ نے اسی وقت ان کو اپنا وصی و وزیر اور خلیفہ بنایا تو اس کا منشا یہ تھا کہ امر فکر کے اظہار کو جسے اصطلاح شریعت میں تبلیغ رسالت کہتے ہیں، پیغمبرؐ نے اپنی ذات خاص کے متعلق رکھا اور اس تبلیغ رسالت کو بذریعہ عمل جاری کرنا اور قائم رکھنا علی علیہ السلام کے سپرد کیا جس کو اصطلاح شریعت میں منصبِ امامت

کہتے ہیں۔
علیؑ و نبیؐ کے تمام واقعات زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور جس طرح انسانیت کے دائرے میں فکر عمل سے اور عمل فکر سے جُدا نہیں اسی طرح ان دونوں کے سوانح عمری بھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں۔
ظاہر ہے کہ ابتدائی دعوت اسلام کے وقت پیغمبرؐ نے علی مرتضیٰؑ کو جو امر سپرد کیا یا جس امر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آنحضرتؐ نے علی علیہ السلام کو مقرر کیا۔ آپ اس پر آخر عمر تک قائم رہے۔ مثلاً امر رسالت میں پہلے مسئلہ توحید تھا۔ جو فکر سے متعلق ہے۔ اور جس کو پیغمبرؐ نے سب سے پہلے ظاہر کیا۔ اسی مسئلہ توحید کو بذریعہ عمل جاری کرنا شرک کو مٹانا تھا۔ اور یہ ممکن نہ تھا جب تک کہ وہ لوگ قتل نہ کئے جاتے جو ذاتِ باری میں دوسروں کو شریک قرار دیتے تھے۔ اسلام دو قدم آگے نہ بڑھتا۔ جناب علیؑ نے اپنے عمل سے شرک کو مٹایا۔
جیسے یہ امر یقینی ہے کہ آنحضرتؐ نے مسئلہ توحید کو ظاہر کیا ویسے ہی یہ امر بھی یقینی ہے کہ پیغمبرؐ نے بذات خود کفار و مشرکین کو قتل نہیں کیا۔ البتہ یہ کام حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پایا۔ انتہا یہ ہے کہ یوم فتح مکہ کعبہ میں بت شکنی بھی آنحضرتؐ نے علیؑ کے ہاتھ سے کرائی اور اپنے دوش مبارک پر سوار کر کے کرائی تاکہ اس امر میں کوئی شبہ نہ رہے۔ کہ احکام اسلام کی تعمیل کرنے والا اور ان کا جاری اور قائم رکھنے والا علیؑ کے سوا اور کوئی نہیں اور کار رسالت ان کے سوا دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔ پیغمبرؐ کی قوت فکری اور علیؑ کی قوتِ عملی نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا اور مختلف معرکوں میں ان کے پجاریوں اور امر توحید میں مزاحمت کرنے والوں کو نیست و نابود کیا ہے۔ مراد ہے جاء الحق و زھق الباطل سے نبی اور علیؑ اس آیت کے مصداق ہیں اور ایسا شدید اتصال رکھتے ہیں کہ جُدائی ممکن ہی نہیں۔ نبیؐ حق کو لائے اور علیؑ نے باطل کو مٹایا۔
جب خانہ کعبہ بتوں سے اور مکہ ان کی پرستش کرنے والوں سے پاک ہو گیا تو پیغمبرؐ نے طائف کے بت توڑنے کے لیے علی مرتضیٰؑ کو بھیجا۔ اور آپ نے وہاں کے تمام بت توڑ کر گرا دیئے۔ اور بت شکنی کا تمام کام آپ کے ہاتھوں سے ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی دونوں بزرگوار اپنے جد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ بت شکنی میں ہوئے۔ ان میں سے ایک نے حکم کیا اور دوسرے نے عمل۔
علی علیہ السلام کے سوا جتنے لوگ پیغمبرؐ کے ساتھ تھے سب بتوں کی پرستش کیے ہوئے تھے بعض صحابہ کی عمر کا بہت بڑا حصہ اسی شغل میں گزر چکا تھا۔ اگر علیؑ کے سوا دوسرا بت شکنی پر مامور ہوتا تو اس کے دل میں

بتوں کی پہلی دنعت کی وجہ سے ضرور جھجک پیدا ہوتی اور بے دھڑک یہ خدمات انجام نہ دے سکتا۔ اس طبعی معاملہ کا اس وقت بھی تجربہ کیا جاسکتا ہے جب کوئی کافر مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کو ایسے کام کرنے میں کراہت ہوتی ہے جو اسلام میں تو جائز ہوتے ہیں مگر دیگر ادیان میں مکروہ۔ مثلاً کسی ہندو کو مسلمان کرنے کے بعد اگر گائے کا گوشت کھانے کو کہا جائے تو یقیناً وہ گھبرا جائے گا اور اگر کھائے گا فوراً قے کر دیگا اور اس کی حالت مدت دراز تک رہے گی۔ اس کے برخلاف حالت اس مولود کی ہے جو فطرتِ اسلام پر پیدا ہوا ہی ہو اور دائرہ اسلام میں نشوونما پا کر اور اسی میں بوڑھا ہو کر مرا ہو۔ بچپن سے لے کر آخر عمر تک معصوم رہا ہو۔ ان دونوں حالتوں میں علیؑ اور غیر علیؑ کی صورت ایسی نظر آجاتی ہے جیسے آئینہ میں کوئی صورت دیکھے۔

آنحضرتؐ نے جب پہلی دعوتِ اسلام دی تو جان لیا تھا کہ مسئلہ توحید کو قائم کرنے کا عمل میرے اور علیؑ کے سوا کوئی نہ کرسکے گا اور یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ جیسے بت پرستی میں نے کبھی نہیں کی علیؑ نے بھی نہیں کی۔ علیؑ بے دھڑک اس کام کو انجام دیں گے جو میں کرانا چاہوں گا۔ کیونکہ اس کی اور میری فطرت ایک ہی ہے۔

وقتِ ہجرت آنحضرتؐ نے سب مسلمانوں کو پہلے سے مدینہ روانہ کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور علی علیہ السلام باقی رہ گئے۔ وقتِ ہجرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور اپنی ردائے خاص جو شہر حضرالموت سے بطور ہدیہ آپ کے لیے بھیجی گئی تھی اور جس کو لوگ پہچانتے تھے کہ حضرتؐ کی ہے آپ کو اڑھا دی تاکہ کفار یقین رکھیں کہ پیغمبرؐ خود سو رہے ہیں۔

کوئی پیغمبرؐ ایسا نہیں کرتا کہ اپنا لباس پہنا کر دوسرے کو اپنے ہونے کا یقین دلائے بلکہ اگر کوئی پیغمبرؐ کے ساتھ التباس کرے اور اپنے کو پیغمبرؐ بنا کر دکھائے تو واجب القتل ہو جائے گا۔ البتہ پیغمبرؐ اسی کے لیے ایسا کرسکتا ہے جس کو مثل اپنی ذات کے سمجھتا ہو۔ رسولؐ کا مکہ سے ہجرت کر جانا اور علیؑ کا تین روز تنِ تنہا رہنا ایسی ہی تھا جیسے پیغمبرؐ اس زمانہ میں جبکہ کوئی مسلمان نہ تھا تنِ تنہا خدا کا نام لینے والے ہیں۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ شبِ ہجرت ایسے خورد سال نوجوان کو جس کی پرورش و تعلیم پیغمبرؐ نے بطور اپنے فرزند کے کی ہو اور جس نے دنیا میں کسی قسم کا لطف نہ اٹھایا ہو ایسے خطرناک مقام پر کیوں چھوڑ گئے جب کہ قتل ہو جانے کا قوی امکان تھا۔ نیز کفار کی اس لعن کا بھی خیال تھا کہ خود تو جان بچا کر چلے گئے اور ایک نوجوان کو اپنا فدیہ بنا دیا۔ حضرت ابوبکر کو جو سن رسیدہ اور زندگی کا مزہ چکھے ہوئے تھے۔ علیؑ کے بجائے اپنے بستر پر نہ لٹایا جب کہ ان کے تعلقات بھی مشرکین و کفار سے استوار تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی جانشینی کا حق صرف اس کو دینا چاہتے تھے جس نے دعوت ذوالعشیرہ میں سب سے پہلے اپنے

کو نیابت کے لیے پیش کیا تھا۔
رسولؐ کا علیؑ کو اپنی جگہ لٹانا پیغمبرؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔ کیونکہ لعلم نبوت معلوم تھا کہ علیؑ راز کی بات کسی کو نہ بتائیں گے۔ اور ان کا نفس اتنا قوی ہے کہ اضطراب اس میں راہ نہ پائے گا۔ ایسی ہی عدیم المثال قسم کی جاں نثاری کی بناء پر رسولؐ نے علیؑ کی نسبت کہا ہے لحمک لحمی ودمک دمی کیا جعفر و عقیل جو حضرت علیؑ کے حقیقی بھائی تھے۔ بنظر مساوات فی القرابتہ اس قول کے مصداق ہوسکتے ہیں۔ ہرگز نہیں پیغمبرؐ نے کب ان کو اس طرح پالا تھا جس طرح علیؑ کو۔ جب علیؑ پیدا ہوئے پیغمبرؐ نے اپنی گود میں لیا اور ہمیشہ ان کی نگہداشت کرتے رہے۔
زمانۂ قحط میں۔ حضرت ابو طالبؑ سے کر ان کی پرورش کی ہے۔ بے شک یہی بدلہ اس پرورش کا تھا جو حضرت ابو طالبؑ نے پیغمبرؐ کو حضرت عبد المطلب سے لے کر کی تھی۔ پیغمبرؐ نے جب سے علیؑ کو لیا پھر جدا نہیں کیا اور اپنی ذاتی کمائی جس طرح اپنے اُوپر صرف کرتے رہے ویسے ہی علیؑ پر صرف کی۔ پس جس طرح پیغمبرؐ کا گوشت پوست پیدا ہوا اسی طرح علی علیہ السلام کا۔ قبیح اور حسن افعال جسمانی سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ امر مسلم ہے کہ پیغمبرؐ سے کوئی امر قبیح سرزد نہیں ہوا۔ پس اس ارشاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح میرے گوشت پوست سے کوئی امر قبیح سرزد نہ ہوگا۔ اسی طرح اے علیؑ تیرے گوشت پوست سے بھی نہ ہوگا۔
پیغمبرؐ انتہائی عدل کے ساتھ ہر کام کرتے تھے جب شروع دعوت اسلام کے وقت پیغمبرؐ علیؑ کو اپنا وزیر مقرر کر چکے تھے تو سوائے علیؑ کوئی اس کا مستحق نہ تھا کہ جس طرح مکہؐ میں آنحضرتؐ خود وقت ہجرت اُٹھے بجائے ان کے علیؑ سو رہے تو وہی جوان ان کا وزیر ہوا۔ اگر آنحضرتؐ کسی کو بجائے علیؑ کے بستر پر سلاتے اور دوسرے کی جان خطرے میں ڈالتے تو یہ امر منافی عدالت ہوتا اگر کسی دوسرے کو اپنی جگہ لٹاتے تو لوگ کہتے پیغمبرؐ اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان بچاتا ہے اور دوسروں کو معرض ہلاکت میں ڈالتا ہے: یہی خیال اس کے غیر کے دل میں بھی ہوتا البتہ ایسے شخص کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتا جو علیؑ کا سا کامل الایمان ہو۔ اور جو حفاظت پیغمبرؐ کے مقابل کسی خطرہ کی پرواہ نہ کرتا ہو۔ باوجودیکہ ردلئے حضر الموت یہ اشارہ کر رہی تھی کہ موت حاضر ہے مگر پھر بھی وہ اپنی جان بیچے اور خدا کی حفاظت پر بھروسہ کئے انتہائی اطمینان سے سو رہا تھا۔
آنحضرتؐ کو علیؑ کی سچی جاں نثاری اور قدیم المثال شجاعت پر پورا بھروسہ تھا۔ آپ جانتے تھے کہ دوسرا دہشت کے مارے اس مقام پر لیٹ نہ سکے گا اور افشائے راز کر دے گا۔ اسی وجہ سے علیؑ کو تجویز کیا اور اپنی جان کی کنجی اُن کے سپرد کر کے تشریف لے گئے۔ پیغمبرؐ نے جو فکر کی تھی۔ اور اپنی حفاظت کی جو تدبیر

سوچی تھی اس کو علیؑ نے اپنے عمل سے ویسا ہی انجام دیا جیسا ان کی ذات سے توقع تھی۔ اگر حضرت علیؑ اس وقت تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی کر جاتے تو بیشک پیغمبرؐ کفار کے ہاتھوں قتل ہو جاتے اور ان کے ساتھ ہی دین اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ تمام اُمت کو حضرت علیؑ کے اس عمل پر نظر رکھ کر اس کا قائل ہونا چاہیے کہ لولا علیؑ لہلك الرسول۔ پس جس نے اسلام اور رسولؐ کی حفاظت اپنے عمل سے کی۔ کیا وہ بعد رسولؐ امت رسول کا امام بننے کے قابل نہ تھا۔ جو عمل اس وقت کیا دراصل وہی حقیقت امامت ہے کیونکہ امام اسی کو کہتے ہیں جو تبلیغ پیغمبر کو قائم رکھے۔ شروع دعوت اسلام کے وقت پیغمبرؐ نے جو علیؑ علیہ السلام کو وزیر مقرر کیا تھا۔ وہ اقرار فکری تھا۔ اور شب ہجرت اپنی جگہ پر چھوڑنا خلیفہ بنانے کا عمل تھا جانِ پیغمبرؐ کی حفاظت کا واقعہ ایک عجیب واقعہ ہے۔ جس کے ضمن میں حفاظت جان ابوبکر بھی ہو گئی۔ اگر علی علیہ السلام اس وقت ذرا بھی بے احتیاطی کر جاتے تو آنحضرتؐ کے ساتھ ابوبکرؓ بھی قتل ہو جاتے کیا علی علیہ السلام کا یہ احسان قابلِ فراموشی تھا۔ علیؑ کے ساتھ آنحضرتؐ کا بھی احسان مند ہونا چاہیے۔ کیونکہ آپ اگر کسی اور کو علیؑ کی جگہ مقرر کر گئے ہوتے تو ابوبکر بھی مارے جاتے تو پھر سقیفہ میں نہ ان کو خلافت ملتی نہ ان کے بعد حضرت عمرؓ کو۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے، کہ جس طرح کلام عرب میں بلحاظ فصاحت و بلاغت قرآن کا مرتبہ سب سے اعلیٰ ہے۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کو بھی ابلغ و افصح مانا گیا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی فصیح و بلیغ کتاب کو سوائے افصح و ابلغ کے دوسرا بھی کماحقہ سمجھ سکتا ہے۔ علی علیہ السلام میں یہ فصاحت و بلاغت کیسے پیدا ہوئی؟ یہ سچ ہے کہ علیؑ کی دماغی ساخت قدرتاً ایسی تھی، لیکن اس پر جلا اس تعلیم کی بدولت ہوئی۔ جو پیغمبرؐ نے اُن کو دی تھی جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا پیغمبرؐ اس کے متعلق ہر ایک بات بتلاتے اور سمجھاتے گئے۔ ایسے شخص کے متعلق کون گمان کر سکتا ہے کہ قرآن کے معنی سمجھنے میں اس سے غلطی ہو سکتی ہے یا ان سے بہتر کوئی آیات قرآنی کی تاویل کر سکتا ہے کہ قرآن کو لوگوں تک پہنچانا رسولؐ کا کام تھا اور مفہوم و مقصود بتانا امام کا کام تھا۔ اسی وجہ سے رسولؐ نے فرمایا اے علیؑ میں نے جس طرح تنزیل قرآن پر جنگ کی ہے ویسے ہی تم تاویل قرآن پر کرو گے۔

سورہ برأت کی تبلیغ کو پہلے آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا پھر موافق وحی درمیان سے لوٹا کر علی علیہ السلام کو بھیجا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آیاتِ قرآنی کے معنی جیسے علی علیہ السلام سمجھتے تھے کون سمجھ سکتا تھا۔ مزید یہ اندیشہ تھا کہ اگر کسی نے ان آیات کا مفہوم یا مصداق پوچھ لیا۔ تو ابوبکرؓ تسلی بخش جواب نہ دے سکیں گے، علی علیہ السلام کے متعلق یہ خدشہ نہ تھا وہ پیغمبرؐ کی طرح صحیح مراد جانتے تھے۔ سلاطین ہمیشہ ایسے

ہی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں جس کی قوتِ فکر و عمل پر ان کو اعتماد ہوتا ہے۔ اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ وہ شاہی نوشتہ کا مطلب سمجھا دے گا۔

پہلے ہی علی علیہ السلام کو کیوں نہ بھیجا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر پیغمبرؐ کسی کو امرِ تبلیغ کے لیے معین کر بھی دے اور خدا نہ چاہے تو اس معاملہ میں پیغمبرؐ کی چل نہیں سکتی۔ اس سے بڑا عقدہ یہ حل ہوا کہ جو لوگ رسولؐ پر اتہام لگاتے ہیں۔ کہ وہ محبتِ علیؑ میں ایسے چور رہتے کہ ہر بات ان ہی کے لیے چاہتے تھے ان کی بات کا جواب ہو جائے۔

بھلا پیغمبرؐ مرضئ خدا کے بغیر کیسے چل سکتا ہے۔ نیز یہ کہ جب ایک سورہ کی تبلیغ بغیر حکم نہ ہو سکی تو جانشینی رسولؐ تو بہت دور کی بات ہے۔ پس جب رسول اللہؐ کو اختیار نہ دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے جسے چاہیں امرِ خلافت سپرد کر دیں تو بھلا مسلمانوں کے اجماع پر اسے کیسے موقوف رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ اطمینان بخش وہ واقعہ ہے۔ جب رسولؐ نے علی علیہ السلام کو ہدایت کے لیے یمن بھیجا تھا اور بغیر جنگ وہاں کے لوگ ایمان لے آئے تھے۔ اور جب نصارانِ نجران سے جزیہ وصول کرتے ہوئے حجۃ الوداع میں آ شریک ہوئے کیا یہ واقعات ظاہر نہیں کرتے کہ پیغمبرؐ نے اپنی طرف سے کارِ تبلیغ رسالتؐ اور اس کا قائم و جاری رکھنا علیؑ مرتضیٰ کے سپرد نہیں کیا تھا۔ اور آپ کی قوتِ عمل رسولؐ کی قوتِ فکر کے ساتھ ساتھ کام نہیں کر رہی تھی۔

دینِ اسلام مسلمانوں کا بنایا ہوا دین نہیں بلکہ خدا و رسولؐ کا بنایا ہوا ہے۔ پس حقیقی خلیفۂ رسولؐ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا و رسولؐ بنائیں نہ کہ وہ جس کو مسلمان اجماع کر کے بنالیں ایسا شخص خلیفۂ رسولؐ نہ ہو گا بلکہ خلیفۃ الناس کہلائے گا۔

اسلام کا بادشاہ اور رسول کا خلیفہ تو وہی شخص ہو سکتا ہے۔ جس میں وہ تمام خصوصیات ہوں جو رسولؐ میں پائی جاتی ہوں۔ اور جس نے امرِ فکری رسولؐ کو اپنی قوتِ عمل سے کامل اور تمام کیا ہو۔ ایسا ہی شخص مرکزِ اسلام کو قائم رکھ سکتا ہے۔

شرافتِ نسبی جس کو عرب خلافت و سلطنت کے لیے بہت ضروری مانتے تھے جو رسول اللہؐ کی تھی وہی علیؑ مرتضیٰ کی تھی۔ وہ بھی عبدالمطلب کے پوتے تھے اور یہ بھی، وہ بھی بنی ہاشم سے تھے اور یہ بھی رسولؐ خدا بعد پیدائش فوراً کعبہ میں تشریف لائے اور علیؑ کو آنحضرتؐ نے گود میں لے لیا۔ بچپن میں صلبی باپ کے یہاں دونوں نے پرورش پائی۔ جس کمائی سے رسولؐ کا گوشت پیدا ہوا اسی سے علیؑ نے نشو و نما پائی۔ جس جگہ پیغمبرؐ پلے وہیں علیؑ پلے جس مکان میں وہ رہے وہیں یہ رہے۔ دونوں نے کسی وقت بھی شرک نہیں کیا۔ ایک زمانہ

ایسا تھا کہ رسولؐ جوان تھے اور علیؑ کم سن تھے اور کوئی مسلمان نہ ہوا تھا۔ اس زمانہ میں سوائے رسولؐ اور علیؑ کے کوئی حامیِ توحید مکہ میں نہ تھا۔ ایک زمانہ ہجرت کا وہ تھا جبکہ سب مسلمان اور آنحضرتؐ مکہ سے ہجرت کر گئے تھے اور علیؑ کے سوا توحید پرست اور حامیٔ اسلام کوئی دوسرا مکہ کے اندر نہ تھا۔

جس طرح پیغمبرؐ آخری پیغمبر ہیں اسی طرح علیؑ آخر مہاجر ہیں۔ اشاعت دین میں جیسے پیغمبرؐ کی جان جوکھوں میں پڑی ویسے ہی علیؑ کی اگر اپنی زوجہ کی وجہ سے پیغمبرؐ نے فائدہ حاصل کیا تو علیؑ نے بھی اپنی زوجہ کی روحانی وجاہت سے فائدہ اُٹھایا۔ جس چادر کو رسولؐ نے اوڑھا اسی کو علیؑ نے اور جس مرکب پر رسولؐ سوار ہوئے اسی پر علیؑ سوار ہوئے ناقہ غضبا جس طرح رسولؐ کی سواری میں رہا۔ اسی طرح علیؑ کی سواری میں بھی رہا۔ ذوالفقار جو رسولؐ کے لیے آسمان سے نازل ہوئی تھی وہ رسولؐ نے علیؑ کو عطا کر دی اسی طرح جو عمامہ رسولؐ سر پر رکھتے تھے اور بمنزلہ تاج تھا بعد رسولؐ وہی علیؑ کو ورثہ میں ملا۔ جو اسلحہ رسولؐ کے تھے وہی علیؑ کے تھے جس طرح پیغمبرؐ کو کسی جنگ میں ہراس و گھبراہٹ نے نہیں گھیرا اسی طرح علیؑ بھی کبھی نہیں گھبرائے جس طرح رسولؐ بحالت جنابت مسجد میں جا سکتے تھے چونکہ علیؑ نفسِ رسولؐ تھے وہ بھی جا سکتے تھے۔

لہٰذا سوائے منصب رسالتؐ اور صفاتِ نبوتؐ اور تمام فضائل اور مناقب میں حضرت علی علیہ السلام آپ کے شریک تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے بیٹے بھی رسولؐ کے بیٹے قرار پائے۔ نبیؐ نے اپنی پیاری بیٹی علیؑ کے سپرد کی تھی۔ علی علیہ السلام نے اپنی اولاد پیغمبرؐ کے سپرد کر دی تھی۔

افسوس صد افسوس جس قدر پیغمبرؐ سے علیؑ کو زیادہ قربت تھی۔ اسی قدر لوگوں نے احترام کو مٹانے میں زیادہ کوشش کی۔ رفتہ رفتہ معاویہ وغیرہ کی کوششوں سے ایک وقت ایسا آگیا کہ لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ جناب فاطمہ صلوٰۃ اللہ علیہا حضرت رسولؐ خدا کی کون تھیں اور حسنین علیہم السلام کو آنحضرتؐ سے کیا رشتہ تھا۔ چنانچہ صاحب کنز المصائب لکھتے ہیں۔

کہ جب اہل حرم زندانِ شام میں تھے تو ایک روز حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے زندان بان سے فرمایا۔

"اے شخص تو کس دین کا پیرو ہے"؟ اس نے کہا میں مسلمان ہوں۔ آپ نے فرمایا۔

"تو یہ بھی جانتا ہے کہ تیرے رسولؐ کی اولاد میں کون کون ہے"؟ اس نے کہا ہمارے رسولؐ کی اولاد ہی نہ تھی۔ فرمایا۔

"اے شخص تو نے جناب فاطمہ زہراؑ کا نام نہیں سنا"؟

اس نے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہیں؟ آپؑ نے فرمایا۔

"نہ حسنؑ و حسینؑ کو بھی جانتا ہے"۔ اس نے کہا صرف حسینؑ کے متعلق اتنا جانتا ہوں کہ وہ مکہ کا ایک باغی تھا۔ جس نے یزید بن معاویہ پر خروج کیا تھا۔ یزید کی فوج نے اس کو قتل کر دیا۔ یہ سُن کر آپ رونے لگے اور دیر تک اسے تمام واقعات اور تعلقات سمجھاتے رہے۔ جب اس کو حقیقتِ حال سے آگاہی ہوئی تو رونے لگا اور منہ پر طمانچے مارنے لگا۔

پھر ہاتھ باندھ کر عرض کی یابن رسولؐ اللہ جو سختیاں میں نے نادانستہ طور پر آپ پر کی ہیں۔ ان کو معاف فرمایئے۔ آہ مجھے علم نہ تھا کہ اس قید خانہ میں اولادِ رسولؐ بند ہے۔ خدا یزید بن معاویہ کو غارت کرے اے فرزندِ رسولؐ! آج ہی سے میں اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوتا ہوں۔

منقول ہے کہ ظالموں نے اہلِ حرم کو ایسے تنگ و تاریک قید خانہ میں مقید رکھا تھا کہ جہاں نہ ہوا کا گزر تھا نہ روشنی کا۔ آہ! ایسے مقام پر بے کس بی بیوں اور یتیم بچوں نے جس طرح تڑپ تڑپ کر اپنے دن اور راتیں گزاریں اس کا بیان ناممکن ہے۔

ایک روز امام زین العابدین علیہ السلام کا دل گھبرایا تو آپ طوق و زنجیر سنبھالے قریب دروازۂ زندان تشریف لائے اور زندان بان سے فرمانے لگے۔

"اے شخص! اس تاریکی میں پڑے پڑے میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے زندان سے باہر نکل کر تازہ ہوا کھا لوں۔"

وہ شخص اہلِ دل تھا۔ رحم آگیا اور زندان کا دروازہ کھول دیا۔ حضرتؑ بیڑیاں اور طوق اُٹھائے قریب درِ زندان ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے بیٹھ گئے۔ اتفاقاً محبانِ اہلِ بیت میں سے ایک شخص اِدھر سے گزرا وہ مدینہ میں آپ کی خدمت میں حاضر بھی ہو چکا تھا۔ آپ نے اس کو پہچان کر اپنی گردن جھکا لی۔ آہ! دُنیا میں کوئی عزیز ذلیل نہ ہو۔ جب کوئی شناسا ایسی حالت میں مل جاتا ہے تو سخت ندامت ہوتی ہے وہ شخص دیر تک آپ کو دیکھتا رہا۔ دل میں کہتا تھا یہ صورت تو خاندانِ رسالتؐ سے ملتی جُلتی ہے۔ مگر ان سے اور خاندانِ رسالتؐ سے کیا تعلق؟

جب ضبط نہ ہو سکا تو پاس آکر کہنے لگا۔ "اے اسیرِ بلا تم کس خاندان سے ہو اور کس جرم میں قید ہوئے ہو۔ حضرتؑ نے آہ سرد بھر کر فرمایا۔

"اے شخص کیا بتائیں کہ ہم کون ہیں۔ بس اب تو اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یزید ابن معاویہ کے قیدی ہیں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا۔" مدینہ رسولؐ کے رہنے والے ہیں اور خاندانِ رسولؐ سے ہیں یہ سنتے ہی اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا اور بہت غور سے حضرتؑ کے چہرے پر نظر کر کے کہنے لگا۔ کیا آپ

علیؑ بن الحسینؑ ہیں۔ فرمایا۔" ہاں میں وہی ہوں۔ اب تو اس کو تابِ ضبط نہ رہی۔ پیر دل پر سر رکھ کر کہنے لگا۔" ہائے میرے سید و آقا غلام آپ پر سے فدا ہو۔ آپ کو کس جرم میں ظالموں نے قید کیا ہے۔ مولا کاش یہ بیڑی میرے پاؤں میں پڑی ہوتی۔ یہ خار دار طوق میں پہنے ہوتا۔ آہ مولا! تیری غربت اور بے کسی پر نثار یہ کیا انقلاب ہوگیا۔ میرے سید و مولا حضرت ابو عبداللہ الحسینؑ کہاں ہیں۔" یہ سن کر بیمار کربلاؑ اس کے گلے مل کر زار زار رونے لگے۔ اور تمام واقعات بیان کیے۔ ابھی کلام ختم نہ ہوا تھا کہ نہایت نحیف و نزار آواز زندان کے اندر سے آئی۔

" بیٹا سید سجاد بڑی دیر لگائی اتنی دیر جدائی کی تاب نہیں۔" یہ سنتے ہی حضرتؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سے فرمایا۔

" اے شخص اب میں رخصت ہوتا ہوں کیونکہ میری پھوپھی جناب زینبؑ قید خانہ میں یاد فرما رہی ہیں۔"

جب آپ اندر پہنچے تو جناب زینب نے بے اختیار گلے میں باہیں ڈال دیں اور آبدیدہ ہو کر فرمایا بیٹا باہر تم کس سے گفتگو کر رہے تھے۔ عرض کی ہمارا ایک دوست ادھر آنکلا تھا میں اس سے باتیں کرنے لگا تھا آہ! آہ! ذریت رسولؐ اپنے ہمدردوں کو کیسی ترس گئی تھی۔ دوست کا نام سنتے ہی جناب زینبؑ کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہوئے۔ فرمانے لگیں۔

" بیٹا وہ بندۂ مومن چلا گیا یا ابھی ہے۔ اگر ہو تو ذرا بلالو زینبؑ کو بھی کچھ کہنا ہے"۔ امام علیہ السلام نے آواز دے کر فرمایا۔

" اے شخص ذرا زندان کے قریب آ۔ میری پھوپھی تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔" جب وہ بندۂ مومن قریب آیا تو جناب زینبؑ نے فرمایا۔" بیٹا سید سجاد پہلے تو ہمارے اس دوست کو میرا سلام کہو۔" یہ سننا تھا کہ وہ شخص رونے لگا اور منہ پر طمانچے مار کر کہنے لگا۔ اللہ اللہ غلاموں کا یہ مرتبہ ہوگیا کہ شہزادیاں ان پر سلام بھیجتی ہیں۔ مولا ثانی زہراؑ کی خدمت میں میرا سلام نیاز پہنچا دیجئے اور میری طرف سے اٹھارہ بنی ہاشم کا پرسا دیجئے اور یہ فرما دیجئے کہ اگر کوئی خدمت اس غلام کے لائق ہو تو بیان فرمائیے تاکہ بجا لاؤں۔

جناب زینبؑ نے فرمایا! اے بھائی دختر زہراؑ دو باتیں کہنا چاہتی ہیں؟"

اول یہ کہ جب ٹھنڈا پانی پینا تو اپنے مظلوم آقا کی پیاس یاد کر لینا۔

دوسرے یہ کہ ہم بے کس اپنے شہیدوں پر جی بھر کر نہیں رو سکے۔ لہٰذا مقتضائے محبت یہ ہے کہ ہمارے دوست صف ماتم بچھا کر اپنے مظلوم امامؑ کے مصائب کو یاد کر کے گریہ و بکا کریں۔ یہ سن کر وہ بندۂ مومن دہاڑیں

ماتم کر کے رونے لگا۔ اور پھر سلامِ آخر بجا لا کر روانہ ہوا۔

منقول ہے کہ ایک روز امام زین العابدین علیہ السلام نے دیکھا کہ جناب زینبؑ بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہیں۔ آپ بے چین ہو گئے اور قریب جا کر فرمایا۔

"اے پھوپھی اماں مجھے زندگی میں پہلا موقع ہے کہ آپ جیسی عاشقِ خدا بی بی کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے سخت سے سخت علالت میں بھی بیٹھ کر نماز نہیں پڑھی۔ فرمائیے اس کا کیا سبب ہے" فرمایا۔

"بیٹا اس کا سبب نہ پوچھو تم سے نہ سنا جائے گا"

فرمایا، نہیں میں سننا چاہتا ہوں۔ جب جناب زینبؑ مجبور ہوئیں تو جناب اُمّ کلثومؑ سے فرمایا "بہن تم ذرا بیمار بھتیجے کا بازو پکڑ لو ایسا نہ ہو کہ غش کھا جائیں اس کے بعد آپؑ نے فرمایا۔

"سنو بیٹا جو کھانا یزید کے یہاں سے ہم اسیروں کے لیے آتا ہے وہ مقدار میں اتنا کم ہوتا ہے کہ کسی طرح کافی نہیں ہوتا۔ آج تک میں اپنے حصّہ کا کھانا بچوں کو کھلاتی رہی ہوں۔ بیٹا جب تک بدن میں جان رہی کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ اب اس پر قادر نہیں۔" یہ سننا تھا کہ بیمارِ کربلا آہ کا نعرہ مار کر بیہوش ہو گئے۔ اولادِ رسولؐ کے ستانے میں ان ظالموں نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

چونکہ یہ زندان محل یزید کے قریب تھا اس لیے ان بیکس قیدیوں کو بلند آواز سے رونے کی اجازت نہ تھی۔ آہ نازوادا کے پلے بچے اس زندان کی تاریکی میں کیسے گھبراتے ہوں گے۔ آب سرد پینے اور تازہ ہوا کھانے کو ترس گئے تھے۔ ان بچوں میں سب سے زیادہ تباہ حال جناب سکینہؑ کا تھا۔ آہ باپ کی چھاتی پر سونے والی بچی جب رات کو خاک پر سوتی تھی اور اپنے باپ کی یاد میں بلبلا کر روتی تھی تو سیدانیاں تڑپ جاتی تھیں۔ جناب زینبؑ دل بہلانے کے لیے کربلا کی کہانی سناتی تھیں۔

ایک روز سکینہؑ یادِ پدر میں بہت بے چین تھیں اور بار بار جناب زینب سے کہتی تھیں۔ بابا جان کو بلاؤ ہائے مجھے اس زندان میں چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ اسی حالت میں نیند آ گئی۔ خواب میں امام علیہ السلام کو دیکھا تو گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

جناب زینبؑ نے پوچھا "بیٹی کیا دیکھتی ہو۔؟"

تو رو رو کر کہنے لگیں۔ "ہائے میرے بابا جان کہاں چلے گئے ابھی تو یہاں تھے۔ مجھے چھاتی سے لگا کر کہہ رہے تھے۔ سکینہ گھبراؤ مت۔ تمہاری مصیبت کا زمانہ ختم ہوا۔ کل رات تم ہمارے پاس ہو گی۔ یہ سن کر سیدانیوں میں ایک کہرام بپا تھا۔ اور سب نے سمجھ لیا کہ سکینہ سے دائمی جدائی ہے۔ چنانچہ اسی رات کو اس یتیم حسینؑ سے

انتہائی مصائب و آلام برداشت کر کے زندانِ شام میں انتقال کیا۔ اس وقت بیکس سیدانیوں پر کیا گزری ہوگی۔ کس کی طاقت ہے کہ اسے بیان کرے۔ زندان میں ایک کہرام بپا تھا۔ جب یزید کو اطلاع ہوئی تو اس نے اپنی کنیز کے ذریعے پیغام بھیجا کہ کفن و دفن کا جو سامان درکار ہو منگا لو۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا ہمیں تجھ سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک چھوٹی سی قبر کی جگہ درکار ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے اسی خون بھرے کرتے میں اس امانتِ حسینؑ کو سپردِ خاک کر دیا۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۱۱/۱۸ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۲۶/۲۲۷

انتیسویں مجلس

تفسیر آیہ قد جاء کم من اللہ نور الخ

حال رہائی اہلحرم اور زندان شام

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾ (۵/۱۵ سورۂ مائدہ)

اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین

ترجمہ :۔ اس آیت میں کتاب کے ساتھ ایک نور کا ذکر کیا گیا ہے جس سے مراد حضرت رسول خدا ہیں۔ اور دوسری آیت میں قرآن کو نور کہا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ﴿۱۷۴﴾

(۴/۱۷۴ نساء)

(تمہاری طرف رب کی طرف سے برہان آئی ہے۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک نور مبین کو نازل کیا ہے ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول بھی نور ہیں اور قرآن بھی نور ہے اور نور نور کے ساتھ ہے۔ آسمانی کتابیں اور بھی ہیں۔ مگر وہ کل نور نہیں بلکہ جز و نور ہیں۔ چنانچہ توریت کے متعلق ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْھَا ھُدًى وَّنُوْرٌ (۵/۴۴ مائدہ)

ہم نے توریت کو نازل کیا اس میں ہدایت و نور ہے۔ قرآن تمام عالموں کے لیے نور ہے اور توریت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی جیسا کہ قرآن بتاتا ہے۔ وَاٰتَیْنَا مُوْسَى الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۱۷/۲ ترجمہ : اور ہم نے موسیٰ کو کتاب توریت عطا کی اور اس کو بنی اسرائیل کا رہنما قرار دیا۔

جو تعلق روح کو بدن سے دل کو ایمان سے آنکھوں کو بصارت سے موتی کو آب سے ہے وہی کتاب کو نور سے ہے ہدایت عالم ان ہی دونوں کے دامن سے وابستہ ہے، ہر زمانہ میں ان کا وجود ضروری ہے نور و کتاب مبین کے پارہ حرف ہیں۔ پس دنیا کی ہدایت ان ہی بارہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر ان دونوں سے ایک کو جدا کر دیا جائے تو ہدایت ناقص ہو گی۔ حدیث ثقلین اسی بات پر روشنی ڈال رہی ہے۔ یہ ہی ہدایت کے دونوں ہاتھ ہیں۔

نور کی حقیقت ہماری سمجھ میں کیا آئے جب نار کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ نار اور چیز ہے نور اور چیز ہے۔ عددی فرق بھی دیکھا جائے تو پانچ ہے نار میں پانچ ملا دیں تو نور ہو جائے بے شک پنجتن سے تمسک ناری کو نوری بنا دیتا ہے۔ نور جلا دینے والی چیز ہے اور نار جلانے والی۔ نار سے خلقت شیطان ہے نور سے خلقت سیدالانس والجان ہے۔ نور ہمیشہ نار پر غالب رہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا آگ گلزار بن گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تنور کی آگ نقصان نہ پہنچا سکی۔ ان لوگوں کا ذکر ہی کیا جو شریک نور رسالت تھے۔ جو لوگ ان سے تمسک رکھتے تھے اور کامل الایمان تھے۔ آگ ان کو بھی نہ جلا سکتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرد خراسانی حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ آپ اپنے دشمنوں سے اپنا حق کیوں نہیں لیتے۔ فرمایا:

کامل الایمان ناصر و مددگار میرے پاس نہیں۔ اس نے کہا آپ کیا فرماتے ہیں۔ خراسان میں آپ کے ہزارہا شیعہ موجود ہیں جو آپ کے ایک اشارہ پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔ منجملہ ان کے آپ کا ایک غلام یہ بھی ہے۔ حضرتؑ یہ سن کر خاموش ہو گئے اور کنیز کو حکم دیا کہ تنور روشن کر دے جب آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ تو اس مرد خراسانی کو بلا کر فرمایا:

"اس تنور میں کود پڑو" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا یا ابن رسول اللہؐ! آپ مجھے بے جرم و خطا کیوں جلاتے ہیں۔ رہنے دیجئے کہ میں آپ کے دشمنوں سے وقت ضرورت جنگ کروں گا۔

حضرتؑ یہ سن کر مسکرائے۔ اتفاقاً اس وقت اس طرف سے ہارون مکیؓ کا گزر ہوا۔ آپ نے اشارے سے ان کو بلا کر فرمایا۔

"اے ہارون ذرا اس میں کود تو پڑو۔ یہ حکم سنتے ہی ہارون فوراً کود پڑے۔ آپ نے تنور بند کر دیا اور مرد خراسانی سے بات چیت کرنے لگے۔ وہ بے چین ہو کر کہنے لگا" مولا ذرا اس شخص کی خبر تو لیجیے۔ اب تو جل کر خاک ہو گیا ہوگا۔ آپ مسکراتے ہوئے تنور پر تشریف لائے۔ اب جو اسے کھول کر دیکھا تو ہارون مکی کو تلاوت قرآن مجید کرتے ہوئے پایا۔

آگ ہی کیا نورِ الٰہی پر دنیا کی کوئی چیز غالب نہیں آسکتی۔ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی اپنے شکم کی آگ سے نہ جلاسکی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں کا پانی نہ ڈبوسکا۔ صندوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریائے نیل نہ ڈبوسکا۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام کو درندے ضرر نہ پہنچاسکے۔

آگ چار طرح کی ہوتی ہے۔

۱۔ کھاتی ہے پیتی نہیں۔ جیسے نارِ دُنیا۔

۲۔ پیتی ہے کھاتی نہیں جیسے نارِ اشجار۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا ۳۶/۸۰ یٰس

۳۔ کھاتی بھی ہے اور پیتی بھی ہے جیسے نارِ معدہ۔

۴۔ نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے جیسے وہ نار جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور پر دیکھی تھی دوسری تقسیم اور بھی ہے۔

۱۔ وہ آگ جو روشن رکھتی ہے جیسے نارِ طور۔

۲۔ گرمی رکھتی ہے مگر نور نہیں جیسے نارِ جہنم ۳۔ گرمی و نور دونوں رکھتی ہے جیسے نارِ دُنیا ۴۔ نہ گرمی رکھتی ہے نہ نور جیسے نارِ اشجار۔

اس آیت میں عہدِ رسالت کے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے پاس نور آیا ہے اور کتاب مبین آئی ہے۔ پس جب عہدِ رسالت میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں تو بھلا اب کیوں نہ ہوں گی۔ ہم کو اس برکت سے کیوں محروم رکھا جائے گا۔ یہ بات سراسر عدلِ الٰہی کے خلاف ہے کہ ایک زمانہ کے مسلمانوں کے لیے تو دو ہادی ہوں۔ اور ایک زمانہ والوں کے لیے صرف ایک اگر صرف کتاب خدا کافی ہوتی تو اس کے ساتھ نور کو کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ اگر یہ نور کتاب کے ساتھ نہ ہو تو کتاب پر تاریکی ہے۔ صرف الفاظ نظر آنے سے کام نہیں چلتا۔ تاوقتیکہ مفہوم پر روشنی نہ پڑے۔ اور یہ بات اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک نورِ خدا اس کے ساتھ نہ ہو۔ عدلِ الٰہی اور ضرورتِ دین کا مقتضا یہی ہے کہ ہر زمانے میں کتاب کے ساتھ ایک نور رہے۔ کیا قرآن اس کے متعلق کچھ رہنمائی کرتا ہے صرف ایک یہ آیت اس مقصد پر صاف روشنی ڈال رہی ہے۔

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۷) ۷/ الاعراف

ترجمہ:۔ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کی عزت کی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل ہوا ہے یہی لوگ اپنی دلی مرادیں پائیں گے۔

یعنی اس نور کے اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے جو آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ نازل کیا گیا۔ اتباع کے لفظ سے معلوم ہوا کہ مُراد اس سے اتباع فی العمل ہے۔ یعنی کتاب علم ہے اور نورِ عمل۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون ہے جس پر رسولؐ کی معیت صادق آتی ہے۔ حدیث انا وعلی من نور واحد سے واضح ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نور محمدؐ ہی کا جزو ہیں۔ پس جب یہ نور صلب آدمؑ میں اُترا۔ نورِ علی علیہ السلام ساتھ ساتھ تھا۔ یہاں تک کہ صلب عبدالمطلب تک یہ شرکت رہی۔ صرف ایک پشت کی جُدائی کے بعد جب نور کے دونوں حصوں نے بشری جامہ پہنا تو حضرت علی علیہ السلام کو پھر نبی سے معیت نامہ حاصل ہو گئی۔ یعنی خدا نے ان تمام صفات کو حضرت علیؑ کی ذات میں جمع کر دیا جو آنحضرتؐ کی معیت کے لیے لازم تھیں۔

چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ

(۲۹/۴۸ سورۃ الفتح)

محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں رحم کا برتاؤ کرنے والے ہیں۔ تم ان کو رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھو گے اور وہ رضوان الٰہی کے چاہنے والے ہوں گے۔ تم ان کی پیشانیوں پر سجدے کے نشان دیکھو گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فضل اور رضوان خدا کا چاہنا رسول اللہؐ کے ساتھ رہنے والوں کی خاص صفت ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کی سند کس کے ہاتھ میں ہے۔ اول مرضی الٰہی کو لیجئے اور آیہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

(۲/۲۰۷ سورہ البقرہ)

آیت پر غور کیجئے۔ صاف ہے کہ علی علیہ السلام نے شب ہجرت فرش رسولؐ پر سو کر مرضی الٰہی کو حاصل کیا

اب رہا فضل حاصل کرنا تو اس کے متعلق بھی سن لیجیے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾ (۵۴/۵ مائدہ)

(اے ایمان والو۔ جو کوئی تم سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو ہم کو اس کی پرواہ نہیں پھر جائے، اللہ عنقریب ایک ایسی قوم کو لے آئے گا کہ خدا ان سے محبت کرتا ہوگا اور وہ خدا سے۔ مومنوں کے مقابل وہ فروتن ہوں گے اور کافروں کے مقابل عزیز ہوں گے۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرنے والے ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کریں گے یہ ہے اللہ کا فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس آیت میں صاحبانِ فضل کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ جناب امیر علیہ السلام کے سوا اور کسی میں من حیث المجموع نہیں پائی جاتیں۔ پہلی صفت محبت ہے حضرت رسولِ خدا نے جنگِ خیبر میں فرمایا تھا۔

لَأُعْطِيَنَّ الرَّايَةَ غَدًا رَجُلًا كَرَّارًا غَيْرَ فَرَّارٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَالرَّسُوْلُ۔

پس جب یہ علم جناب امیر علیہ السلام نے پالیا تو اس حدیث کے مصداق وہی قرار پائے اور جب اس حدیث کے مصداق ہوئے تو اوپر والی آیت کے بھی مصداق ہوئے۔ اب رہی بات مومنین کے ساتھ فروتنی تو وہ جناب امیر علیہ السلام سے زیادہ کسی نے دکھلائی ہی نہیں۔ آپ اپنی عبا کا دامن بچھا کر فقرائے مومنین کو بٹھاتے تھے۔ ان کے گھر کا کام کاج کرتے تھے۔ اب رہی کفار کی نظر میں عزت تو اس کا حال عمر بن عبدود کی بہن سے پوچھو جس نے باوجود اپنے بھائی کے قاتل ہونے کے خود حضرت کی تعریف میں مدحیہ اشعار کہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ حضرت علیؑ سے زیادہ کسی نے کیا ہی نہیں۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ فضل اور رضوانِ الٰہی کے مالک جناب امیر علیہ السلام ہیں اور جب ایسا ہے بموجب وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ آپ کا اتباع تمام امت پر واجب ہو گیا۔ پس یہی وہ نور تھا

۱۵۷/۷ اعراف

جو جناب رسولؐ خدا کے بعد کتاب اللہ کے ساتھ رہا۔ اور اسی نورؐ کی ایک شعاع ہر زمانہ میں کتاب اللہ کے ساتھ رہی اور رہے گی۔ اسی کا اظہار ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام نے اس وقت کیا تھا جب یزید نے رہائی کے لیے اپنے دربار میں بلایا تھا۔ آپ نے دوران تقریر میں فرمایا:

"اے یزید! آگاہ ہو کہ ہم وہ نور الہیہ ہیں جن کا ہر زمانے میں قرآن کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔"

منقول ہے کہ جب ایک مدت کے بعد یزید بے حیا کو اپنے غلط رویہ پر انتباہ ہوا تو اس نے ایک غلام کو زندان میں بھیج کر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو بلایا۔ مومنین جس وقت جناب زینب سلام اللہ علیہا کو یہ معلوم ہوا کہ یزید سید سجّادؑ کو بلا رہا ہے تو ثانیٔ زہراؑ کا دل خوف سے ہل گیا امام علیہ السلام سے فرمانے لگیں۔

"بیٹا! میں تمہیں تنہا نہ جانے دوں گی۔ مجھے یزید کی غداری سے خوف معلوم ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ وہ شقی تم کو قتل کر دے۔" حضرتؑ نے فرمایا۔

"پھوپھی اماں! ابھی آپ کا جانا قرینِ قیاس نہیں ہے۔ نہ معلوم اس شقی نے کس مصلحت سے بلایا ہو۔"

الغرض آپ غلام یزید کے ساتھ محل یزید میں تشریف لائے۔ اس بے حیا کی مکاری دیکھو۔ جوں ہی امام علیہ السلام کو آتے دیکھا۔ استقبال کے لیے آگے بڑھا اور حضرتؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چاہا کہ آپ کو تخت پر بٹھائے۔ حضرتؑ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

"اے یزید بس میرے زخمی دل پر نمک نہ چھڑک۔ یہ وہی تخت تو ہے کل جس کے نیچے میرے پدر مظلوم کا سر رکھا تھا کیونکر ممکن ہے کہ آج میں اسی تخت پر بیٹھوں۔"

یہ سن کر یزید شرمندہ ہوا اور کہنے لگا۔ "اچھا آپ کی مرضی میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آج میں آپ کی رہائی کا حکم سنا دوں۔ اے علیؑ ابن الحسینؑ تمہارے باپ کا اصلی قاتل ابن زیاد ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ حسینؑ قتل کیے جائیں۔ بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا میں چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا خون بہا آپ کو ادا کر دوں۔ میرے خزانے آپ کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ جتنا مال آپ کو درکار ہو لے لیجئے۔" آہ یہ سنتے ہی امام علیہ السلام زار زار رونے لگے۔ اور فرمایا اے یزید۔ حسینؑ کا خون بہا میں لینے والا کون؟ یہ خون بہا روز حشر حضرت رسولؐ خدا کو دینا۔ جنہوں نے اپنی زبان چُسا چُسا کر حسینؑ کو پالا تھا۔ یہ خون بہا حضرت علی علیہ السلام کو دینا۔ جنہوں نے چھاتی پر رکھ کر پالا تھا۔ یہ خون بہا حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو دینا جنہوں نے چکیاں پیس

بیس کر پالا تھا۔ اے یزید اس قسم کی باتیں کرکے کیوں ہمارا کلیجہ پھاڑتا ہے۔

یہ سن کر یزید بدانجام نے اپنا سر جھکا لیا اور کہنے لگا۔ اچھا اب میں نے آپ کو رہا کر دیا چاہے یہاں رہیئے، چاہے مدینہ چلے جایئے۔

حضرتؑ نے فرمایا۔ "میں اس امر میں اپنی پھوپھی جناب زینبؑ سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔"

چنانچہ وہاں سے آپ زنداں میں تشریف لائے اور جناب زینبؑ سے کل حال بیان کیا۔ جب جناب زینبؑ نے فرمایا۔

"بیٹا ابھی تو زینب اپنے مظلومؑ بھائی کی صفِ ماتم بچھا کر رونے بھی نہیں پائی۔ بیٹا! تم یزید سے کہو کہ دمشق میں ایک مکان ہمارے لیے خالی کرا دے۔ اور جو لوگ ہمارے پاس پرسے کو آئیں ان کو آنے کی اجازت دے۔ نیز ہمارے شہیدوں کے سر اور لوٹے ہوئے تبرکات بھجوا دے تاکہ ہم اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے مل لیں اور جی کھول کر نوحہ و ماتم کر لیں۔

الغرض ایک مدت تک اسیری کے مصائب اٹھانے کے بعد اہل حرم زندانِ شام سے نکل کر دمشق کے ایک مکان میں فروکش ہوئے۔ حسینؑ مظلوم اور دیگر شہدائے کربلا کی صفِ ماتم بچھی۔ سیدانیوں نے سیاہ لباس پہنے نوحہ و ماتم کی صدائیں بلند ہوئیں۔ جوق در جوق زن و مرد پرسے کو آنے لگے۔

منقول ہے کہ جب یزید نے سرہائے شہدا کو واپس کیا ہے تو اس وقت اہلِ حرم میں ایک عجیب کہرام برپا تھا۔ جب کوئی سر آتا تھا۔ تو سیدانیاں اپنا سر کھول کر نوحہ و ماتم کرتی تھیں اور جس بی بی سے وہ سر متعلق ہوتا تھا وہ آگے بڑھ کر اپنی گود میں لے لیتی تھی۔

پہلے بالترتیب انصارِ حسینؑ کے سر آئے سیدانیوں نے ان پر اسی طرح ماتم کیا جیسے خاص اپنے عزیزوں پر کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد بنی ہاشم کے آنے شروع ہوئے۔

جب عون و محمد کے سر آئے تو جناب زینبؑ نے چھاتی سے لگا لیا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے چہروں کے بوسے لیے اور فرمایا۔

"اے فرزند دکھیا ماں تمہاری شکر گزار ہے کہ تم نے کربلا میں میری آبرو رکھ لی۔"

اس کے بعد یتیم حسنؑ جناب قاسم کا سر آیا جناب اُمّ فروہ نے دوڑ کر چھاتی سے لگایا۔ اور پھر وہ رو رو کر بین کرنے لگیں۔

"اے میرے ناشاد و نامراد فرزند آہ! تیری جوانی کیسی خاک میں مل گئی۔ آہ اب یہ دکھ جلی ماں

کس کے سہارے سے جئے گی۔"

اس کے بعد حسینؑ کے کڑیل جوان شبیہ پیغمبر علی اکبر کا سر آیا۔ سیدانیاں وا علی اکبراہ وا قرۃ عیناہ کے نعرے مارتی سینہ پیٹتی استقبال کو بڑھیں۔ جناب زینبؑ نے بڑھ کر سرِ علی اکبر گود میں لیا اور رو رو کر کہنے لگیں۔

"آہ بیٹا۔ ظالموں نے تیری چاند سی صورت خاک میں ملادی آہ! میرے کڑیل جوان۔ تجھے کس کی نظر کھا گئی۔ آہ کیا میں نے اٹھارہ برس اسی لیے محنت کی تھی کہ ظالموں کے تیر و تبر کا نشانہ بناؤں۔ بیٹا میرے سب ارمان خاک میں مل گئے۔

جناب ام لیلیٰ نے جناب زینبؑ سے علی اکبر کا سر لے کر چھاتی سے لگایا۔ رخساروں کے بوسے لیے اور ایسے دل خراش بین کئے کہ کہرام بپا ہوگیا۔

آہ جب قمر بنی ہاشم جناب عباسؑ کا سر آیا تو زوجہ جناب عباسؑ کو شرم آئی کہ جناب زینبؑ و جناب اُم کلثومؑ کی موجودگی میں اپنے شوہر کا سر گود میں لیں۔ پس جناب اُم کلثوم ہائے بھیا آگے بڑھیں اور فرمانے لگیں۔

"بھیا عباسؑ آپ کربلا میں میری طرف سے ماں جائے حسینؑ کا فدیہ بنے تھے۔ دکھیا بہن آپ کے سر کے قربان جائے۔ میری گود میں آئیے۔ تمام سیدانیاں سر کے گرد جمع ہو کر سفلئے اہل حرم کا ماتم کرتی رہیں۔

آہ! اس کے بعد ایک چھوٹا سر جھنڈوے بالوں والا آیا جناب رباب بڑھیں اور سر کو چھاتی سے لگا کر فرمانے لگیں۔

"بیٹا علی اصغر مجھے خبر نہ تھی کہ یہ ظالم تمہاری دودھ بڑھائی پیکان ستم سے کریں گے۔ بیٹا تمہیں میرے بغیر کیسے چین آیا۔ آہ ظالموں نے میری گود خالی کردی۔ آہ ظالم نے میرے سینے پر وہ تیر مارا ہوتا جو تیرے سوکھے گلے پر مارا۔ ہر ہی باری باری وہ ننھا سر اپنی گود میں لے کر اسے پیار کرتی تھی۔

آہ! جب امام مظلوم علیہ السلام کا سر آیا تو تمام سیدانیاں بے تابانہ السلام علیک یا ابن رسولؐ اللہ کہتی دوڑیں اور وا حسیناہ وا مظلوماہ کا شور برپا ہوگیا۔ جناب زینبؑ نے بڑھ کر سر اقدس اپنی گود میں لے لیا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

اور پھر فرمانے لگیں ؎

يَا اَخِىْ يَا اَخِىْ اَىُّ الْمَطَالِبِ اَشْتَكِىْ
فِرَاقُكَ اَوْ ذُلِّىْ وَهَتْكِىْ وَنَفْرَ بَنِىْ

اے میرے ماں جائے اے میرے شہید برادر دکھیا بہن کس کس مصیبت کو بیان کرے۔ آپ کی جدائی بیان کروں یا اپنی ذلت اور بازار کوفہ و شام کی تشہیر کا حال یا دربار ابن زیاد و یزید میں جو ہتک ہوئی ہے اس کو بیان کروں۔ مومنین اس وقت سیدانیوں کے دردناک بین سے زمین و آسمان ہل رہے تھے۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَسَيَعْلَمُ
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝

تیسویں مجلس

تفسیر آیۂ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ

اور حال روانگی اہل حرم بمدینہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ‌ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ذٰ لِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿۵۹﴾ (۵۹/۴ سورہ نساء)

ترجمہ :- اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں صاحبانِ حکومت ہوں ان کی۔ اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو تو اگر تم اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ و رسولؐ کی طرف رجوع کرو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

آیت اُتری یوں تھی پہلے اللہ کی اطاعت تھی۔ اور پھر رسول کی اور پھر اولی الامر کی لیکن تعمیل ہو گئی پہلے اولی الامر کی اطاعت پھر رسولؐ کی۔ پھر اللہ کی یعنی اطاعت اولی الامر اطاعتِ رسول ہے اور اطاعتِ رسول اطاعتِ خدا

اس آیت میں خداوند عالم نے رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے یعنی ایک ہی اطیعوا کے تحت میں دونوں کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ اور اولی الامر کا حکم جزوی اور قطعی قرار دیا گیا۔ لہذا اولی الامر کا بھی رسولؐ کی طرح معصوم ہونا ضروری ہے۔ اب قابلِ غور یہ بات ہے کہ وہ معصوم کل اُمت مانی جائے یا بعض اُمت۔

امام اہل سنت فخرالدین رازی کہتے ہیں کہ اگر کسی خاص گروہ یا خاص ذات کو مراد لیا جائے تو یہ دقت ہے کہ ہم معرفت امام معصوم سے قاصر رہیں گے۔ اور اس کے استفادہ سے محروم۔ لہذا اولی الامر سے مراد

ارباب حل وعقد ہونی چاہیے۔ جو امت سے ہر زمانہ میں ہوں۔ اور اس سے لازم آتا ہے کہ اجماع حجت حق ہے اس کی تردید یہ ہے کہ جب بعض امت یعنی امام معصوم کی معرفت متعذر سمجھتے ہیں تو یہ دشواری اہل حل وعقد یعنی علماء و عقلائے امت کی تلاش میں کیوں نہ ہوگی۔ کیا وہ بعض امت میں نہیں رازی صاحب امام معصوم مراد لینے پر راضی تو نہیں۔ لیکن ارباب حل وعقد کی شناخت کا کوئی ایسا طریقہ نہیں بتاتے جس سے کل امت کو ان کی معرفت کا یقین ہو جائے۔ جب رازی بعض افراد امت کو اولی الامر جانتے ہیں اور ان کے اجماع کو بمنزلہ عصمت سمجھتے ہیں۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ان بعض افراد کا انتخاب کس معیار پر ہوگا۔ غالباً علم ہی کو قرار دیا جائے گا۔ لیکن علم کے مدارج و مراتب مختلف ہیں۔ کسی کو کم ہے اور کسی کو زیادہ پس اس صورت میں ارباب حل وعقد کا انتخاب کرتے وقت کیا طریقہ ہوگا۔ جس سے اعلم ہی چناؤ میں آجائیں اور انقص اور اوسط چھوٹ جائیں۔ ہو سکتا ہے جن کو ہم نے اعلم سمجھا ہے۔ ان سے زیادہ عالم بھی موجود ہوں۔

امام رازی شیعوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیعہ جب اپنے امام تک پہنچ ہی نہیں سکتے تو ایسے امام معصوم کا فائدہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعد وفات پیغمبرؐ صلعم تبلیغ و ترویج اسلام کا سلسلہ بند ہونا چاہیے کیونکہ اب کوئی آنحضرتؐ سے براہِ راست ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ آیت میں رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت ساتھ ساتھ ہے۔ پس اگر اولی الامر سے استفادہ کرنا دشوار اور تکلیف مالایطاق ہے تو یہ بات پیغمبرؐ کے متعلق کیوں نہیں۔ کیا اس صورت میں پیغمبرؐ کی اطاعت ساقط ہو جاتی ہے۔ یہی حال خدا کی اطاعت کا ہے وہ بھی نظر نہیں آتا اور نہ کوئی اس تک پہنچ سکتا ہے۔

رازی کا یہ اعتراض شیعوں پر بارہویں امام علیہ السلام کے غائب ہونے کی وجہ سے ہے افسوس ہے کہ رازی صاحب شیعوں کے اس عقیدہ پر تو راضی نہیں لیکن یہ مانتے ہیں کہ جب کوئی صاحب کتاب و شریعت رسولؐ اپنی زندگی کی مدت ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو جب تک کوئی دوسرا صاحب شریعت نہیں آتا اس کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور اسی کو صاحب حکم مانا جاتا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام کو رخصت ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آتے ہیں لیکن مسلمان ان کو حی القائمؐ مانتے ہیں اور ان کی شریعت کا زمانہ قیامت تک مسلم ہے۔ قرآن ہمارے لیے کتاب ہدایت ہے لیکن اس میں بے شمار آیات متشابہات بھی ہیں۔ اس کا ظاہر باطن بھی ہے۔ آیات کو شریعت کے قواعد کلیہ سے مطابق کرنا بھی ہے۔ احکام کا استنباط کرنا بھی ہے۔ قواعد کلیہ کو قواعد جزئیہ سے منطبق کرنا بھی ہے۔ پس کیا یہ معمولی کام ہے۔ کیا اس کے ایسے جانشین کی ضرورت نہیں جو مثل نبی اور نفس نبی ہو تاکہ وہ قرآن سے وقت ضرورت استنباط کر سکے۔ ایسے شخص کی اطاعت بھی رسولؐ

کی اطاعت کی طرح واجب ہوگی۔ پھر اس کا رسولؐ کی طرح معصوم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ضلالت کا خطرہ نہ رہے رازی صاحب عصمت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن اجماع سے عصمت پیدا کرنی چاہتے ہیں اور اس حدیث سے تمسک کرتے ہیں۔ لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ (میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی) ان کی یہ نرالی منطق ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں ہے۔ عقل کیوں کر یہ بات مان لے گی کہ دس اندھے مل کر سیانکھے ہو جائیں گے یا سو جاہل مل کر عالم بن جائیں گے۔ یا ہزار گناہ گار مل کر معصوم ہو جائیں گے ناقص کا مجموعہ ہر حالت میں ناقص ہی رہے گا۔ کامل ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر رازی صاحب فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ اگر تم جھگڑا کرو تو خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ پس اگر اولی الامر سے امام معصوم مراد ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کرنے کا بھی حکم ہونا ہے جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب و سنت ہے۔ یعنی ہر مسلمان کے لئے کتاب خدا اور سنت رسولؐ لازم ہے اور جب کسی امر شرعی میں نزع ہو تو اولی الامر کے حکم کی اطاعت بھی اسی طرح لازم ہوگی جس طرح خدا و رسول کی کتاب اور سنت کے معاملہ میں آخری فیصلہ اولی الامر کا ہے جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾
وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ
اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ
وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

(۸۲-۸۳/۴ النساء)

کیا یہ لوگ قرآن کے متعلق اتنا نہیں سوچتے کہ یہ اگر خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے بیان میں بڑا اختلاف پاتے۔ جب ان مسلمانوں کے پاس کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے فوراً مشہور کر دیتے ہیں۔ اگر اس امر میں وہ رسولؐ اور اولی الامرؑ کی طرف رجوع کرتے تو جو لوگ اس کی تحقیق کرنے والے ہیں (رسول و اولی الامرؑ) تو وہ اس کو سمجھ لیتے۔ اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم سب کے سب سوائے چند آدمیوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگتے۔

اس آیت میں اللہ نے صرف اولی الامر کی طرف رجوع کرنے ہی کو نہیں کہا بلکہ یہ بتادیا کہ اولی الامر کی اطاعت کس چیز میں کی جائے۔ یعنی اطاعت ان کے استنباط میں اور اولی الامر کو بھی بتادیا کہ وہ استنباط کرنے والے ہیں۔ یہ اولی الامر مثلِ رسولؐ معصوم ہونے چاہئیں۔ ورنہ ان کے استنباط پر مثل قول رسولؐ بھروسہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ چونکہ ان کی اطاعت مثل اطاعت رسولؐ ہے لہٰذا پہلی آیت میں صرف رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کو کہا۔ اور اولی الامر کا ذکر نہ کیا کیونکہ جب اطاعت ایک ہی قسم کی ہے پھر رجوع کرنا بھی ایک ہی قسم کا ہے۔

اس آیت میں جو نزاع کا ذکر ہے اس سے یہ مُراد نہیں کہ اگر مومنین اور اولی الامر میں نزاع ہو تو اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اولی الامر کے کسی حکم کو اس کے ماتحت خلاف حق سمجھیں تو دو حال سے خالی نہیں یا تو اولی الامر کا وہ حکم درحقیقت خلاف حق ہے۔ اس صورت میں تو وہ اولی الامر ہی نہیں یا اس کے ماتحتوں نے غلطی سے خلاف حق سمجھا ہے۔ اس صورت میں انہوں نے خلاف نص عمل کیا کیونکہ اولی الامر کی اطاعت واجب تھی۔ اس کو ترک کیا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے رسولؐ کو رسولؐ سمجھا ہو اور پھر اس کے حکم کے خلاف کو حق جانا ہو۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کسی نزاعی معاملہ میں اولی الامرؑ اور اس کے ماتحتوں پر واجب ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کی طرف رجوع کریں اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت جو مثل اطاعت رسولؐ واجب کی گئی ہے بے فائدہ ہے۔ اس صورت میں اللہ اور رسول کے قول کے سوا اولی الامر کا قول کوئی چیز نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے مخالف جو حق پر ہوں گے وہ اولی الامر بن جائیں گے اور وہ اپنے قول کی اطاعت کرنے والے ہوں گے نہ کہ اولی الامر کی۔

اگر اولی الامر مفترض الطاعت نہ ہوتے۔ تو صرف اتنا کہنا کافی تھا۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اولی الامر کے وجوب کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ پھر ایمان والوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر تم کسی چیز میں جھگڑا کرو، تو خدا و رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ قرآن زبان اور محاورہ عرب میں نازل ہوا ہے۔ خدا و رسولؐ کی طرف رجوع کرنے سے یہ مراد ہے کہ جیسے کسی بے علم یا کم علم والے سے کہیں کہ قرآن اور حدیث کی طرف رجوع کرو تو پتہ چلے تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ جاہل خود قرآن و حدیث کو دیکھ کر یا خود ان سے استنباط کر کے تنازع کا فیصلہ کرے۔ نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بے علم خود رجوع کرے بلکہ کسی عالم کی طرف جو قرآن و حدیث کا کافی علم رکھتا ہو رجوع کرے۔ باعتبار اسی محاورے کے خدا نے خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کا حکم دیا ہے مراد یہ ہے کہ اگر رسولؐ وفات پا جائیں اور نزول وحی کا سلسلہ بند ہو جائے تو اولی الامر کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہارے درمیان عدل سے حکم کریں گے۔ اسی لیے خدا نے دوسری آیت میں اولی الامر کی طرف رجوع کو بیان کر دیا۔ اس

آیت میں تنازع کا جو ذکر ہے۔ وہ مومنین کا مومنین کے ساتھ ہے نہ کہ مومنین کا اولی الامر کے ساتھ یہ کہنا بالکل غلط ہے۔ کہ مومنین میں اولی الامر اور غیر اولی الامر اہلبیت اور غیر اہل بیت سب شامل ہیں اولی الامر منکم (اولی الامر جو تم میں سے ہیں) اولی الامر کو عام مومنین سے جن پر اطاعت فرض ہے جدا کر دیا اور اولی الامر کو مثل خدا و رسول مطاع بنا دیا گیا اور دیگر مومنین خدا و رسول اور اولی الامر کے مطیع ہو گئے اور اللہ و رسولؐ کی کی طرف رجوع کرنے سے مراد قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا ہے۔ کیونکہ یہی دونوں مل کر قانونِ شریعت ہیں۔ پس مقصود یہ ہوا کہ شریعت کی طرف رجوع کرو۔

لیکن احکام شریعت کا واضع جب موجود نہ ہو۔ یعنی سلسلۂ نبوت قطع ہو جائے تو ان احکام کا بتلانے والا اور ان سے استنباط کرنے والا کوئی ضرور ہونا چاہیے۔ جو صاحبِ شریعت تو نہ ہو مگر مثل صاحبِ شریعت کے حکم کرنے والا ہو۔ پس وہی اولی الامر ہے اگر نزاع میں اولی الامر کو شامل کر لیا جائے تو اس بناء پر کہ اس آیت کے شروع یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر مومنین سے مخاطبہ کیا گیا ہے مگر اولی الامر اولی الامر داخل مومنین ہیں۔

لہذا فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ کا تعلق ان سے بھی ہے تو پھر رسول کو کیونکر جدا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ رسولؐ کے مومن ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم بالکل بدل جائے گا۔ یعنی خود ہی رسول جھگڑا کرنے والا اور خود ہی فیصلہ کرنے والا بن جائے گا۔

اگرچہ حکم خدا کی نوعیت اور ہے اور حکم اولی الامر کی حالت اور ہے۔ لیکن واجب العمل ہونے کی حیثیت سے سب کے حکم مساوی منزلت رکھتے ہیں۔ اللہ وحی بھیجنے والا اور رسول وحی لینے والا اور اولی الامر وحی سے استنباط کرنے والے ہیں۔ اولی الامر صاحب شریعت نہیں بلکہ محافظ شریعت ہیں اور قرآن و حدیث سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے والے۔ وہ سرمو اصولِ شریعت سے تجاوز نہیں کرتے وہ ہمیشہ شریعت کے مطابق حکم دیتے ہیں اور علم لدن کے حامل ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے لفظ اولی الامر سے وہ حاکم مراد ہے جو رسول کی طرف سے کسی لشکر یا شہر پر حاکم بنایا گیا اور اس کی اطاعت اس وقت تک واجب ہو جب تک اس کا حکم خدا و رسول کے خلاف نہ ہو ان حکام پر بھی اطلاق ہو گا جن کو بعد رسول حکومت ملی۔

غور کے قابل بات یہ ہے کہ اگر اولی الامر سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو رسول کی طرف سے حکومت ملی ہو تو بعد رسول حکومت پانے والے اولی الامر کیسے قرار پائیں گے۔ اور اگر یہ دائرہ وسیع کر دیا جائے تو بنی امیہ اور بنی عباس کے تمام بادشاہ جن میں فساق و فجار بھی تھے۔ اولی الامر قرار پائیں گے اور ان

سب کو اطاعت رسول کی طرح واجب قرار پائے گی۔
عام سلاطین کی طرح اولی الامر سے مراد وہ لوگ بھی نہیں ہو سکتے جن کو رسول نے سردار بنا کر کسی لشکر کے ساتھ بھیجا تھا کیونکہ یہ لوگ کبھی مطاع تھے اور کبھی مطیع۔ عہد رسالت میں سوائے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے اور کوئی ایسا سردار نظر نہیں آتا جو ہمیشہ امیر ہی بن کر نکلا ہو اور مامور نہ بنا ہو۔
رسولؐ کی یہ امتیاز بخشی حضرت علی علیہ السلام کے اولی الامر ہونے کی قوی دلیل ہے۔
امام رازی اور ان کے ہم مشرب علماء بادشاہان دنیا ہی کو اولی الامر سمجھے بیٹھے ہیں۔ اور باوجود ان کے کھلے فسق و فجور کے رسول کی طرح واجب الاطاعت مان رہے ہیں۔ استغفر اللہ بادشاہان دنیا کو اولی الامر سے کیا نسبت ؎

طینت جام جم از طینت کان دگر ست
تو توقع ز گل کوزہ گران می داری

ہم ذیل میں ایک تاریخی واقعہ درج کرتے ہیں۔ جس سے بادشاہ اور اولی الامر کا فرق بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔ ایک بار ہشام بن عبد الملک بادشاہ شام حج کے ارادے سے خانہ کعبہ آیا۔ اتفاقاً اس سال حاجیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ باوجود کوشش کے وہ بوسہ دینے کے لیے حجر اسود تک نہ پہنچ سکا۔ آخر مجبور ہو کر ایک بلند مقام پر جا کھڑا ہوا کہ خلائق کا ہجوم کم ہو تو جا کر بوسہ دے۔
ناگاہ اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ نورانی صورت پیشانی پر سجدہ کا نشان سر سے پیر تک سیاہ لباس پہنے ہوئے عصا کے سہارے دروازے کی طرف سے خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں۔ لوگ آپ کو دیکھتے ہی کائی کی طرح پھٹ گئے اور دروازے سے حجر اسود تک ایک راستہ بنا دیا۔ لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ہاتھوں اور پیروں پر بوسہ دینے کے لیے گرے پڑتے تھے۔ آپ کے ساتھی کہہ رہے تھے لوگو! زیادہ ہجوم نہ کرو۔ ہمارے امام نحیف و نزار ہیں۔ مگر لوگ کسی طرح نہ مانتے تھے۔ غرضیکہ آپ اسی طرح حجر اسود تک پہنچے اور بوسہ دے کر واپس ہوئے۔ ہشام بہ نگاہ حیرت یہ واقعہ دیکھتا رہا۔ باوجودیکہ وہ بخوبی واقف تھا کہ آپ سید الساجدین حضرت امام زین العابدین علیہ السلام ہیں مگر بطور تجاہل عارفانہ پوچھنے لگا۔ یہ کون شخص تھا جس کی لوگوں نے اتنی غیر معمولی تعظیم کی۔ اس کے ارکان سلطنت جو دستر خوان نعمت کی مکھیاں تھے۔ یہ سن کر خاموش رہے۔ مگر فرزدق شاعر سے جو پہلو میں کھڑا تھا ضبط نہ ہو سکا۔ فی البدیہہ امام علیہ السلام کی شان میں ایک قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ قصیدہ

طولانی ہے۔ اس کے چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْاَتَهُ

یہ وہ بزرگ ہیں جن کے نشانِ قدم کو بطحا پہچانتا ہے

وَالْبَیْتُ یَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

خانہ کعبہ پہچانتا ہے اور مقام حل و حرم پہچانتا ہے

هٰذَا ابْنُ خَیْرِ عِبَادِ اللّٰهِ کُلِّهِمُ

یہ اس کے بیٹے ہیں جو سب بندوں سے بہتر تھا

هٰذَا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

یہ متقی اور پاک و دل طاہر اور دنیا میں مشہور ہیں

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَهُّدِهٖ

یہ ایسے سخی ہیں کہ کسی سائل سے لا (نہیں) کہنا جانتے

لَوْلَا التَّشَهُّدُ کَانَتْ لَاءُهٗ نَعَمُ

ہی نہیں اگر تشہد میں لا نہ ہوتا تو ان کی زبان میں ہر جگہ ہاں ہوتا۔

الغرض جب فرزدق قصیدہ پڑھ چکا تو ہشام نے غضب ناک ہو کر کہا۔

اے فرزدق تو مدت سے ہمارا درباری شاعر ہے مگر تو نے آج تک میری تعریف میں ایسا پرزور قصیدہ کبھی نہ کہا۔ فرزدق نے فرمایا۔

اے ہشام خاموش ہو تو بھی اپنی ذات میں یہی خوبیاں پیدا کرے۔ تو بھی اپنے ماں باپ ایسے ہی بنائے۔ تیری شان میں ایسا ہی قصیدہ لکھ دوں گا ہشام یہ سن کر غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ حکم دیا کہ فرزدق کو ابھی طوق و زنجیر میں جکڑ کر قید خانہ میں لے جاؤ۔

مومنین آپ نے اولی الامر کے روحانی اثرات کو دیکھا۔ بھلا دنیوی بادشاہوں کے اقتدار کو اس سے کیا نسبت جسموں پر حکومت کرنا اور بات ہے اور روحوں پر حکومت کرنا اور بات ہے۔

الغرض جب امام زین العابدین علیہ السلام کو یہ معلوم ہوا کہ فرزدق شاعر ہماری محبت میں قید ہو گیا تو آپ کو بے حد صدمہ ہوا۔

چونکہ آپ زنداں کی تکلیفیں جھیل چکے تھے اس لیے فرزدق کے مصائب سے اور زیادہ دل کڑھا۔ آپ نے ایک رومال میں چند درہم و دینار باندھے اور اپنے غلام سے فرمایا۔

زنداں میں فرزدق کے پاس لے جا۔ اور ہماری طرف سے کہو کہ بھائی ہمارے پاس مال دنیا سے کچھ باقی نہیں۔ یہ حقیر ہدیہ جو بھیجا جا رہا ہے۔ اس کو منظور کر لینا۔ غلام وہ عطیہ امام علیہ السلام سے لے کر فرزدق کے پاس گیا۔ وہ اس وقت در زنداں کے قریب سر جھکائے بیٹھا تھا۔

غلام نے جا کر سلام کیا۔ اس نے سر اُٹھا کر کہا۔

اے شخص تو کون ہے؟ اس نے کہا۔

میں امام زین العابدین علیہ السلام کا غلام ہوں۔

فرزدق نے خوش ہو کر کہا: اے شخص ذرا قدم آگے بڑھا تاکہ میں ان پر بوسہ دوں۔ کیونکہ تو میرے امام علیہ السلام کا غلام ہے۔ زہے نصیب کہ میرے مولا کا قاصد میرے پاس آیا۔ الغرض غلام نے وہ رومال فرزدق کے سامنے پیش کیا اور امام علیہ السلام کا پیغام پہنچایا۔

فرزدق نے پہلے تو اس رومال کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر رو رو کر کہنے لگا۔

"اے میرے آقا کے غلام۔ میرے سیّد و آقا سے کہہ دینا کہ میں نے آپ کی شان میں یہ قصیدہ کسی طمع دُنیا کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ روز قیامت جب یہ گناہ گار میدان محشر میں آئے تو اپنے دامن کا سایہ میرے سر پر کر لینا۔

آہ! اس وقت مجھے امام زین العابدین علیہ السلام کا ایک تحفہ اور یاد آ گیا جو آپ نے بشیر بن جذلم کو مدینہ منوّرہ میں قید یزید سے رہا ہو کر عطا فرمایا تھا۔ لکھا ہے کہ جب اہل حرم دمشق میں ایک ہفتہ رہ چکے اور مدینہ کو واپس ہو ئے۔

یزید نے اپنے سپہ سالار بشیر کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ بحفاظت مدینہ پہنچانے کے لیے معین کیا۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام مع اہل حرم روانہ ہوئے جناب زینب نے فرمایا "بیٹا بشیر سے کہو ہمیں کربلائے حسینؑ کی طرف سے نکال لے چلے۔

لکھا ہے کہ جناب جابر انصاریؓ صحابی رسول امام حسین علیہ السلام کی قبر مطہر کی زیارت کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے چونکہ نابینا تھے اس لیے غلام سے کہہ دیا تھا جب کربلائے حسین علیہ السلام نمودار ہو تو مجھ سے کہہ دینا چنانچہ جب وہاں پہنچے تو غلام نے جناب جابرؓ کو آگاہ کیا آپ فوراً اونٹ پر سے اُتر پڑے عمامہ سر سے پھینک دیا۔ پیروں سے جوتیاں نکال دیں اور روتے پیٹتے آگے بڑھے۔ پھر آپ نے غلام سے فرمایا۔

"مجھے فرزند رسولؐ کی قبر پر لے چل"۔ اس نے کہا: "یہاں تو چند قبریں ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا فرمایا تو

مجھے قبروں کے بیچ کھڑا کرا دے۔ غلام نے ایسا ہی کیا۔ آپ نے فرمایا۔

السلام علیک یا ابا عبداللہ۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ عَلَيْكَ السَّلَامُ يَا جَابِرُ

جابر سمجھ گئے کہ یہی قبر جناب امام حسین علیہ السلام ہے۔ قبر سے لپٹ گئے اور زار زار رونے لگے۔ اسی اثنا میں غلام نے کہا۔

"اے صحابی رسول مجھے کوئی فوج اس طرف آتی نظر آتی ہے۔" فرمایا۔ ذرا نظر جما کر دیکھو۔ یہ کون لوگ ہیں۔ غلام تا دیر دیکھتا رہا۔ جب دامن گرد پھٹا تو کالے کالے نشان اور سیاہ پردے اونٹوں کی ہودجوں پر پڑے نظر آئے۔ غلام نے حال بیان کیا جناب جابر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں واحسینا واحسیناہ کی آواز میں آئیں۔ اونٹ بٹھائے گئے۔ اور کچھ بی بیاں اونٹوں سے اتریں اور نوحہ و ماتم شروع کیا آہ! جوں ہی بیمار کربلا کی نظر جابر پر پڑی۔ بے اختیار لپٹ گئے۔ اور فرمایا اے جابر ہمارا گھر تباہ ہو گیا حضرت ابو عبداللہ شہید کر دیئے گئے اور ہم کو اسیر کر کے در بدر پھرایا گیا۔ درباروں میں ہماری بی بیوں کو سر کھلے لے گئے۔ اب ہم قید سے رہا ہو کر آئے ہیں۔ جابر غش کھا کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ وہ روز اہل حرم کربلا میں رہے۔ قریب تھا کہ روتے روتے ہلاک ہو جاتے۔

بشیر نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے عرض کی۔ مولا! اب مدینہ چلنے کا اہتمام کیجئے ابھی منزل بہت باقی ہے۔ الغرض باحال تباہ کربلائے حسین علیہ السلام کو رخصت کر کے یہ قافلہ مدینہ کو روانہ ہوا۔ جب مدینہ کے قریب پہنچے اور شہر کے در و دیوار نظر آنے لگے تو جناب ام کلثوم نے رو رو کر یہ اشعار پڑھے ؎

مَدِيْنَةُ جَدِّنَا لَا تَقْبَلِيْنَا ، فَبِالْحَسَرَاتِ وَالْاَحْزَانِ جِئْنَا
خَرَجْنَا مِنْكَ بِالْاَهْلِيْنَ جَمْعاً ، رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِيْنَا ،

اے نانا کے مدینے ہم تجھ میں آنے کے قابل نہ رہے کیوں کہ ہم غم و الم کی تصویر ہیں۔ جب نکلے تھے تو بھرا کنبہ ساتھ تھا آہ! اب مرد ہیں نہ بچے۔ امام علیہ السلام نے بشیر سے فرمایا۔

"مدینہ میں جا کر ہمارے آنے کی خبر کر دے۔ بشیر جب محلہ بنی ہاشم میں پہنچا تو کئی بار باآواز بلند کہا۔

قتل الحسین بکربلا۔

بشیر مدینہ میں یہ شعر پڑھتا ہوا داخل ہوا ؎

يَا اَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ بِهَا
قُتِلَ الْحُسَيْنُ فَاَدْمُعِيْ مِدْرَارٌ

مدینہ والو! اب مدینہ تمہارے رہنے کی جگہ نہیں رہا۔ حسینؑ قتل کر دیئے گئے"۔ پس میرے آنسو جاری ہیں یہ آواز سنتے ہی لوگ گھروں سے نکل پڑے اور کہنے لگے۔

"اے بُری خبر دینے والے کیا فرزند رسولؐ حسینؑ بن علیؑ قتل کر دیئے گئے؟ کیا مدینہ پنج تن پاک سے خالی ہو گیا؟"

بشیر کہتا ہے جب میں محلہ بنی ہاشم میں پہنچا اور آواز بلند کی۔

یہ سنتے ہی بنی ہاشم کے گھروں سے رونے کی صدائیں آنے لگیں۔ ایک لڑکی برقعہ پوش عصا کے سہارے نہایت بے تابانہ انداز میں گھر سے نکلی۔ اور گھبرا کر پوچھنے لگی۔ اے شخص کیا خبر سنا رہا ہے۔ کیا میں یتیم ہو گئی اے شخص کیا تجھ کو ہمارے کنبہ کی بھی خبر ہے' میں نے کہا بی بی کربلا کا لٹا ہوا قافلہ بیرون شہر مقیم ہے۔

یہ سنتے ہی فاطمہ صغراؑ بے تابانہ دوڑتی ہوئی محمد بن حنفیہ کی خدمت میں آئیں۔ اور ان سے لپٹ کر کہنے لگیں۔

"چچا جان آپ کا گھر تباہ ہو گیا۔ بابا حسین مارے گئے۔ میں یتیم ہو گئی۔ لٹا ہوا کنبہ واپس آیا ہے"

یہ سنتے ہی محمد بن حنفیہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور فاطمہ صغریٰ کو لے کر کنبے سے ملنے کو چلے۔ جب قریب پہنچے رَدَاُی اَعْلاَمُ السَّوْدِ نَحْوَ مُعْتَنِیًّا عَلَیْہِ جونہی سیاہ نشان نظر آئے غش کھا کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا اور بیمار کربلا پر نظر پڑی تو بیتابی سے دوڑے اور یتیم بھتیجے کو چھاتی سے لپٹا کر رونے لگے۔

امام علیہ السلام نے فرمایا "چچا جان مجھے زیادہ نہ دبایئے میرا سینہ زخمی ہے"۔ یہ کہہ کر عبا کا تکمہ کھول دیا۔ اب جو جناب محمد بن حنفیہ کی نظر پڑی تو سینہ پر ایک زخم دکھائی دیا۔ پوچھا یہ زخم کیسا ہے فرمایا چچا دیکھئے یہ سیاہ نشان ان بیڑیوں کے، ہیں جو میرے پاؤں میں پہنائی گئی تھیں۔ یہ سن کر جناب محمد بن حنفیہ کا غم سے عجب حال ہوا۔ پھر فرمایا۔ اے فرزند کچھ حال اپنے بھائی کا تو بیان کرو۔ فرمایا قتل مظلوماً دماً عطشانا آہ ظالموں نے تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کر ڈالا۔ لاش بے گور و کفن چھوڑ دی۔ سر اقدس کاٹ کر نیزہ پر چڑھایا پوچھا میرے بھائی قمر بنی ہاشم کہاں تھے فرمایا بابا جان سے پہلے ہی لب فرات ہاتھ قلم کر کے شہید کر دیا۔ اور علی اکبر برچھی کھا کر راہی جنت ہوئے۔ چچا جان بھرے گھر میں میرے سوا کوئی باقی نہیں۔ حد یہ ہے کہ ظالموں نے علی اصغر کو تیر ستم کا نشانہ بنا دیا۔

آہ جب بھائیوں کی ترسی بہن زینبؑ کو معلوم ہوا کہ محمد بن حنفیہ آئے ہیں تو زار زار روتی ہوئی ان کے پاس آئیں اور گلے میں بانہیں ڈال کر کہنے لگیں۔ بھیا محمد کنبہ موتی بہن کو مظلوم بھائی کا پرسا نہیں دیتے۔ آہ سب کنبے کو کھو کر آئی ہوں۔ بھیا محمد ایک گھر سے اٹھارہ جنازے چند گھنٹے کے اندر نکل گئے۔ آہ ظالموں نے ہمارے خیموں

ہیں آگ لگا دی۔ ہمیں ایسا لوٹا کہ کسی بی بی کے سر پر چادر نہ چھوڑی۔ آہ بھیا محمد تمہاری بہنیں اور بھاوجیں بازار کوفہ و شام میں تشہیر کی گئیں۔ دربار وں میں بلائی گئیں۔ آہ بھیا! ہمارے شانوں میں رسیاں باندھی گئیں۔ دیکھو یہ میرے بازوؤں پر رسی کے نیل ہیں۔ اس کے بعد محمد بن حنفیہ اور لوگوں سے مل کر روتے رہے ایک عجیب کہرام بپا تھا۔ ایک طرف محمد بن حنفیہ بچھڑے کنبے سے مل مل کر رو رہے تھے۔ دوسری طرف فاطمہ صغریٰ پچھاڑیں کھا رہی تھیں اور ایک ایک کو چھاتی سے لگا لگا کر رو رہی تھیں اور ایک ایک بی بی کی گود کو غور سے دیکھتی جاتی تھیں۔ جناب رباب نے پوچھا۔ بیٹی کیا دیکھ رہی ہو۔ کہنے لگیں اپنے بھیا علی اصغر کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ فرمایا بیٹی علی اصغر کہاں۔ ظالموں نے اسے تیر سے شہید کر دیا۔

الغرض یہ قافلہ مدینہ میں داخل ہوا پہلے روضۂ رسول پر پہنچ کر دردناک بین کئے کہ سننے والوں کے کلیجے کے ٹکڑے ہوگئے۔ وہاں سے روتے پیٹتے روضہ جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا پر پہنچے اور ایک ایک بی بی قبر سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی۔ وہاں سے قبر جناب امام حسن علیہ السلام پر پہنچ کر نوحہ و ماتم کیا اس کے بعد اُجڑے ہوئے گھر میں آئے۔ سوائے چند مصیبت زدہ بی بیوں کے اور وہاں کون تھا۔ تمام زنان بنی ہاشم اور محلہ کی عورتیں پرسے کے لیے جمع تھیں۔ آہ! بہتر کا ماتم تھا، کیسے صبر آتا۔ روئیں جتنا رو سکتی تھیں اب کیا ان بیکسوں کی ساری عمریں روتے ہیں گذر گئیں۔

تمت بالخیر